

روحِ نظیر

مؤلفہ

سید محمد محمود ضوی مخدوم کسب آبادی

۱۹۴۶ء

۸۹۱۰۲۳۱۰۹
نظای - ح

مطبوعہ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ

گیا پر شاد ایدہ سنز
بکسیر پلشیر - آگرہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

(۱) دیباچہ

(طبع اول)

نفسیات کے محض سرسری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان وقتاً فوقتاً مختلف کیفیات کے زیر اثر رہا کرتا ہے۔ کوالف ذہنی کی ماہیت پر غائر نظر ڈالنا اور ان کی تکوین و انحطاط کی تشریح کرنا تنقید کا مبحث نہیں۔ تاہم اس تنوع کو مد نظر رکھتے ہوئے اس موقع پر اتنا بتا دینا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ صفاتی اعتبار سے کیفیات کی کم از کم دو قسمیں ضرور کی جاسکتی ہیں، یعنی ایک تو وہ جن کو ہم اعلیٰ کہتے ہیں اور دوسری وہ جن پر اسفل کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ اصول جس طرح افراد عامہ کے لئے صحیح ہے اسی طرح شاعر پر بھی بھاد آتا ہے۔ والٹر پیٹر کا قول ہے کہ شاعر اعلیٰ اور اسفل کیفیات کا ایک مجموعہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تباہن فی نفسہ ذاتی نہیں بلکہ اضافی ہے اور حقیقت مدارج غور و انہماک پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر اپنے موضوع پر جیسی بسیط نظر ڈالتا اور اپنی تصنیف میں جس درجہ انہماک پیدا کرتا ہے

اسی حیثیت سے اُس کی کینیات ذہنی کی بلندی اور پستی کے مدارج مرتب کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس فرق کے سمجھنے اور اس کی داد دینے کے لئے مزاج اور نفس کی حقیقی اور قرار واقعی تربیت کی ضرورت ہے۔ جو افراد انہماک و طمانیت نفس کی وساطت سے اس تربیت کے روبرو سر نیاز خم کر دیتے ہیں اُن میں ایک استعداد پیدا ہو جاتی ہے جس کے قیام کا اثر لازمی طور پر اُن میں یہ صلاحت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ صنعت و ترقی و بحیات اور عوام میں ہمیشہ ان اجزاء کو جو وہی و جدالی اور مترنم ہوں، مصنوعی، کسبی اور جامد سے تمیز کر لیتے ہیں۔

ان الفاظ سے غالباً انتخاب کی غرض و غایت پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اتنا ضرور واضح ہو چکا ہے کہ اس تالیف کا مقصد صحیح کیا ہے اور مولف کس بات کو خصوصاً نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ مزید برآں انتخاب کے اور بھی متعدد فوائد ہیں جن کی صراحت اس موقع پر کچھ ایسی ضروری نہیں۔ لیکن چند باتیں اتنی اہم ہیں جن پر کم از کم سرسری نظر ڈال لینا ناگزیر ہے۔ یقیناً کسی غفلت سلیم کے مدعی کو دنیائے جدید کے باشندوں کے عموماً اور تعلیم یافتہ طبقے کے خصوصاً غیر معمولی انہماک اور کثرت اشغال سے انکار نہیں ہو سکتا۔ قطع نظر اس سے ملک کا موجودہ سیاسی نظام اور قومی خیالات کا حیرت انگیز انقلاب ایسے بین واقعات ہیں جو کسی نوع نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ پس ایک بڑی جماعت ایسے افراد کی ہے جنہیں ان وجوہ سے مطالعے کے لئے بہت کم وقت میسر آتا ہے۔ اس لئے ان کو اپنا عزیز و بیش قیمت وقت ایسے ادب پر جو مصنوعی، کسبی اور جامد ہو، ضائع کرنا صرف ناپسند ہی نہیں بلکہ ایسا کرتے ہوئے وہ دردی بھی محسوس کرتے ہیں۔ لہذا اس صنف کے لوگوں کے لطفن طبع اور ورزش ذہنی کے لئے صرف منتخب پھول اور چیدہ جواہر پیش کرنا لازمی ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب افادہ مطالعے کے لئے انتخاب کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے یہ اصلاح پیش کریں کہ انتخاب ایسا کام ہے جو بڑھنے والے کو بطور خود کرنا چاہئے۔ یہ اعتراض اپنے مقام پر درست اور ہر حیثیت سے مقبول ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا مذاق ادب

فطرتاً نہایت صحیح اور مکمل ہوتا ہے۔ یہ لوگ جلداً شعر کے حسین و ہمہ گیر عناصر کی جانب مجذب ہو سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی حساس طبعیتیں بہت کم ہیں اور ایسے لوگ جن میں تربیت اور مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ جیسے معلم ذرائع بھی شعری حس بہ مشکل پیدا کر سکتے ہیں، زیادہ ہیں۔

لیکن یہ دونوں طبقے میرے مخاطب صحیح نہیں۔ طبقہ اول کی سرچ الاحاسی کسی بیرونی تحریک یا خارجی مدد کی محتاج نہیں۔ وہاں ہر نظر شعر اور ہر حس لفظ کا حکم رکھتی ہے۔ طبقہ ثانی کا جھود ازل سے ناقابل شکست ہے۔ ارباب ذوق کی کوشش ان میں رقت و ترنم کی لطیف کیفیات پر انگیزتہ نہیں کر سکتی۔

ہمارا مخاطب ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنی نوعیت میں ان دونوں سے جدا ہے۔ یہ وہ اہل مطالعہ ہیں جن میں نوجوان مبتدیان ذوق خصوصاً بکثرت شامل ہیں۔ یہ عجلت پسند بعض اُن خشک و بد مزہ اجزاء سے تنگ آ کر تقریباً ہر سخنور کے کلام میں پائے جاتے ہیں شعری تفریح کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ بیٹھتے ہیں اور کبھی اس غریب شاعر کی جانب توجہ مبذول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ مفسر قویہ ہے کہ بری رائے قائم کر کے اس کی ترویج اپنا اخلاقی فرض قرار دے لیتے ہیں۔ اس طرح ان محاسن کا خون ہو جاتا ہے جن کی داد صرف بالغ نظری سے دی جاسکتی تھی اور جس کے فقدان کا غریب شاعر کسی طرح ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس جگہ یہ جتنا ضروری ہے کہ وہ بلند پایہ مقامات جن کو سمجھایا کسی معاملے کے زیر اثر سرسری طور پر طال دیا جاتا ہے اپنی ندرت کے اعتبار سے بڑھنے والے کے معلومات میں معتد بہ اضافہ، خیالات میں متم بالشان ارتقاء اور مطلع نظر میں ایک موقع اور سودمند اصلاح تجویز کرنے کے بوجہ احسن اہل ہوتے ہیں۔

اب مولف کا کام ہے کہ وہ ان خشک اور بد مزہ اجزاء سے جن پر بعض اوقات مزخرفیات کا اطلاق کیا جاتا ہے کلام کو پاک کر دے۔ بہت سے خصوصیات، بالخصوص کسل و انقباض کے لمحوں میں تفریح و شگفتگی پیدا کرنے کی بنا پر شعر کی صحبت دنیا میں بہترین سمجھت ہے۔ لیکن یہ لوگ ہر وقت اپنے بہترین انداز سے مزین نہیں رہتے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ مناسب موقع تلاش کر کے جو عنوان جمیل ان کی انجمن میں بار حاصل کریں ساتھ

ہی ساتھ مولف کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ خود ایک مرتبہ تعارف کرادے۔ اس کے بعد بڑھنے والے کو اس کی حالت پر چھوڑ دے کہ وہ اپنے تعلقات خود جاری رکھے یا ختم کر دے۔ لیکن مولف کے مہیا کردہ مواد تفریح کے استعمال اور اس کے ذریعے جلب منفعت کی توقعات کے بارے میں اس مقام پر ارباب مطالعہ کو ایک اور خاص امر کی ہدایت کرنا ضروری ہے جو بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسٹیل ایک بڑے مصور کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ”جس طرح بعض صورتیں بعض مصوروں کے لئے قلم کے لئے مخصوص ہوتی ہیں اسی طرح بعض عنوان بعض شعرا کا حصہ ہوا کرتے ہیں“ یہ اصول من و عن انتخاب مطالعہ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی شاعر کے کلام کا مکمل حقہ طعم نہیں اٹھا سکتا جب تک اس میں یہ اہمیت نہ ہو کہ وہ اس شاعر کی زندگی میں اس کا رفیق و ہمدم بن سکتا۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ کسی شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونا یا نہ ہونا مزاج اور افتاد طبعیت پر بہت کچھ منحصر ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ہی شاعر یا ایک ہی تصویر کو پس نہیں کرتا۔ مزاج ہماری دوستیوں کو سوسائٹی میں طے کرتا ہے اور مزاج ہی کے فیصلے پر ہیں ادبی مشاغل کی بنا قائم کرنی چاہئے۔

لیکن بایں ہمہ مزاج اور دماغ کی تربیت جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے قرین امکان ہے۔ اس شخص کو جو کسی شاعر کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پاتا یہ مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس کی بجائے کسی کے قابل بنائے۔ بسا اوقات عدم وقوف اور فقدان لذتِ ادبی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ ناخوشگوار کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ پس اگر ابتدا میں کسی شاعر کے داخلی معانی ہماری دست رس سے باہر معلوم ہوں تو ہم کو یوں نہ ہونا چاہئے۔ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب حیات کی کشمکش جو جملہ امور کی معلم ہے کسی سطر یا الم کے موقعے پر اُن سارے حقائق کو یکایک منکشف کر دیتی ہے جو ہماری کم نگاہی کے سبب ہم سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ شادمانی کے لحوں میں اور غم کے مواقع پر بھی بالیقین شعرا کی صحبت ہمارے لئے بہترین نعمت اور بدرجہ اتم مسرت بخش ہے۔ شعر زندگی کے اُن دشوار گزار راستوں میں جن سے کوئی شخص پیشتر نہ تھا

نہیں ہوتا ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم حسن پرستی، زندہ دلی اور محبت نوازی سے جو شعر کی جان ہے اپنی نظریں کشادہ، اپنا دماغ حاضر اور اپنی ہمدردیاں سرگرم رکھیں۔

یہ جملہ باتیں جواب تک بیان کی گئیں اصولاً ہر اعتبار سے نظیر پر صادق آتی ہیں۔ اس بنا پر اور اس کے علاوہ اور بہت سے وجوہ کی بنا پر نظیر کے کلام کا انتخاب اس حیثیت اور شان سے شائع کرنا نہایت ضروری تھا۔ باوجود ایسا نغمہ گو اور عظیم المثال شاعر ہونے کے ملک و ملت اب تک نظیر کی تمام و کمال روشناس نہیں۔ بلکہ موجودہ واقفیت اگر وہ کسی نوع واقفیت کہی جاسکتی ہے، جہل کی صورت میں نمایاں ہوتی تو زیادہ سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ قابل افسوس تو یہ امر ہے کہ ارباب ذوق اور اہل علم کو بھی اس بلند پایہ سخنور کے کلام پر اتنا عبور نہیں جتنا دوسرے اساتذہ کے کلام پر ہے بلکہ ان کا تفاعل اور عدم توجہ کسی طرح عوام الناس سے کم نہیں۔ اردو زبان باوجود اپنی بے بضاعتی اور کم یابی کے شاعری کو اپنے مربیانہ فیضان سے ہمیشہ مالا مال کرتی رہی ہے۔ اردو بولنے والوں کو شعر و سخن اسے ہر زمانے میں جو دہشی دہی ہے وہ شعر کی کثرت سے صاف ظاہر ہے۔ اس صورت میں نظیر سے ناواقفیت اور بے پرواہی اور بھی تعجب انگیز ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ ذوق عام، صحیح مذاق شعر و ادب نہ تھا اور اس سے ہمارے استعجاب کا پورا جواب مل جاتا ہے۔

بہر حال اب مطالعہ کرنے والوں کو سہولت بہم کرنے اور دماغوں کو نظیر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہترین نظموں کا ایک مختصر مجموعہ پیش کیا جائے جو کیندہ ارباب تلاش کے نزدیک تحقیق و تنقید کا بیش خیمہ بن سکے۔ کسی شاعر کا مطالعہ کرتے وقت اس کا ضروری لحاظ رکھنا چاہئے کہ اس کے کلام کا کم از کم اتنا حصہ ضرور پڑھ لیا جائے جس سے زندگی اور آرٹ کے متعلق اس کے نقطہ نظر کا کافی اندازہ ہو سکے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کلام کا وہ حصہ پیش نظر ہو جس میں شاعر نے پورا پورا زور و تخیل صرف کیا ہے۔ میں نے اپنی یاقوت اور استعداد کے مطابق اسی نوعیت

کا کلام منتخب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم متبعین کے لئے ابھی بڑی گنجائش باقی ہے۔ یقین ہے کہ یہ ترغیب بار آور ہوگی اور اس بنیاد پر نئی نئی عالی شان عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

بحمد اللہ اب ملک میں بیداری کے آثار نمودار ہیں اور استقلال کی روشنی دلوں پر مسلط ہو چکی ہے۔ اس لئے قومی امید ہے کہ ملک خود اپنے پوشیدہ جواہر کو گمنامی کی تاریک کانوں سے کھود کھود کر نکالے گا اور ہر جوہر قابل کی اس کی حیثیت اور محاسن کے مطابق پوری پوری داو دی جائے گی۔

جدید تمدن سے روشناسی اور مغربی ادبیات کے درود نے ہندوستانی مذاق میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ علاوہ بریں مغربی و مشرقی خیالات کے تو اصل سے جو ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی بالذات نہایت لطیف اور کیف آور ہے۔ بہر حال انگریزی ادبیات میں جس طرز کی نظمیں پائی جاتی ہیں وہ اردو زبان میں میسر نہیں۔ ہر چند موجود شعر اس جانب مائل ہیں تاہم اساتذہ کا کلام جواب بہت سے درجہ سے ادب القدما کی حیثیت سے ہمارے پیش نظر ہے اس طرز سے خالی ہے۔ یہاں اساتذہ کو سہ نیاز خم کرنا پڑتا ہے لیکن اردو زبان کا درفش سرور کی کسی طرح سرنگوں نہیں ہوتا کیونکہ یہاں سے نظیر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نظیر کی شخصیت سب سے بلند نظر آتی ہے اور ہمیں سے نظیر کی فوقیت کا ثبوت اور معترضین کا جواب دونوں ہم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مغرب پسند حضرات کا اعتراض رد کرنے کے لئے نظیر کا صرف وہ کلام پیش کرنا زیادہ فرین آمد صحت ہے جو ان کے خیال میں قطعی مغربی انداز پر ہے۔ جس کو مشرقی چاشنی کے متوالے خالص اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا پالے ہیں۔

اس انتخاب کی ایک سیاسی غایت بھی ہے جو کسی عنوان مفاد سے خالی نہیں۔ نظیر کا کلام دیکھ کر اس کی ہمہ گیری سے شاعر کی بے تعصبی کا اندازہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ قرون ماضیہ میں ہندوستان ایک قوم دوسری ہمایہ قوموں کے جذبات کا یہاں تک پاس و لحاظ کرتی تھی کہ شعرا ارادۃ یا اضطراراً کا اظہار اپنا فرض منصبی قرار دے لیتے تھے بلکہ یہ بھی واضح ہوگا کہ اس سرزمین پاک کے بے جرم و خطا

مطعون باشندے اس قسم کے شریفانہ حیات سے بے بہرہ اور محروم نہیں جن پر ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور قوموں کے باہمی اتحاد و مصالحت ہمدردی اور رواداری کی بنیاد رکھی جاسکے۔ یہ غیر فانی نکتہ نظیر کے کلام کا زندہ معجزہ ہے اور ملک کے بداندیشوں کا جو ہمیشہ اختلاف کے حامی اور شکر رنجیوں کے معاون رہے ایک دہقان جواب ہے۔

نظیر کا کلام ایک زخا رہنمائی ہے جس میں ہر قسم کے موتی بچہ و شمار دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے انتخاب کرنے والے کو بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اسی فیض عام کی برکت سے اس تالیف میں بھی ہر مذاق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہندو، مسلم، شیعہ، سنی، سکھ، ہر مذہب اور عقیدے کے پیروں کے لئے کافی دلچسپی کا التزام کیا گیا ہے۔ نظموں کی نوعیت اور مختلف مذاقوں کی رعایت کا ذکر لاحقہ حاصل معلوم ہوتا ہے۔ مطالعے سے ہر بات خود ظاہر ہو جائے گی۔

نظموں کے ناموں کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے اور میں معترف ہوں کہ اس بارے میں تحقیق دشوار ہے۔ مختلف نسخوں میں مختلف عنوان دئے ہوئے ہیں۔ میں نے نظیر کا تجویز کردہ عنوان معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا سراغ کچھ تو بڑے نسخوں سے لگایا ہے اور کچھ نفس مطمئنوں سے اندازہ کیا ہے۔ پھر بھی پورے یقین کے ساتھ صحت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اس انتخاب میں جو نظمیں شامل ہیں ان کی ساری مختلف نسخوں سے صحت کی گئی ہے۔ لیکن شہباز کے ایڈیشن پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔ مگر جہاں ہر نسخے میں اختلاف واقع ہوا ہے اور شہباز کے ایڈیشن سے بھی کافی تسلی نہیں ہوئی تو میں نے اکبر آباد کا باشندہ اور یہاں کی ہر قسم کی زبان سے واقف ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس تالیف میں عموماً اردو میاں نگاری میں خصوصاً انگریزی ادبیات سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ دیباچہ میں متعدد انگریزی انشا پردازوں اور محقق مؤلف کے خیالات کا امتزاج ہے۔ بعض جگہ فقرہ کا بجنسہ ترجمہ کر دیا گیا ہے جو ادیب کے اندر بند ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر عبارت کا ابطاقام رکھنے اور دوسری انشائی ضروریات

کے باعث یہ مقامات علیحدہ نہ رکھے جاسکے اور اس طرح مخلوط ہو گئے کہ قوسین کے اندر بھی بند نہیں۔ ممکن ہے عالی حوصلہ حضرات اس پر انگشت نہا ہوں لیکن اس بارے میں صرف اس قدر گزارش کرنا غالباً عذر گناہ نہ سمجھا جائے گا کہ اردو زبان خصوصاً نثر ابھی بہت کم مایہ ہے۔ دوسری زبانوں اور ادبیات سے خیالات کا اقتباس کر کے اپنی زبان میں شائع کرنا اور اس کو سرمایہ دار بنانا کسی نوع مفاد اور دلچسپی سے خالی نہیں اور میوب بھی نہیں تصور کیا جاسکتا۔

جون ۱۹۲۲ء
آگرہ

محمود السبزوادی

(۱) دیباچہ

(جلع دوم)

روحِ نظیر پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب چوبیس برس کے بعد اس کا دوسرا نقش شائع ہوا ہے۔ صرف ایک ہزار جلدوں کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے لئے جس میں سے کم و بیش تین سو نسخے اجاب اور عوار کے حلقے میں مفت تقسیم ہوئے ہوں، یہ طویل مدت بڑی ہمت شکن ہے۔ لیکن اس احساس کی بنا پر کہ نظیر کے مطالعے کا ذوق روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور اس اعتماد پر بھی کہ اس ذوق کے نشوونما میں روحِ نظیر نے بھی قدرے قلیل حصہ لیا ہے، اس صحیفے کی دوسری اشاعت پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ اس اشاعت کے متعلق ذیل کی باتوں پر توجہ دلانا ضروری ہے :-

(۱) پہلی اشاعت صرف چالیس نظموں پر مشتمل تھی۔ اس کی امثالیں سو فی نظم جو حافظ کی ایک غزل کی تفسیر ہیں، اس مرتبہ حذف کر کے، گیارہ مزید نظمیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ اس طرح جدید اشاعت میں پچاس نظمیں شامل ہیں۔

۲۔ پہلی اشاعت میں غزلیں شامل نہ تھیں لیکن اس میں بہت سی غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کو تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے :-

(۱) غزلیں

(۲) مسلسل غزلیں

(۳) موضوعی غزلیں

۳۔ غزلوں کے علاوہ چند تفسیہیں اور مستزاد بھی شامل کئے گئے ہیں۔

۴۔ جو نظمیں بڑھائی گئی ہیں، ان پر تبصرہ بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ ”پری کے سراپے“ پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر نوع کی غزلوں، مستزادوں اور تفسیہوں پر بھی تبصرہ کر دیا گیا ہے۔

۵۔ پہلی اشاعت میں نویں نمبر کی نظم کا نام ”ذکر مرغیاں“ ہے۔ اس اشاعت میں اس کا نام بدل کر ”چڑیوں کی تسبیح“ رکھ دیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی نام نظیر کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ ”برسات کی بہاریں“، ”کھلکھل“، ”نفسی“ اور پہلی ”ہولی“ کے بہت سے بند جو پہلی اشاعت میں شامل نہ تھے، اس اشاعت میں بڑھا دئے گئے ہیں۔ لیکن شہباز کے نسخے کے مقابلے میں چونکہ ”برسات“ میں، ”چار“، ”نفسی“ میں، اور چھ پہلی ”ہولی“ میں اب بھی کم ہیں۔

۶۔ پہلی اشاعت کے وقت کئی مختلف نسخوں سے صحت کی کمی کی گئی تھی۔ بسا اوقات شہباز رحمہ اللہ کیا تھا۔ اب عزیز می صاحب نے عباس ہاشمی صاحب خیابانی، بی ایونی صاحبے صاحب ریاست گوالیار کی مدد سے ایک قلمی نسخہ میسر آیا ہے۔ یہ نسخہ گوالیار کے ایک قدیم فرانسیسی خاندان کے کتب خانے میں اب تک محفوظ تھا۔ چنانچہ اس اشاعت کی صحت میں اس نسخے رحمہ اللہ کیا گیا ہے۔

۷۔ اس نسخے میں بہت سی غیر مطبوعہ غزلیں میسر آتی ہیں۔ یہ نسخہ ابتداً دیوان کے طور پر مرتب کیا گیا تھا، لیکن اصل مرتب کرنے والے یا کسی دوسرے شخص نے غالباً بعد کو اس میں کچھ نظموں کا کبھی اضافہ

کر دیا ہے۔ اس لئے اس نے جزو الکلیات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بہر حال اس غزلوں اور نظموں دونوں کی صحت میں بڑی مدد ملی ہے۔

۸۔ اس اشاعت میں صحت کا بڑا التزام کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں اب بھی بس نہیں جلا۔ چنانچہ غزلوں کے بعض مصرعے جن کی صحت نہ ہو سکی درج نہیں کئے گئے۔ پہلی اشاعت کی کتابت کی غلطیوں اور دوسری خامیوں کی بھی اس اشاعت میں صحت کر دی گئی ہے، لیکن اس اشاعت میں بھی بعض کتابت کی خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔

۹۔ بری کے سراپے میں شہباز ایڈیشن اور قلمی نسخے میں بڑا فرق ہے۔ شہباز کے یہاں کل اٹھارہ اور قلمی میں بیس بند ہیں۔ قلمی کا بار ہواں اور تیر ہواں بند شہباز کے یہاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوں کی ترتیب، بندوں میں مصرعوں کی ترتیب اور مصرعوں میں لفظوں کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ کہیں کہیں دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ تیسرے بند کے پہلے مصرعے میں شہباز نے ”غوب“ درج کیا ہے اور قلمی میں ”زور“ استعمال ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ پروفیسر شہباز جیسے اہل نظر اور نظیر شناس نے ”غوب“ کو ”زور“ پر کیسے ترجیح دیدی۔ ”زور“ نظیر کا محبوب لفظ ہے اور عمدہ کی زبان کا سچا نمونہ ہے۔ اسی طرح شہباز نے اپنے نویں اور دسویں بندوں کے پانچویں مصرعے میں ”دونوں جگہ“ ”مونڈھوں“ استعمال کیا ہے۔ نویں میں یہ لفظ بالکل بر محل ہے لیکن دسویں میں سیاق اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں ”مونڈھوں“ کی جگہ ”کوٹھوں“ ہونا چاہیے۔ نظیر ایک ہی لفظ کو دو جگہ لانا پسند نہیں کرتا۔ قلمی نسخے کا شہباز ایڈیشن سے ہر اختلاف نظیر کی زبان اور مزاج شعری سے پوری مطابقت کرتا ہے۔ یہ شہادت اس کی صحت اور سند کی بڑی دلیل ہے۔ اس بنا پر ہر جگہ قلمی نسخے کے اندراج کو ترجیح دی گئی ہے لیکن میں اپنے فیصلے کو قول فیصل کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ادنیٰ مسائل مزید ذاتی تحقیق و تفتیش کے ہمیشہ محتاج رہتے ہیں۔

۱۰۔ ”بھونچال“ نامی نظم میں شہباز کے نسخے میں صرف اٹھارہ بند ہیں اور قلمی میں پچیس۔ اس کے علاوہ

بعض مصرعوں میں بھی اختلاف ہے۔ اسی طرح ”جوانی اور بوڑھاپے کی لڑائی“ اور ”مفسی“ نامی نظموں میں بھی دونوں نسخوں میں اختلاف ہے۔ میں نے بہر عنوان فلمی نسخے کا اتباع مناسب سمجھا ہے۔

۱۱۔ نظموں میں جہاں مکالمے کی صورت پیدا ہو گئی ہے وہاں داوین کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ”کرشن جنم“ ”جوگی نامہ“ اور ”جوگن نامہ“ نظموں میں مکالمے کی کثرت ہے۔ ان میں خصوصیت سے اس نوع کا التزام کیا گیا ہے۔

۱۲۔ نظیر کے جو مصرعے کسی عنوان غلط معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقت میں غلط نہیں۔ افسوس ہے کہ ہم تک اس صورت میں پھونچے ہیں۔ زبان کے تغیر زمانے کے لازمی رد و بدل اور کاتبوں کی سہل انگاری نے بعض الفاظ اور محاوروں کو اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ اصل تک پھونچنا آسان کام نہیں رہا۔ اس کا الزام نظیر کے مرتبہ بابے انصافی ہے۔ اس لئے نظیر پسندوں کو صحت کی کوشش میں برابر مصروف رہنا ضروری ہے۔ نظیر کا صحیح لفظ ہم کرنے کے لئے نظیر کے عہد کی زبان ہر وقت پیش نظر ہونی چاہئے۔

۱۳۔ اس اشاعت میں فرہنگ اور حاشی کی ضخامت وہی ہے جو پہلی اشاعت میں تھی اور حاشی کی تاریخی صداقت کی ضمانت نہیں کی جاتی۔ جو نظمیں اور غزلیں اس میں اضافہ کی گئی ہیں ان کی فرہنگ اور حاشی مرتب نہ کئے جاسکے۔ ”موت“ نامی نظم مطبع کی غلطی سے شامل ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر تبصرہ بھی نہیں کیا گیا۔

۱۴۔ اس کتاب کا مسودہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں مطبع کو سپرد کر دیا گیا تھا مگر اب تک اس کے تکمیل اور اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھئے کب تک اس قید سے آزاد ہو۔

مؤلف کا یہ پرانا خیال کہ آزاد سے نظیر کے باب میں سہو ہوا (صفحہ ۶) اب تک بالکل بدل چکا ہے۔

سہو کے امکان کی جگہ سہوعد نے لیلی ہے۔ آپ جیات میں جگہ نہ دے کر آزادانہ دانستہ نظیر کی اہانت کی کوشش کی ہے۔ وہ اگر دیانت سے نظیر کو شاعر نہیں مانتا تو اس کے ذوق شعر نہمی پر حرج آتا ہے۔ نظر انداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نظیر کو جدید رنگ کی شاعری کا پیش رو تسلیم کرنے کے لئے طیارہ نہ تھا۔ اگر یہ وجہ بھی غلط ہے تو یہ الزام مسلم ہے کہ محض عامۃ الورود و خیالات سے متاثر ہو کر آزادانہ اپنی ناقدانہ بصیرت کو پس پشت ڈال دیا اور نظیر کے متعلق غور و فکر تحقیق و تفتیش کی سعی نہ کی۔

(۳)

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۲ء میں 'مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا مرتب کردہ' دیوان نظیر شامل کیا ہے۔ اس موقع پر اس مجموعے کے متعلق حسب ذیل گزارش بے محل نہ ہوگی۔
۱۔ مرزا صاحب نے اپنے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ ان کے مرتب کردہ دیوان میں نظیر کا کل غزلیہ کلام شامل ہے۔ یہ خیال ذیل کے وجہ سے غلط ہے :-

(۱) ضیائے عباس ہاشمی ضیائی بدایونی والانسخہ جس سے میں نے اس اشاعت کے لئے انتخاب کیا ہے، بہت سی ایسی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جو اور کہیں میسر نہیں آتیں۔
(۲) مولوی عابد علی صاحب شاہ گنج آگرہ کے ذخیرے میں جو خود ان کا مرتب کردہ ہے، بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۳) منشی درگاہ شاد مہرہ ایڈوکیٹ ورٹس پٹی گلی آگرے کے مرتب کردہ سرمائے میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۴) ان کے علاوہ اور بھی چند مقامات کا ذکر روایا بنا گیا ہے مگر ان کے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً یہ کہ :-

(الف) پنڈت کی تلاش ناتھ کنز روم روم وکیل سرکار و رئیس اکبر آباد کے قبضے میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام تھا جس کا بیشتر حصہ پورے دیوان حافظ کی تضمینوں پر مشتمل تھا۔ کلام میں حافظ کی تضمینوں کی موجودگی اس روایت کو قرین قیاس بناتی ہے۔ بہر حال مجھے اس کلام کا پتہ نہ لگ سکا۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو وہ کلام اس وقت بھی کسی نہ کسی کے قبضے میں موجود ہے۔

(ب) بابورام گوپال ایڈوکیٹ سہارنپور کے قبضے میں کچھ کلام ہے۔ یہ اسی کھتری خانہ کے چشم و چراغ ہیں، جہاں میں نظیر پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس کلام کی موجودگی نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ یقینی ہے۔ خود انھوں نے اور ان کے بعض عزیزوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے مگر اب وہ کسی مصلحت سے بات ٹالتے ہیں۔ ایک مستند تصویر بھی ان کے قبضے میں بتائی جاتی ہے۔ مگر اس ذخیرے تک میری رسائی نہ ہو سکی۔

(ج) بقول مولوی عابد علی صاحب، بندر ابن کے کسی حلوائی یا کنجڑے کے پاس بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

(د) مختلف لوگوں کو زبانی یاد ہے جو سینہ بہ سینہ چلا کر رہا ہے۔ ان حافظوں میں پھیری کے فقیر قلندر، خوشچے والے اور جٹا جو رگم والے بھی ہیں۔

(۵) نشریں، سہ نشر فہرستی کے طرز کی کئی نشریں ہیں۔ ان میں سے حسن بازار اور قدیمیں دو کا حوالہ پروفیسر شہباز نے دیا ہے۔ ان دونوں کے کلمی نسخے اور ان کے علاوہ دو اور جو نہایت بوسیدہ اور کرم خوردہ ہیں خود میرے پاس موجود ہیں۔

(۶) بہر حال جب تک ان سب ذرائع سے جمع کر کے، سارا کلام ایک جگہ شائع نہ کیا جائے۔ مزار فرحت الشریک صاحب کا سادہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ کتاب کی کتابت و طباعت ناقص ہے۔ حیرت ہے کہ انجمن نے جو کثیر سرمائے اور بیش از بیش ذرائع کی مالک ہے، اردو کے نظیر جیسے رکن اعظم کے کلام کو، ایسی بددلی سے شائع کرنا جائز رکھا۔
۳۔ انتخاب میں کسی خاص اصول یا ترتیب کو مدنظر نہیں رکھا گیا اور دباچے میں محض عامۃ الورد باتوں پر نظر ڈالی گئی ہے جن سے کوئی بصیرت پیدا نہیں ہوتی۔ نظیر جیسے شاعر کا کلام اس سے بہت زیادہ گہرے، تحقیقی و تنقیدی مطالعے کا مستحق ہے۔

۴۔ نظیر کو محض روایتی نقطہ نظر سے دیکھ کر بورژوا ذہنیت کا مظاہر کیا گیا ہے۔
۵۔ ۳۱ صفحے پر مرزا صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ نظیر نے غالب کے مضمون کو الٹ دیا ہے۔ یہ بیان فاش تاریخی غلطی ہے۔ نظیر، غالب سے کم و بیش ساٹھ برس متقدم ہے۔ نظیر نے ۱۸۳۱ء اور غالب نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے مضمون لکھتے وقت، دونوں کے عہد حیات پر غور نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود غالب نے نظیر کا مضمون الٹ کر باندھا ہے۔ غالب کے کلام میں، اس نوع کے توار کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ تبصرے میں، اس موضوع پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

خاتمے میں ایک بات عرض کر دینی ضروری ہے۔ میں نے کئی سال کی متواتر محنت کے بعد نظیر پر ایک دوسری کتاب مرتب کی ہے، جس کا نام نظیر نامہ ہے۔ یہ ضخیم کتاب نظیر کے شاعرانہ نقطہ نظر کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں مکمل ہو چکی ہے۔ اگر کاغذ کا یہ قحط اور کتابت و طباعت کی یہ دشواریاں حائل نہ ہوتیں تو یہ کتاب بھی اب تک شائع ہو جاتی۔ میں برابر کوشش کر رہا ہوں کہ جلد جلد سے نظیر نامہ شائع کر سکوں۔

محمود اکبر آبادی

نئی دہلی
مئی ۱۹۴۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۳) فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۵	۹۔ چڑیلوں کی تسبیح	۸-۱	۱۔ دیباچہ
۲۳۶	۱۰۔ قضا نامہ	۱۵-۹	۲۔ دیباچہ طبع دویم
۲۳۲	۱۱۔ طفلی	۱۸-۱۶	۳۔ فہرست مضامین
۲۳۳	۱۲۔ جوانی	۲۰-۳	۴۔ مقدمہ
۲۳۶	۱۲۔ برطیابا	۲۰۰-۳۳	۵۔ تبصرہ
۲۵۶	۱۳۔ فقیروں کی صدا	۳۰۲-	۶۔ کلام نظیر
۲۵۹	۱۵۔ خوش نامہ	۲۰۳	۱۔ اتلی نامہ
۲۶۳	۱۶۔ کلجگ	۲۵۷	۲۔ برسات کی بہاریں
۲۶۶	۱۷۔ مغاسی	۲۱۷	۳۔ بخارہ نامہ
۲۶۱	۱۸۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام	۲۳۶	۴۔ عاشق نامہ
۲۶۵	۱۹۔ دوا لی	۲۲۳	۵۔ آدمی نامہ
۲۶۸	۲۰۔ حضرت سلیم چشتی	۲۳۶	۶۔ ہنس نامہ
۲۸۰	۲۱۔ بیوی کی بہار	۲۳۰	۷۔ روضہ تاج گنج
۲۸۱	۲۲۔ نایک شاہ گرد	۲۳۱	۸۔ تندرستی نامہ

۳۳۰	۴۲- آئینہ	۲۸۳	۲۲- جنم کنہیا جی
۳۳۲	۴۳- روٹی نامہ	۲۸۹	۲۴- بانسری
۳۳۵	۴۴- آندھی	۲۹۱	۲۵- آگرے کی تیراکی
۳۳۷	۴۵- اڑدے کا بچہ	۲۹۴	۲۶- موسم زمستان
۳۳۹	۴۶- لکڑی	۲۹۶	۲۷- اُوس
۳۵۲	۴۷- بھونچال	۲۹۸	۲۸- کورابرتن
۳۵۷	۴۸- کوڑی نامہ	۳۰۱	۲۹- کوا اور ہرن کا بچہ
۳۶۰	۴۹- وجد و حال	۳۰۳	۳۰- خواب کا طلسم
۳۶۲	۵۰- جوانی اور بڑھاپے کی لڑائی	۳۰۶	۳۱- ریکچہ کا بچہ
۳۶۶	۵۱- بلدیو جی کا میلہ	۳۰۹	۳۲- راکھی
۳۷۵	۷- غزلیات	۳۱۰	۳۳- سخی موت و عشرت
۳۷۷-۳۹۰	۱- غزلیں	۳۱۳	۳۴- چاندنی رات
۳۹۸-۴۰۱	۲- مسلسل غزلیں	۳۱۵	۳۵- ہونی
۵۰۱	۳- موضوعی غزلیں	۳۱۷	۳۶- جوگی نامہ
۵۲۱	۸- تضمینیں و مستزاد	۳۲۳	۳۷- جوگن نامہ
۵۳۱	۹- فرہنگ	۳۳۱	۳۸- موتی
۵۴۷	۱۰- حواشی	۳۳۳	۳۹- موت
۵۷۱	۱۱- عنوانات کا انڈیکس (اشاریہ)	۳۳۵	۴۰- اکبر آباد
		۳۳۶	۴۱- پرمی کا سراپا



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

(۳) مُقَدِّمَةٌ

تمہید | شاعری کے محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے آرنلڈ ایک مقام پر رقم طراز ہے کہ شاعری ”تفتید زندگی“ ہے۔ اس دعوے کی حقیقت نہائی اور صداقت پر جو بین ہے اگر یقین کر لیا جائے تو شاعری کی ضرورت تسلیم کر لینا بہر قبیل سے لازم آتا ہے۔ اس لئے بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس کا جو دہ مذہب قوموں کے لئے ناگزیر ضروریات حیات میں سے ہے اور اس کی ترقی قومی حیات و عوام کی ترقی کے پہلو پہلو رہتی ہے۔ جس طرح کوئی قوم فلسفی اور نقض کی دماغی و ذہنی مساعی سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اسی طرح شاعر کی روح پرورد خدمات قومی ضروریات سے حذف نہیں کی جاسکتیں۔ اگر فلسفی اپنی عزیز عمر و تمام تر قوتیں

مقصد حیات، اسباب فلاح اور وسائل نجات کی تلاش و جستجو کے لئے وقف کر دیتا اور مقنن، بہبود و امن عامہ کو مد نظر رکھ کر کامل ترقی اور اعلیٰ معیار حیات تک پہنچانے کے ذرائع بہم کرنے کی کوششیں کرتا اور شاہراہ سعی و عمل پر بہ اسلوب احسن قدم زن محفے کے لئے قواعد منضبط کرتا ہے، تو شاعر بھی اسی شغف و انہماک کے ساتھ قومی غیرت و حمیت کو زندہ اور احساس قومیت کو جو حیات قومی کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری عنصر بیدار رکھتا ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لحظہ ملک کے حیات کے مد و جزر سے باخبر رہے اور اخلاق کی درستی میں نمایاں حصہ لے۔ مردہ آرزوں کو زندہ کرنا، پست ہمت کو ابھارنا اور خفہ جذبات میں تلاطم و ہیجان پیدا کرنا شاعر کا فرض اولین ہے۔ شعر فطری وجدان کو براہِ نیغمتہ کرتا ہے، طبیعتوں کو جوش اور ولولہ، خیالات کو جذبات اور لطافت اور دلوں کو مسرت اور تازگی بخشتا ہے۔ جس قوم کا ذوق شعری کند ہو جائے سمجھ لو کہ اس کے آثار حیات زائل ہو چکے اور درۂ منزل کی جانب مائل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قوم کو زندہ و باخبر رکھنے اور اُس میں جدوجہد کی روح پھونکتے رہنے کے لئے شاعر کی شخصیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی فلسفی و مقنن کی۔ لیکن دراصل ان سب سے زیادہ ضروری نقاد کا وجود ہے جو ہر چیز کو نقد کی روشنی میں پیش کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا ہے۔ تنقید وہ کسوٹی ہے جس سے شعر کے حسن اور قبح کا اندازہ کیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کہاں تک اپنا فرض انجام دیا اور اُس کی شاعری کس حد تک شاعری کہی جانے کی مستحق ہے۔ اس وقت نظیر اور نظیر کا کلام ہمارے پیش نظر ہے۔ اب ہم نقد کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں گے کہ نظیر کیا تھے اور ان کا کلام کیا اہمیت رکھتا ہے۔

گمنامی [نظیر کا نام لیتے ہی جو چیز سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ ان کی گمنامی ہے۔ نظیر کو گلشنِ جاناں کی سیر کرتے ہوئے تقریباً ۱۹۷۹ء میں ہو گئے۔ یہ مدت اتنی کافی ہے کہ اگر بنائے وطن اس مرحوم سخنور کی طرف توجہ کرتے تو تحقیق اور تنقید کا بڑا ذخیرہ اس باب مطالعہ کے قبضے میں ہوتا۔ ایک صدی کی مدت اتنی کافی ہے جس میں زندہ اور باخبر قوموں کے شعرا مدارجِ شہرت و قبولیت طے کر کے آسمانِ عروج و سر بلندی کے ستارے بن جاتے ہیں اور ان کے کلام کا شمار ادبِ اقدام کی برگزیدہ فہرست میں ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہندوستانی ادبِ قدیم کے لئے جو اپنے حسن میں کامل اور اپنی

نوع میں یگانہ ہے ہنوز روزا دل ہے۔ جیت ہے اس ملک اور ملت کی خفہ بختی پر جس نے اپنے گوہر یک دانہ کو گرد گناہی سے اس طرح آلودہ کر رکھا ہو۔ پورے یقین کے ساتھ نہیں بتایا جاسکتا کہ نظیر کی حیات میں ان کی قدر دانی کا کیا عالم تھا۔ اتنا ضرور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ ساٹھ شہریس کی مدت میں جیسا روح فرسا اور جو ہر کش برتاؤ ان کے ساتھ کیا گیا اس سے بدرجہا بہتر قدر دانی غالباً ان کی حیات میں ہوئی ہوگی۔ لیکن اس پر بھی بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظیر فی الحقیقت جس قدر دانی کے مستحق تھے اتنی قدر ان کی حیات میں بھی نہیں ہوئی۔ تاریخ ادب اردو اس امر کی شاہد ہے کہ ذوق شعری نے اس وقت تک ارتقا رکھی اس منزل میں قدم نہ رکھا تھا جہاں سے نظیر کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ بلکہ شاعری ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل بھی طے نہ کر چکی تھی کہ اس فطری مغنی نے اپنے آئینہ نغے پھیل دئے۔ زمانے کی بھونڈی قدامت نواز طبیعت کسی اور طرف مائل تھی اور ان کے نفیس و انتراع پسند خیالات کا جہان کسی اور جانب تھا۔ یہاں تک کہ ان کی تیز رفتاری نے ادبیات کے سست روکاروں کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا۔ پس اس طرح نظیر کو اپنے ہی وقت میں روش زمانہ سے بہت آگے مل گئے لیکن اہل ملک میں یہ صلاحیت اتنی پیدا نہ ہو سکی کہ ان کی کتب بیان کو سمجھتے اور اس کی مناسب داد دے سکتے۔ ہاں ایک نئی اور دلچسپ چیز سمجھ کر تھوڑی بہت داد واد ضرور کرتے رہے۔ نظیر کے معاملے میں اتنی سخت حق تلفی اور انصاف کا خون ہونے کی غالباً یہی سب سے بڑی تاریخی وجہ ہے جس تک رسائی ممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک مستغنی مزاج والے اور غیر تالیش پسند بزرگ تھے انھوں نے کبھی اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اپنے کو جس کام پر مامور سمجھتے تھے وہ کام انھوں نے ہمیشہ نہایت اطمینان و خاموشی سے انجام دیا اور جو بیخام تمام ازل نے انھیں ودیعت کیا تھا عمر بھر اس کی تلقین کرتے رہے۔ جدید تمدن کی معرفی نے نظیر کے محاسن کو حقیقی روشنی میں پیش کیا ہے اور اب ہمارے نزدیک وہ وقت آگیا ہے جب ان کی پوری پوری قدر شناسی کی جائے گی۔

کوئی بڑا شاعر اتنا نظیر کی مخصوص سر بلندی اور انتہائی گن گناہی دونوں کو ایک جا جمع کر کے لازمی طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ گم نام نہیں | کوئی بڑا شاعر اتنا گن گناہی نہیں۔ ہر چند متعدد نارسا تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن تفصیل کے ساتھ کسی میں نہیں اس لئے اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ البتہ پروفیسر شمس بھٹ نے جو تذکرہ مرتب کیا ہے اس سے بہت

کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے۔ عوام اور سطح نظر گروہ تو ایک طرف بلکہ نگاہ اور اصحاب تحقیق کی نظر سے نظیر کا پوشیدہ رہنا بظاہر بہت تعجب انگیز ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد صاحب تذکرہ آبِ حیات کی وسیع تلاش و جستجو سے نظیر کے پوشیدہ رہنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آزاد نظیر کو شاعر نہ سمجھتے تھے دوسرا یہ کہ ان سے سہواً آزاد کی جو ہر شناس نگاہ کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ نظیر کے قائل نہ تھے ہم بہتان سمجھتے ہیں۔ پس یہ خیال تو ایک منٹ کے لئے بھی قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ البتہ دوسری وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ گذشتہ زمانے میں مذاق سخن اس درجہ مصنوعی ہو گیا تھا کہ فطرت شناسوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ اس عام مذاق نے لوگوں کو روز بروز نظیر کی جانب سے غافل کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار زوال اس حد پر پہنچ گیا جہاں سے پھر کمال کی ابتدا ہونے لگتی ہے۔ اس ماحول کے زیر اثر اگر آزاد سے سہواً ہو تو زیادہ تعجب خیز نہیں۔ گناہی کی ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے اور اس کے غالباً نظیر خود ذمہ دار ہیں۔ وہ ایک درویش صفت صاحبِ دل، قانع، با وضع، مستغنی، خود دار، عالی ظرف، بلند وصلہ اور سیرِ چشم بزرگ تھے۔ اس لئے انھوں نے کبھی کسی دربار کی ملازمت یا حاضر باشی پسند نہ کی۔ کئی درباروں سے طلبی بھی ہوئی مگر جانا پسند نہ کیا۔ شہبازی رائے کے مطابق راجا کا شمی مقیم اکبر آباد کے یہاں ان کا تعلق ثابت ہے لیکن وہ برائے نام تھا۔ کسب معاش یا حصولِ زر کی خاطر نہ تھا۔ غالباً خود داری اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ رئیسوں کی دربار داری کریں اور ان کی جا اور بیجا خواہش، چالوئی، سخن پروری اور ناز برداری کا بار اپنے حقیقت پرور نفس پر ڈالیں۔ وہ شاعری کا صحیح مفہوم جانتے تھے اور اس کو کسی فرد واحد کی تعریف و توصیف سے آلودہ کرنا باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شعر دل کی تحریک سے ظہور پزیر ہو سکتا ہے نہ کہ رؤسا کی فرمائشوں اور حصولِ عطایا کی خواہشوں سے۔ شاعری ان کا شغل شوق تھا وہ اسے کسب معاش کا ذریعہ بنانا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ درباروں سے تعلق نہ پیدا کرنے اور رؤسا کی مجلسوں سے الگ رہنے کی ایک وجہ غالبان کی فارغ البالی اور معاش سے بے فکری بھی تھی وہ اپنے گھر کے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ کسی کی امداد و حمایت کے محتاج نہ تھے۔ غالباً یہی وہ بات ہے جس نے ان کے مزاج کی شہرِ لیانا خصوصیات کے قرار و قیام میں ہمیشہ مدد دی۔ پس چونکہ تمام عمر خانہ نشینی سے کام رہا اس لئے ملک میں مشہور اور مقبول نہ ہو سکے۔ صرف گرد و نواح کے باشندے

قدر سے قلیل واقف رہے۔ چونکہ ملک میں مراسلت اور تبادلہ خیالات کے ذرائع اس وقت تک اتنے ترقی یافتہ نہ تھے کہ کوئی شاعر گھر بیٹھے پہنچے اور اس کا کلام شہر بہ شہر پھیل جائے اس لئے ملک عموماً اُن سے بے خبر رہا، ہاں اکبر آباد میں ان کی عزت و توقیر اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں میں ہمیشہ بہت زیادہ رہی۔

شاعرانہ اہلیت | نظیر کے متعلق ایک متنازعہ فیہ امر یہ بھی ہے کہ آیا وہ شاعر ہیں یا نہیں۔ گزشتہ زمانے میں جبکہ ایشیائی شاعری کے مصنوعی شاہیہ کا رنگ دلوں پر نہایت گہرائی کے ساتھ غالب تھا اور تعصب اور تنگ خیالی نے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے، ملک میں ایک باوقعت گروہ ایسا تھا جو نظیر کی شاعری کا قائل نہ تھا۔ لکھنؤ اور دہلی کے شعرا خصوصاً آخر الذکر جو ہمیشہ زبان اور شاعری کو اپنی میراث سمجھتے رہے ہیں، اس خیال کے بہت بڑے حامی رہے۔ یہ جماعت نظیر کو ایک ہزل گو، فحش پسند، صحت لفظی سے معزایا وہ گونا گم اور مبتذل طبقے کا آدمی سمجھتی رہی۔ ان کے اجتہاد اور مافوق العادت کمال شاعری کا اعتراف تو درکنار نظیر کو زمرہ شعرا میں بھی جگہ دینا انھیں پسند نہ تھا۔ یہ توخیر متقدمین کا ذکر ہے، لیکن اس زمانے میں بھی جب کہ علم کا چرچا گھر گھر اور ذوق کی جنس اس قدر عام ہے، پُرانی لکیر کے پیٹنے والے قدامت پرست لوگ موجود ہیں جو نظیر کی اہلیت کے قائل نہیں اور ان کو اب تک ایک تنگ بندہ ہی سمجھتے ہیں۔ اس مخالف گروہ کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ نظیر کا کلام اور ان کی زبان اپنے زمانے کے معیار سخن سے جانچا جاتے ہیں۔ یہ ناش ادبی و تاریخی غلطی ہے اور اس سے سراسر نادانی ٹپکتی ہے۔ وہ لوگ اس بات کو مد نظر نہیں رکھتے کہ نظیر جس زمانے کے شاعر ہیں وہ اردو کا بچپن تھا اور اس وقت یہ زبان منازل تکوین طے کر رہی تھی۔ تراکیب میں آج کل کی سہولتگی اور پاکیزگی نہ تھی۔ بھاشا کے الفاظ کثرت سے شامل تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ شاعری اس قدر لسانی اور عروسی قیود کی پابند نہ تھی۔ انشا کے بعد سے عروض زبان اور صحت لفظی کے متعلق جو قیود لگائے گئے وہ اس وقت نافذ نہ تھے۔ پس نظیر پر جو انشا کے معاصر اور دور تکوین کے سخنور ہیں، ان قیود کا اتباع کیونکر فرض ہو سکتا تھا۔ وہ اس زمانے کی ضروریات کے خلاف ان قواعد کی پابندی خود اپنے اوپر کیونکر عائد کر لیتے۔ بہر حال اُس وقت کی مشکلات جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں، نظیر کے لئے کیا کم تھیں کہ وہ اور قیود اپنے اوپر لگاتے۔ اس لئے نظیر پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ ان غلوں کے غلط فتووں اور جوہر کش ہرزہ سمرانی

سے نظیر کی شان شاعری اور اہمیت بخود ہی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود اس طبقے کے تعصب، بدذوقی، اور کم نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ غالباً وہ لوگ شاعری کا صحیح مصروف نہ جانتے تھے اور اگر جانتے تھے تو کم سے کم یہ خیال ضرور رکھتے تھے کہ خود وہی شاعری کا بہترین حق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ وجدان کسی فرد و احد یا مخصوص طبقے کی ملک نہیں ہوتا۔ جدت کی الامام آفریں روح پرور نسیم جہاں چاہتی ہے اپنے خوش گوار جھونکوں سے داغوں کو تروتازہ اور روگوں کو معطر کر سکتی ہے۔ تمام ازل کی فراغ و وصلگی نے کسی جمعیت کو اپنی بے پایاں نعمتوں سے بے بہرہ نہیں رکھا۔ ملک کا کوئی گوشہ جہاں مرض شناس موجود ہوں فطرت کے فیض عام سے محروم نہیں رہ سکتا۔ رموز الوہیت کا سرچشمہ ہر جگہ جاری ہے اور عام اجازت ہے کہ لوگ اس سے سیراب ہوں۔ جس کے پاس ظرف موجود ہے اور جس پر تشنگی غالب ہے وہی اس سے سیراب ہو سکتا ہے۔ نظیر کے پاس یہ ظرف جملہ خصوصیات کے ساتھ موجود تھا اور تشنگی بھی غالب تھی۔ انھوں نے خود سیر ہو کر پیا اور ہزاروں کو سیراب کیا۔ اب تک جو شخص نظیر کی مدد کا طالب ہو، وہ اس کو چشمہ فیضان کا راستہ بتا سکتے ہیں۔ پس ایسے شخص کے لئے کیونکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ محض ایک ہزل گو اور بازاری شاعر ہے۔ نظیر کے کلام کو سوتیانہ طرز سخن کا مترادف سمجھنا بہت بڑی اخلاقی غلطی ہے۔ وہ ایک نفز گو، بندہ لہجہ اور مرض شناس شاعر تھے۔ انھوں نے باتوں باتوں میں کھیل کود اور تماشوں میں لے جا کر ظرافت اور تفلن کے پیرائے میں وہ وہ کار آمد اصول بتائے اور مفید نصیحتیں کی ہیں جن پر اگر سچے دل سے غور اور عمل کیا جائے تو انسان کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا اور دنیا کے سچیدہ راستوں کو بہت آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ نظیر نے نئی بندشوں اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ قدیم فرسودہ استعارے اور تشبیہوں کو چھوڑ کر جدید باتوں کی ترویج کی اور انواع و اقسام کے نئے خیالات پیدا کئے۔ زندگی کے حالات پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی اور جس شعبے کو اٹھایا اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ایشیائی شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند لگانے کا فخر سب سے پہلے اکبر آباد کے اسی قدیم سخن گو کو حاصل ہے، زبان پر قدرت، معاشرت پر عبور، فطرت کی مرض شناسی، مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت، انبیات کا علم، مختلف علوم و فنون کا وقوف، رفتار زمانہ سے دلچسپی، سیاسی بصیرت، صنعت و حرفت سے واقفیت، ہمدردی، ظرافت، سوز و گداز، ترنم محبت، غرض یہ کہ

شاعری کے سارے لوازم اور شاعر کے جملہ عاقلانہ نظیر کی ذات میں جمع ہیں۔ انھیں شاعر نہ سمجھا غلطی ہے۔
 علمیت [نظیر کو شاعر نہ سمجھنے والا طبقہ ان کی علمی لیاقت کا بھی منکر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں نظیر علم سے بے بہرہ اور
 جاہل آدمی تھے۔ اب رہا شاعرانہ کمال تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ زور طبیعت نے انھیں منکب بند بنا دیا تھا یہ
 نظریہ قطعی غلط ہے۔ نظیر کا شمار اُن کے زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں تھا۔ بہت سے لوگوں کا اس ایک نظم پر
 استدلال ہے جو انھوں نے اپنے متعلق کہی ہے اور جس میں انھوں نے اپنی بے علمی اور کم بائگی کا اعتراف کیا ہے۔ قدیم
 تمدن کو مد نظر رکھتے ہوئے جس کی رو سے انکسار اور پیمانی کا اظہار اعلیٰ ترین اخلاقی خوبیوں میں شمار کئے جاتے تھے، نظیر
 کے اشعار کے ظاہری معنی لینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ عربی میں تو غالباً نظیر کو زیادہ استعداد نہ تھی مگر فارسی کے وہ
 بہت بڑے عالم تھے۔ فارسی کی جملہ درسی کتب تو انھوں نے طفولت اور تعلیم ہی کے زمانے میں پڑھ لی تھیں لیکن
 ادب عالیہ کی مشہور تصانیف تمام عمر اُن کے مطالعے میں رہیں۔ اُن کا ہمیشہ معلیٰ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے
 مکاتب کی حالت آج کل کے مکاتب کی طرح زبوں نہ تھی۔ طلباء وہیں سے فارغ التحصیل ہو کر اور اعلیٰ تعلیم کی سسٹمز لے کر
 نکلتے تھے۔ پھر ہر قسم کی سیاسی، ملکی، آئینی ذمہ داریاں اُن کے سپرد کی جاتی تھیں۔ لہذا ایسے مکاتب میں درس دینا
 بھی کسی معمولی شخص کا کام نہ تھا۔ جب تک مسلم الثبوت استاد اور مستند لیاقت کا معلم نہ ہوا اتنی بڑی ذمہ داری ہرگز اس کو
 سپرد نہ کی جاسکتی تھی۔ اس لئے نظیر کا معلم ہونا ہی اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے منتخب فاضل اور بڑے
 ذی علم بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی شہادتیں ہیں جن سے ان کا صاحب علم ہونا ثابت ہے۔ علمی قابلیت کے ماسوا
 وہ زبانوں کے بہت بڑے ماہر تھے اور یہ قدرت اُن میں خدا داد تھی۔ فارسی، عربی کو چھوڑ کر وہ ہندی، پنجابی، مارواڑی،
 پوہنی اور بھجاشاہی پانچ زبانیں اور جانتے تھے۔ اس طرح اردو ملاکر آٹھ زبانوں میں داخل تھے۔ مختلف علوم اور فنون
 میں ان کے عام معلومات نہایت وسیع تھے اور ہر شعبہ علم میں تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتے تھے۔ چنانچہ ریل، بخوم،
 ہندسہ، موسیقی، منطق وغیرہ میں شغف کا پتہ ان کے کلام سے چلتا ہے۔ اپنے ملک کی سیاست کو وہ ابھی طرح سمجھتے تھے
 لیکن تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ تاریخی ناموں کے حوالے اور تاریخی واقعات کے جا بجا ذکر ان سے مترشح ہوتا ہے

کہ تاریخ پر ان کو بڑا عبور تھا اور یہ علم ان کے پسندیدہ ترین مضامین میں سے تھا۔

رنگ کے موجد | نظیر خود اپنے رنگ کے موجد ہیں۔ اس لئے مقدم کی فضیلت اُن کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنا رنگ خود پیدا کیا، خود ہی اس پر جلایا اور اپنے ہی پر اس کا خاتمہ کر دیا۔ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ طبیعت کے زور نے انھیں شاعر بنایا تھا۔ فطرت نے اُن کے ذوق کی تربیت کی تھی اور حقیقت شناسی نے انھیں مکمل کر دیا تھا۔ اپنے طرز سخن میں وہ کسی کے پیرو یا مقلد نہ تھے۔ چونکہ انگریزی سے محض ناواقف تھے اس لئے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے مغربی شعر کا تتبع کیا۔ مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ استاد ازل نے انھیں خود ہی سکھا پڑھا کر اُتار تھا۔ جو رنگ ان میں خاص طرز نمایاں تھا وہ مصور حقیقی ہی نے اُن میں بھرا تھا۔ عمر کا بہت ابتدائی حصہ تو حیرت و استعجاب میں گزرا لیکن جب مناسب وقت آیا تو حجاب کے پردے ان کی آنکھوں سے اٹھنے لگے۔ رموز فطرت اور حقائق شعری اُن پر روشن ہونے لگے۔ اب ان کی داخلی قوتوں نے جو ان کو ازل میں ودیعت کی گئیں تھیں، انھیں مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی آنکھیں پوری پوری کھول دیں۔ جو دیکھیں وہی محسوس کریں اور جو محسوس کریں وہی زبان پر لائیں۔ جو زبان پر لائیں وہی عقیدہ رکھیں اور اس عقیدہ کو ارباب نگاہ کی ہدایت اور معلومات کے لئے بجنسہ ان تک پہنچا دیں۔ نظیر کی بدنامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فرسودہ راستے سے ہٹ کر چلے۔ لوگ جن کو صراطِ مستقیم سمجھے ہوئے تھے انھوں نے اُسے ٹیڑھا راستہ تصور کیا اور ملک کے مذاق پر ذرا اعتنائی نہ کی۔ اپنے غلط ماحول سے مطابقت کرنی نہ چاہی بلکہ شاعر کا پیغمبر فرض اپنے ذمہ لیا کہ غلط ماحول کو بدلیں اور حقیقی ماحول پیدا کریں۔ ملک کے مصنوعی طرز سخن کو وہ صرف ناپسند ہی نہ کرتے تھے بلکہ ناپسند کرنے پر مجبور تھے۔ قدیم مذاق کا جامہ کن اب بہت تنگ ہو چلا تھا۔ نظیر کی ہمہ گیر و وسیع تخیل اس میں نہ سما سکتی تھی۔ ان کی طبیعت کا متواتر اتفاق تھا کہ وہ ان خود ساختہ بندشوں سے رہا ہو کر آزادی کی دھڑکن میں پرواز کریں اور فطرت کے مطالعے میں مشغول ہو جائیں۔ زمانہ انھیں اپنی طرف کھینچتا تھا اور فطرت اپنی طرف۔ کچھ دن تک تو یہ کشمکش رہی لیکن طبیعت کا فطری زور غالب آتا معلوم ہوا۔ حیات کی نزاکت مدد پر کمربستہ ہوئی۔ آخر کار جب زور آزادی نے ان تمام عارضی بندشوں کو توڑ کر اپنے خیال کو بالکل آزاد کر لیا اور مصنوعی رنگ کو چھوڑ کر فطرت کی رنگ برنگیوں میں ڈوب گئے۔

نظیر کا آرٹ | نظیر کی شاعری میں مہتمم بالشان خود داری اور احساس بشریت کی ایسی جھلک پائی جاتی ہے جو ہیما نہ جذبات اور دل کی پر غضب تحریکوں کی تردید کے لئے ناموزوں ہے اور ان کے کلام کو شہرِ یفانہ، حسین، اور موثر خیالات کے اظہار کا لائق ذریعہ بناتی ہے۔ یہ اثر کچھ تو سہی اور دیگر قدیم اساتذہ کے دانستہ ابداع سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ سطحی خیالات سے احتراز کرنے سے۔ دنیا کے نامشوں کو محض تماشا سمجھنا اور دنیا کی دلچسپیوں میں شامل ہو کر ان کی بُرائیوں سے غلطی رہ رہتے سے کلام میں ایک وقار پیدا ہو گیا ہے جو علوئے تخیل سے متحد ہو کر دلوں پر نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ نظیر کی نادر خصوصیت شاعری بالکل نمایاں ہے اور بہت آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ یہ خصوصیت اُن کا خلوص اور غیر متنازعہ فیہ حقیقت پسندی ہے۔ نظیر کے تخیل اور حیات میں اضافی مسرت و اطمینان، بے معنی اثر پذیری، اور نمائشی نفاست نہیں۔ وہ ہمارے سامنے جس جذبے کی کیفیت پیش کرتے ہیں اس کی برقی رو پہلے اُن کے ذہنی حیات قلب میں دوڑ چکتی ہے۔ نصیحتوں کی اُن کے کلام میں بڑی کثرت ہے لیکن وہ کسی ایسی بات کی تلقین نہیں کرتے جو پہلے خود ان کی رہنمائی نہیں کر چکی۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سماعی شہادت کی بنیاد پر نہیں بلکہ معنی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنا پر۔ وہ اُن مناظر معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہیں جن کے درمیان رہ کر انھوں نے زندگی کے رموز پر غور کیا ہے اور جن نے ان کی روح کو حسین جذبات، پاکیزہ خیالات اور مستحکم ارادوں کا مستقل نشیمن بنا دیا ہے۔ اُن کے جذبات کسی ذاتی مقصد یا نمائش کی خاطر ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اس لئے ابل چلتے ہیں کہ اُن کا رقیق دل اُن کے ضبط پر قادر نہیں۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ پورا پورا ترنم صرف کرتے ہیں۔ زبان اگر کبھی کبھی بازاری ہو جاتی ہے لیکن کبھی صحت اور حقیقت سے معز انہیں ہوتی۔ خلوص کے علاوہ اُن میں ایک اور کمال ہے جس کا اظہار انتخابِ عنوان میں ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہے کہ کمال کا اظہار عنوان سے بے پرواہ رہنے میں ہوتا ہے۔ نظیر ہر عنوان کو دلچسپ بنا دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ معمولی شاعر معمولی انسان کی طرح ہمیشہ بیرونی واقعات سے اُس مدد کا طالب رہتا ہے جو اس کو صرف اپنے باطن سے مل سکتی ہے۔ نظیر میں یہ کمال ہے کہ وہ ادنیٰ باتوں، گھر لوہو واقعات اور سادہ مناظر سے وہ کیفیات اور مطالب پیدا کر لیتے ہیں جو معمولی شاعر دقیق مسائل سے بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ نوعی ہمدردی کے ساتھ رواداری اور

روداداری کے پہلو پہلو مذہبی بے تعصبی نظیر کے کلام کا وہ مت از جو ہر ہے جو ہندوستانی شعرائے تقدیر میں عموماً ناپید ہے۔ یہ جو ہر سرزمین ہندوستان کے اس مغنی کے لوازم دل فریبی میں فائق ترین عنصر ہے۔ فواحش کی دراندازی کے باوصف رکاکت اور ابتدال نظیر کے کلام سے چھو کر نہیں نکلے۔ اس عربیانی جواہل فلسفہ کے نزدیک آرٹ کی تکمیل اور محاکات کی مترادف ہے بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن اس کی غایت صرف اظہار واقعہ ہے۔ کسی قسم کا شعریا استکراہ مد نظر نہیں۔ جس طرح ایک نقاد کسی تصویر پر نقد کرتے ہوئے کہاں اس کے محاسن کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کے معائب کا بھی ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح نظیر جب معاشرت کا سامان کھینچتے ہیں تو خوبیوں کے ساتھ عیبوں پر بھی لامحالہ اُن کی نگاہ پڑتی ہے۔ چونکہ وہ ایک صاف گو اور ایمان دار مصور ہیں اس لئے وہ معائب کو بھی اسی آزادی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں جتنا دوسری خوبیوں کو، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کو دکھاتے ہوئے وہ ایک پوشیدہ درد ایک غیر محسوس شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ جب وہ اپنی جنس کو شرمناک حرکتوں میں مبتلا دیکھتے ہیں تو ان کی فطری غیرت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن فوراً ہی ان کی انتہائی شرافت جوش میں آتی ہے اور تمام غم اور غصہ امدردی اور حمایت میں مبدل ہو جاتا ہے۔

نظیر نے اپنے روحانی و پر فسانہ خیالات کو ادب قدیم کے پرسکون انکسار کا جامہ پہنایا ہے، جس سے راحت و انبساط کی ذی حیات کیفیت طاری ہوتی ہے اور کچھ لمحوں کے لئے دنیا کا تمام غم و الم جو ہو جاتا ہے۔ بیان کا تسلسل، تزیین کی دلکشی، بھور کا ترنم، ناگزیر الفاظ کا تجسس، ان کے رنگ کی خصوصیات ہیں۔ دقیقہ رس ناظر اور صداقت شعار مصور کی حیثیت سے نظیر کو کوئی مد مقابل نہیں۔ دقیق النظری کے ساتھ ساتھ قدرتی مسلمات کا ایک عالمانہ وقوف بھی ان کی فطرت میں شامل ہے جو ان کی تمثیلوں، تشبیہوں اور استعاروں کو جو مناظر قدرت سے اخذ کئے جاتے ہیں دو گنا مؤثر بنا دیتا ہے اور جب ان پر کلام کی لذت بخش موسیقیت و شیرینی، اصوات سے معانی پیدا کرنے کی قوت کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے تو پھر نظیر کی حیرت انگیز دلفریبی و دل فوازی کاراز منکشف ہونے لگتا ہے۔

نظیر کا موضوع انسان اور اُس کی معاشرت ہے۔ بنی نوع انسان کی ان کے نزدیک خاص اہمیت ہے اور وہ ان کی انتہائی دلچسپی کا باعث ہے اس لئے وہ اس کو ہر رنگ میں اور ہر پہلو سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں

اور ہر مقام پر اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر قسم کی حرکات و سکنات سے بخوبی واقف ہو کر اس کو دنیا کے جملہ نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کا کوئی فعل ان میں نفرت و امتلا کے جذبات پیدا نہیں کرتا۔ ایک طرف تو وہ انسان کو جرم و خطا کا پتلا اور قدم قدم پر بہک جانے والا سمجھتے ہیں، دوسری طرف وہ دنیا کی رنگارنگیوں اور نظر فریبیوں سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے وہ اپنے موجب ہمدردی کی خطاؤں اور غلطیوں کو لائق سہ زلش خیال نہیں کرتے، بلکہ اس کی کمزوریوں کو سمجھ کر اس پر رحم کھاتے ہیں۔ اس کو جملہ آلودگیوں سے نکال کر حقیقت کا صحیح راستہ دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ دنیا کے لئے ایک پرامن و سکون زندگی اور وسیلہ نجات بہم کریں۔ وہ اپنے کو اسی خدمت پر مامور سمجھتے ہیں اور یہی کام انجام دینے کے لئے ہم اُن کو ہر محبت، ہر شغل، ہر جمع میں دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ انسان کی ہر دلچسپی میں دلچسپی لیتے اور معاشرت کے ہر رنگ میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اس پر لطف یہ ہے کہ جس آزادی کے ساتھ وہ اعلیٰ مجلسوں میں حصہ لیتے ہیں اسی بیباکی کے ساتھ ادنیٰ طبقوں میں نشست و برخاست کرتے ہیں۔ وہ صرف انسان اور اُس کی معاشرت پر فدا ہیں اور اس کے بہود و فلاح کی فکر میں ہر وقت غرق رہتے ہیں۔ وہ غالباً نیک و بد، اعلیٰ و ادنیٰ کے فرق کے قائل نہیں۔ ہر چیز ان کے نزدیک ایک ہے۔ وہ وحدت کو ہر شے میں دیکھتے ہیں اور اُسی کے گیت جا بجا گاتے پھرتے ہیں۔

معشوق کی تذکیر اور قدیم کے اردو شعرا نے مرد کو اپنا معشوق گردان کر اسی جنس پر تمام نازک خیالیاں صرف کی ہیں اور اسی کو اپنے جذبات محبت و یگانگت، درد و خلش، سوز و گداز کا مرکز قرار دیا ہے۔ کلام میں جا بجا تذکیر کی ضمیر استعمال کی گئی ہے، جس کی وجہ سے گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ مخاطب عورت کی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فارسی شعر کا غیر محسوس اثر ہے جو اب تک دلوں پر اُسی قدر گہرائی کے ساتھ قائم ہے۔ ایرانی ادبیات کا اضطرابی اتباع اور اس کے ساتھ بھاشا کی شاعری کی عدم واقفیت بھی بہت کچھ اس فاش ادبی غلطی کی ذمہ دار ہے۔ فطری ماحول میں غیر فطری وجود کا ذہنی درود بدنامی پیدا کرنے اور شعر کی نزاکت و نفاست زائل کر دینے کے علاوہ فی نفسہ نہایت مذموم ہے۔ اس نوع کے تخیل کا

نقل تکثر و تنقص کا ایسا مکروہ بار و مانع پڑا تھا ہے جس کی گرائی شعر کے لطیف اجزا پر غالب اگر اس کی مسرت آفریں کیفیت محسوس نہیں ہونے دیتی۔ نظیر کی شاعری ہر قسم کے تصنع اور جملہ غیر فطری آلائشوں سے مبرا رہے۔ لیکن یہ ایک ایسا عام عیب ہے جس سے ان کا دامن عصمت بھی بالکل پاک نہ رہ سکا۔ نظیر نے جگہ جگہ عورت سے خطاب کیا ہے اور ضمیر اور فعل دونوں مؤنث استعمال کئے ہیں لیکن کہیں کہیں مرد معشوق سے بھی خطاب ہے اور ضمیر مذکر ہے۔ بہر حال ان کے یہاں اس عیب کا جزوی وجود بھی نہایت تعجب خیز ہے۔ یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ ان کی فطرت پسند طبیعت نے اس سقم کو کیونکر جائز رکھا۔ وہ بھاشا زبان کے بہت بڑے ماہر اور اُس کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات ان کی طبعی اور ازلی فطرت پرستی کے بھی منافی ہے۔ غالباً ملک کے مذاق کی رعایت اور شعر کی روشنی عام کی مطابقت نے اُن سے ایسا کرایا۔ پہلے ہی وہ بہت سے دیرینہ قیود اور قدیم بندشیں توڑ چکے تھے اگر اس قانون کی بھی بالکل خلاف ورزی کرتے تو نہ معلوم اور کتنے سقم کئے جاتے۔ غالباً یہی وجہ اُس کی پابندی کی ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی آزاد خیالی دیکھتے ہوئے پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو کسی پابندی کا ماتحت دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ پھر اپنے مزاج کے خلاف انہوں نے اس رکاکت کو کیونکر جائز رکھا۔ یہ نکتہ نظیر کی شاعری کا ایک لایحل مسئلہ ہے۔ بہر حال اس فرسودگی کے ارتباب کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ عہدِ اباسہو اُکسی کے نتیجے میں یا بہ طور خود جس وجہ سے بھی یہ عیب کلام میں موجود ہے اور ہر حالت میں خود نظیر اس کے ذمہ دار ہیں۔

خالص ہندوستانی شاعر نظیر ہر لحاظ سے قطعی ہندوستانی شاعر ہیں۔ وہ ہندوستان کے باشندے ہیں اور ہندی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے ولایتی ہونے کا دعویٰ کر کے لوگوں پر غلط اثر ڈالنا یا ان کو مرعوب کرنا نہیں چاہا۔ تحمل، بردباری، انکسار جو ہندیوں کے اجزائے سرشت ہیں وہ سب اُن میں موجود تھے۔ نظیر کی مادری زبان اردو ہے اور اسی زبان کو انہوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ فارسی گوئی سے قاصر تھے بلکہ اس لئے کہ فطرت کا ودیعت کردہ پیغام انھیں ہندوستانیوں کو بھونچا نہ تھا۔ اس لئے دہی زبان اختیار کرنی لازمی تھی جو پیغام سننے والوں کی تھی۔ وہ زبان نہ تو مرعوب و مفرس اردو تھی نہ سنسکرت کے ناماؤس الفاظ ملی ہوئی برج بھاشا۔ یہ سبھی سادی عام فہم

ہندوستانی ہے جس میں بھاشا اور اردو دونوں کے معمولی معمولی الفاظ شامل تھے۔ فارسی میں بھی نظیر کا کلام نظم و نثر موجود ہے لیکن وہ اردو کلام کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف ذاتی تفریح اور اپنی خاص صحبت کے ارباب علم کی ضیافت طبع کے لئے تھا۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کو وہ بدیشی زبانیں سمجھتے تھے اس لئے ان پر انحصار کرنا وہ اُن سے زیادہ مدد لینا انھیں گوارا نہ تھا۔ ان دونوں زبانوں کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے بھی وہ اجتناب کرتے تھے بلکہ حُب وطن یہاں تک مجبور کرتی تھی کہ زیادہ تر بھاشا کے الفاظ کی ترویج اردو میں کریں اور اس طرح انھیں مانوس بنائیں۔ جذبات و محسوسات کے لحاظ سے بھی نظیر قطعی ہندوستانی شاعر ہیں۔ ہندوستان کے دیا، ہندوستان کے پہاڑ، ہندوستان کے مناظر، انھیں بہت گریہ کرنا پڑا اور ان کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ وہ خیالی مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوتے، خیالی بہار کا سماں نہیں کھینچتے بلکہ ہندوستان کی برسات کی بہاریں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور انھیں نظم کرتے ہیں۔ اُن کی تشبیہیں اُن کے استعارے، ہندوستانی مناظر قدرت کی چیزیں ہیں اور ان کی مثالیں ہندوستانی زندگی پر مبنی ہوتی ہیں۔ عرب کے خانہ بدوش بدوی کی پُر حرب زندگی اُن کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتی مگر ہندوستان کا امن کو ش صحرا اور دبلا بخارہ اُن کے دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ وہ اس کی معاشرت سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کی تمثیل سے فوراً اپنی اعلیٰ تریں تخیل کے لئے لباس تیار کر لیتے ہیں۔ ایرانی بادشاہوں کی عظمت و شان کے افسانے شعرا کے کلام میں عام طور پر مذکور ہیں لیکن نظیر کے قلب پر اکبر کی پر شکوہ زندگی اور ہندوستان کے دیگر جلیل القدر سلاطین کی شوکت و جبروت کا نقش مرثم ہے۔ دارا و سکندر، جمشید و فریدون کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اپنے ملک کا عظیم الشان شہنشاہ اکبر فوراً یاد آ جاتا ہے اور اس کی تلمیح وہ اپنے کلام میں قائم کر لیتے ہیں۔ ایران و عرب، بابل و نینوا اور دیگر قدیم ممالک کے مشہور مقامات، ہندوستانی شعرا کے نوک زبان سہی مگر نظیر اپنے وطن کے تاریخی مقامات کا رتبہ کسی طرح، چاہا بابل اور دیو اچین سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ ہانسی اُٹھا چوڑ گڑھ، کالجی کا ذکر کر کے سلف کے فراموش شدہ کارناموں کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں۔

ذہنی نگستاں اور خیالی چین ان کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتے کیونکہ اس قسم کی ہزاروں چیزیں ان کے دماغ میں موجود ہیں۔ وہ ہمیں ہندوستان کے باغوں کی سیریں کرانا چاہتے اور وہاں کے ہر پھول کی خوشبو سے ہمیں مانوس کرنا چاہتے

ہیں۔ بلبل ہندوستان کی سرزمین میں ناپید ہے اس لئے نظیر کو اس کی خیالی ہزار داستان میں کوئی واقعی دلچسپی نہیں پیدا ہوتی۔ ڈھتیر کی لرزاں آہیں، کوئل کی درد بھری کوک، پیپے کی ہیمن نالہ وزاری، پی کہاں پی کہاں کی ہرالم صدا میں وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں اس لئے ان کی غمخواری پر آمادہ ہیں۔ لال، بے، سینا، طوطی، کبک، تندو کے دلکش ترانے اُن کے فطری تم کو متحرک کرتے ہیں اور وہ اُن کی مسرتوں میں حصہ لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اُن کی بازی و اشغال کے طائر سارے ہندوستانی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ نظیر کو طرح طرح سے لہجہاتے ہیں اور شعر کہتے وقت مثالیں اور تشبیہیں بن کر ان کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ ہندوستانی بھولوں کی عطر پاشیاں اُن کے دماغ کو ہر وقت معطر اور ان ہی کی نظر پرورش رنگیاں ان کی نگاہوں کو ہر لحظہ بشارت و خنداں رکھتی ہیں۔ رابیل، سیوتی، بیلا، جمیلی کی بھینی بھینی خوشبوئیں، چمپا کی ست نکلتیں، گلاب کے قرابے ہر وقت اُن کے لئے وقف ہیں۔ اُن ہی کچھوں میں منگن ہر کمبدا سے فیض سے وہ اپنا نام حاصل کرتے ہیں اور اہل ذوق کی تفریح کے لئے وہیں وہ اس کو نعروں کی شکل میں منتشر کرنے کے لئے شعر کے اپنے میں ڈھالتے ہیں۔ جاڑا، گرمی، برسات خاص ہندوستان کے موسم ہیں اس لئے ان کو عزیز ہیں۔ اوس کی اذیت صرف ہندوستان میں ہوتی ہے اس لئے وہ اس کا ذکر کرنا اپنے ملک کی خصوصیت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ بہت ہندوستان موسمی یو ہا ہے اس لئے انھیں مرغوب ہے۔ کورا برتن خاص ہندوستان کی مٹی کا بنا ہوا ہے اس لئے وہ اُس کی بندھ پر فدا ہیں۔ کور سے برتن میں لنگا کا پانی پینا انھیں آبِ حیات سے زیادہ خوش گوار ہے اور اسی لئے وہ اس کو مہمشید پر نرنجج دیتے ہیں۔

ماشرت نگاری | نظیر کا کلام ان کے زمانے کی معاشرت کے ہر پہلو کے متعلق ہے۔ مغربی تمدن کے ورود نے ہندوستانی زندگی میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ نشست و برخاست کے قرائن، اکل و شرب کے طریقے، رفتار و گفتار کے انداز، مدگر تعلقات و مولانت کے قواعد، آداب مجلس غرض ہر قسم کے عوائد معاشرت پر بڑا اثر پڑا اور ان میں پیشتر کی بہ نسبت بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ہندوستان کی معاشرت ایک مخلوط شے ہے جس سے ہر طرز زندگی کا ہر شکل صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم صحبتیں اور اُن کے رونق دینے والے تو اب کہاں میسر ہاں اُن کا

ذکر خیر افسانہ یا ران کمن کی طرح کتب سیر یا قدیم اساتذہ کے کلام میں ضرور دستیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نظیر کا کلام اسی قبیل کی شاعری ہے جس سے قدیم معاشرت کے ازیادہ رفتہ حالات مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے کلام میں خالص ہندوستانی معاشرت کا تذکرہ ہے اور کسی نہ کسی پہلو سے معاشرت کے ہر شعبے پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی گئی ہے۔ نظیر کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کر لے کہ نظیر سے صرف مسلمانوں کی قدیم معاشرت کا حال معلوم ہوگا۔ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ وہ ہندوؤں کی معاشرت کے بھی اتنے ہی بڑے ماہر ہیں جتنے مسلمانوں کے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہندو شعرائیں ایسے بہت کم نکلیں گے جو ہندو معاشرت وانی میں نظیر کا مقابلہ کر سکیں۔ ان کی نگاہ کی وسعت انھیں ہر طبقے کی حالت سے بخوبی واقف رکھتی ہے۔ کچھ ہندو مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں ہندوستان کی ہر قوم کی معاشرت کا ان کو کیا علم و تجربہ ہے۔ امر کے طریق زندگی ان کے روزمرہ کے مشاغل ان کی دلچسپیوں اور تفریحوں کے اسباب، متوسط طبقے کی طرز معاشرت، غرباء کے عادات و اطوار، عام شہریوں کے ابو و لعب، شہر کے مختلف پیشہ وروں کے چال چلن، ہندو کے تیوار، مسلم اور ہندو خواتین کے رسم و رواج، خانگی زندگی کی کیفیت، صوفی اور فقرا کے خصائل، آزادوں، بد معاشتوں، تماش بیوں کی بد وضعی، پھکرلوں کی عربانی، میلے ٹھیلوں کی رنگ رلیاں، ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں، غرض معاشرت کے جتنے کوائف ہیں سب کا کچھ نہ کچھ ذکر ان کے یہاں موجود ہے۔ پرانے زمانے کے رسوم میں بہت سے ایسے ہیں جن کے جاننے والے اب تک موجود ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا چرچا صرف ادنیٰ بہت مذہل طبقے میں ہے، شریفوں میں ان کا رواج ترک ہو چکا ہے، لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا عامل اب کوئی نہیں بلکہ ان کے جاننے والے بھی ناپید ہو چکے بعض رسوم اب قطعی مفقود ہو چکے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کی صرف صورت بدل گئی ہے۔ پہلے وہ کچھ تھے اور اب امتداد زمانہ سے بدل بدلا کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں مگر بہ صورت مبدل قائم اور جاری ہیں۔ بہر حال نظیر کے کلام سے ہر رواج کا سمران بخوبی لگ سکتا ہے اور اگر کوئی شخص چھان بین پر آمادہ ہو تو تمام رسوم رواج کو ان کی اصلی ہیئت میں دیکھ سکتا ہے۔ معاشرت کے مورخ کے لئے نظیر کا کلام نہایت بار آور کر تلاش جسوتہ ہے۔ تمدن کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے نظیر کے کلام سے نہایت پر معنی اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

حاکم نہ انداز اور زبان کے شعر نے عام طور پر غزلیں زیادہ کہیں اور جہاں تک ممکن ہوا اسی طرز سخن کو روز بروز ترقی دینے کی کوشش کی۔ طرح طرح کے مضامین پیدا کئے، بندشوں میں جدت پیدا کی، طرز ادا کے انوکھے ڈھنگ نکالے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عمیق تخیل کے ساتھ الفاظ میں شستگی اور دلفریبی پیدا ہوتی گئی مگر شاعری پر رنگ تفرق غالب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج عاشقانہ جذبات سے تو اردو شاعری اس قدر مالا مال نظر آتی ہے لیکن اساتذہ کے کلام میں بیانیہ کلام کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ شعرائے متقدمین تفرق میں اس قدر نہمک رہے کہ اس طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ ہاں کسی کسی نے مثنویاں لکھ کر بیانیہ طرز سخن کا کچھ کچھ حق ادا کیا ہے۔ لیکن مشنویوں میں بھی عشق و محبت، ہجر و وصال، سوز و گداز کا عنصر اس قدر زیادتی کے ساتھ موجود ہے کہ مثنوی کا فضا ئے صحیح فروغی لوازم میں غلط ملط ہو کر ایک حد تک مفقود سا ہو جاتا ہے۔ بہر حال واقعہ نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اساتذہ میں نظیر پہلا شخص ہے جس نے اس نوع کے انداز میں خامہ فرسائی کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں بیشتر حصہ بیانیہ نظموں ہی کا ہے۔ نظیر اس طرز خاص کے کشیدائی ہی نہ تھے بلکہ اس کے بڑے ماہر بھی تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ موجد اپنی ایجاد کو تکمیل پر نہیں پہنچا سکتا بلکہ متاخرین اس کی کمی اور کوتاہیوں کو پورا کیا کرتے ہیں۔ نظیر کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے بیانیہ طرز سخن کو اردو میں خود ہی پیدا کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی کر دی۔ انھیں معاملہ بندی اور واقعات نظم کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ میلوں کی کیفیتیں اور ہندو مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی تقریروں کو جہاں بیان کیا ہے ان معمولی سی معمولی تفصیل بھی نظر انداز نہیں کی۔ جس جگہ فصل کی دلچسپیوں اور موسم کی دلفریبیوں کا نقشہ کھینچا ہے وہاں شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ اصلیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہر شے کی ادنیٰ ادنیٰ چیز پر ان کی نظر ہے اور اس کو بیان کر دینے سے ان کے کلام کی زینت دو بالا ہوتی ہے۔ برسات کے موسم میں بسروں پر جوہر ہوٹیاں اور ٹیلوں پر دستورے پیدا ہو جاتے ہیں وہ بھی ان کی باریک بین نظر سے نہیں بچتے۔ وہ جن صیفے کو اٹھاتے ہیں، ابتداء سے انتہا تک اُس کے اتیا زات کی چھان بین کر ڈالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں کتنی رسائی اور بیان میں کتنی وسعت ہے۔ واقعات کی مصوری کے لئے اول تو اس امر کی ضرورت ہے کہ جملہ مدارج بہر شاعر

کی نگاہِ حاوی ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کو اپنے کلام پر بھی قدرت ہو۔ اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو بہترین مرتفع بن سکتا ہے نظیر میں یہ دونوں خصوصیتیں کمال کے ساتھ موجود تھیں۔ واقعات و احوالِ عالم کی بصیرت و واقفیت کے علاوہ وہ زبان پر پورا عبور اور محاوروں پر بڑا بھر رکھتے تھے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ تخیل کی رنگینی اور بیان کی سلاست و روانی ان کے مرتفع پر رنگ تکمیل کا کام کرتی ہیں۔ اس پر نظم کی برجستگی و بیساختگی، ادائے مطالب کی سہولت و بے تکافی، کلام کی زیب و زینت پر اور چارچاند لگا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس قدر تصویریں کھینچی ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل اور ہر عنوان سے نظر فریب ہیں، جن میں خود خیال کے اعتبار سے اصل اور نقل کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ قوتِ بیان اور صورتِ گری میں نظیر، انیس کے ہم پلہ ہیں۔ یہ ملکیت انہی دونوں سخنوروں کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ قادر الکلامی کی وجہ سے، بیان میں جو شیرینی و فصاحت ہے وہ جن شعری کو اور افروز کر دیتی ہے ٹیگور کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک خیال کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ التزامِ نظیر کے کلام میں عام طور پر موجود ہے۔ مسدوسوں اور غنموں کے آخری مصرعوں کا ہر بند میں اعادہ شعر کے اثر کو بڑھاتا اور ایک قسم کا دل گداز ترنم پیدا کرتا ہے جس کا لطف صرف بار بار پڑھنے سے ہی آ سکتا ہے۔

احتمالات پہلو نظیر کی قوتِ بیان دکھا کر اب اُن کا کلام اخلاقی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں شاعرانہ زور و طبیعت نے غیر معمولی مبالغہ کی اختیار کر لی ہے۔ اُن کا مطالعہ بلاشبہ سنجیدہ طلباء کو شاق گذرتا ہے لیکن اس کراہت و گرائی سے قطع نظر، کلیاتِ نظیر میں بہت بڑا جزو ایسا ہے جو متین خیالات، سنجیدہ جذبات، اور پاکیزہ نظریات سے ملو ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت صرف یہی حصہ ہے اور اس تحت میں صرف اسی سے بحث کی جائے گی۔ نظیر کے اخلاق کا سب سے زیادہ قباباں جوہر اُن کی بے تعصبی ہے۔ اگر وہ کسی جگہ اسلامی معاشرت کے کسی صیغہ پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری جگہ فوراً ہی ہندو سوسائٹی کے ہم ترہ و ہم رنگ شعبے کا تذکرہ اسی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک مصرعے میں مسجد کا ذکر ہے تو دوسرے میں مندر کا ذکر لازمی ہے۔ جس طرح کسی منطقی قیاس میں کبریٰ کے بعد صغریٰ کا وجود اخذِ نتیجہ کے لئے ضروری ہے، اسی طرح نظیر کے یہاں درویشوں

اور صوفیوں کی حالت رقم ہونے کے بعد ہندو جی اور تیاگی کا بیان ناگزیر ضروریات اخلاقی میں سے ہے۔ نظیر نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم جذبات کا ایسا نازک توازن قائم رکھا ہے جس پر مذہبی تفریق کا بڑے سے بڑا حامی اور بدبین سے بدبین متعصب بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ نظیر اپنے مذہب میں بڑے راسخ الاعتقاد تھے۔ ایسی صورت میں اتنی کامل و مواداری اور ایسی خالص بے تعصبی دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ بادی النظر میں دونوں فرقوں کے افراد کے لئے نظیر کے مطمح نظر کی پیروی محال معلوم ہوتی ہے لیکن وحدت شناسوں کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ کاش ملک میں نظیر جیسے دوچار شاعر اور پیدا ہو جاتے تو آج ہندوستان کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

اب نظیر کے واعظانہ انداز کو لیجئے۔ نصیحت کرنے کے ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک بالواسطہ دوسرا بلاواسطہ۔ نظیر نے اپنے کلام میں ان دونوں طریقوں سے کام لیا ہے لیکن اول الذکر کا مصرف بہت زیادہ ہے۔ بلاواسطہ نصیحت کا اثر سننے والے پر محض ایک نظر سے کا سوتا ہے۔ نہ اس کی یاد دیر پا ہوتی ہے نہ اس کا اثر قیام پذیر ہوتا ہے لیکن بالواسطہ نصیحت ہمیشہ نہایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ نظیر نے زیادہ تر بلاواسطہ نصائح سے کام لیا ہے۔ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ جب کوئی بات ممنوع قرار دیدی جاتی ہے تو اس کی طرف طبیعت خواہ مخواہ زیادہ مائل ہوتی ہے اور اس کی خیالی دلچسپیاں خواہ وہ فعل اُن سے قطعی معزایں کیوں نہ ہو طرح طرح سے دل بھاتی اور استقلال پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن جب اُسی چیز کا نقشہ اچھی طرح دکھا کر اور اُس کے جملہ معائب کی تفصیل منہ و عن پیش کر کے اُس سے احتراز کرنے کے لئے کہا جائے تو طبیعت فوراً قبول کر لیتی ہے۔ پس نظیر کو جب کسی معیوب شغل زندگی یا ملعون صیغہ معاشرت کی برائیوں سے متنبہ کرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس فعل کا من و عن نقشہ کھینچتے اور اس کی تمام ظاہری دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہیں جب اُس کی سیمائی نظریہ پیوں کی جملہ تفصیل کی تشریح کر چکے ہیں تو نہایت دلہیز پیرائے میں اس کے معائب کی مکمل تصویر پیش کر کے اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس طرح پڑھنے والے کے دل پر ایسا مستقل نقش قائم ہو جاتا ہے جس کو کوئی شیطانی دوسرہ زائل نہیں کر سکتا۔ ڈرامہ اور بایکوب کے تماشوں کے ذریعے سے نصیحت کرنے اور ذہن پر مستقل اثر ڈالنے کا جو طریقہ آج عقلائے یورپ نے

راج کیا ہے وہ صدیوں پیشتر اس ہندوستانی سخنور کے کلام میں مستعمل ہے۔ لقمان کی بابت مشہور ہے کہ وہ اپنے عائضی مالک کو نصیحت کرنے کے لئے مدت تک مناسب موقع کا منتظر رہا۔ فصل کٹنے کا وقت اس کے نزدیک نصیحت کا بہترین محل تھا۔ اس نے پوری قوت سے اپنا فرض انجام دیا اور اس کی نصیحت نے بالیقین اپنا مستقل اثر چھوڑا۔ نظیر انسانی نفسیات کے ماہر ترین نباض تھے۔ وہ کبھی بے موقعہ نصیحت نہیں کرتے لیکن کسی موقع کو ضائع بھی نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کو مقبولیت اور ان کی موعظت کو پُر اثری کا فخر حاصل ہے۔ نظیر کے حکیمانہ پسند و فصل کاغ کی تفصیل تو کہاں تک دی جائے مگر نیک کرداری، خوش معاملگی، پاکبازی، خدا ترسی، ہمدردی، ایمان داری، وسعت اخلاق اور صداقت کی پُر تاکید تلقین، بخل، محبت، زر، مکائد گری، دنیا پرستی اور ابو بازی کی بھو، سخاوت، شجاعت، منکسر مزاجی اور خود داری کی تعریف، غرض ہر قسم کے مواعظ حسنہ جس جس اسلوب سے بیان کئے ہیں وہ اُن کا حصہ ہیں اور اُن کی اہمیت میں کسی کو مجال دم زدن نہیں۔

لوکل کلریا مقامی رنگ | اردو میں لوکل کلریا مقامی رنگ کی اہمیزش نظیر کے اولیات میں سے ہے۔ یہ وہ غیر منفک صفت ہے جو کلام کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک لازمی خاصہ یہ ہے کہ کلام سے اس کی علیحدگی بہ ہر نوع ناممکن ہوتی ہے۔ اگر کوئی لوکل کلریا اپنے مقام سے جدا کر لیا جائے تو اثر و لطف زائل کر دینے کے ساتھ ساتھ اس کی غیبت مقصد اصلی کو بھی فوت کر دے گی۔ یعنی جس نتیجے کی توقع کی جاتی ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا غالباً زیادہ درست ہوگا کہ لوکل کلری کی موجودگی میں نظم کی ساری بنیاد صرف اُسی پر قائم ہوتی ہے۔ نظم یا فسانہ جو کچھ بھی ہو وہ مقامی خصوصیات کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوتا ہے کہ دوسرے ماحول میں اس کا وقوع محض ایک لائیں سی بات ہو جاتی ہے۔ مثلاً نظیر کی ”بھولی“ پیش کی جاسکتی ہے۔ بھولی کا تہوار خاص ہندوستان کی سرزمین اور آب و ہوا سے وابستہ ہے، انگلستان یا عرب میں اس کا وقوع ناممکن ہے۔ وہاں کی موبھی کیفیات وہاں کے رسم و رواج اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لئے وہاں کے شعراء میں اس قسم کے جذبات ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے۔ اردو میں اس لطیف عنصر کا فقدان شاعری کے فطری شعبے میں بڑی بدنما کمی ہے۔ قدیم اساتذہ کے کلام میں اس کا

استعمال قطعی نہیں لیکن نظیر کی شاعری اس الزام سے بری ہے۔ غالباً نظیری ایسا شاعر ہے جس نے اپنے وطن کی خصوصیات کو شاعری میں داخل کیا ہے، دیکھئے :-

اس سیہ ابر میں پوں اڑتے ہیں بگلے جیسے لبِ مالیدہ مسی میں دُردنداں کی ضیا
جگنو اس طرح جکتے ہیں کہ جوں وقت سنگار ماتھے پر ہاتھی کے سنگرت ہے گویا چھوڑ کا
مور کا شور و فغاں غوک کی، جھینگڑ کی جھنگار پی پی ہر اک پیپیہ کی ہے کوئل کی صدا

سیہ ابر میں بگلے کا اڑنا، جگنو کی چمک، غوک کی فغاں، جھینگڑ کی جھنگار، پیپیہ کی پی پی، سب ہندوستان کی مقامی و لفظی بیاں ہیں۔ اس کے ساتھ کمال یہ ہے کہ جن چیزوں سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے، مثلاً لبِ مالیدہ مسی، ماتھے پر ہاتھی کے سنگرت، وہ بھی خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صنعت کسی یا اختیاری نہیں، فطری اور حقیقی شاعر کا حصہ اور ناگزیر جزو طبیعت ہوتی ہے۔ اس لئے جو شخص جس مقام کا باشندہ ہے اور ذرا بھی صحیح حس شعری رکھتا ہے وہ وہاں کے مناظر اور مخصوص چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کسی شاعر کی نظر اپنے ملک کے امتیازات پر کسی نہ کسی عنوان سے نہیں پڑتی تو اس کے مکمل شاعر ماننے میں کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ نظیر نے کسی کے قبیح میں کوئل کا اختیار نہیں کیا بلکہ یہ خیال ان کا طبع زاد تھا۔ اسی سے صاف ظاہر ہے کہ بعض صنائع شعری فطری ہوتے ہیں اور شعر سے اس طور پر ان کا علاقہ ہوتا ہے کہ حساس طبیعت انھیں خود بخود پیدا کر لیتی ہے۔

ایلیگری یا تمثیل | لفظ ایلیگری یا تمثیل قریب قریب شاعری کا مترادف ہے۔ اس لئے کہ شاعری خود ایک قسم کی لفظی مماثلت ہے جس میں پسندیدہ الفاظ سے دلنیز پیرائے میں اصل واقعات کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ ایلیگری اور شاعری دونوں میں انکار مجرہ ہولائی مشکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ جس طرح پہلی مطلق تشبیہ ہے اسی طرح تمثیل مطلق استعارہ ہوتی ہے۔ ایلیگری، مصنف کے مطالب، دلائل اور مواظکوں انسانی یا مادی شکل میں بلوس کر کے بڑھنے والے کے ادراک سے قریب تر کر دیتی ہے۔ اس طرح مفہوم کا تجزیہ کرنے اور الفاظ مرقومہ سے معنوی مطالب اخذ کرنے میں جو ذہنی کاوش

شامل ہوتی ہے وہ بھی فی نفسہ نہایت دل آویز اور پُر اثر بن جاتی ہے۔ ایلیگری میں قصہ اور معنوی مفہوم ایک دوسرے کے متقابل ہوتے ہیں، لیکن یہ تو قریب قریب کبھی نہیں ہوتا کہ یہ تقابل جملہ مراتب میں مکمل ہو جائے۔ پس ایک مسلسل اور مطوّل ایلیگری میں، ایلیگری عموماً فسانے پر غالب آکر اس کی دلچسپی کو زائل کر دیتی ہے۔ بہر حال اس وقت ایلیگری کی ماہیت اور اس کے تاریخی ارتقا پر بحث کرنی منظور نہیں۔ صرف اتنا دکھانا ہے کہ نظیر کے کلام میں یہ لطفِ ادب بھی موجود ہے اور لوکل کلر کی طرح یہ بھی ان ہی کا طبع زاد ہے۔ ایلیگری کا استعمال ہر قوم و ملت کے مذہبی اور آسانی صحائف اور یونان و رومہ کے ادبِ قدیم اور دیگر ادبِ القدام میں بھی ہے لیکن اردو کے شعرا کو اس سے مس نہیں رہا۔ یوں تو تمثیلی نظیں نظیر کے کلام میں متعدد ہیں لیکن بخارہ نامہ، ہنس نامہ، اور خواب، خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ اول الذکر دو نظیں تو بہت ہی عتیق اور پندرہ تہنیل ہیں۔ خواب میں کسی قدر زندانہ جھلک ہے تاہم اس میں بھی احوالِ دنیا کی فوری و گر گونی اور تماشگاہِ عالم کے سیما کی جلووں کی بے ثباتی کا نقشہ نہایت لطیف اور شاعرانہ انداز میں کھینچا ہے۔

بخارہ نامہ میں نہایت مؤثر پیرائے میں یہ دکھلایا ہے کہ انسان حرص و ہوا میں مبتلا ہو کر حصولِ زندگی خواہش کرتا ہے اور اسی مدعا کو پورا کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتا اور قسم قسم کی تکالیف و صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اس عمل اور جدوجہد کے دوران میں وہ موت سے جس سے کسی حالت میں مفر نہیں بالکل بے خبر سا ہوتا ہے، یہاں تک کہ موت یکایک اس کو آدباتی ہے اور اس کا تمام مال و جواہر، ساز و سامان، سیم و زر، عزیز و اقارب حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی اس کے کام نہیں آ سکتی۔ یہ نظم نہایت دلگداز پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ اول سے آخر تک نظم میں ایک واعظانہ انداز ہے۔ تمثیل کے لئے بخارہ سے اور اس کی زندگی کا تلازمہ اختیار کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کہ بخارہ کی تمثیل اہل ہند کو نصیحت کرنے کے لئے ایک حکیمانہ تلاش ہے، بخارہ کا نام اور پیشہ کچھ ایسی رومانی اور پُر فسانہ چیزیں ہیں جن کا ذکر آتے ہی، جدوجہد، سفر، بے سرو سامانی، عارضی قیام، اور خانہ بدوشی کے مصائب خود بخود سامنے آنے لگتے ہیں جن سے رحم کا جذبہ برائے گھٹتا ہوتا ہے اور جب ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ اُس کی ساری کوششیں لامحالہ، جملہ سامعی بے سود ہیں، اس کی بہیم جدوجہد مستقل سفر و بے سرو سامانی کا آخر میں

اُسے کوئی غم نہ نہیں ملے گا تو دنیا کے تمام مشاغل، سارا انہماک ہیج معلوم ہونے لگتا ہے۔

ہنس نامے میں، طیور کا ملازمہ ہے۔ مختلف اقسام و مشائخ عادات و خصائل کے باشندگان عالم کو مختلف النسل طیور کا مترادف و ہم طریق قرار دیا ہے۔ اس نظم میں بھی مسلسل تمثیل ہے اور تمثیل کے جملہ مراتب فنا کے ہم رتبہ مقامات پر حاوی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کے جملہ افراد کو باہم دگر، انس و محبت ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ جذبات اس قدر ترقی کر جاتے ہیں کہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ بغیر ایک دوسرے کے دیکھے کوئی چارہ نہیں بلکہ زلیت محال ہے۔ ہنس کی ہم جلیسی نے سارے طاؤروں میں یہی خیال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی فرقت برداشت نہ ہو سکے گی۔ اس لئے سب نے اپنی اپنی ہمت کے موافق اس کی رفاقت کی کوشش کی لیکن سب ٹھک ٹھک کر رہ گئے۔

آخر کے تین ہنس اکیلا ہی سدھارا

اسی طرح انسان جب اپنے وطن حقیقی کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کی اولاد، عزیز و اقارب، دوست احباب اس کی جدائی کے خیال سے اپنا برا حال کرتے ہیں اور کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہم بھی اسی کے ساتھ چلے جاتے کہ یہ رنج دیکھنا نہ پڑتا۔ آخر کار ہر شخص اپنے تعلقات کے مطابق اس کے جانے کو ایک خاص مقام تک پہنچا آتا ہے۔ کچھ لوگ نماز جنازہ پڑھ کر نصرت ہو آتے ہیں، کچھ قبرستان تک پہنچا کر چلے آتے ہیں، کچھ قبر میں اتار کر رکھ لے آتے ہیں، کچھ دفن میں شامل ہو کر مٹی دے کر واپسی اختیار کرتے ہیں لیکن قبر میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ وہاں سے ہنس بچا اکیلا ہی سدھارتا ہے۔ ہنس نامہ اول سے آخر تک نہایت عبرت انگیز نظم ہے۔ اس میں فریب محبت اور اس کے دل شکن انجام کا جیسا پُر درد مرقع پیش کیا ہے وہ قطعی غیر فانی ہے۔

ادب القدا | میاں تغیر کا کلام اب اردو ادبیات کے لئے ادب القدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب قدیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے علاوہ، سادہ اور مؤثر بھی ہوتا ہے۔ اس میں الفاظ کی شان و شوکت کم ہوتی ہے مگر معانی کا ترانہ زیادہ ہوتا ہے۔ تغیر کے کلام کی بھی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں صاف، سیدھے، عام فہم مضامین نظم

کئے گئے ہیں۔ شعری آرائشوں مثلاً تشبیہ اور استعاروں کا اس حد تک لحاظ نہیں رکھا گیا کہ نفس مضمون پر ان کا کوئی اثر پڑے اور وہ ذہن سے بالکل مفقود ہی ہو جائے۔ جن بیان اور طرزِ ادا سے وہ کام لیا ہے جو تلازمے اور تلمیح کی ٹھوس ٹھانس سے لیا جاتا ہے۔ اسی باعث معمولی معمولی تشبیہوں میں خاص لطف ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے اثر و نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سادگی اور عدم تصنع کے ماسوا، نظیر نے روایات پارینہ اور اساطیر قدیمہ کو جامہٴ شعری پہنا کر اپنے جذبہٴ قدامت پرستی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ بھارت ویش کے ماقبل تاریخ واقعات اور ہندو علم الاصنام کے نیم مذہبی افسانوں اور حکایات کو جس خوبی اور حسن عقیدت سے نظم کیا ہے وہ کسی ہندو شاعر سے بھی ممکن نہیں ہوا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ہندو مذاق اور تہذیب کی جو چیزیں ہیں وہ خالص اسی قدیم رنگ اور ٹھیلے اسی زبان میں نظم کی گئی ہیں۔ نظیر نے صرف سادہ واقعات ہی کو نظم نہیں کر دیا بلکہ ایسی کامل مصوری کی ہے جس سے ہزاروں برس پیشتر کی ہندی معاشرت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر لگتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اسلاف کی جس قدر تصویریں کھینچی ہیں وہ ساری ابھی تک اُسی آب و تاب کے ساتھ باقی ہیں۔ حاصل کلام نظیر کے کلام میں، سادگی، عریانی، پراثری، صداقت، ترنم غرض ادب قدیم کی جتنی نوعی خصوصیات ہیں سب موجود ہیں۔

شیکیپیر شکیپیر کی عظمت شاعری چونکہ مسلم الثبوت ہے اور چونکہ دنیائے مغرب میں وہ آسمان ادب کا روشن ترین ستارہ ہے اس لئے اردو کے انگریزی خواں ناقدوں میں یہ ایک فیشن سا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے موضوع تنقید شاعر کو شیکیپیر کا مقابل قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظیر میں ہر حیثیت سے شیکیپیر کا ہم پلہ ہونے کی اہلیت ہے۔ اول یہ کہ گناہی دونوں کی صفت مشترک ہے جس طرح شیکیپیر کی قدر دانی اس کی حیات میں نہ ہوئی اسی طرح میاں نظیر بھی اپنی زندگی میں زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ہم اصناف شعرا کے حالات و سوانح عمری اس قدر کم دستیاب ہوتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شیکیپیر زبان کا بڑا زبردست ماہر تھا تو نظیر کو بھی اپنی زبان پر بڑا عبور تھا۔ دونوں نے الفاظ کا استعمال اس کثرت سے کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے کسی شاعر نے اتنا نہیں کیا۔ دونوں کو ہمہ دانی، ہمہ گیری، نفسیات اور معاشرت کے سمجھنے میں یہ طولی حاصل ہے۔

دونوں ہر کیریکٹر کو اس کمال سے لکھتے ہیں کہ اس کی ضد ان ہی کی قلم سے اسی کمال سے لکھی ہوئی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ شکیکپیر نے ڈرامے لکھے ہیں لیکن نظیر نے ڈرامے نہیں لکھے۔ ڈرامہ نویس کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ شاعر انسانی اطوار و اخلاق میں کامل بصیرت رکھتا ہو۔ نظیر کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کردار کی ہر کنہ سے خوب واقف تھے اس لئے ان میں ڈرامہ نویس کی قوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اگر وہ ڈرامہ لکھتے تو یقیناً اُن کے کیریکٹر شکیکپیر کے کرداروں کا مثنی ہوتے لیکن انھوں نے یہ ہے کہ اہل اُردو کو اس کا مذاق ہی نہ تھا۔ اُردو میں ڈرامے کا رواج نہ ہونے کے دو وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ اہل ملک ڈرامے سے ناواقف تھے دوسرے یہ کہ اصنافِ سخن میں کوئی صنف ایسی نہ تھی جس کو ڈرامہ نگار کی پڑی کا مترادف سمجھا جاسکتا۔ اس لئے اس طرزِ سخن کی عدم موجودگی نے اُردو میں ڈرامے کی ترویج نہ ہونے دی۔ اب اس شعبے میں کوششیں ہو رہی ہیں لیکن انھوں نے ابھی وقوعِ ادبی صورت اختیار نہیں کی۔

تقدیم و تاخیر کلامِ اروپ کے ادیبوں میں ایک زمانے سے یہ رواج چلا آتا ہے کہ وہ اپنے شعر کا کلیات تاریخ کے اعتبار سے مرتب کرتے ہیں۔ اول تو وہاں کے تمام شعرا خود ہی اس کا خیال رکھتے ہیں، لیکن جن اساتذہ کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا ناقدوں اور تبصرہ نگاروں نے اپنی کوششوں سے اُن کے کلام کو بھی اسی طرح ترتیب دے لیا ہے۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ منجملہ ان کے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے کو شاعر کی ذہنی ترقی کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ کلام میں زور اور خیالات میں نئی اور بخندگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ و ترتیب اسے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس زمانے کا کلام دیکھنے کو دل چاہے فوراً وہی نکال کر دیکھ لیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ التزام اس حد تک کیا جاتا ہے کہ نظموں کی تاریخیں بھی عنوان کے ساتھ ساتھ لکھ دی جاتی ہیں۔ باوجود حالات کی نیا بانی کے شکیکپیر کے کلام کی اس قدر چھان بین کی گئی ہے کہ یہ بھی پورے طور پر تحقیق ہو گیا ہے کہ کون سا ڈرامہ شاعر نے کس حصہ میں لکھا تھا۔ ایک ہی حصہ شعر کے کئی ڈراموں میں بھی تقدیم و تاخیر معلوم کر لی گئی ہے۔ یہ زندہ اور قدردان قوموں کے علمی کارنامے ہیں۔ اہل ہند بھی اگر اپنے اساتذہ

کا کلام اس طرح مرتب کرنا چاہیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ محض غزل گو شعرا کے کلام میں تو یہ کسی قدر دشوار ہوگا لیکن نظم کے کلام میں جہاں مستقل عنوانوں پر نظمیں کثرت سے موجود ہیں نفس مضمون کی شہادت اور رہنمائی سے نظموں کی تقدیر کا تاخیر تحقیق کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اس کام میں بڑی محنت اور جانفشانی تلاش اور جستجو تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے۔ اور یہ کسی فرد واحد کا کام بھی نہیں۔ مؤلف نے اس باب میں کسی قدر کوشش کی لیکن راہ کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو دیکھ کر اگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجبوراً اس ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ ایک وجہ نظر اندازی کی یہ بھی ہے کہ اس چھوٹے سے رسالے میں ایسی دقیق اور وسیع علمی تحقیقات کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر شروع کرنے کا ہے۔ بہر حال اس شعبے میں کامیابی سے بالکل ناامیدی نہیں ہے۔ لہذا اس وقت صرف اس عنوان سے روشناس کر کے اس کام کو آئندہ ناقدان کلام نظیر کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

مقبولیت | باوجود اس گمنامی اور کس پر سری کے نظیر کے کلام کو جیسی مقبولیت حاصل ہوئی وہ بہت کم شعرا کو میسر ہوتی ہے۔ عوام الناس کو ان کے کلام میں جیسی دلچسپی ہے دوسرے شعراء متقدمین یا حال کے کلام میں نہیں۔ تعلیم یافتہ، ہمدان، باب نشاط، ہنود میں مختلف خیال مشاغل اور معاشرت کے لوگ غرض ہر قسم کے افراد کی زبان پر نظیر کا کلام کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ لوگ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کی زبانوں پر کس کا کلام ہے۔ یا یہ کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اسے شعر کہتے ہیں۔ اگر کسی کو شعر صحیح طریقہ پر یاد نہیں تو وہ اپنے طور پر توڑ مڑ ڈھکی کر پڑھتا اور اس سے لطف اٹھاتا ہے اور موقع موقع سے اس کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن جو اتنا بھی کرنے سے قاصر ہے تو کم سے کم شعر کا خیال ضرور اس کے ذہن نشین ہے اور مناسب جگہ وہ اس کو مثل کی صورت میں دہرا بھی دیتا ہے۔ اکبر آباد اور دوسرے شاہی شہروں کے قدیم شریف گھرانوں کی پردہ نشین خواتین نظیر کے کلام کی بہت بڑی محافظ ہیں۔ حرم کے اندر نظیر کے اشعار اور ان کی نظموں کا ہند ہی کلام اور مناقبوں کے علاوہ اتنا بچر چاہیں۔ لیکن مثالیں، کہاوتیں اور کلیے جو ان کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں عام طور پر بی بیوں کے زبان زد ہیں۔ اس ضمن میں میاں نظیر امیر خسرو کے ہمد و شمس ہیں۔ جس طرح ان کی پہلی اور کمرہ کرنیاں شریف خاندانوں میں تفریح و تفسن کے لئے رائج ہیں اسی طرح نظیر کی کہاوتیں

مثلاً غریب کی جو رو سب کی بھابی، ”کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں“ عام طور پر استعمال ہیں۔ عورتوں کو یاد دہونا قبول عام کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ان جملہ باتوں کو دیکھ کر کنا پڑتا ہے کہ نظیر نے اپنی جادو بیانی سے قلوب کو تسخیر کیا اور ان کا سحر از کلام دلوں کا مالک ہے۔ شاعر کے نام و نشان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کا کلام لوگوں کے طبائع پر نقش ہے اور دلوں کا جزو بنا ہوا سینوں سے لگ رہا ہے۔ آہ یہ حافظان کلام نظیر امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور نظیر کے ریزہ ریزہ دل و جگر ان کے ساتھ پیوندِ خاک ہو رہے ہیں۔

کثرتِ کلام | نظیر کے کلام کی کثرت اور ہمہ گیری دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طاقت گویائی اتنی غیر معمولی تھی کہ اس نے انھیں پُرگوشتا شاعر بنا دیا۔ اُردو کلام کے علاوہ فارسی کا غیر مطبوعہ کلام بہت سا موجود ہے جس سے دنیا اب تک روشناس نہیں ہوئی۔ اس میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔ سہ نثر ظہوری کے انداز پر جو نثر میاں نظیر نے لکھی ہے وہ اس نوع کی نثر کا نمونہ اور آپ اپنی نظیر ہے۔ باوجود اس پُرگوئی اور کثرت کلام کے اُن کے کلام میں سلاست اور روانی ایسی موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موزوں کرنے میں انھیں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی خاص ذہنی سعی کرنی پڑتی تھی۔ ”حیکے سخن برزباں آفرین“ نے ان کا دماغ ہی موزوں بنایا تھا اور اس موزونیت کا یہ عالم تھا کہ نثر غالباً زبان سے نکلتی ہی نہ تھی۔ شاعری پر نثر کی سی قدرت کا راز اسی ازلی موزونیت میں پنہاں ہے۔

تصنیع کلام | تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ لیکن جو کچھ باقی رہا وہ بھی پورا طبع نہیں ہوا۔ کلیات کے علاوہ بہت سی نظمیں اور ہیں جو انھوں نے لوگوں کو کہہ کہہ کر دیدی تھیں اور پھر کبھی ان کا نام بھی نہیں لیا۔ فقیر، نوخیز دہے، اور پیشہ واران سے بہت سی نظمیں کہوا کہوا کر لے گئے تھے جن کا کلیات میں پتا بھی نہیں۔ نظیر کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان کے پاس آکر کسی مضمون پر کہنے کی فرمائش کرتا تھا تو وہ فوراً کہہ کر اُسی وقت اُسے دیدیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ان نظموں کو لے جا کر تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھتے تھے۔ بہر حال اس قسم کی کسی نظم کا اندراج کلیات میں نہیں اور یہ چیزیں قطعی ضائع ہو جانے کے برابر ہیں۔ میر سے ایک بزرگ جنھیں میاں نظیر کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، بیان فرماتے تھے کہ اُنھیں محلہ ڈھولی کھار میں ایک بوڑھا شخص ملا جو میاں نظیر کی ایک نظم پڑھا

کرتا تھا۔ یہ نظم اس نے خاص اپنے ہی لئے کہوائی تھی۔ اس کا قلعہ اس نے اس طرح بیان کیا کہ ”جب میں جوان تھا مجھے ایک عورت سے عشق سرزد ہوا۔ جب میں اپنی محبوبہ کی محبت میں بہت یسچین ہوا اور اس کا فرق مجھ سے کسی طرح برداشت نہ ہو سکا تو میں میاں نظیر کے پاس تاج کچ گیا اور اُن سے اپنا حال دل بیان کر کے چارہ گری کی خواہش کی۔ میاں نظیر نے مجھے یہ نظم کہہ دی۔ چنانچہ جب مجھے دردِ ہجر بہت ستاتا اور یسچین کرتا تھا تو میں اس نظم کو پڑھا کرتا تھا اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہو جاتی تھی۔“ اس بوڑھے عاشق کی جوانی اور اس کا ولولہ محبت اور جوش جنوں تو اب خود اسی کی زندگی کے لئے ایک بھولا ہوا خواب، ایک افسانہ پاریز بن گیا تھا مگر ایامِ نشاط کی باقیات صالحات وہ فراقیہ نظم یاد ایام کی حیثیت سے اب تک اس کی زبان پر تھی جسے وہ بڑے لطف سے پڑھ پڑھ کر فریب آرزو کا یاد کیا کرتا تھا۔ نظیر کے عہدِ زریں کی زندہ یادگار قدیم رنگیں صحبتوں کا نام لیا، پیرِ فرسودہ، آہِ نظیر کی مجلسِ جاوداں میں جا پہنچا اور اب ان سے عشقِ حقیقی کا راز دریافت کر رہا ہے لیکن وہ فراقیہ نظم بھی جو ایک مدت تک اس کی سونس تنہائی اور تنگسارِ فرقت بنی رہی تھی، عاشقانِ ساوی کی دلہری اور دلِ سوزی کے لئے اسی کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئی۔ پروفیسر شہباز کا قلم اُد ملک اور اُد زبان پر خصوصاً بڑا احسان ہے کہ انھوں نے غیر معمولی تکلفیں اُٹھا کر اور طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کر کے کلامِ نظیر ایک جگہ صحت کے ساتھ جمع کر دیا اور اُن کے سوانحِ عمری کو کچھ ہمایا ہو سکے زندگانی بے نظیر میں جمع کر کے ملک کے مردہ شاعر کو زندہ کر دیا ورنہ رہا سہا کلام بھی ضائع ہو جاتا اور سوائے کتبِ افسوس ملنے کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا۔

تخریبِ کلام | نظیر کے کلام کی جیسی روح فرسا تخریب کی گئی ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ کلام سے لوگ بے خبر رہے کیونکہ بہت سے ایڈیشن موجود ہیں لیکن کلام کا کٹا ایسا کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر بڑا دردِ محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کی دماغی کاوشوں کی داؤد جس عظیم المثل تغافل سے دی گئی ہے، وہ ملک کے لئے نہایت شرم انگیز ہے۔ جتنا کچھ کلام باقی ہے اور میسر آسکتا ہے وہ بھی بہت زیادہ غلط ہے۔ نہایت تسخر انگیز غلطیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر پہلے ہنسی اور پھر غصہ آتا ہے۔ افسوس ہے کہ چھاپنے والوں نے ذرا صحت کا خیال نہیں کیا، جیسا ہاتھ لگا غلط سلط

چھاپ ڈالا۔ بہت سی غلطیاں تو ایسی ہیں جو امتداد زمانہ اور دوری عہدِ نظیر کی وجہ سے پیدا ہوئیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو محض مطابع اور کاتبوں کی غفلت اور سہل انکاری سے رونما ہو کر مستقل بن گئیں۔ صحت کرنا اب بہت دشوار کام ہو گیا ہے۔ میں نے صحت کی بہت کوشش کی ہے لیکن پھر بھی بہت سے شکوک باقی رہ گئے ہیں۔ شہباز کا مترسہ کلیات اس وقت کلامِ نظیر کا بہترین اور مستند مجموعہ ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ اس میں بھی غلطیاں موجود ہیں۔ اس سے شہباز مرحوم کی لیاقت یا سامعی پر معاذ اللہ کسی قسم کا اعتراض کرنا منظور نہیں ہے صرف تصحیح کی دشواری پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ شہباز مرحوم کے یہاں غلطیاں باقی رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اکبر آباد کے باشندے نہ تھے۔ اس لئے یہاں کی زبان کے محاورے اور مقامی اصطلاحات سے انھیں واقفیت نہ تھی۔ نظیر کا کلام اس قدر غلط اور غلط ملط ہو جانے کی ذمہ دار ملک کی عام بد مذاقی، اہل علم کا تغافل، کاتبوں کا جہل اور بے پرواہی، مطابع کی زربند اور فراٹس سے بے خبری ہے۔ ایسے ہنتم با نشان شاعر کا کلام کچھ بیٹھنے اور غلط کر دینے کا ملک کے دامن پر ایسا پدنا دھبہ ہے جو قیامت تک یا کم سے کم اس وقت تک جب تک کلام کی قرار واقعی تصحیح نہ ہو جائے اس کے دامن سے نہ دھلے گا۔

اکبر آباد کی نظیر کی زبان اکبر آباد کی خالص قدیم زبان ہے اور یہی کسالی اُردو ہے۔ عہدِ حاضر میں جو زبان بولی قدیم زبان جاتی ہے وہ نظیر کی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نظیر کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ وہ کسی وقت ان مقامات کی زبان کی دست نگر ہے۔ چونکہ نظیر مقدم اور بہت پرانے زمانے کے شاعر ہیں اس لئے یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی زبان جنسِ اعلیٰ ہے اور دیگر مقامات کی زبانیں اس کی انواع ہیں دہلی اور لکھنؤ کے اساتذے متاخرین نے آنکھ کھول کر جس زبان کو دیکھا وہ نظیر کی زبان تھی۔ پس اسی کو اصل قرار دے کر اسی میں ترمیمیں اور اصلاحیں کیں۔ اس لئے دہلی، لکھنؤ کی شہستہ زبانیں اکبر آباد کی قدیم زبان کی ارتقائی شکلیں ہیں۔ نظیر کی زبان کو خاندانِ اُردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اُردو شعرا میں ولی اور بنی نوع انسان میں حضرت آدم کو ہے۔ تاریخِ زبان مرتب کرنے کے لئے اگر کوئی شخص قدیم اُردو زبان کا پتہ لگانا چاہے تو کلامِ نظیر اس کی پوری پوری

رہبری کئے گا اور اس سرچشمے سے اس کو پوری سیرانی ہو سکے گی۔ اکبر آباد کی ڈیڑھ صدی پیشتر کی زبان کا سراغ صرف نظیر کے کلام سے لگ سکتا ہے۔ کلام چونکہ مقدار میں کثیر ہے اس لئے ایک ہی جگہ، تحقیق و تفتیش کے لئے بڑا سرمایہ اور ہر قسم کے نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کا استعمال اس کثرت سے ہے کہ اردو کا بڑے سے بڑا شاعر سوائے میر تقی میر کے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بطور کے نام، کبوتروں کی قسمیں، ہندو مذہب کی اصطلاحیں، پیشہ وروں کے لئے، لہو و لعب کے چٹکے غرض ہر رنگ کے الفاظ اور پھر ان کے مترادف اس کثرت سے کلام میں ملتے ہیں کہ اردو کو نامکمل اور محتاج زبان کہنا غلط معلوم ہونے لگتا ہے۔ نظیر کے کلام سے قدیم الفاظ کی ایک اچھی خاصی کتاب لغات تیار ہو سکتی ہے جو نہایت کارآمد ثابت ہو۔ الفاظ کی کثرت اور لغت دانی میں نظیر عربی زبان کے اساتذہ کے ہم پلہ ہیں۔

زبان پر اجتہاد | نظیر اردو کے ایام طفولت کے شاعر ہیں۔ اس زمانے میں شعرا کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت کم تھا۔ اس لئے جو لوگ صاحب نظر و استعداد تھے وہ حسب ضرورت دوسری زبانوں کے مناسب الفاظ تلاش کر کے اردو میں کھپاتے تھے۔ یہی ضرورت نظیر کو بھی درپیش تھی۔ انھوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے نئے نئے الفاظ وضع کر کے زبان پر اجتہاد کیا۔ مترادفات تلاش کرنے میں انھیں بڑی قدرت تھی اور یہ کمال انھیں ہر زبان میں یکساں حاصل تھا۔ فارسی عربی الفاظ کے لئے بھاشا سے اور بھاشا کے لفظوں کے واسطے فارسی سے اتنا موزوں مترادف ڈھونڈھ لاتے ہیں جس کو دیکھ کر میا ختمہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ اجتہاد زبان اور عروض کی بہت سی مثالیں میر اور دیگر اساتذائے متقدمین کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نظیر کے کلام میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اب نئے اور عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ نظیر کے وضع کردہ محاورے اور الفاظ کثرت سے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تو مقبول ہو کر زبانوں پر چڑھ گئے اور زبان کا جز بن کر اس طرح مخلوط ہو گئے کہ اب تمیز بھی نہیں کئے جاسکتے لیکن وہ الفاظ جو اب نئے نئے معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں وہ ہیں جو کسی دہرے عام نہ ہو سکے اور صرف ان ہی کے کلام تک محدود رہے۔ اب چونکہ اس زمانے میں متعل نہیں ہیں اس لئے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو کم نظر غلط اور اہل بصیرت اجتہاد کہتے ہیں۔ اس بنا پر نظیر کے کلام کو دہلی اور گھنٹو کی زبان کے جدید معیار سے جانچنا غلط ہے۔ نظیر نے اپنے کلام میں ادبی، کو لوکل

یاد فرمہ، اور سلنگ یا بازاری و مبتذل تین قسم کی زبانوں کا استعمال کیا ہے۔ ادبی زبان میں تو انھوں نے زیادہ تر عربی فارسی کے ناموس الفاظ پر اکتفا کی ہے اور یہ زبان پاکیزہ خیالات اور سنجیدہ جذبات اظہار کرنے کے لئے تجویز کی ہے۔ روزمرہ میں انھوں نے جگہ جگہ اجتہاد کیا ہے۔ یہاں ہندی کے الفاظ دل کھول کر استعمال کئے ہیں۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ اور ہندو الفاظ کی ترویج بھی اسی صیغے میں کی گئی ہے۔ اب رہی سلنگ یا بازاری زبان اسے وہ غیر سنجیدہ اور عریاں موقعوں پر استعمال کرتے ہیں۔ میلے پھیلے، لہو و لعب، احوام الناس کی ہر قسم کی بُری بھلی صحبتوں میں وہ اس زبان کو بولتے ہیں اور یہ ہر طرح جائز ہے۔ زبان کی عالمانہ تقسیم اور ہر موقع پر مناسب حال زبان کا استعمال نظیر کی ایجاد اور اُن کے مجتہدانہ کمال کا بین ثبوت ہے۔

زبان پر احسان | نظیر کا اردو زبان پر بڑا احسان ہے۔ اس معاملے میں سب سے پہلے اُن کی دودینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے کتنی مدت پہلے تاڑ لیا تھا کہ یہ زبان جس کی اب ابتدا ہے ایک دن ہندوستان کی علمی اور فنی زبان بن کر رہے گی۔ مستقبل کی اس بصیرت کے ساتھ اردو کی کم مائیگی اور بے بضاعتی بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنی تمام کوششیں اس زبان کو وسیع کرنے اور سرمایہ دار بنانے کے لئے وقف کر دیں۔ اُن کا کلام شاہد ہے کہ انھوں نے اپنی اور اپنے زمانے کی زبان کو اس قدر وسیع کر لیا تھا کہ انھیں الفاظ کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی اور اس وجہ سے وہ کوئی خیال کسی انداز سے ادا کرنے میں قاصر و عاجز نہ تھے۔ اردو کو وسیع کرنے کے لئے فطری اعتبار سے انھوں نے ہندی کو زیادہ مناسب زبان خیال کیا۔ چنانچہ بھاشا کے موزوں اور عام فہم الفاظ چھانٹ چھانٹ کر استعمال کرنا شروع کئے اور عبارت میں اس خوبی سے کھپائے کہ سیاق سے اُن کے معانی اور مطالب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حسن استعمال سے دو فائدے ہوئے۔ اول تو یہ کہ الفاظ بہت جلد مل جل گئے، دوسرے یہ کہ سامع کو آگوار نہ معلوم ہوئے۔ نئے الفاظ کا سامع کو آگوار معلوم نہ ہونا اُن کے جزو زبان بن جانے کی بہت بڑی شہادت ہے۔ بھاشا کے الفاظ کی معنی کے پہلو پہلو نظیر نے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ کو ترک بھی کرنا شروع کیا۔ فارسی سے انھوں نے محاوروں کے معاملے میں مدد لینی زیادہ مناسب سمجھی۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ اُن کے کلام

میں بہت دستیاب ہوتا ہے۔ زبان کی ضرورت کو اس حد تک سمجھنا اور پورا کرنے پر اتنا قادر ہونا معمولی آدمی کا کام نہیں ہے۔ کوئی شاعر جب تک خاص لسانی ملکہ اور مختلف زبانوں پر کامل تجربہ رکھتا ہوا اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نظیر بڑے ماہر لسانی تھے اور ان کو روزِ فصاحت و بلاغت سے خاص واقفیت تھی۔ ناموس کو ناموس بنا کر بھی کلام میں روانی اور سلاست کوٹ کوٹ کر بھر دینا ان ہی کا حصہ تھا۔

قومی شاعر ہے محض ادبی نہیں | غالب اور تپیل کی طرح نظیر خالص ادبی شاعر نہیں ہیں، بلکہ اسکوٹ لینڈ کے مشہور شاعر اسکوٹ اور برٹن کی طرح قومی مغنی ہیں۔ غالب اور تپیل کے مانند ان کا موضوع فلسفہ اور تصوف نہیں۔ وہ عربیوں میں پوشیدہ کو نہیں ڈھونڈتے بلکہ انسان کو بہترین منظر حقیقت والہیت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا موضوع جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے انسان اور اس کی معاشرت ہے۔ وہ ان شعرا کی طرح مشکل پسند بھی نہیں ہیں۔ ان کا کلام معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہیں۔ وہ بالخصوص عوام کے شاعر ہیں اور ان ہی کے جذبات اور حیات کی ترجمانی اپنا فرض اولیں سمجھتے ہیں۔ باوجود کوئی قدیم مثال سامنے نہ ہونے کے ان کی تیز نگاہوں نے کائنات اور انسان کا سچا تعلق معلوم کر لیا۔ اس انکشاف نے ان کی ذہنی قوت اور بڑھادی اور پھر انھوں نے نفسی تحقیقات کی تیاری شروع کی۔ صداقت اور دلکشی ان کے شاعرانہ امتیازات ہیں اور شاعرانہ حیثیت سے نہیں بلکہ انسانی حیثیت سے وہ ہمارے لئے زیادہ دلچسپ اور نوثر ہیں۔ نظیر کی روح حقیقی شاعرانہ روح ہے۔ اس کو صرف پھیر ڈینے کی ضرورت ہے۔ اس سے نغمہ پیدا ہونا لازمی ہے۔ پھیرنے کے لئے کسی خاص مضرب کی حاجت نہیں فطرت کا معمولی سے معمولی جزو حتیٰ کہ ایک نفس انسان بھی ان کے لئے مستقل حن ہے۔ نظیر کو خصوصاً اس وقت دیکھو جب کہ وہ اپنی مرغوب جماعت میں بے تکلف ہوتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سرگرم، ہمہ گیر اور پُر خلوص انسانی ہمدردی کا کیا عالم ہے۔ ان کی پراعتماد، نامحدود محبت کا کیا رنگ ہے اور وہ اپنے محبوب خاص انسان کے لئے کیسی کیسی فیاضیاں کر سکتے ہیں۔ ان کا شہری دوست اور گندم رنگ دوشیزہ ان کے لئے ذلیل اور معمولی نہیں بلکہ ہیرو اور ملکہ ہیں جن کی وہ بادشاہوں سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی قلوب کی پراسرار صناعتی اور مقدرات کی ناقابل

قیاس ظلمت و ضیاء کے مظہر صرف بلند منزلت کاخ و ایوان ہی نہیں بلکہ اُن کا اظہار ہر جھوپڑے میں جہاں انسان بستا ہے ہو سکتا ہے۔ ہم نظیر کو عوام کی صحبتوں میں دلچسپی لیتے، ہنستے بولتے، ملتے جلتے، اُن کے مشاغل میں حصّہ لیتے اور ان ہی کی زبان بولتے دیکھتے ہیں لیکن ان کے روزمرہ میں رکاکت اور ابتذال نہیں ہے۔ کسی موقع پر وہ عالی ظرفی اور بلند وصلگی کو جوان کی شریفت بشریت کے عناصر میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بس یہی بالغ نظری اور صفائی قلب اُن کے کمال کی بنیاد ہے۔

نوا آزادانہ نظیر کے دربار کا دروازہ ہمیشہ وار ہوتا تھا اور ان کی صحبت ہر شخص کے لئے صلائے عام تھی۔ اس لئے وہاں ہر رنگ کا آدمی حاضر ہوتا تھا۔ یہ ادنیٰ طبقے کے لوگوں اور غربا کے ساتھ خاص مراعات کرتے تھے اور یہ لوگ بھی اُن کی خدمت میں خاص طور پر گستاخ تھے۔ چنانچہ فقیر، ان سے مناقبیں، قلندر صدائیں اور پھیری کے خوشچنے والے لٹکے کوا کھوا کر لے جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کے بہت سے کلام کی نوا آزادانہ اور لے قلندرانہ ہے۔ اس قسم کی نظمیں خاص طور پر طویل اور مترنم بحروں میں ہیں تاکہ گانے میں سہولت ہو اور لے کے ساتھ خوب پڑھی جاسکیں۔ نظیر کا کلام اکبر آباد اور مضافات اکبر آباد کے خصوصاً اور ملک کے عموماً فقیروں کی زبان پر ہے۔ سنا جاتا ہے کہ بنکال کے فقیروں کو بھی ان کا کلام بہت یاد ہے۔ فقیروں کو جو مناقبیں اور معجزے میاں نظیر کے یاد ہیں وہ ایسے حسب حال اور پُر اثر ہیں جن سے خاص کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن یہ غور ہے کہ یہ فقیر اب بہت تھوڑے رہ گئے ہیں اور جو کچھ ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ ہر چند یہ کلام سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آ رہا ہے لیکن اس طریقے سے اول تو کلام کی صورت بہت کچھ بدلتی جا رہی ہے دوسرے فقیروں کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ پھیری والے پیشہ وروں اور خوشچنے والوں کو بھی نظیر کا کلام جس کی نوا آزادانہ ہے کافی یاد ہے۔ یہ لوگ اسے گا کر اپنی چیزیں بیچتے ہیں جس کی وجہ سے خوب بکری ہوتی ہے۔ مستہر کرنے کا اتنا اثر اور فطری طریقہ نظیر کی ایجاد ہے۔ اگرے میں گا کر سودا بیچنے اور لے کے ساتھ حیر کا اعلان کرنے کا رواج غالباً نظیر کے وقت اور ان ہی کی نظموں کی بدولت پڑا۔ اگرے کے چورن بیچنے والوں کو جو خوشچنے لگاتے ہیں نظیر کے لٹکے بہت سے یاد ہیں جو نہایت پُر لطف اور سادہ انداز ہیں۔

متروکات و معائب | مردہ زبانوں کا تو خیر کوئی ذکر نہیں، جو زبانیں زندہ ہیں یعنی جن کی بولنے والی قومیں روئے زمین پر موجود ہیں ان میں مردہ زبانوں کی تبدیلیاں اور آئے دن اختلافات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگر نو شیرواں کے دربار کا کوئی امیر اس وقت زندہ ہو جائے تو وہ ایران کی موجودہ زبان سے بہ مشکل کوئی مطلب سمجھ سکے گا۔ نظیر کے زمانے سے اس وقت تک زبان اُردو میں بڑی بڑی ترمیمیں اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ سینکڑوں الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو اب قطعی متروک ہیں۔ اسی طرح نظیر کے کلام میں جو بہت سی ترکیبیں مستعمل ہیں وہ اب رائج نہیں۔ پس جس طرح اور اساتذہ کے کلام میں متروکات کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جاتا اسی طرح نظیر کے کلام کا بھی عیب نہیں خیال کیا جاسکتا۔ نظیر کے کلام پر یہ ایک بڑا اعتراض ہے کہ اُن کے یہاں صحت لفظی کا التزام نہیں۔ یہ اعتراض بھی جملہ متقدمین پر ایک ہی طرح صادق آتا ہے۔ ہر چند اس زمانے میں صحت لفظی کی کوئی قید نہ تھی لیکن نظیر کے معاملے میں اس کا ایک خاص جواب موجود ہے۔ وہ یہ کہ نظیر عوام کے لفظ کے مطابق، بق لفظوں کو باندھتے ہیں اور چونکہ وہ عامۃ الناس کے ہی مخصوص شاعر ہیں اس لئے اس معاملے میں انہیں ہر طرح کا اختیار اور پوری آزادی حاصل ہے۔ یہ بات کیسی بے محل ہوتی کہ وہ کنہیا جی کے جنم میں ہندو عورتوں کی زبان کی جگہ لکھنؤ کی خواتین کی زبان لکھتے اور بلدیہی کے میلے میں برج کے گنواروں کی بجائے دہلی کے ثقات کی۔ نظیر کی شاعری پر بعض لوگ یہ بھی اعتراض کر بیٹھے ہیں کہ وہ مرصع نہیں ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح بھی تسلیم کیا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے موجد اپنی ایجاد کو مرصع اور مکمل نہیں بنا سکے۔ یہ متاخرین اور متبعین کا فرض ہے کہ تقلید کے راستے میں جو فرد گزشتہ اور کی دیکھیں پوری کر دیں لیکن نظیر کا کلام مرصع اور مکمل بھی ہے۔ وہ اپنا رنگ اپنے ہی پر ختم کر گئے۔ جب ٹھنڈے دل سے نظیر کی شاعری پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی بنا مخصوص محاسن پر قائم ہے۔ وہ اٹھارویں انیسویں صدی عیسوی کے صرف بہت بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کی سمر زمین کے ایک نہایت عالی وقار صنّاع بھی تھے۔ یہ اعتراض کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے کام نامکمل چھوڑا۔ ان کے کام کی ماہیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہی بہت زیادہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ تمام

عناصرِ جن سے ان کی شاعری مرکب ہے، ان کو خود ہی دریافت بھی کرنے پڑتے تھے۔ یہ سارے جو اہر جن کی تلاش میں وہ ہر وقت سرگرم کار تھے ایک ایسے دیرانے میں مدفون تھے جس کا وجود اور کسی فرد کی نہیں بلکہ صرف ان ہی کی نگاہ نے دریافت کر لیا تھا۔ اس باب میں یہاں تک کہنا پڑتا ہے کہ اُن کو کھود نکالنے کے لئے اوزار بھی اُن ہی کو بنانے پڑتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کو ایسی شدید ظلمت میں پامیاں کوئی مدد کوئی اوزار کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور اگر کوئی نمونہ موجود تھا تو وہ نہایت ذلیل اور ادنیٰ قسم کا۔ کہا جاتا ہے کہ نظیر کے کلام میں بجا اعدادے کا عیب ہے۔ فی الواقع یہ شعر کا بڑا عیب ہے لیکن اعدادے کی کثرت صرف اس وقت ناگوار ہوتی ہے جب ایک ہی بات یا خیال بار بار دہرانے سے طبیعت پر بار پڑے اور یکسانیت سے جی اُگتا جائے۔ لیکن جس صورت میں ایک ہی خیال مختلف موقعوں پر مگر ہر مرتبہ نئے خیالات کے ماحول میں پیش کیا جائے تو برا نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس سے کلام میں نور اور تانفیر پیدا ہو جاتی ہے۔ فنِ موسیقی کی شہادت اس عیب کے جن کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ترجم کے ساتھ جو روانی اور سلاست پیدا ہو جاتی ہے وہ مزید برآں ہے۔

عروض نظیر کے عروض پر تفصیلی بحث کرنے میں طول کا اندیشہ ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ نظیر کے کلام میں بہ ظاہر عروضی غلطیاں موجود ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ عروضی غلطیاں کلام غلط ہو جانے سے بعد میں پیدا ہو گئیں یا خود نظیر سے سرزد ہوئیں اس کی تحقیق سرمدست بہت دشوار ہے۔ اس وقت جو کلام میسر ہے اس میں خامیاں موجود ہیں۔ موجودہ ضروریات کے لئے صرف اسی کلام پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ غلطیاں کس نوعیت کی ہیں۔ ان میں بعض غلطیاں تو قافیہ سے متعلق ہیں اور بعض وزن شعر سے یعنی یہ کہ تقطیع کرتے وقت بعض حروف مثلاً 'ح'، 'ر'، 'ہ' تقطیع سے گر جاتے ہیں۔ اس قسم کے معائب نظیر کے کلام میں کچھ نئی بات نہیں، شہباز نے مثالیں دے کر دکھایا ہے کہ قدیم اساتذہ کے کلام میں بھی یہ نقائص کثرت سے موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانہ شاعری میں شعر پر ایسے دقیق قیود عائد کرنا اس دور کے دور میں شعرانے مناسب نہ سمجھا۔ اس عام جواب سے نظیر پر اعتراض کا بھی جواب مل جاتا ہے لیکن اُن کے متعلق ہمیشہ یہ ایک خاص بات اور یاد رکھنی چاہیے۔

کہ وہ بسا اوقات الفاظ کا تلفظ عوام کی زبان کے مطابق کر جاتے ہیں۔ اس نکتے کو یاد رکھنے سے نہ صرف اس بات کا بلکہ اور بہت سے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے۔ عوام کی زبان کے مطابق تلفظ کر کے مصرع پڑھنے میں بہت سے حروف جو بظاہر تقطیع سے گرتے معلوم ہوتے ہیں خارج نہ معلوم ہوں گے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر نے جو کچھ کیا وہ عمداً اور دانستہ کیا۔ وہ کسی طرح عروض میں عاجز نہ تھے۔ ہاں مشرقی عروض کی سخت بندشوں سے تنگ آ کر ان کی فطری آزادی پسند طبیعت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تخیل کی صحت اور شگفتگی کی خاطر کہیں عروض کے قواعد قربان ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ عروض کو شعر کا صرف جز و ضروری سمجھتے تھے جز و لاینفک نہ سمجھتے تھے اور اس نظر سے وہ اسطو کے ہم خیال تھے۔

نحیات [نظیر کے کلام میں جہاں فحش اور غیر سنجیدہ باتیں ہیں ان کے متعلق کئی جگہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کا وجود محض معاشرت نگاری کی بنا پر ہے۔ ان کو اگر نظر انداز کر دیا جاتا تو انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا پہلو پوشیدہ رہ جاتا، جس سے نظیر کی اہلیت اور ہمہ گیری پر اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس موضوع پر زیادہ بحث کی حاجت نہیں۔ صرف سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری کے ماضی لانہ تبصرے مطبوعہ نقاد اگست ۱۹۱۳ء کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے جس سے اس عنوان پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

”بعض نظمیں جو غیر مذہب ہیں، ان سے نظیر کی شاعری کو حقیقتاً کوئی تعلق نہیں۔ بلاشبہ ان کا شمار نظیر کے نتائج افکار میں ہو سکتا ہے لیکن چونکہ ان کا وجود فتنن طبع یا کسی خارجی تحریک پر مبنی سمجھا جاتا ہے اس لئے کلام نظیر کی تنقید کے واسطے وہ بطور معیار کے کام نہیں دے سکتیں۔ ان عجب اخلاق و اشتعال انگیز نظموں کی شانِ نزول یا غرض و غایت کیا تھی؟ اس کا صحیح جواب اس وقت دینا محال ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ معاشرت انسانی کے جو تاریک پہلو نظیر نے دکھلائے ہیں وہ غیر فطری یا سرتاپا غلط ہیں۔ ممکن ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح کی غرض سے شاعر نے یہی مناسب سمجھا ہو کہ لوگوں کے آگے، ان کی مذہب و عادات و خصائل کا تذکرہ، من و عن کر دیا جائے کہ انھیں اپنی دردناک اور غیرت سوز حالت پر غور کرنے کا موقع ملے اور اس سے شاید اتنا ہو کہ وہ اپنے خصائل و اخلاق

کی درستی پر از خود مائل ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بعید از امکان نہیں کہ انھوں نے اپنی طبعی خواہش سے ایسا کیا ہو۔ تاہم اس کے لئے نظیر کو خصوصیت سے لازم گردانا ناانصافی ہے خصوصاً اُس حالت میں کہ سعدی ایسے کئی گراں پایہ فلسفی شعر اکادامن ہڈل گوئی کے ہمداد داغ سے ملوث نظر آ رہا ہے۔ یہیں ”خذ با صفا ودع ماکدر“ کے عاقلانہ اصول پر کار بند ہونا چاہئے۔ اچھے مال کی قدر دانی کرنا چاہئے اور خراب چیز کی طرف نظر بھی نہ ڈالنا چاہئے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے کے بعد اربابِ نظر متلاشی ہوں گے تو انھیں ”ویرانہ نظیر“ کی خاک سے بہت سے بیش قیمت خزانے برزے ایسے ملیں گے جن سے ادب و لطیف کمالِ جگر کا تاج غیر معمولی زرب و زینت پاسکتا ہے۔ متعدد نظیریں نظیر کی اس قسم کی ہیں کہ اُن کا انتخاب تعلیمی کورس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اور اُن کا منتخب مجموعہ نوہمالان قوم کے ہاتھ میں بلا کسی خدشے کے بغرض استفادہ دیا جاسکتا ہے۔

رسم خط | ہر شخص جانتا ہے کہ بعض قدیم الفاظ کی کتابت کا طرز بھی پُرانا ہے۔ لیکن اب قدیم الفاظ کے ترک کے ساتھ اُن کا طرز کتابت بھی بدل گیا ہے۔ اس تالیف میں رسم خط ہمیں تو قدیم ہی قائم رکھی ہے کہیں جدید کر دی ہے۔ قدیم کتابت صرف اُن مقامات پر قائم رکھی ہے جہاں ضرورتِ شعری نے اس کے قائم رکھنے کے لئے مجبور کیا۔ ”جائے“ ”آوے“ اور اس قبیل کے الفاظ کو اسی شکل میں رکھا گیا ہے۔ اگر بدل دئے جاتے تو شبہ ہو سکتا تھا کہ نظیر نے اسی طرح لکھا ہوگا۔ لیکن اون، او سے، اونہیں کو اُن، اُسے، انہیں کر دیا گیا ہے اس لئے کہ ایسا کر دینے سے تلفظ میں کوئی فرق نہیں پڑتا نہ اور کوئی شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اب بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی کتابت بدل دینے سے بعض اوقات تو مصرع کی موزونیت پر اثر پڑتا ہے اور بعض اوقات نہیں پڑتا مثلاً ”ایدھر“ ”اودھر“ چنانچہ جس جگہ تلفظ صاف طور پر ”ایدھر“ ہے اور بدلنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے وہاں کتابت اسی طرح رکھی ہے۔ لیکن جہاں تلفظ اودھر ہے اور بدلنے سے بھی مصرع موزوں رہتا ہے وہاں بے خوف کتابت بدل دی گئی ہے۔

سوانحِ نظیر | پر و فیدر شہباز نے زندگی بے نظیر میں نظیر کے عقلی و نقلی سوانحِ عمری جمع کئے ہیں اور کلام کو

زندگی کے واقعات کی روشنی میں دکھانے کی کچھ کوشش کی ہے۔ اس سے نظیر کی پیدائش، وطن، پیشہ، مزاج، چال چلن، اخلاق، اشغال، معاشرت، سیرت غرض زندگی کے جملہ حالات بخوبی واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس مجموعے کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نظیر کی تذکرہ نگاری کا مسئلہ پورے طور پر حل ہو گیا۔ اس سے واقعات کی کیا بیانی کی جانب اشارہ کرنا مقصود نہیں بلکہ اس پر نظر ہے کہ تذکرے کا مدعا حاصل کرنے کے لئے اُن کا محدود اور نامکمل استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کوئی فرد واحد واقعی اس کا اہل ہے کہ اس کی حیات کے واقعات اور خصائل یا دو گاموں کے طور پر ضبط تحریریں لائے جائیں تو انصاف کا یہی فیصلہ ہے کہ عوام الناس خصوصاً اس کے اہل وطن کو اس کی سیرت کے جملہ اندرونی سرشتوں اور وسائل سے روشناس کرو دینا چاہئے۔ زمانے کو دکھا دینا چاہئے کہ دنیا اور انسانی زندگی اس کے ذاتی نقطہ نظر سے اس کے نفس پر کس حیثیت و رنگ میں منکشف ہوئیں۔ اس کے عہد کے خارجی واقعات نے اس میں کیا ترمیم کی اور اس نے اپنی شخصیت اور باطنی تاثرات سے ان میں کیا تغیر پیدا کیا۔ وہ کس کس کوشش اور قابلیت سے اُن پر غالب آیا اور کیسے کیسے تصادم اور کن کن صوبہ جوں کے بعد اُن سے مغلوب ہو گیا۔ ان سب باتوں کو ایک فقرے میں یوں کہنا چاہئے کہ سوسائٹی نے اس پر اور اس نے سوسائٹی پر کیا اثر ڈالا۔ کسی فرد کی حیات کے متعلق جو شخص ان سوالات کا شافی جواب دے وہ اس کے تذکرے کا مکمل نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ بے شمار انسانوں میں صرف محدود و چند نفوس اس نوعیت کا مطالعہ کئے جاتے ہیں۔ بہت سے تذکرے لکھے جاتے ہیں اور معصوم و عجائب پسند طبائع کو خوش اور مطمئن کرنے کے لئے لکھے جاتے بھی جاتے ہیں لیکن جو اس مفہوم کو ادا نہ کریں گے وہ صرف ایک بار مطالعے کے بعد ہمیشہ کے لئے طاق نسیاں کے سپرد کر دئے جائیں گے۔ اب یہ غلطی نہیں کرتا تو نظیر اسی فہرست کے چند افراد میں سے ہیں۔ لیکن ان کا ایسا مطالعہ جس کا یہ ماحصل ہو اب تک نہیں کیا گیا۔ اس ضمن میں میری کوشش ناکافی اور کمزور ثابت ہوتی اس لئے میں نے اس سے گریز کیا۔ نہ ایسی بحث اس مختصر جریدے کا موضوع بن سکتی ہے۔

قطعات | اب دو قطعہ تاریخ درج کئے جاتے ہیں جن سے میاں نظیر کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ ان میں پہلا نظیر

نظیر کے مجاز اے خلیفہ گلزار علی اسیر کا نتیجہ فکر ہے اور دوسرا حکیم قطب الدین خاں باطن کا جو نظیر کے شاگرد رشید تھے۔ قطعات حسب ذیل ہیں :-

(۱) چرخوش در حلتش آورد فکر طبع تاریخی
نظیر اکبر آبادی چوں زین دنیا ئے ابتر شد
مخمس بے سرو پا، بیت بیدل، فرد بے سر شد
نظام نظم باہم در ہم و بر ہم شد و یکسر
دوسرا ملاحظہ ہو :-

(۲) ہزار حیف ز باطن گزشت استادم
دوازده چہل و شش بود چوں سنہ ہجری
سن وصال طبیعت با نظام آورد
کہ بے نظیر جہان و نظیر عسلم آموز
گذاشت نظم جہاں و جہاں الم آموز
سر غزل در باغی و مطلع و دل سوز

۴۶ ۱۲ ھ

خاتمہ | نظیر کا کلام جس بحث و تنقید کا مستحق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس کا حق ادا نہ ہو سکا۔ کلام کے صنائع و بدائع، انواع و اقسام، حقیقت و معنویت، نظیر کا شغف موسیقی، غرض بہت سے نکات ایسے ضروری ہیں جن پر اس وقت روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ نظیر کی محاسن نگاری میری محدود قابلیت سے بہت بالا تر ہے۔ اس وقت جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ منتشر خیالات کا ایک مجموعہ پریشان ہے جس میں کمالات نظیر کا احصاء محال ہے۔ اب ارباب کرم سے استدعا ہے کہ اس ناکام کوشش کو بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرمائیں اور جو معائب اور کوتاہیاں اس میں باقی رہ گئی ہیں انہیں اندر دے ڈرہ نوازی نظر انداز کریں یا ان کی طرف میری توجہ دلائیں۔ اس صحیفے کا مقصد کلام نظیر پر روشنی ڈالنا نہیں بلکہ ملک کو ان کے کلام سے جدید طریقے پر معرفت کرانا اور اہل بصیرت کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانا ہے تاکہ کسی اعلیٰ پیمانے پر ان کے کلام کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہو سکے میں امید کرتا ہوں کہ اگر نظیر کے متعلق کوئی اہم نشان و تحریک شروع کی گئی تو یہ جریدہ جو اس وقت صرف ایک پیش خیمہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس وقت نمونے کا کام دے گا اور اس عالی شان ایوان کا سنگ بنیاد بن سکے گا۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تبصرہ

تظہیر کے کلام کے عام اور نمایاں محاسن پر سرسری بحث کرنے کے بعد اب اُن خاص نظموں کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو اس صحیفے کے لئے منتخب کی گئی ہیں۔ یہاں ہر ایک نظم کو جدا جدا لے کر اس کے داخلی لطائف دکھائے اور اُن پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

الہی نامہ ایک عبرت مندانہ نظم ہے جس میں فنائے جہاں اور بقائے رحمان کے مسلم الثبوت کلیے کی تشریح کی گئی ہے اور دقیق حکیمانہ نجات کو عام فہم نصیحتوں میں منتقل کر کے شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ اول

تو اس نظم میں ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ مختلف موجودات عالم اور اجزائے کائنات پر باری باری سے نظر ڈال کر عالم اسباب کی ناپائنداری اور خلاق عالم کا دائمی قیام ثابت کیا ہے۔ دوسرے اول سے آخر تک صداقت اور حقیقت کی ایک ایسی برقی رو اس نظم میں دوڑتی چلی جاتی ہے جو قلب کو یکسر مضطرب کر دیتی ہے اور پھر دنیا کے تمام مشاغل و تعلقات ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن چیزوں کو مثال کے طور پر فانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ بادی النظر میں استحکام و استقامت کا ایسا اہم نمونہ پیش کرتی ہیں جن کی فنا کا بہ ظاہر گمان بھی نہیں ہوتا لیکن جب ایسی عظیم الشان و عظیم الشیائے عالم کی فنا کا مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے تو عبرت اور ہیبت کے وحشت انگیز آثار دل پر طاری ہونے لگتے ہیں۔ دیکھئے یہ بند کس قدر عبرت آموز ہے:-

جوشاہ کہاتے ہیں کوئی اُن سے یہ پوچھو داراؤ سکندر وہ گئے آہ کدھر کو

مغور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیر و اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیرو

نے ملک نہ دولت نہ سر انجام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ وہ سنجیدہ موقعوں پر سطحی چیزوں سے اس طرح گریز کرتے ہیں کہ ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بھی موقع پر اُن سے کوئی سروکار رکھتے ہوں گے۔ دنیا کی فنا اور اہل دنیا کی چند روزہ حیات کا منطقی نتیجہ وہ یہ نکالتے ہیں کہ باہمی تفرقے اور تنازعے محض بیکار اور عبث ہیں اور اس لئے بے تعصب اور صلح کل روادارانہ اور پرامن زندگی بسر کرنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں:-

جھگڑانہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن

زنا رگے یا کہ بغل بیچ ہو قسراں عاشق تو قلند رہے نہ ہندو نہ مسلمان

کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر کی اس نظم کا یہ بند الہامی ہے۔ شاعر کی پیغمبرانہ خصوصیات، معلوماتِ عامہ، بصیرت، دور بینی اور پیش گوئی کی اس سے بہتر مثال غالباً دنیا کے کسی لطیف چرمیں میسر نہیں آسکتی۔ اس کو دیکھ کر لاعلمیہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ نظیر ہندوستان کے موجودہ سیاسی تلاطم کو اپنی دور بین نگاہوں سے دیکھ چکے تھے اور اس زمانے کے مذہبی اتحاد کی رہنمائی کے لئے انھوں نے یہ کلیہ وضع کیا تھا۔

برسات کی بہاریں، فصل اور موسم کے متعلق خاص مشرقی مذاق کی نظم ہے اور شاعر کے طبعی ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اس میں جا بجا اپنے وطن کی خصوصیات فائقہ کا تذکرہ ہے۔ اس لئے برسات کی بہاریں، مناظر کی دلچسپیاں، سوسائٹی کے مشاغل، ساری باتیں ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہیں۔ موسم کے تغیر سے روزمرہ کی زندگی میں جو جو واقعات پیش آتے اور تبدیلیاں ہوتی ہیں سب کا سچا حال اور صحیح موقع شاعر نے پیش کیا ہے۔ اس نظم میں، دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بے سود کوشش نہیں کی گئی بلکہ ہندوستان کی برسات کے قطرے قطرے کے دریا ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نظیر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آواز سے صورت کی تخلیق اور ترنم سے کیفیت کی صورت گری کرتے ہیں۔ اس نظم میں یہی التزام کیا گیا ہے۔ اس نوع کی مصوری کے لئے انھوں نے جا بجا ایسے موزوں اور مترنم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ صورت مفہوم کا سچا منظر اور کیفیت متعلقہ کا سچا اثر، باصرے اور سامعے کے لئے پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں سبزوں کی اُلہا ہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھجھاوٹ قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے ہر گھٹات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یاد و برسات کی بہاریں

سبزے کی اُلہا ہٹ، بوندوں کی جھجھاوٹ، ایسی ترکیبیں ہیں جن میں اُلہا ہٹ کے صرف تلفظ سے سبزے کی تازگی، ہلکے دہانی پن اور خفیف جنبش کا سماں بندھ جاتا ہے اور جھجھاوٹ کے خفض ترنم سے بوندوں کے تواتر کی سببی سامعہ نوازی کرنے لگتی ہے۔ اس نظم کے تیسرے اور پانچویں بندوں میں بھی اس قسم کی صنعتیں موجود ہیں۔ برسات

کے لطائف کی ہو ہو مگر سادہ اور غیر مصنوعی تصویر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔
 جنگل سب اپنے تن پر ہر پالی سج رہے ہیں گل پھول بچھاڑوٹے کر اپنی مدح رہے ہیں
 بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 ہندوستانی برسات کی دلفریبیاں اس قیامت کی ہوتی ہیں کہ ان میں مبتلا ہو کر کسی شخص کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہ سکتی۔
 لیکن نظیر کی رمز شناس بصیرت برسات کے مجازی حن میں حقیقی جمال کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ وہ حن مطلق کی
 ناقابل برداشت جلوہ ریزیوں سے متاثر ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں :-

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا اور مور کی زل میں تیرا ہی نام ہے گا
 یہ رنگ سومرے کا جو صبح و شام ہے گا یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

برسات کی بہاروں میں عشاق کے اضطراب اور درد و فرقت کا جہاں تذکرہ ہے وہاں بھی ہندی شاعری
 کی نازک ترین خصوصیت قائم رکھی ہے۔ جنس لطیف کو عاشق قرار دے کر ہجر کی کلفتیں اور مہیا سے دوری کی مصیبتوں
 کا سارا دکھ در بیان کیا ہے۔ وصل سے شاد کام پیا کی پیاریوں اور بے قرار بہمنوں کی قلبی کیفیات کی مصوری
 میں جو خوبی ہے وہ تحریر میں نہیں آ سکتی، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ برسات کا پورا پورا لطف لوٹنے والی بنی سنوری
 رنگین پریوں کی عیش آزمائیاں، شوخ و شنگ طر حلاول کے حسن بے پناہ کا زاہد فریب عالم،ستان شباب اور متوالی ادا والیوں
 کی تو بہ شکن رنگ رلیاں، اگرچہ عشاق کے لئے بجائے خود نہایت مہلک و تباہ کن ہیں لیکن نظیر نے اُن کا نقشہ
 جن پیارے الفاظ میں گھینچا ہے وہ خالص ان کے حصے کی چیز ہے، آہ کہتے ہیں :-

اوجھ صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی گلناریا گللابی یا زرد سرخ دھانی
 کچھ حن کی پہ سڑھائی اور کچھ نئی جوانی بھولوں میں بھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں

اس بند سے پہلا ایک اور بعد کے دو بند بھی اسی ستم کے ہیں، گو شاعرانہ رنگ غالب ہے اور جوانی کی زندانہ بے باکی اپنی جھلک دکھا رہی ہے مگر جس رنگ میں ہیں محاکات کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ برسات کی مصوری کئے میں اس کے اثرات اور لازمی نتائج کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔ امراد غربا کے مکانات کی حالتیں، ان کے طرز معاشرت، سب کا موقعہ بہ موقعہ تذکرہ ہے۔ غرض کہ بیرہوئی، کنسلڈائی، دھتورے، پھنسی، پھوڑا، کچھ بھی ان کی نظر سے نہیں بچتا۔ یہاں تک کہ ظرافت کے لئے برسات میں پھسلنے پھسلانے کا بھی حال موجود ہے۔

نجمارے نامہ ایک حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری اور ناصحانہ نظم ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔

اس کے پوشیدہ مطالب جس قدر عمیق ہیں اس کی ظاہری دلچسپی اُسی قدر نمایاں ہے۔ حقیقی معانی سے قطع نظر کر لیا جائے تو بھی نظم بالذات نہایت لطیف اور مکمل رہتی ہے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ دقیق و عمیق نظم نظیر کے کلام میں نہیں ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ غالباً اس سے زیادہ مقبول بھی ان کی کوئی نظم نہیں ہوئی۔ اول تو اس کی بحر نہایت مترنم اور حسرت و یاس کے خیالات اظہار کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ اس کی روانی و تسلسل سے ایک قسم کا سکون قلب پر طاری ہو جاتا ہے جو فی نفسہ حسرت و یاس کا بڑا معاون ہے۔ دوسرے خیالات اور الفاظ بحر سے اس طرح وابستہ ہیں کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ نظم کسی دوسری بحر میں لکھی جاتی تو اس میں اتنی دلکشی اور جاذبیت پیدا نہ ہوتی اور نہ اس پر اختراع و فائز کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے کہ شاعر نے نجمارے کی خانہ بدوش زندگی سے انسان کی نقش بر آب ہستی کی تمثیل پیدا کی ہے، اظہار خیال اور مرتع کشی کے لئے، الفاظ اتنے موزوں، مناسب، اور چھپے متنب کئے ہیں جن کا جواب ناممکن ہے۔ الفاظ کثرت سے استعمال کرنے، غیر مانوس کو مانوس بنانے، اور مترادف بہم کرنے کا جو کمال نظیر میں بدرجہ اتم ہے، وہ اس نظم سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ اس بند کو دیکھئے :-

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھپ بھی تیری بھاری ہے اسے غافل تجھ سے بھی چتر اک اور بڑا بوباری ہے

کیا شکرِ مصریِ قندگری کیا سانہو بیٹھا کھا رہی ہے کیا داکھ منقا سوٹھ مرج کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہا جو دے گا جب لاد چلے گا نجارہ

عاشق نامہ ایک عارفانہ نظم ہے اور اپنی طرز میں نہایت مکمل ہے۔ اہل تصوف کے اعتقاد و یقین، ہمدست کی تشریح اس سے بہتر غالباً نہیں ہو سکتی۔ ساری نظم اول سے آخر تک نہایت صاف، سادہ و پاکیزہ اور عام فہم الفاظ میں ہے۔ اول تو نظم کا ہر مصرع بیاسختہ ہے لیکن ہر بند کے چوتھے مصرعے میں بیاسختگی اور بلاغت کی انتہا نظر آتی ہے۔ ہر بند بجائے خود اس قدر پر معنی اور مکمل ہے کہ قوتِ انتخاب مجروح ہے۔ لیکن معشر کی ٹیپ کی جو ہر بند میں ڈھرائی جاتی ہے، فصاحت و بلاغت و معنویت سب سے بالاتر ہے۔ بلا حظم ہو:-

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان
نظیر تو دلبر کو ہر آن، ہر بات، ہر ڈھنگ میں پہچان لیتے ہیں لیکن ٹیگور کہتے ہیں:-

”وہ وہاں ہے جہاں کاشتہ کا رخت زمین میں ہل چلا رہا ہے جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے، وہ اُن کے ساتھ دھوپ اور بادشس میں ہے اور اس کا بلبوس خاک میں اٹا ہوا ہے۔ یہ خرقة سالوس اُتار کے پھینک دے اور اسی کی طرح خاک زمین پر اُتر آ“

دوسری جگہ اسی خیال کو ٹیگور نہایت پرسکون و متین الفاظ میں یوں اظہار کرتے ہیں:-
”کیا تم نے اُس کی خاموش آواز قدم نہیں سُنی وہ آتا ہے، آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔
ہر لمحہ اور ہر عمر میں، ہر دن اور ہر رات وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

میں نے بہت سے گیت مختلف کیفیاتِ قلب میں گائے لیکن ان کا لحن ہمیشہ یہی رہا کہ وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

گرم اپریل کے معطر ایام میں، جنگلی کے راستے سے وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔ شہمے جولائی کی بلاں تاریکی میں بادلوں کے گرجنے والے رتھر پر وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

تو ہر الم کی حالت میں اسی کے قدم ہیں جو میرے دل کے اندر گر جاتے ہیں اور اسی کے قدموں کا زیریں

مس ہے جو میری مسرتوں کو درخشاں بنا دیتا ہے ۴

شخصیتوں کا مقابلہ ایک ناپسندیدہ سی کوشش ہے لیکن اتنا بتا دینا نہایت دلچسپ ہو گا کہ ٹیگور کی اس نظم کے ہر خیال کا مترادف عاشق نامے میں مل سکتا ہے۔ دونوں نظموں کو ساتھ پڑھنے سے بہت لطف حاصل ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے محاسن پر خوب روشنی ڈالتی ہیں۔

آدمی نامہ ایک قسم کی فلسفیانہ نظم ہے جس میں انسانی سوسائٹی کے مختلف و متباہن مراتب دکھائے گئے ہیں۔ نظیر چونکہ انسان کے عاشق اور معاشرت کے شہیدانی ہیں اس لئے وہ یہ نظم کہنے پر مجبور ہوئے وہ دیکھتے ہیں کہ ہر متنفذ فطری اعتبار سے اور خدا کے نزدیک بھی ایک ہی سی حیثیت رکھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے ہر شخص برابر اور حیثیت و شان میں یکساں نہ سمجھا جائے۔ اپنے خیال اور سطح نظر کے خلاف، مراتب میں اختلاف اور حیثیات میں فرق دیکھ کر انھیں خاص تعجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی معاشرت اور مسائل کے مختلف پہلو ایک جگہ جمع کر کے دکھلاتے اور اہل بصیرت کی توجہ دنیا کے واقعات کی گونا گونی کی طرف مبذول کرنے کے لئے کہتے ہیں :-

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس دگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زر و دار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ایک شخص کو بادشاہ اور دوسرے کو ٹکڑے چباتا دیکھ کر خداوند عالم کے ناقابل درک و فہم روز کا احساس ہونے لگتا ہے اور مشیت کا لایخل پہلو پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی سادگی، سہستگی اور روانی میں ادب القدا کی سی جھلک پائی جاتی ہے اور نظیر کی میناختہ گوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ نظم اس قدر مسلسل بے تکان اور بے تصنع ہے کہ مصرعوں پر نشر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگر مصرعے کی نشر کرنا چاہیں تو الفاظ کی نشست و

ترتیب بدلنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ میاں نظیر کا سا، یہ کمال سوائے میر انیس کے اساتذہ میں کوئی نہ پیدا کر سکا۔ سعدی نے بھی آدمی نامے کی مثال ایک نظم ”در صنعت حق تعالیٰ“ کر بایں لکھی ہے۔ نظیر اور سعدی دونوں اساتذہ کا موضوع ایک ہی ہے لیکن نظیر نے صنعت حق کو مخصوص کرنے کے لئے آدمی کو اس کا مظہر قرار دے لیا ہے۔ یہ انتخاب بہترین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظیر کی نظم جس قدر بسیط اور جامع ہے سعدی کی اتنی نہیں سعدی فرماتے ہیں :-

کے پاسان ویکے بادشاہ یکے دادخواہ ویکے تاج خواہ
کے باجدار ویکے تاجدار یکے سرفراز ویکے خاکسار
کے بے لڑا ویکے مالدار یکے نامراد ویکے کامگار

آدمی نامہ جیسی بنجیدہ نظم میں کہیں کہیں ظرافت کا جھٹپان بھی موجود ہے اور کیوں نہ ہو شاعر کا فطری چلبلا پن کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔ ایک جملہ کہتے ہیں :-

اور آدمی ہی ان کی جرات ہے جوتیاں

نظیر عید گاہ یا جامع مسجد میں نماز پڑھنے کو گئے ہوں گے بھوتہ لامحالہ دروازے پر اتار دیا ہوگا۔ کوئی صاحب موقع دیکھ کر اٹھالے گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو اور یہ اس وقت دیکھ رہے ہوں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال اور آدمی ہی مارے ہے بھانسی گلے میں ڈال
اس شعر کا کسی قدر تاریخ سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ نظیر کے زمانے میں پنڈاریوں کی رہزنی شباب پر تھی۔ اُن کی دست برد سے مسافروں کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی تھیں۔ یہ لوگ دھوکا دے کر مسافر کو لگا لاتے تھے اور موقع پا کر گلے میں رومال ڈال کر بھانسی دیتے اور ختم زدن میں مار ڈالتے تھے۔ اس کا مال دا اسباب آپس میں بانٹ کر صرف میں لاتے تھے۔ اس شعر میں غالباً اس طرف اشارہ ہے۔

ہنس نامہ ایک مشہور حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری ہے۔ اس میں دو نصیحتیں پہلو بہ پہلو کی گئی ہیں۔ پہلی اور بالکل نمایاں تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی عارضی ہے جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو تنہا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا خواہ کیسا ہی ہمدرد اور رفیق ہو ساتھ نہیں دیتا۔ دوسری سطح سے کسی قدر نیچی یہ ہے کہ محبت سے اس قدر مغلوب نہ ہونا چاہئے کہ اپنی حقیقت اور ماہیت نظروں سے پوشیدہ ہو جائے قبل اس کے کہ تجربہ نا اہل ثابت کرے ہیں خود اپنی طاقت کا اندازہ کر لینا چاہئے۔ اب ہنس نامے کی داخلی شعریت کو لیجئے۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو ناصحانہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور دوسرا حاکمانہ۔ نظم میں حکایت یہ ہے کہ ایک ہنس نے کسی شہر سے آکر ایک پیڑ کی کسی شاخ پر اپنا گھر بنالیا۔ اس شجر پر رہنے والے جتنے پرند تھے، سب کو چند روز میں اس سے کمال محبت ہو گئی۔ آخر کار ہنس کے وطن جانے کا دن آیا۔ پہلے تو پرندوں نے اس بات کو باور کرنا نہ چاہا لیکن جب یقین ہو گیا کہ یہ کسی طرح نہیں رُک سکتا، تو اس کی محبت نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہر ایک اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق اس کے ساتھ اڑا۔ آخر کو سب نے تھک تھک کر پلٹنا شروع کیا اور ہنس اکیلا ہی سدھارا۔ اس نظم کی ایک بہت بڑی ظاہری خوبی یہ ہے کہ بطور کے نام اس میں کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک مقام پر اتنے نام اردو میں غالباً کہیں نہ ملیں گے۔ اس سے شاعر کی عام واقفیت اور زبان دانی کا کمال ثابت ہوتا ہے۔ مزید معنوی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف اقسام کے پرندوں سے مختلف قسم، خیال، مزاج، ہدیت اور طبع کے انسان مراد ہیں۔ ہر طائر کی حیثیت و اہلیت کے مطابق اس کے ساتھ اوصاف منسوب کئے گئے ہیں۔ وہ جس خدمت کی صلاحیت رکھتا ہے وہی اُس سے وابستہ کی گئی ہے۔ مثلاً بلبل چونکہ چھوٹی چڑیا اور بہار کی منفیہ ہے اس لئے اس کے سپرد گانے کا کام ہے۔ کوکے اور کوئل کے دل میں ہنس کی محبت دکھائی ہے اس لئے کہ یہ ہمیشہ سے ناکام اور ازل سے اہل درد ہیں۔ کھنجر اور کنگا چونکہ بڑے جتنے کے پرند ہیں اس لئے وہ جنگ بجانے پر مامور ہیں۔ سیرخ ایک عالی حوصلہ اور پُر اشتیاق پرند ہے، اس کی عظمت اس طرح

تائیم رکھی ہے کہ وہ ملنے کا شائق ہوا۔ گڑھ پسند چونکہ قومی گرا دنیٰ طبقے کا پرند ہے اس لئے اُسے پنکھا جھلنے کا کام دیا گیا ہے۔ غرض جس طائر کی حیثیت اور بچنے کے موافق جو خدمت تھی وہ اسے سپرد کی گئی ہے۔ آٹھویں اور نویں بندوں میں پیڑ کی پُر امن و سکون شاخوں پر خرم زندگی کا مرقع پیش کیا ہے۔ لیکن دسویں اور گیارہویں بندوں میں لطف و طمانیت نازل ہوتے دیکھ کر دل پر رقت و یاس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس وقت انسان مرنے لگتا ہے اور اس کو اپنے اقربا سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو اسی قسم کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ کسی سے تقصیر کھل کر آتا ہے، کسی سے رخصت ہوتا ہے اور کسی کو وصیت کرتا ہے۔ غرض کہ عجب پُر حسرت سماں ہوتا ہے، جس کے خیال سے جی تھرتاتا ہے۔ وہی کیفیت اس وقت ہنس کی دکھائی ہے۔ اس کے بعد پرندوں کا اضطراب دکھایا ہے اور یہ وہی کیفیت ہے جو انسان کے مرجانے کے بعد ہوتی ہے آخر کے باغچے بندوں میں پرندوں کی در ماندگی اور بچاریگی جو انسانی عاجزی کی مترادف ہے دکھائی ہے۔ آخر کے بند میں ساری نظم کا ماحصل ہے۔ فرماتے ہیں :-

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ جب شکل یہ ہو دے تو بھلا کیونکہ ہو نر باہ
ناچاری ہو جس جا تو وہاں کیجئے کیا چاہ سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھ تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدا راہ

روضۂ تاج گنج چونکہ عمارت کے متعلق ہے اس لئے اس کو مصورانہ نظم کہہ سکتے ہیں۔ نظم کا لہجہ و مصافحہ ہے۔ اس میں لوکل کلریا مقامی رنگ اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نظم شاعرانہ مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔ کہیں شاعرانہ مبالغہ یا تعلی سے کام نہیں لیا گیا۔ عمارت اور چین کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ اس سادہ بیانی اور سادگی میں ایسی دلکشی ہے کہ ہزار رنگ آمیزیاں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ کلس کے ہلال کی سادہ اور فطری تعریف اس سے بہتر الفاظ میں ناممکن ہے۔ کہتے ہیں :-

اور وہ کلس جو ہے سر گنبد پہ سر بلند ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند

ہمراہ جس کے غم پر مہ نوشتار ہے

اس کے بعد کے بند کی لطافت بار بار پڑھنے سے اور زیادہ برہمیتی اور دوبا لاہوتی ہے۔ آگے چل کر عمارت کی صنایعیاں الفاظ میں منتقل کی ہیں اور محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے کہ سنگ تراشی کے نازک ترین نمونے اور کامل ترین صنعتیں کا غنڈہ دکھائی ہیں۔ دیکھئے :-

ہیں بیچ میں مکان کے وہ دو مرتدیں جویاں گردان کے جالی اور حجر ہے درخشاں
سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں پتے نکلی سہاگ رگ و رنگ ہے عیاں

جولفتش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے

آخری سے پہلے دو بند باغ کی تعریف میں ہیں جن کو پڑھنے سے غیر معمولی شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور طبیعت نہایت تروتازہ ہو جاتی ہے۔ کسل و انقباض کے لحوں میں اس نظم سے بہتر رفیق کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمام تکرار اور اداسی آن واحد میں فرو ہو جاتی ہے۔ میر سے نزدیک شعر کا یہ بہترین فریضہ ہے اور اسی کا نام شاعری کا کمال ہے۔

تندرستی نامہ ایک اعلیٰ درجے کی ناصحانہ نظم ہے جس کی ابتدا و اعطاف انداز میں ہوتی ہے۔ اس میں اول سے آخر تک یہ جتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں آبرو اور تندرستی دونوں بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ آگے چل کر اسی خیال کو وسیع کیا ہے جا بجا اسی کی تشبیح کی ہے اور مختلف مثالیں دے دیکر سمجھایا ہے۔ زبان کے اعتبار سے یہ نظم نہایت صاف ہے۔ البتہ کہیں کہیں متروک الفاظ کا استعمال ہے۔ دیکھئے یہ بند حقیقت کا کیسا سچا مرتق ہے :-

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں ہمارے کہنے اور نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں بنے ٹھنے

بہتر ہیں مفلسی کے میاں چاہے بنے چنے جو تندرست ہیں وہی دوٹو ہیں اور بنے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخنِ درت

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اس بند کی معنویت و صداقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ علالت میں کوئی چیز بھلی نہیں معلوم ہوتی اور تندرستی میں اگر سرد پانی بھی پیو تو شیر و شہد کا مزہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی سا حقیقت شناس حکیم تندرستی کو لوازم حیات میں نہایت ضروری سمجھتا ہے:-

اے خالق ہر بلند و پستی شش چیز عطا کن زہستی
علم و عمل و فراخ دستی ایمان و امان و تندرستی

ذکر مرغان ایک پر مرصوفیہ نظم اور اردو میں بالکل نئی چیز ہے۔ یہاں نظیر نے اپنے مجہد اور خلاق ہونے کا ثبوت دیا ہے اور شاعرانہ و مغنیانہ آرٹ کا پورا پورا کمال دکھایا ہے۔ وہ ہر شام و سحر، طیور اور حشرات الارض کی آوازوں میں نغمہ و وحدانیت سُنتے اور اُسے صوتِ سرمدی کی آواز باز گشت سمجھ کر اس پر وجد کرتے ہیں۔ حافظؔ نے اپنی ہستی کو طائر کی مغنیانہ حیات کا مترادف قرار دے کر کہا ہے:-

در پس آئینہ طوطی صنعتِ داشتہ اند انجہ اُستاد ازل گفت ہماں می گویم
حافظؔ کا خیال ہے کہ خدا جو کچھ مجھ سے کہواتا ہے میں چڑیوں کی طرح کہتا ہوں، لیکن نظیر اپنی دردناک خموشی کو محسوس کر کے چڑیوں کی حالت پر رشک اور اپنی غفلت پر افسوس اور ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

کس کس کا لون نام غرض ہیں جتنے طائر خود گویم کوئی کہے یا حئی تو انا کوئی کہے یارب قدیر
طائر تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں ہیں ایسا سیر ہم سا غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہو گا آہ نظیر

ساجد سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں

چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

غالباً اسی قسم کے کسی جذبے نے ٹیگور کے دل میں یہ صورت اختیار کر لی ہے جس کا اظہار اس طور پر ہوا ہے:-

”جب تو مجھے گانے کا حکم دیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا قلب، اس لطف پر سسٹن کی سمانی اپنے دل میں نہ پا کر، غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، میں تیری صورت دیکھتا ہوں اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔“

جو کچھ میری زندگی میں سخت و کڑخت ہے، ایک شیریں نغمہ واحد کی صورت میں رقیق ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے اور میری پرستش اس سرور طائر کی طرح جو سطح سمندر پر اڑ رہا ہو اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں تو میرے گانے میں دلچسپی لیتا ہے، میں جانتا ہوں کہ صرف ایک مغنی کی حیثیت سے میں تیرے حضور میں آتا ہوں۔

میں اپنے وسیع البسط بازوئے نغمہ کے کنارے سے تیرے قدموں کو چھو لیتا ہوں، جن تک پہنچنے کا حوصلہ میں کبھی نہیں کر سکتا تھا،
سہرت سرود سے سرشار ہو کر میں اپنے تئیں بھول جاتا ہوں اور تجھے اپنا دوست کہتا ہوں حالانکہ تو میرا ملک و آقا ہے۔“

ذکر مرغان میں معنوی محاسن کے علاوہ لفظی و شعری صنائع بھی ہیں۔ ایلیٹریشن دینی ایک حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کا بالالتزام ایک مصرع میں آنا، کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ نظم کو ذرا لحن کے ساتھ پڑھنے سے نہایت خوش گواری ترنم پیدا ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چڑیاں چہاڑ ہی ہیں۔
فتا نامہ ایک عبرت مندانہ نظم ہے۔ میاں نظیر کو جو دلچسپی تاریخ سے تھی وہ اس نظم سے صاف ظاہر ہے۔ پوری نظم اول سے آخر تک عبرت کا ایک بسیط اور مجرد سبق ہے۔ اہل بصیرت کے لئے اس سے زیادہ سامان بند و نصیحت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان نہایت صاف ہے لیکن خال خال تدویم اصطلاحوں کا استعمال ہے جو اس وقت غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا استعمال ناگزیر تھا۔ مثالوں اور تشبیہوں میں ہندو مسلم جذبات کا توازن قائم رکھا ہے۔ پوری نظم سنجیدہ خیالات عبرت آموز واقعات اور سوؤند

پند و نصائح کا ایک پر معنی چمن ہے، جس میں عبرت کے پھول جا بجا کھلے ہوئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ حوادث اور تغیرات عالم کا اس سے بہتر اور موثر الفاظ میں تجزیہ بہت دشوار بلکہ محال ہے۔ دیکھئے یہ بند کیسے کیسے ابو العزم راجاؤں اور عالی نسب فرماں رواؤں کے قدیم واقعات یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اب صرف نام ہی نام دنیا میں باقی رہ گیا ہے:-

یاراج بنی ہو کر دنیا میں راج پایا چوڑا گر لکھ ستارا کا لہجہ آسنایا
جب توپ نے اجل کی امور چم لگایا سب اڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گلدھ، کوٹ، توپ، گولہ، سنڈر ہوا تو بھر کیا

طفلی کے عزائم سے جو نظم ہے وہ نہایت پاکیزہ، سادہ اور نظری جذبات سے لبریز ہے۔ ہندوستانی شعرا میں ایسے بہت کم ہیں جنہوں نے جوانی کے علاوہ اور کسی حصہ عمر پر نظر ڈالی ہو اور سوائے عاشقانہ جذبات محبت کے اور اصناف محبت سے بھی متاثر ہوئے ہوں۔ ہاں نظیر کی ہمہ گیری نے ان پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ طفلی میں ہندوستانی نقطہ نظر بھی موجود ہے اور دوسرے مالک کے بچوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ہندوستانی بچوں کی معاشرت، اُن کے ناز و نعم سے پرورش کئے جانے کے حالات، اور بچوں کے متعلق والدین کے جذبات کا صحیح نقشہ اس میں موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بچپن نکل جانے کے بعد جب دنیا کے آلام و مصائب انسان کو گھیرتے ہیں تو طفلی کی بے فکریاں اس کو یاد آتی ہیں اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے:-

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اس نظم کی زبان بہت صاف ہے لیکن کہیں کہیں متروک الفاظ جیسے 'ووں، گھرنا، اونٹے، وغیرہ' کا استعمال ہے۔ دیکھئے بچوں کی بے تعین زندگی اور طمانیت نفس کا کیا سچا مرقع ہے:-

جوان کو دوسو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا

جس جا پہنند آئی پھر وداں ہے ان کو سنا
 بردانہ کچھ پلنگ کی نے چاہے بچھونا
 بھونپو کوئی بجالے پھر کی کوئی بچالے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 اس محبت بھری نظم کا جو ہر صاحبِ اولاد کے نازک ترین حیات کو برا نگینہ کرتی ہے اس سے
 بہتر کیا خاتمہ ہو سکتا ہے :-

جیتے رہیں سمجھوں کے اس فہمِ اولے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 جوانی عاشقانہ و جوانہ نظم ہے اور زندانِ لہجہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم جوانی دیوانی کی کرشمہ سازیوں سے
 سہرا تیار ہے اور اس میں انسانی فطرت کے خلاف ایک حرف نہیں بتایا جاسکتا۔ اس نظم میں شباب
 کی بے لگام عیش آرائیوں اور بے حجاب لطف اندوزیوں کا منظر تو پیش نظر کیا ہی گیا ہے لیکن بیان کی
 بیباختگی و بے باکی نے اس نظم میں ایک خاص کیفیت اور لطف مکرر پیدا کر دیا ہے۔ انداز بیان میں اگر ثقاہت یا
 سنجیدگی سے کام لیا جاتا تو عنوان کی پوری پوری داد دی جاسکتی تھی۔ فطری جذبات کی فطری داد اور صرف فطری
 شاعر ہی دے سکتا ہے اور صرف وہی فطری لطف برا نگینہ کر سکتی ہے۔ جوانی وہ عمر ہے جس میں انسان اندھا
 ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ نہ کر بیٹھے تھوڑا ہے شباب کی کار فرمایاں کہاں تک گونوائی جائیں، ہر شخص اپنے
 دل سے پوچھ لے کیا حالت ہے :-

لڑتی ہے کہیں آنکھ کہیں دست کہیں سین
 چھوٹا ہے کہیں پیار کسی سے ہیں لگے نین
 وعدہ کہیں اقرار کہیں سین کہیں نین
 نے جی کو فدا رخت ہے نہ آنکھوں کے تین چین
 اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
 عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

یہ نظم حقیقت میں کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ ہر بات اس قدر صاف ہے کہ کسی تشریح اور وضاحت کی حاجت باقی نہیں رہ گئی۔ آرٹ اگر عربی کا نام ہے تو یہ نظم اُس کا بہترین مظاہرہ ہے۔

بڑھاپے کی نظم بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ آزمودگی، خوش طبعی، ظرافت، زندگی تو ایسے اجزاء ہیں جو سطح پر نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ساری نظم عبرت کا نہایت پُر تاسف و درد انگیز مرقع ہے۔ جوانی میں جو باتیں جزد و فطرت اور طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہیں وہ پیری میں بہ شکل چھوٹ سکتی ہیں لیکن زمانہ ان کو جائز نہیں رکھتا اور عمر ان کی اجازت نہیں دیتی۔ بڑھاپے کی تکلیفیں خود ہی کیا کم ہوتی ہیں۔ اس پر یہ اور ستم ہے کہ مشاغلِ لطف و مسرت سے بھی ہاتھ اٹھالینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ دست کش ہونا نہ ہونا تو اپنے ہاتھ کی بات ہے لیکن اس وقت تو یہ مجبوری آپڑتی ہے کہ عیش و مسرت خود بڑھے کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ وہ تو لاکھ چاہتا ہے کہ جو انانہ افعال اس سے سرزد ہوں لیکن دیکھنے والے ان کا اعتراف نہیں کرتے۔ اعتراف کی بجائے ان کا تو یہ حال ہے کہ:-

نقلیں کوئی ان پو پے ہونٹوں کی بناوے چل کر کوئی کپڑے کی طرح قد کو جھکاوے
ڈاڑھی کے کئے انگلی کو لالا کے پیاوے یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھاوے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ع- عشق جو کرتا ہے سُنتے ہیں جوان مر جائے ہے، لیکن اگر کوئی عاشق بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس غریب کو جیتے جی موت آجاتی ہے۔ تو مٹی ضرور بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر دل جوان رہتا ہے۔ اس کی وہی حالت رہتی ہے مگر حالات بدل جاتے ہیں۔ پس اس کو جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں اسی کا دل خوب جانتا ہے، سچ ہے

حُسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست

تفصیل کی یہ نظم نہایت مشہور و مقبول ہے اور آرٹ کے اعتبار سے ممتاز ہی نہیں بلکہ اختراع فائقہ سمجھی جاتی ہے۔ شہباز لکھتے ہیں کہ یورپ میں خصوصاً بہت مقبول و دلپسند ہے۔ ڈاکٹر فیلین بھی اس کے بڑے مداح ہیں۔

فقیروں کی صدرا ایک ناصحانہ نظم ہے جس کا لہجہ قلندرانہ ہے۔ نظم کا مخاطب بوڑھوں سے ہے اور مضمون مختصر طور پر یہ ہے کہ اب زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں ہر لمحہ موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ دنیا کے جس قدر تعلقات ہیں ان کو ختم کر دو اور عقیدے کی فکر میں لگو۔ نظم کو پڑھ کر حسرت و یاس کے جذبات کا ہجوم ہوتا ہے اور دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ زندگی کا اختتام اور موت کا قرب کچھ ایسے بڑا اثر، مناسب حال، اور موزوں الفاظ میں بیان کیا ہے جس سے بے بسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں :-

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چنتی ہے جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھنٹی ہے
تم گھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنٹی ہے اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بنتی ہے

تن سوکھا کپڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھر بابا
اب موت نقارہ بلج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اس نظم میں ایک اور خاص لطف یہ ہے کہ موت کے قرب کے علامات بیان کئے ہیں اور وہ خون نبین کی مشہور تشبیہ تصدیقاً ”پلگرس پروگریس“ کے بعض مقامات سے ملتے جلتے ہیں جن حضرات نے اس کتاب کو پڑھا ہے وہ سمجھ لیں گے کہ کچھین اور اس کی زوجہ کے علامات مرگ ذیل کے بند سے کس قدر یگانگت رکھتے ہیں :-

سر کا نیا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا بلکیں آن جھکیں قد ٹیڑھا کان بھٹے بھرے در آنکھیں بھی مجھ پیائے گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گئی دل سست ہوا آواز نہیں جو ہوئی تھی وہ ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
تن سوکھا کپڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھر بابا

اب موت نقارہ بانچکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب شاعر کی جمعیت خاطر اور طمانیت نفس دیکھئے۔ ایسی نازک حالت اور ایسے پُر آشوب وقت میں اعمال صالح اور اخلاق حسنہ کی تلقین کرتا ہے۔ انہماک خیال کے لئے اس نظم میں سفر سے استعارہ کیا ہے اور اول سے آخر تک اسی خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ اب زندہ دلی ملاحظہ فرمائیے۔ ایسی خشک اور سنجیدہ نظم میں بھی ظرافت سے باز نہیں رہتے۔ چھٹا بندر ملاحظہ کر لیجئے:-

خوشامد ایک تجربہ کار نہ نظم ہے جس سے نظیر کی عالی ظرفی اور پختہ خیالی کا ثبوت ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سلیجی ہوئی طبیعت پانی تھی اور بڑے دور میں واکل اندیش تھے۔ ان سب محاسن کی اس نظم سے بالواسطہ تلقین بھی ہوتی ہے۔ خوشامد سے یہ مطلب نہیں کہ آدمی کمینوں کی طرح مبتذل خوشامد کرے اور اپنے کو اس قدر گرا دے کہ خود داری پر حرف آجائے۔ اس کا نشانہ یہ ہے کہ دنیا میں عموماً نیک بڑاؤ اور اس طرح کا عمل کرے جس سے نہ کسی کا دل دکھے نہ کسی کو آزار پہنچے۔ دوسرے لفظوں میں صلح کل اور منکسر مزاج رہنے اور غرور و تکبر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خوش خلق اور بھلا کر ملنے والے کی سوسائٹی بڑی عزت کرتی ہے:-

آہٹا ہے جو خوشامد سے سروکار اُسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں الفت کے خریدار اُسے

آشنا ملتے ہیں اور چاہے ہیں سب یا اُسے اپنے بیگانے غرض کرتے ہیں سب پیار اُسے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

بچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

لغت

کلجاک ایک واعظانہ نظم ہے جس کا لہجہ قلندرانہ اور بیان فقیرانہ ہے جو نفس مضمون سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ یہ نظم بہت پر اثر اس لئے ہے کہ اس کی ہر نصیحت آزمودہ کاری پر مبنی ہے۔ اس کو پڑھ کر بُرے سے برا اور سخت سے سخت دل ظالم بھی ایک غرتہ تھرا اٹھتا ہے اور اپنے افعال قبیحہ کا نتیجہ بد اپنی آنکھوں کے

سامنے پھرتا دیکھنے لگتا ہے جس شاعر نے نظیر کی طرح تقریباً ایک صدی دنیا میں رہ کر اس کے نشیب و فراز کو دیکھا اور باہمی تعلقات کو برتا ہوا وہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ دنیا جائے مکافات ہے۔ اس میں جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنسیاں کی ساتھ لے نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے اس نظم کی بہت بڑی اور بڑی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں افعال کا توازن نمایاں کیا ہے۔ یعنی یہ کہ جس قسم کی نیکی کرو گے اسی قسم کا معاوضہ ملے گا۔ جس انداز کی بُرائی پر کمزور باندھو گے اسی طرز کا بدلہ سنا پڑے گا۔ میوہ کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے اظہار خیال اور نیک و بد افعال کی مصوری کے لئے جیسے مناسب جملے تلاش کئے ہیں وہ بجائے خود قابلِ داد اور کانٹے کے تلے ہوئے ہیں۔ ہر ٹکڑا اپنے مقام پر شاعر کی تلاش اور قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔ بحر ایسی ہے جس کا ترنم مغنیِ فطرت نے خاص اسی نظم کے لئے خلق کیا ہے۔

کانٹا کسی کے مت لگا کر مثل گل پھولا ہے تو وہ تیرے گلی میں زہر ہے کس بات پر پھولا ہے تو مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھاس کا پولا ہے تو سُن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر پھولا ہے تو کھجک نہیں کر جگ ہے یہ یاں ن کو دے در رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس بات لے

نظیر کے ناصحانہ کلام میں، یہ نظم میرے نزدیک ہر اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے۔ اس کے بیش قیمت نصلح اس قابل ہیں کہ ہم انہیں اپنے بچوں کے نصابِ تعلیم میں داخل کریں تاکہ انہیں خوش اخلاقی اور نیک کرداری کی تلقین ہو اور وہ آئندہ زندگی میں دنیا کے انقلابات اور عالم کے تغیرات سے ڈرتے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کی سزا و جزا کی تشریح اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ لقمان نے جو نصیحت اپنے عارضی آقا کو کرنے کے لئے مدت تک موقعے کا انتظار کیا وہ نصیحت نظیر ان سادہ الفاظ میں کرتے ہیں۔

زبان کی سادگی اور عام فہمی کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ سنئے :-

ہواور کھیل دیوے گا وہ بھی سد اچھل پاوے گا گیہوں سے گیہوں جو سے جو چانول سے چانول پاوے گا
جو کج دیوے گا یہاں دیا وہ کل داں پاوے گا کل دیوے گا کل پاوے گا کپاوے گا کپاوے گا
کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

مغسلی مصورانہ نظم ہے لیکن موضوع مصوری چونکہ دلچسپ نہیں اس لئے نظم میں کوئی خاص لطافت و
بافزیت پیدا نہیں ہوئی۔ نظیر کے کلام میں یہ ایک معمولی سی نظم ہے۔ اس میں کوئی خاص حسن شعری نہیں۔ نہ
تخیل کا عمق ہے نہ الفاظ کی رچھن مگر سادہ الفاظ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ واقعات کا بالکل بجا عکس ہے۔ یہ امر
سلم ہے کہ ہر چیز کا صحیح اندازہ تجربے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو بہت سے لوگ
مجھ ہی نہیں سکتے اس لئے کہ وہ کبھی اُن کے تجربے میں نہیں آئیں۔ مثلاً ایک دولتمند جو ہمیشہ عیش و عشرت میں
بہر کرتا رہا ہے عسرت اور مغسلی کی تکالیف سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتا۔ میاں نظیر نے اس موقع پر کتنا
حاضر پایا ہے :-

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مغسلی کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مغسلی
پیا سا تمام روز بھٹاتی ہے مغسلی بھوکا تمام رات سلاتی ہے مغسلی

یہ دیکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مغسلی

دلچسپ عنوان اور رنگین موضوع پر لکھ کر نظم کو مقبول اور دلچسپ بنا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ دوسرے
جے کے شرا بھی ایسا کر لیتے ہیں، لیکن خشک مضامین میں شریعت پیدا کرنا طبقہ اول کے اساتذہ
کام ہے۔ اس قسم کی نظموں سے میاں نظیر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر چند وہ مغسلی نہ تھے بلکہ برعکس
سکے نہایت فارغ البالی اور بے نگرہی سے بہر کرتے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے مغسلی کی حالت اس

خوبی سے لکھی ہے گویا خود اُن پر یہ حالت گر چکی ہے۔ اس نوع کی مصوری شیکسپیر کی خصوصیت کبرئی سمجھی جاتی ہے لیکن نظیر میں بھی کمال کے ساتھ موجود ہے۔ یہ کہنا کہ یہ نظم بیاختہ اور بے تصنع ہے نظیر کے لئے کوئی تائید نہیں لیکن اس کے علاوہ اس نظم کے اور بھی محاسن ہیں اور وہ مجلایہ ہیں کہ باوجود طویل ہونے کے اس میں بدمزگی یا توارد نہیں ہے۔ ہر جگہ ایک نیا خیال نظم کیا گیا ہے اور جو خیال جس موقع پر ہے اس کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ زبان بہت صاف ہے اور متر و کات کا استعمال شاذ ہے۔ یوں تو مفلس کی محبوریوں ہر جگہ نہایت افسوس ناک ہیں لیکن یہ بند کس قدر دل شکن اور پردرد ہے۔ اس کے علاوہ انسانی فطرت کا کیا حقیقی اور غائر مطالعہ ہے:-

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کو آن کو سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو جو رمی پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دہیان کو
آخوندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

معجزہ حضرت علی علیہ السلام ایک عقیدت مندانه نظم ہے اور اس کا اختتام پاس مندانہ الفاظ میں ہے۔ اس معجزے کی واقعیت کا کوئی بہتہ نہیں چلتا، اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ معجزہ واقعی ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظیر تک اس کی اطلاع کیونکر پہنچی اور راوی کس حد تک معتبر ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ معجزے کا واقعہ نظیر کی خیال آرائی کا ثمرہ ہے۔ لیکن جس ذات سے یہ معجزہ منسوب کیا جاتا ہے اس سے ایسے ایسے بے شمار معجزے ظہور میں آئے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نظیر کا خیال بے بنیاد یا خلاف عادت واقعے کی طرف رجوع ہوا۔ بہر حال ہمیں اس سے بحث بھی نہ ہونی چاہئے، کیونکہ یہ کام وقائع نگاروں اور مورخوں کا ہے۔ ہمیں تو صرف شاعرانہ اعتبار سے نظم پر نگاہ ڈالنی ہے۔ معجزے کی ابتدا بالکل اس طرح ہوتی ہے جس طرح کوئی شخص بیٹھا ایک جماعت کے سامنے کچھ بیان کر رہا ہے۔ کسی واقعے یا قصے کے شروع کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے:-

سُنئے ہوا سَعلی کے مَجان دُستدار
 اک مَجرہ میں کُتا ہوں اس شہ کا آشکار
 ہے تازہ واردات بہ از نقلِ روزگار
 تھا کوئی سَکُفِ دولتِ جَنمت میں نامدار
 اک روز وہ گیا تھا کہیں کھیلنے شکار

دوسرے بند میں شیر اور شیرنی کے مسکن کا نقشہ ہے۔ تیسرا بند اس قدر پُراثر ہے کہ بے اختیار جی بھر آتا ہے۔ اول کے دو مصرعوں سے شیرنی کی بے فکری اور مسرت کا اظہار ہوتا ہے اور آخر کے تین مصرعوں سے غم کی پوری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آخر کا مصرع خصوصاً نہایت پُر درد ہے۔ بہائم کے بچے حالانکہ جنگل میں اکیلے رہتے ہی ہیں، ان کا ماں باپ سے چھوٹ جانا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن شاعر کے اندازِ بیان نے منظر کو اس قدر پُر درد بنا دیا ہے کہ یہ سُن کر کہ بچے جنگل میں اکیلے رہ گئے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ جب شیر اور شیرنی باحالت تباہ واپس آئے اور دونوں بچے گھر میں نہ دیکھے تو شیر سے ضبط نہ ہو سکا، اور وہ غش کھا کے گر پڑا۔ لیکن شیرنی نے جو قصد کیا اس سے بڑی عالی ہمتی کا ثبوت ملتا ہے۔ مادرانہ محبت کی فوقیت اور نسا ئیانہ ضبط و تحمل کی برتری اس طرح دکھائی ہے:-

وہ شیر کھا کے غش گرا اک بار کر کے آہ اور شیرنی نے لی نجف اشرف کی داس سے راہ

سرمیٹتی چلی وہ بیاباں سے سو گوار
 آگے چل کر شیرنی کی مصیبت اور نیکی کی تصویر جن پر درو الفاظ میں کھینچی ہے وہ آپ اپنی مثال اور دل ہلا دینے والی چیز ہے۔ شیرنی کے دفعۃً بازارِ نجف میں پھونچ جانے سے وہاں کے باشندوں میں جو ہلکے بڑا اس کے بیان میں خوف و انتشار کے محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ روضۃ النور پر پھونپنے کے بعد شیرنی کی حالت کا مرقع، مصوری کی تکمیل اور جذبات نگاری کی انتہا ہے۔ شیرنیوں کا شیرنی کی حالت زار پر رحم کھا کر جناب مقدس میں عرض کرنا اور وہاں سے جواب ملنا، بچے لیجانے والے بادشاہ کو تنبیہ ہونا اور اس کا خوف سے تھرا کر بچے روانہ کرنا، بچوں کا نجف میں آنا، ماں سے ملنا اور شیرنی

کا اظہار سیاس و احسانمندی، یہ تمام واقعات اس خوبی کے ساتھ بیان کئے ہیں جن کا لطف بار بار پڑھ کر دل ہی خوب محسوس کر سکتا ہے۔ بہر حال اس نظم کا کوئی بند کیفیت سے خالی نہیں۔ پوری نظم ادب اور آرٹ کی ایک اختراع فائقہ ہے۔ ایک مذہبی نظم کو جس کا تعلق محض ایک فرقے کے عقیدت میں دانہ حیات سے ہو اس قدر دلچسپ، عام پسند اور مکمل بنا دینا صرف نظیر ہی کا کام تھا۔ جس شخص کا اخلاق، ظرف اور استغنا اس حد تک بڑھا ہوا ہو کہ وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے صاحبِ جوہر و سخا کی بارگاہِ کرم سے صرف اکبر و کا طالب ہو وہی ایسی بلند پایہ نظمیں لکھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر و دنیا کی نعمتوں میں سب سے زیادہ سربلند ہے اور اس کی طلب سے نظیر کے نفسیات کی پاکیزگی اور علو کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس شخص کا دماغ نشوونما کے ایسے اعلیٰ نقطے پر پہنچ چکا ہو اس کی زبان سے کیونکر کوئی معمولی شعر نکل سکتا ہے۔

دو الی ایک واقعاتی نظم ہے جس میں زندان خیالات کی اول سے آخر تک بھر مار ہے۔ اس نظم میں معاملہ بندی کی پوری داد دی گئی ہے اور دو الی کے معاشرتی پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ دلچسپ اور رنگین باتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دو الی کا تیوہار ہندوستان کی خصوصیات میں سے ہے اور اپنے اندر بڑی جاذبیت اور لطافت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ نظیر نے اس کے زیر پہلو کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور محض مبتذل اور سیاہ رخ پر نظر ڈالی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرت کا زیادہ تعلق انہی باتوں سے دیکھ کر انہی پر زیادہ زور دینے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں اس لطیف تیوہار کی بُرائیوں کی جانب توجہ دلا کر ان کی اصلاح کرنا مد نظر ہے۔ اس طرح اس نظم میں اخلاقی خوبیاں تو پنہاں ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ جگہ جگہ بندش سُست اور مصرعے کمزور ہیں۔ صحت لفظی کی بھی کہیں کہیں کمی نظر آتی ہے۔ متروکات کا استعمال بھی ہے۔ بہر حال دو الی پر جیسی دلچسپ اور مکمل نظم نظیر لکھ سکتے تھے یہ اس قسم کی نہیں۔ ہاں آخر میں نظیر نے اپنے رنگ کی خصوصیت قائم رکھی ہے۔ جو اریوں کی بُرائیاں دکھا کر ان کا فطری رجم و جوش میں آتا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کہیں میری باتوں سے ان کا

دل نہ دکھا ہو۔ اس ڈر سے فوراً ان کی اشک ثنوی کرنے کے لئے وہ اپنے کو بھی اُن کے زمرے میں شامل کر کے کہہ اُٹھتے ہیں :-

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانو یا رو نصیحتیں ہیں انہیں دل سے مانو یا رو
جہاں کو جاؤ یہ قسم بکھاؤ یا رو جو جواری ہو نہ بُرا اس کا مانو یا رو

نظیر آپ بھی ہے جو اریا دوالی کا

حضرت سلیم چشتی ایک پاس مندانہ نظم ہے اور اپنی نوعیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ ایک ایسے شاعر کے قلم سے جن کا مذہب شیعہ ہو ایسی نظم کا ٹھکانا بہ ظاہر تعجب انگیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاعر وہی ہے جو حسن کو حسن سمجھ کر دیکھے اور مذہب کا صحیح احساں رکھتا ہو۔ مذہب کبھی کسی بزرگ سے سوئے ظن رکھنا نہیں سکھاتا، محبت اور عقیدت کی تعلیم دیتا اور احترام کی تلقین کرتا ہے۔ مذہب تعصب کو خصوصاً بُرا سمجھتا ہے اور شاعر کے لئے تو یہ سم قاتل ہے۔ جہاں تعصب نے در اندازی شروع کی وہیں طبیعت نے یک طرفی پر کمر باندھی اور شاعری تباہ ہونی شروع ہوئی۔ نظیر کے یہاں تعصب کا نام نہیں ہے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں ایسی سحر اثری پائی جاتی ہے۔ یہ نظم ہر اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ خیالات میں علو، الفاظ میں شکوہ اور تراکیب میں شستگی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ بندشیں نہایت چست اور مصرعے بالکل بسیاختہ ہیں۔ ہر بند برابر کا نہایت اہم ہے اور پوری نظم ایک رنگ میں ہے۔ زبان میں صفائی اور ادبیت ہے اور متروکات کا استعمال بالکل نہیں ہے۔ دیکھئے پہلے بند سے کس قدر محبت اور عقیدت ٹپکتی ہے :-

ہیں دو جہاں کے سلطان حضرت سلیم چشتی عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفتر مسلمان حضرت سلیم چشتی مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سر دار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

دو جہاں کے سلطان، عالم کے دین و ایماں، سر دفتر مسلمان، سر دار ملک عرفاں، کتنا احترام اور عقیدت کی

انتہا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں تعصب پرزے پرزے ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں جگہ جگہ نہایت پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن آخر کا بند خاص نظیر کے رنگ کی چیز ہے:-

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بوسے حرمت ہے دوستوں کی حضرت تمہارے
یہ چاہتا ہوں اب میں سودل کی آرزو سے رکھو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے

اے موجد ہر احساں حضرت سلیم جسطی

اس بند کا دوسرا مصرع الہامی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ دوستی کی اس سے زیادہ تعریف غالباً کسی لٹریچر میں میسر نہیں آسکتی۔ انتہا درجے کی محبت میں یہ الفاظ منہ سے نکل سکتے ہیں۔ ہر شخص کا ظرف ان کی خلافتی کی صلاحیت اور ہر زبان ان کے بیان کی قدرت نہیں رکھتی:-

ہولی ایک موسمی اور مصورانہ نظم ہے جو نظیر کے بہترین کلام میں سے ہے۔ اس نظم کو شروع اس خوبی سے کیا ہے کہ موسم کی حالت اور کیفیت کا پورا اندازہ صرف لفظوں سے ہو جاتا ہے۔ پہلے گند کا پہلا مصرع تو موسم کی حالت بہت ہی صاف صاف بتاتا ہے لیکن تیسرے مصرعے میں جو حسین ذریعہ موسمی کیفیت اظہار کرنے کا نکالا ہے اس کی لطافت کی بناء نہیں:-

پریوں کے رنگ دکھتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

بحر کا ترنم اور الفاظ کی نشست تو نظم کی جان ہیں لیکن تیوہار کے رسوم کے جزویات کی مصوری جس انداز سے کی ہے، اس سے معاشرت پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہولی کی رنگ رلیوں کا محفل کی دلچسپیوں سے جہاں تک تعلق ہے ان کا سماں دیکھئے کیسا پر کیف اور کتنا ایجان پرور ہے:-

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا وہ سب سامان جمیا ہوا اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹٹھہ ہو رنگ ڈوبوں کا اس عیش مزے کے عالم میں ایک غول کھڑا مجھوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس نظم کو بار بار اور گاکا کر پڑھنے سے، قوت خیال ہوئی کا ایک ذہنی سماں اپنے لئے پیدا کر لیتی ہے جس کا لطف صرف اسی حالت میں محسوس کیا جاسکتا ہے اور ضبط تحریر میں کسی طرح نہیں آسکتا۔
نانک شاہ گرو سپاس مندانہ نظم ہے اور اس سے نظیر کی وسعت نظر، مذہبی بے تعصبی اور عام مطلوبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیکھئے کس عقیدت اور احترام کے ساتھ فرماتے ہیں:-

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو وہ کامل رہبر ہیں جگ میں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود، مراد، امید، سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا زباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

یہ نظم کسی قدر خشک اور بد مزہ ہے لیکن اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ اس کا تعلق ایک فرقتے کے عقیدت مندانہ جذبات سے ہے اس لئے ہر شخص کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ اس کی پراثری اور معنویت کا حال سکھوں سے پوچھئے۔ اس نظم میں سکھوں کی مذہبی اصطلاحوں اور پنجابی الفاظ کا استعمال بہت ہے جو ہم لوگوں کے لئے غیر مانوس ہیں۔ نظم میں فی نفسہ کوئی 'تصنع یا غیر فطری پہلو نہیں ہے اور ٹیپ کے دو مصرعے جو ہر بند میں دوہرائے گئے ہیں خاص دل سے نکلی ہوئی چیز ہیں اور دل پر اثر کرتے ہیں:-

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

کنہیا جی کا جنم ایک واقعاتی اور حاکانہ نظم ہے اور خالص ہندو مذاق کی چیز ہے۔ یہ اس قبیل کی نظموں میں سے ہے جو کسی شاعر کو اس کے گردہ میں ممتاز کر دیتی ہیں۔ ہر شاعر اپنے حصے کی ایک نہ ایک خصوصیت اپنے رنگ میں سب سے علیحدہ رکھتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ یہ نظم نظیر کی اسی خصوصیت کی حامل ہے۔ اول تو یہ ہندوستان کے قدیم صنایع سے متعلق ہے اس لئے شاعرانہ مذاق رکھنے والوں کے

لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے دوسرے مذہب سے متعلق ہے اس لئے ہندوؤں کی خاص دلچسپی کی شے ہے۔ قدیم ہندو معاشرت اور رسم و رواج کا بھی اس سے کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بھاشا کے مانوس اور غیر مانوس دونوں قسم کے الفاظ کا اس میں کثرت سے استعمال ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظیر ہندو فلسفے اور ہندو نجوم سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ جگہ جگہ ان علوم کے بالواسطہ اور بلاواسطہ حوالے موجود ہیں۔ بھاشا کے الفاظ اس نظم میں، خصوصاً اس قدرت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں جس سے اس زبان پر بھی نظیر کا اجتہاد ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھئے کرشن جی کے لئے کتنے صفاتی نام مہیا کئے ہیں:-

پھر آباواں ایک وقت ایسا جب آئے گرب میں منموہن گوپال، منوہر، مہر، لیدھر، سیکشن، کشورن، کیول من
گھنٹشام، مہراری، ہزاری، گروہاری، سندرشام پرن پر بھوناتھ، بہاری، اکان لالا، سکھائی، جگ کے دکھ بھجن

جب ساعت پر گٹ ہونے کی واں آئی نکت دھریا کی

اب آگے بات جھم کی ہے جے بولو کشن کنہیا کی

جہاں عورتوں کی رسموں کا سماں کھینچا ہے وہاں عورتوں کی زبان بڑے کمال کے ساتھ لکھی ہے۔ یہ خصوصیت جس کی اس موقع کے لئے نہایت ضرورت تھی اگر اس کمال کے ساتھ نہ ہوتی تو اس نظم اور بالخصوص اس مقام کا پایہ بہت گر جاتا۔ نظم کا یہ مقام خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہے۔ گھر میں بچہ پیدا ہونے کے وقت خواتین کے مشاغل، ان کی سرگرمیوں اور مسرتوں کا، دیکھئے کیسا بیمثال، صبح اور مفصل نقشہ کھینچا ہے۔ سب ناری آئیں گوگل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت جگا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم کھ اس بالک کا بہاری ہو کر دیکھ رہیں کچھ تھال بخییری کے رکھتیں، کچھ سونچہ سٹھوڑا کرتی تھیں
کچھ کستی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیک آج کے دن کا لینے کو

کچھ کستیں ہم تو آئے ہیں آئندہ بدھاوا دیتے کو

کوئی گھٹی مٹی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسہ کوئی لانی مہنسی اور مکر ٹوے کوئی کرتہ ٹوپی میوہ لکھی

کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ماتھا چوے مہر پھری
 کوئی کہتی عمر بڑی ہو وہ ہے اسے ہیر تھارے ہالے کی
 کوئی کہتی بیاہ بھولاؤ اس آس مرادوں والے کی
 کوئی کہتی بالک خوب ہوا اسے بھینا تیری نگہ لٹی
 اس کہنے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بچا
 یہ ہالے ان کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھاگی
 یہ باتیں سب کی سن سن کر یہ بات جسودا کہتی تھی
 اے ہیر یہ بالک جو ایسا اب میرے گھر میں جتا ہے
 کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی موپ کر رہا ہے
 ان بندوں کی اور کوئی خصوصیت کسی کی نظر میں ہو یا نہ ہو لیکن ان کی موسیقیت تو اس غضب کی ہے
 کہ دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

بانسری ہندو مذاق کی ایک وصافانہ نظم ہے جو کرشن جی کی زندگی کے محبوب ترین شغل شوق و تفریق
 کا نقشہ کھینچتی ہے۔ ہندوؤں کے لئے تو اس نظم میں خدا جانے کیسی جا ذبانہ عقیدت پنہاں ہے لیکن
 دوسرے لوگوں کے لئے بھی اس کی مترنم لطافت بہت پُر لذت و کیف ہے:-

جس آن کا نہم جی کو وہ بنسی بجساؤنی جس کان میں وہ آؤنی واں سدھ بھلاؤنی
 ہرمن کی ہو کے موہنی اور چپت لبھاؤنی نکلی جہاں دھن اس کی وہ میٹھی سہاؤنی

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

نظم کے عنوان اور نفس مضمون میں جس قدر شعریت ہے اتنی خود نظم میں نہیں ہے۔ مہر وک الفاظ اس
 کثرت اور بھاشا کی اصطلاحیں اس بہتات سے استعمال کی ہیں کہ نظم کے معانی اس زمانے کے اردو دا
 طبع کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں لیکن جہاں کہیں بھاشا کے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو

سکتے ہیں تو وہ مقامات مار رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ذیل کے بند کو ذرا پڑھئے اور پھر وہ
۱۰۔ دریا ہوں کے سامنے کھینچنے کی کوشش کیجئے۔ دیکھئے کیا کیفیت طاری ہوتی ہے:-

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن لے اُس کی من کی موہنی دھن اس کی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بچن کیا چل پون نظیر پھیرو کیا ہرن
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

آگرے کی تیراکی ایک مصورانہ نظم ہے اور لوکل کلریا مقامی رنگ کی آمیزش کا اچھا نمونہ ہے۔
نظم نے برسوں آگرے کا یہ میلادیکھا ہے۔ حقیقت میں بڑی حق تلفی ہوتی اگر وہ اس میلے کا اتنا حق بھی ادا
نہ کرتے۔ آگرے کی تیراکی نے انہیں طرح طرح سے لبھایا اور ان کے لئے ہزاروں طرح کی دلچسپیاں
اور ستریں پیدا کی ہیں۔ اس لئے ان تمام لطیف احسانات کے بدلے میں نظیر نے بھی اس میلے کو زندہ
جاوید کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:-

جب پیرنے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں عاشق بھی ساتھ اُن کے غنوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے نادان ہشیار پیرتے ہیں پیرو جوان لڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنی غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

یہ نظم بڑی پاکیزہ ہے اور مشہور نغموں میں سے ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے ہر مصرع نہایت
پرکھیں بے تصنع اور بیباختہ ہے۔ زبان بالکل صاف اسستہ اور متروکات سے معرا ہے۔ اب رہا
نفس مضمون تو اس کی خوبیاں بھی اپنی جگہ پر مستقل اور غیر فانی ہیں۔ آگرے میں دریا کنارے جس قدر مشہور
مقامات اس وقت تھے اور جن کا تیرا کوں سے کوئی لگاؤ تھا، ان سب کا تذکرہ کر کے ان کی تاریخ کو زندہ

کر دیا ہے۔ ان میں سے بہت سے مقامات کے جاننے والے بھی اب باقی نہیں۔ اگر نظیر کی یہ نظم نہ ہوتی تو ان مقامات کے نام بھی ان کی عمارتوں کے ساتھ مٹ جاتے۔ تاریخ پر نظیر کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ اس کے علاوہ پانی کی مختلف ہیئتوں کے نام ایک بند میں اکٹھے کئے ہیں۔ یہ زبان پر بڑا احسان ہے۔ ہر چند یہ نام تیراکوں کی زبان پر ہیں اور بہت سے وہ بھی نہیں جانتے لیکن عامۃ الناس ان سے قطعی بے خبر تھے۔ نظم میں ان کا ذکر لانے سے اول تو ان میں ادبی شان پیدا ہو گئی ہے اور جو کچھ عمومیت تھی وہ زائل ہو گئی ہے۔ دوسرے پانی کی ہیئتوں کے لئے جواب تک صرف دی گئی تھیں مگر بیان نہ ہو سکتی تھیں، الفاظ مہیا ہو گئے ہیں جن کو ہر شخص روزمرہ اور ادبیات میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ اس نظم میں ادب بہت سی شاعرانہ خصوصیات ہیں جو بالذات بڑی کیفیت رکھتی ہیں۔ تیراکی کا سماں دیکھئے :-

جہنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے بارے پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے
منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے گورے پیارے پریوں سے بھر رہے ہیں نجد عار اور کنارے

کچھ وار پیرتے ہیں کچھ بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں
کتے کھڑے ہی پیریں اپنا دکھا کے سینہ سینہ چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینہ
آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینہ سرودوں کا بہ چلا ہے گویا کہ اک قرینہ
دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا لے یار پیرتے ہیں

دوسرے بند کا چوتھا مصرع لاجواب ہے۔ اس کی تشبیہ بالکل نئی اور داد سے مستغنی ہے۔ موسم زمناں موسمی نظم ہے اور اپنے مقام پر اختراع فائز کا حکم رکھتی ہے۔ اس نظم میں موسم کی حالت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے اور کئی طرح سے زمناں کی مصوری کی ہے۔ سب اسے پہلے

نفس زمناں کی محاکات نگاری کی ہے۔ دیکھئے :-

جب ماہ اکھن کا ڈھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
بالا بھی برف کھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا ختم ٹھونک اچھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس بند کا پہلا مصرع تو خیر ایک واقعے کا اظہار کرتا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں صرف دو لفظوں ”ہنس ہنس“ سے شاعر نے کمال دکھایا ہے اور جاڑے کی انتہائی تکلیف پیش نظر کر دی ہے۔ جاڑے کو ایک انسان قرار دے کر یہ دکھایا ہے کہ جب وہ اہل عالم کو سردی کی تکلیف میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کو ان کی حالت ناز پر بجائے رحم آنے کے ہنسی آتی ہے۔ وہ اُن پر تسخر کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ نعم ہو کر دنیا کو سردی کی اذیت سے نجات دے اور سنبھل جاتا ہے۔ تیسرا مصرع پھر سردی کی فریب کاری کی شرح کرتا ہے اور ایک موسمی حقیقت کا بھی اظہار ہے۔ چوتھے مصرعے میں رات کا سماں اور جاڑے کی سختیوں کا ذکر ہے۔ پانچویں مصرعے میں دکھایا ہے کہ جاڑا اپنے افعال سے پہلے تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ چلا جائے گا اور پھر طرح طرح سے دھوکا دیتا ہے۔ آخر کار دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ختم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی سختیاں شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ چلے گا جاڑا پڑنے لگتا ہے۔

یہاں تک تو زمناں کے مظالم اور اس کی فریب کاریوں کا ذکر تھا۔ اب ان کا اثر انسانوں پر ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھئے سردی میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اور پھر اس حالت کو کس قدر تفصیل کے ساتھ شاعر نے دکھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذیل کے بند میں نظیر نے محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور معمولی کی قرار واقعی داد دی ہے۔ دیکھئے سماں آنکھوں کے سامنے بھرنے لگتا ہے۔

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہوا اور دل سے ہوتی ہوشی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور بھو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کھلے پر کلہ لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چسکی سی

ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ ہماری جاڑے کی
تھر تھر کا زور بتیسی بچا، پھو ہو ہو ہو اسی سی سی سی تکتے پر کٹھ لگا، دانتوں کا چنے سے دلتا، یہ ایسی
باتیں تو ہیں نہیں جن کی تشریح کی ضرورت ہو۔ سردی کے موسم میں ہر شخص پر یہ حالت گزرتی ہے لہذا آپ
بیتی کا خود اندازہ کر کے ہر شخص نظیر کی محاکات نگاری کی داد دے سکتا ہے۔ میرے بتانے یا سمجھانے کی
ضرورت نہیں ہے۔

اس نظم میں مصویشاعر کے عاشقانہ و جوانانہ جذبات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ جاڑے کی مصوری
کرنے میں آگے چل کر، نظیر نے تخیل سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور سردی کو مکمل نمونہ صنعت و آرٹ
بنانے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر یہ دو باتیں یعنی حقیقت نگاری اور خیال آرائی یا یوں کہیے کہ عکاسی اور
آرٹ نقیضین معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات کی صورت گری اور صناعی یا آرٹ میں جس کی تمام تر بنا تخیل پر
ہوتی ہے بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں ایک حد مقرر ہوتی ہے اور نگاہ اس سے باہر کسی طرح
نہیں جاسکتی۔ دوسری صورت میں خیال بالکل آزاد ہوتا ہے اور تصویر کی تکمیل خیال کی بلند ترین پرواز
پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں لیکن نظیر نے عکاسی اور آرٹ
کو ایک جگہ جمع کر کے مافوق العادت کمال اور مجتہدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت نگاری میں خیال
آرائی کا لطف ملاحظہ فرمائیے :-

ہر چار طرف سے سردی ہوا اور صحن گھلا ہو کوٹھے کا اور تن میں نیمہ شب جنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑ کا ڈھوا ہوا پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیکا ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فرش کھڑا
فرش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ ہماری جاڑے کی

اس کے بعد کے دو بندوں میں عاشقانہ و جوانانہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ دونوں بند کسی قدر عریانی
ہیں لیکن اتنی ہندب عریانی کی مثال بیشکل کسی لٹریچر میں مل سکتی ہے۔ پانچویں بند کا تیسرا مصرع :-

محبوب گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں
محاکات کی اعلیٰ ترین و نادر ترین مثال ہے۔ ہر چند نہایت عریاں ہے لیکن پھر بھی کوئی اعتراض
نہیں کیا جاسکتا کھلے الفاظ میں کوئی بات نہیں کہی گئی۔ نہ الفاظ ہی فردا فردا ایسے ہیں جن میں خواہ مخواہ
کوئی عریانی ہو۔ صرف الفاظ کی نشست اور مصرعے کے یاق سے وہ سماں کھینچا ہے جسے ہزار
تصویریں بھی ادا نہیں کر سکتیں۔

اوس ایک موسمی اور مصورا نہ نظم ہے جسے صرف ہندوستان کا فطری شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔
اس نظم میں اوس کی کیفیت اور اُس سے جو اذیتیں انسان کو پہنچتی ہیں وہ سب نہایت خوبی کے ساتھ
مفصل بیان کی ہیں اور ایسی مصوری کی ہے کہ نظم پڑھتے پڑھتے اوس کی کیفیت طبیعت پر طاری ہو کر
جی گھبرانے لگتا ہے اور اوس کی سی اذیت ہونے لگتی ہے۔ دیکھئے برسات کے زمانے میں سڑی گرمی
سے قلب میں جو اضطراب اور طبیعت پر جو ہجوم تکدروا نقباض ہوتا ہے اس کا یہ سماں کتنا مصورا نہ ہے۔
بدلی کے جو گھر آنے سے ہوتی ہے ہوا بند پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند
پھینکے کوئی بگڑی کوئی کھولے ہے کھڑا بند دم رگ کے اٹھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

برسات کے موسم میں ٹیٹ زہر ہے اوس

سب چیز تو اچھی ہے پراک قہر ہے اوس

اس نظم میں بھی نظیر نے ایک جگہ غٹکا سی اور آرٹ کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کی ہے اور اوس کا ایک
خیالی منظر پیدا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اوس میں تو لازم ہے نہ ٹیکھا نہ ہوا ہو ایک کو ٹھری ہو جس میں دھواں آکے بھرا ہو
اور کھیلوں کے واسطے گڑتن سے ملا ہو اس وقت مزہ دیکھئے اوس کا کہ کیا ہو

برسات کے موسم میں ٹیٹ زہر ہے اوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اوس
 ”اوس“ اول سے آخر تک مکمل چیز اور مصوری کی اختراع فائقہ ہے۔ نظم فی نفسہ نہایت پاکیزہ
 بے تصنع اور بیاختہ ہے۔ زبان بالکل صاف اور متروکات سے معرّی ہے۔ نظیر کی شاعری کے اعلیٰ
 نمونوں میں اوس بلا خوف تردید پیش کی جاسکتی ہے۔

کورے برتن و صافانہ نظم ہے اور اس فہرست کی نظموں میں سے ہے جن پر اردو زبان اور ادب
 لطیف بجا ناز کر سکتے ہیں۔ اس کے بیان میں ادب قدیم کی سی سادگی اور لطافت، اور اس کے خیالات
 میں الہامی کلام کی سی شادابی، وسعت اور علو ہے، کہتے ہیں :-

کورے برتن ہیں کیا رہی گلشن کی جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
 بوند پانی کی اُن میں جب کھنسکی کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
 تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کورے برتن کی

واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے سن سن کی وہ پیاری صدا سنی ہے اور کورے برتن کی وہ معصوم و شاد
 کیفیت جو اس میں پانی پڑتے وقت ہوتی ہے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ تو اس بند کا پورا لطف اٹھا کر
 ہیں لیکن جنھوں نے نہیں دیکھی اُن کے لئے بھی اس کی خیالی لطافت بادہ ناب کے سرور کا حکم
 رکھتی ہے۔

دوسرے بند میں پانی کی نوعی بزرگی کا اعتراف کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ پانی جب کورے برتن
 میں ملتا ہے تو اس کے سامنے آب حیات کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ حقیقت میں کوئی نہیں
 جانتا کہ آب حیات کیا چیز ہے لیکن پانی ہزاروں آدمیوں نے کورے برتن میں پیا ہے جس سے
 یہ بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ پانی کا مزہ کورے برتن سے بہتر کسی چیز میں نہیں آسکتا۔ پس جب پانی کا اس

ہے بہتر مرزہ انسان کے تجربے میں نہیں تو یہ کہنا کہ کورے برتن میں پانی پینا آبِ حیات کے مرے کو مات کرتا ہے مبالغہ نہیں۔ اب ذرا ان مصرعوں کی تازگی اور شادابی ملاحظہ کیجئے:-

سوندھی سوندھی ٹھٹھولیاں باندھیں ہم نے پانی کی گولیاں باندھیں
اب آگے بڑھئے اور کورے برتن اور اس کے متعلقات کے دوسرے لطائف دیکھئے:-

کوراپنہاری کا جو ہے مٹکا اس کا جو بن کچھ اور ہی مٹکا
لے گیا جان پاؤں کا مٹکا دل گھرے کی طرح سے دے پٹکا

تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی

دوسرے مصرعے میں ”مٹکا“ صرف ایک لفظ سے جو مطلب ادا کیا اور سماں کھینچا ہے وہ دوسرے لفظوں میں پوری نظم سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ تیسرے مصرعے میں جو جاذبیت ہے اسے دیکھ کر ٹیگور کی یہ نظم یاد آتی ہے:-

”جب دو بہنیں پانی لینے جاتی ہیں تو اس مقام پر آتی ہیں اور مسکراتی ہیں۔ وہ ضرور کسی شخص سے واقف ہوں گی جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔ دونوں بہنیں جیساں جگہ سے گزرتی ہیں تو آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کرتی ہیں، انہوں نے ضرور اس شخص کے بھید کو تاڑ لیا ہوگا جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں، یکایک اُن کے گھرے بٹتے ہیں اور پانی پھلک جاتا ہے جب وہ اس مقام پر پہنچی ہیں۔ انہوں نے ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ اس شخص کا دل دھڑکتا رہا ہے جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔ دونوں بہنیں جب اس مقام پر آتی ہیں تو ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ اُن کے تیز تیز بڑھنے والے پاؤں میں ایک خندہ مضمر ہے جو اس شخص کے دماغ کو پریشان کر دیتا ہے جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے“

جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔“
ٹیگور نے جن خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے ایک پوری نظم لکھی ہے وہ نظیر نے صرف ایک مصرعے سے ادا کئے ہیں :-

لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا
بہ ظاہر یہ ایک مصرع ہے اور صرف ایک معمولی سے خیال کو ظاہر کرتا ہے لیکن پاؤں کے کھٹکے میں جو جو وارداتیں پنہاں ہیں ان کو سوچئے اور لطف اٹھائیے۔ خیال کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اب دوسرے کیفیت سے لطف اندوز ہو جائیے نظیر فرماتے ہیں :-

کورے کوزوں کو دیکھ عالم میں کوزے مصری کے بھر گئے غم میں
یوں وہ رستے ہیں آب کے غم میں جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

دیکھئے یہ بند کس بہار کا ہے۔ اس کی اور اس کے بعد کے بند کی لطافت گرمیوں میں محسوس کی جاسکتی ہے جس وقت پیاس لگ رہی ہو اس عالم کا پیش نظر ہونا تو درکنار اس بند کا پڑھنا ہی کافی ہے۔ دیکھئے کیا کیفیت قلب پر طاری ہو جاتی ہے اور کس قدر سکون محسوس ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے میں صرف دو لفظوں ”عالم میں“ نے شاعر کے تمام ذہنی مطالب ادا کر دیے ہیں اور کورے کوزوں کے جملہ ظاہری اور باطنی محاسن اور ان کی ساری جاذبیت دکھا دی ہے۔ لیکن چوتھے مصرع کی لطافت و شگفتگی، شادابی و عطر بیزی کی انتہا نہیں۔ مسرت و سرور کی بے پناہ کیفیت قلب پر طاری کرتا ہے۔ نظم کا آخری بند کسی زندانہ ہے لیکن آپ اپنی مثال آپ ہیں۔ پڑھئے اور سر دھنئے !

کوروں پر جو نظیر جو بن ہے جو جہے میں کہاں وہ کھن کھن ہے

جس گھڑونچی پہ کورا باسن ہے وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور ترمی تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

تیسرے مصرعے میں ”باسن“ نے ”باسن“ کہنے والی بہت سی قدیم ہستیاں یاد دلادیں۔ اس لفظ کے بولنے والے آہ مدت ہوئی پیوند خاک ہو گئے اور اب کورے باسنوں میں جنت کی شراب جلوہ بازی ہے ہیں۔ دنیا میں باسن کا وجود صرف اُن ہی کے ساتھ تھا اور ان ہی کی زبان پر وہ اچھا بھی معلوم ہوتا تھا وہ بھی ان ہی کے ساتھ پیوند زمیں ہو کر اپنے کل کا جزو جابنا۔

کل شیء یرجع الی اصلہ

کوٹا اور ہرن کا بیچہ ایک منظوم قصہ اور حال کیا نہ نظم ہے جس کا ماخذ انوار سہیلی ہے۔ اس لئے اس کو منظوم ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک کوٹے اور ہرن کے بچے کی دوستی کا فسانہ مذکور ہے جس سے نظیر کی قوت بیان و حکایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نظم کی زبان نہایت صاف اور سستہ ہے اور نظم بھی فی نفسہ بالکل بے تکان اور بے ساختہ ہے۔ نظم کی وجہ سے مطالب ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ یا تصنع پیدا نہیں ہوا اور قصہ بالکل اسی طرح ادا ہوا ہے جس طرح نثر میں ہوتا۔ اردو میں طویل منظوم افسانوں کی کمی نہیں لیکن اتنے مختصر منظوم فسانے بہت کم ہیں۔ یہ نظم اپنی نوعیت کی ایک خاص چیز ہے جو بچوں کے درس میں شامل کرنے کے لئے بہت اچھی ہے۔ آخر میں نظیر نے اس قصے سے ایک اخلاقی نتیجہ اخذ کیا ہے جو خود نہایت اہم اور سبق آموز ہے:-

گیدڑ نے اس ہرن کا جو چیتا تھا واں بڑا پائی اسی نے اپنی بدی کی وہیں سزا
تھا یہ تو نثر میں نے اسے نظم میں کیا پھونچا نظیر جب وہ خوشی ہو کے اپنی جا
کوٹے کے ساتھ پھر وہ بہت خوش رہا ہرن

خواب کا طلسم ایک عاشقانہ نظم اور ایک پرمعنی ایلیگری ہے جس میں دنیا اور دنیا کی دلفریبیوں کی بے ثباتی کی مصوری کی ہے۔ نظم اول اسے آخر تک ایک رنگ میں ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس کا لہریچر اول درجے کا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں شاعر نے خاص طور پر اہتمام کیا ہے کوئی لفظ، کوئی بندش، کوئی مصرع ایسا نہیں جو لطافت سے خالی اور ادبیت سے معری ہو غرض کہ پوری نظم ایک پُر کیف چمنستان ہے جس کی دلکشی صرف اس کی سیر سے قلب پر اثر کرتی ہے۔ پہلے بند میں اس بے فکری اور فارغ البالی کا نقشہ ہے جو انسان کو کبھی کبھی میسر آجاتی ہے۔ اس کے بعد تین بندوں میں دنیا کی ان نظر فریب آرائیوں اور سیمائی جلووں کا سماں ہے جو انسان کو طرح طرح سے لہھاتے اور اس کو مافیہا سے غافل کر دیتے ہیں۔ نظیر کی سلاں بندی کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-

گلشن کہیں چمن کہیں شیشہ صراحی جاں فرش طلا بچھا کہیں یکسر جرأت کا کام
تھی نفرتی زمین تو سنہرے تمام بام طاق و رواق اس کے پچکتے تھے یوں بدمام
گویا کہ اینٹ اینٹ جواہر کی ہے جھڑی

اس کے بعد ایک ستم ایجا دمہ لقا کے حسن و جمال کا سراپا، اس کے شباب کی زاہد فرمیاں، اس کی شوخیاں اور طرح دریاں، اس کا شگھار اور آرائشیں ان تمام باتوں کا تذکرہ ہے اور ان تمام کے مجموعے سے مراد دنیا ہے۔ اب اس کا بے پناہ عالم اپنی آنکھوں سے دیکھئے :-

خویریز برو جان کی قاتل ہر اک نگاہ مژگاں وہ بھٹیوں کو لئے تل رہی پناہ
منہدی سے انگلیوں نے کئے خون بے گناہ آنکھوں میں گھنچ رہا تھا وہ کا جل غضب سیاہ
پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہر پڑی

آخر کے مصرعے میں ”ہر پڑی“ کا لفظ گو کسی قدر مبتذل اور سوقیانہ ہے لیکن اس سے مفہوم پورے طور پر ادا ہوتا ہے۔ مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ دوسرا لفظ یہ مفہوم ادا ہی نہیں کر سکتا۔ اگر یہ لفظ نہ ہوتا تو مصرع

تشنہ رہتا اور اس کا زوق قطعی زائل ہو جاتا۔ سہرا پا کا ایک سماں اور دیکھئے :-

زلفیں وہ مشک ناب سی چہرہ وہ چاند سا جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جلمگ
گئے کا و صف یا کہ بدن کی کہوں صفا جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک لھا
گویا شفقت میں آن کے بجلی چمک پڑی

یوں تو یہ بند کا بند بے مثال ہے لیکن اس کے چوتھے اور پانچویں مصرعوں کا جواب ناپید ہے۔ ”سرخ جوڑے کو شفقت سے تشبیہ دینا تو خیر کوئی ایسی عجیب بات نہیں معمولی شاعر بھی ایسا کر سکتا ہے لیکن ”تن کی جھمک“ میں بجلی کی مشابہت دیکھنا صرف نظیر کی نازک بصیرت و شاعرانہ نظر کا کام ہے۔

اب اس کے بعد اس ستم ایجا دمہ لقا کی صحبت کا سماں دیکھئے۔ حقیقت میں یہ وہ حالت ہے جب عنانِ صبر و استقلال انسان کے ہاتھ میں کسی طرح نہیں رہ سکتی۔ اس سے دنیا کے فریب مراد ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ طرح طرح سے لہما کر انسان کو پہلے بے قابو کر دیتے ہیں پھر اس کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتے ہیں اور اس پر ستم یہ ہے کہ پھر بھی وفا نہیں کرتے۔ کم بخت، بد نصیب انسان کو محروم ہی رکھتے ہیں۔ خیر اس رنج کو چھوڑئے اور اب یہ سماں دیکھئے :-

آتے ہی اس کے دل کا مرے کھل گیا چن عیش و طرب کے ابر کی پڑنے لگی بھرن
نازک کمر وہ صاف شکم اور وہ نرم تن گل سا ملا جو مجھ کو نیا گد گدا بدن
رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی ٹھیل بھڑی
لے کر بفل میں اس کو لگایا جو ہیں گلے سو عشرتوں کے دل پر مرے کھل گئے نورے
حاضر ہوئے جب آن کے سب عیش و عشرت سیلنے سے سینہ مل گیا اور بس لب لے
لٹے لگی ہمار مزوں کی دھڑکی دھڑکی

یہ اس عالم کا سماں ہے جب انسان مسرتوں میں محو اور عشرتوں میں چور ہو جاتا ہے اس کیفیت میں

یہ ایک یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے:-

ان عشقوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں چاہیں اس پر ہی سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل گئی

یہ اس حالت کا سماں ہے جب عارضی مسرت و انبساط کے پردے آنکھوں سے ہٹ جاتے ہیں اور انسان
پھر اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے۔

آخر کا بنداس وقت کی حالت دکھاتا ہے جب عارضی عیش و نشاط کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان
پھر ایک غیر دلچسپ اور سادہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی حالت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔
گزشتہ زمانے کے عیش و عشرت کا فراق اس کو بید مضطرب رکھتا ہے اور اس کا تمام وقت اسی کی یاد
میں کتب افسوس ملتے گزرتا ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا دیکھئے یہ وہی حالت ہے:-

یہ حادثہ جو مجھ پر پڑا آ کے یک بیک آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو پڑے ٹپک
نیمند اڑ گئی قرار گیا جل گئی پلک جاگا کیا نظیر میں پھر آہ صبح تک

مل مل کے ہاتھ رات کی کاٹی گھڑی گھڑی

ریچھ کا بچہ بہ ظاہر تو ایک طفلانہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایک حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری ہے۔
ریچھ کے بچے سے انسان کا نفس شریہ مراد ہے جو بہ مشکل رام کیا جاسکتا ہے اور قلندر سے مطلب خود حضرت
انسان ہیں جو اس کو طرح طرح سے سدھا سدا کر اپنا مطیع کر لیتے ہیں۔ ریچھ کے بچے کی تعلیم و تربیت سے مراد
ریاضت نفس ہے جس میں بہت زمانہ صرف ہوتا ہے۔ ذیل کے بند میں اس کی طرف اشارہ ہے:-

کل راہ میں جاتے جو ملای ریچھ کا بچہ لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ

سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ

جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

اس نظم میں باطنی معانی و معنوی مطالب کے علاوہ ظاہری خصوصیات اور شعری لطافتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ دیکھئے ریچھ کے بچے کی کیا آرائش دکھائی ہے۔ واقعی بری معلوم ہوتا ہے:-

بُھکے دہ، بھکتے تھے بڑے جس پہ کرن پھول مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اور پھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گل پھول یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سُدھ بھول
گویا وہ بری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچہ

ذیل کا بند اس چھوٹے ٹے سے تماشے کا مرقع اور فلسفہ اجتماع کا ایک مختصر کرشمہ ہے۔ دیکھئے اس کے چوتھے مصرعے میں کس قدر خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس مصرعے میں سات لفظ ہیں اور ہر لفظ سے ایک مستقل خیال اور جہد گانہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ دریا کو زہ میں بند کرنا اسی کا نام ہے اور یہ صرف مجتہدین سخن ہی کا کام ہے ملاحظہ ہو:-

اک طرف کو تھیں سینکڑوں لڑکوں کی پکاریں اک طرف کو تھیں پیر و جوانوں کی قطاریں
کچھ ہاتھیوں کی قیق اور اونٹوں کی ڈکاریں غل شور، مزے، بھیڑ، ٹھٹھ، ابنوہ ہاریں

جب ہم نے کیا لاکے کھڑا ریچھ کا بچہ
کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر وہ کیا ہوئے اگلے جو تمہارے تھے وہ بند
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ ہمیشہ ہے قلندر ہاں چھوڑو بابا انہیں جھگڑے کے اند

جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ

بندر سے ایام طفولت مراد ہیں جب تقلید کی قوت جوش پر ہوتی ہے۔ چوتھے مصرعے کے یہ معنی ہیں کہ بچپن اور بے فکری کا زمانہ ختم ہو گیا اب ذمہ داری کا وقت آگیا ہے اس لئے شریفس پر قابو پانے کی ضرورت ہے اس لئے اس کی تربیت میں مصروف ہیں۔

ذیل کے بند میں بڑا دقیق صوفیانہ راز مضمر ہے جس کا سمجھ لینا عارف ہی کا کام ہے۔ کوئی کتنا ہی

نفس کش اور متاثر کیوں نہ ہو، نفس کی مخالفت آخر عمر تک جاری رہتی ہے۔ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بعض اوقات نفس شہر پر غالب آکر عمر بھر کی عبادت و ریاضت خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس ضمن میں برصیعا زاہد کی مثال کس قدر دردناک اور عبرت انگیز ہے۔ پکا صوفی وہی ہے جو ہر وقت ہشیار رہے اور کسی وقت بھی نفس کے حلوں سے غافل نہ رہے۔ اس بند سے اسی کی تلقین فرماتے ہیں:-

جب کشتی کی ٹھیری تو وہیں سر کو جھٹا لگا رہتے ہی اس نے ہمیں آن لٹاڑا
کہ ہم نے پچھاڑا اُسے کہ اُس نے پچھاڑا اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا

گو ہم بھی نہ ہمارے نہ ہمارے پچھ کا بچہ

آخر کے مصرعے میں اپنا کسر نفس اور نفس کی سرکشی دکھائی ہے۔ ”بھی کا لفظ بتا رہا ہے کہ نفس سختی کے ساتھ مخالفت کر رہا ہے مگر پھر بھی اس کے مغلوب کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنی ریاضت کا کبھی غرہ نہ کرنا چاہیے۔ ہمیشہ امید و بیم میں رہے۔ اپنے کو کمزور اور اپنے مخالف کو قوی سمجھے۔ اس وقت اُس کے لئے پوری فتح کا امکان ہو سکتا ہے۔

راکھی ایک ہندوانہ و عاشقانہ نظم ہے جو اپنے رنگ کی ایک نرالی چیز ہے۔ سلو نوں کا تیو ہار ہندوستان کا بڑا مشہور تیو ہار ہے۔ اس میں ہر شخص راکھی باندھتا اور شکر لے کر اپنی سسرال جاتا ہے۔ راکھی کی مذہبی اہمیت کچھ بھی ہو لیکن شاعرانہ نقطہ نظر سے اس میں بڑی لطافت اور جاذبیت ہے جس لطیف اور اس کے اس طبقے میں جو دشمنی سے ہمکنار ہے راکھی ایک مستقل حسن پیدا کر دیتی ہے، جس کی ستم آرائیاں کوئی نظیر کے دل سے پوچھے، کسی کی موتیوں کی اور زری کے تاری راکھی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں:-

اداسے ہاتھ اٹھنے میں گل راکھی جو ملتے ہیں کلجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ پھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پھونچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول پھلتے ہیں

جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گل رخسار کی راکھی

ساری نظم عاشقانہ جذبات اور حین تاثیرات کا ایک پُر کیف و سکرچین ہے جس میں طرح طرح کے خوش رنگ پھول جا بجا کھلے ہوئے ہیں، جو ہر اہل دل کو متوالا بنائے دیتے ہیں۔ راکھی اور راکھی باندھنے والیوں کی فنیوں پاشیاں جب نظیر سے ضبط نہ ہو سکیں تو آخر بیتاب ہو کر کہہ بیٹھے:-

پھر ہے ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم جن کے تائے تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جان چاؤ کے مارے
پہن زناں اور قشدہ لگا ماتھے اُپر بارے نظیر آیا ہے با مہن بن کے راکھی باغدھنے پیارے
بند حالو اس سے تم نہیں کر اب اس تیوہار کی راکھی

سناوت اور عشرت ایک ناصحانہ نظم ہے جس میں دراصل بخل کی ہجو کرنی منظور ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے سناوت کے باب میں کسی قدر مبالغہ کرنا ضرور تھا لیکن نہ اتنا کہ سناوت خود ایک عیب کی شکل اختیار کر لے۔ اس مقام پر طبیعت کے زور اور اخلاق حسنہ کی حمایت کے جوش نے شاعر کے رواں قلم کو جاوہ اعتدال سے ہٹا دیا ہے کہتے ہیں:-

زردار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو تن زیب بن سکھوں سے ترسانہ اپنے تن کو
جو زچلن چلیں ہیں تو بھی چل اُس چلن کو مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دمن کو
گر مرد ہے تو عاشق کو ٹری نہ رکھ کفن کو

اس بند کا پہلا مصرع عاقلانہ نصیحت سے کس قدر لبریز ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسی کی تشریح ہے اور طبیعت نہ مارنے کا طریقہ بتایا ہے۔ تیسرے میں ایک شریفانہ پند ارکا اظہار ہے جو قطعی قابلِ زیرانی ہے۔ باخوش میں بھی ایک معتدل روش کی تلقین ہے لیکن چھٹے مصرعے میں بڑی زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ کوٹری کفن کو نہ رکھنے کی بُرا کید تلقین فی نفسہ نہایت مذموم ہے نہ یہ دراصل ایک عامیانہ شیوہ ہے اور سنجیدہ طبائع کو اس قسم کے طرز زندگی سے گریز کرنا چاہیے۔ آخر کے دونوں مصرعوں کی لئے بھی قلندرانہ ہے

جس سے ان کی بخیدگی میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے اور اس سے یہ بھی کسی قدر مترشح ہوتا ہے کہ یہ تلقین شریفانہ زندگی بسر کرنے والوں کے لئے نہیں ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظم کا مدعا کوئی فضول خرچی یا روپیہ برباد کرنا سکھانا نہیں۔ کارخیر میں صرف کرنے اور دل کھول کر صرف کرنے کی ہدایت نہایت مبالغہ آمیز لفظوں میں کی ہے۔ بہرگز گنہگار تپ راضی شود کا اصول پیش نظر رکھا ہے۔ اب دیکھیے یہ کتنا بلند اور عارفانہ خیال ہے:-

جو جو بخیل کتنی نہ رچھوڑ کر مرے گا ہاکھائے گا جنوائی یا خالصہ لگے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہ خدا میں ہے گا تھکا تا کھلا تا ہنستا تو بھی سدا رہے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

قناعت، توکل اور خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین اس سے بہتر الفاظ میں اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس بند کا چوتھا مصرع اب ضرب المثل کا کام دیتا ہے:-

جس نے یہ زردیا ہے پھر وہی دھن بھی دیگا مال و مکاں جو ملی بلغ و جن بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو اُن بھی دیگا مر جائے گا تو وہ ہی تجھ کو کفن بھی دے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

چاندنی رات ایک مصورا نہ اور عاشقانہ نظم ہے جس میں نظم کا شاعر نہ کمال نقطہ اوج پر نظر آتا ہے چاندنی رات پر اُردو اور دوسرے ادبیات میں اور ابھی بہت سی نظمیں ہیں لیکن کوئی اس قدر کامیاب اور شگفتہ نہیں جس سے چاندنی کا سماں و عن آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور طبیعت میں غیر معمولی تازگی اور بشاشی پیدا ہو۔ گتے ہیں:-

صبحِ چین میں واہ وازو بکھی تھی چاندنی چاند بوریں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی
 نظیر کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ وہ بحر ایسی مناسب حال اور مترنم چھانٹ کر لاتے ہیں جس سے
 مضامین کا لطیف و بالا ہوا جاتا ہے اور نظم میں جان سی پڑ جاتی ہے۔ اگر الفاظ خیال کو سماں بندی میں مدد
 دیتے ہیں تو ترنم سماں میں ایک مزید فسون پیدا کر دیتا ہے۔ یہ نظم ذرا سخن میں پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے
 کہ چاندنی رات کا منظر پیش نظر ہے اور دھیمی دھیمی موسیقی سامعہ کو آزی کر رہی ہے۔ اس شعر میں چاند
 بوریں لینا بالکل اچھا خیال ہے اور اب تک کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا۔ چاند کی غالباً یہی صفت ہے جو اس
 میں ایک خاص کیفیت و جاذبیت پیدا رکھتی ہے لیکن یہ کیفیت صرف محسوس کی جاتی تھی، اب تک اس
 کے بیان کے لئے الفاظ میسر نہ تھے۔ نظیر نے الفاظ مہیا کر کے فطرت کا ایک نازک و معصوم حسن ارباب
 ذوق و نظر تک پہنچا دیا۔ اب بار کے حن گلوں اور اس کے لباسِ زر نگار کی مصوری دیکھئے :-
 آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری چکے تھی تار تار میں مہ کی جھلک ذری ذری
 ذیل کا شعر دیکھئے کس قیامت کا ہے صبح کا منظر اتنے کم اور ایسے لطیف اور مترنم الفاظ میں
 اور کہیں نہ دیکھا ہوگا :-

صبح ہوئی گرجا، پھول کھلے ہو اچلی

یا بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

صبح کا ہونا طرح طرح سے اور بہت طویل طریقوں سے دکھایا گیا ہے لیکن صبح کے ساتھ گرجا، پھول
 پھول کھلنا اور ہوا چلنا جو صبح کے لوازم خصوصی ہیں بہت کم دکھائے گئے ہیں۔ ان چند باتوں کے مجموعے نے
 ایک عجب پُر لطف و سکون کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس حسن کا خیالی نقشہ اگر کھینچا جائے تو بڑا دلکش ہوگا۔
 اب چاندنی رات میں عیش و طرب کی صحت کا ایک اور منظر دیکھئے :-

چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک چمک رہی تھیں بلبلیں، باغ رہا تھا سب نمک

جام کے لبے ہر گڑھی نکلے تھی مے چھلک چھلک
یار بغل میں غنچہ لب، بوسوں کی سولپک لپک
عیش و طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بیک
ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے ہک نہ دہک
صبح ہوئی گجر جسا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

یہ بند ایک طلسم مسرت و طرب ہے۔ اس کی کون کون سی خصوصیتیں اور کیا کیا لطائف بتائے جائیں اور خوبیاں تو درکنار صرف جھلک جھلک، ہمک، چھلک چھلک، لپک لپک، یک بیک، ہک نہ دھک، مے چاندنی کا سماں، باغ کی عطر پاشیاں، شراب کی شگفتگی، بوسوں کی پرلطف لذتیں، عیش و طرب کا اضطراب، او پھر سب سے آخر میں دل کی اضطرابی کیفیت کی مصوری میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظیر ہی کا حصہ ہے۔ یوں تو ساری نظم سماں بندی میں اپنی مثال دونظیر نہیں رکھتی لیکن اس بند میں صرف ایک لفظ کی تکرار سے اصل سماں اور ساری کیفیت بلا کم و کاست آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نظم فی نفسہ بالکل بے تصنع ہے، زبان صاف اور سستہ ہے، متروکات کا استعمال بہت کم ہے لیکن جمع موصوف کے لئے فعل بھی صیغہ جمع ہی میں لایا گیا ہے، جیسے :-

ہم بھی نشے میں مست تھے ساتی کی پی کے پالیاں
جل کے فلک نے اس میں لائے آفتیں لایہ ڈالیاں
اس قسم کی اور بھی اکثر مثالیں اس نظم میں موجود ہیں۔

ہولی ایک ہندوانہ اور مصورانہ نظم ہے اور شاعرانہ صناعی کی اختراع فائزہ ہے۔ ہولی میں مذہبی عنصر کے علاوہ ایک موسمی پہلو بھی ہے۔ اس لئے نظیر کو یہ تیوہار بہت مرغوب ہے۔ خود ہولی میں شعریت اس قدر ہے کہ نظیر اس سے کسی طرح قطع نظر نہیں کر سکتے تھے۔ نظیر کی پسندیدگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کلیات میں آٹھ نظیں ہولی پر موجود ہیں۔ ہولی کی محفل کا سماں ملاحظہ ہو۔ ہولی کے جشن کی سماں بندی کے لئے کیسے مترنم الفاظ منتخب کئے ہیں :-

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مزدنگ بجی
کچھ تار ظنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھولکی اور مزدنگ بجی
کچھ چھڑیں بن رہا یوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ گھنٹروں کے جھنکے کچھ چھڑیں بن رہا یوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

اور دیکھئے ہولی کی رنگ رلیوں کی مصوری کیسے لطیف پیرائے میں کی ہے :-
ہر جا کہ تھال گالوں سے خوش رنگت کی لکاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری بیکاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ جمایا ہولی نے

پوشا کیں چھڑکی رنگوں کی اور ہر دم رنگ نشانی ہے
کھیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کھیں کھینچتی ہے
ہر جا رطوف خوش حالی کا یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہولی کی یہ نظم حقیقت میں کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ ہر بات اس قدر عریاں، پُرکین اور مؤثر
ہے جس کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جوگی نامہ اور جوگن نامہ دونوں ایک قسم کی نظمیں ہیں۔ انہیں بن ظاہر عاشقانہ اور بہ باطن عارفانہ نظمیں
کہہ سکتے ہیں۔ دونوں میں قریب قریب ایک سے مضامین ہیں اور جذبات بھی نوعیت میں یکساں ہیں۔ فرق
اتنا ہے کہ ایک میں عاشق مرد ہے اور دوسری میں عورت۔ جوگن نامے کی ہر روئے عورت ہے، صرف اس
نحاطہ سے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں نزاکت اور رقت زیادہ ہے لیکن جہاں تک خالص عاشقانہ جذبات
کا تعلق ہے وہ دونوں میں یکساں ہیں۔ اپنی معشوقہ کے فراق میں دیکھئے جوگی کتنا ہے :-

دشت اور کوہ میں وحشی سا پڑا پھرتا ہوں
برق کی طرح سے بیتاب سا پھرتا ہوں
میں غرض تجھ سے صنم جبکہ جدا پھرتا ہوں
رات دن بھر میں جوگی سا بنا پھرتا ہوں

بے قراری سے ترے نام کی جتنا سوسن
اب دیکھے اپنے دلدار کے ہجر میں جو گن دکھ کی ماری کتنی ہے :-
ہجر نے اب تو نہایت کیا بیدم مجھ کو پھرتی ہوں شکل بگولے کی میں ویراں ہر سو
لے لے مے ماہ جیں اسے مرے ہدم گل رد کون سے شہر میں ہے کون سی جا پر ہے تو
لے لے مرے ہدم جاں لے لے جان و تن من

دونوں بندوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوگی کے جذبات میں درد کے ساتھ کسی قدر
کینجی ہے لیکن جوگن کے جذبات میں درد کے ساتھ ایک قسم کی ملاحظت ہے۔ یہ بالیقین اس کی نسائیت
نے پیدا کی ہے۔ جوگی کے خیالات سے بقراری اور اضطراب کا اظہار ہے جسے وہ کسی طرح ضبط نہیں
کر سکتا۔ جوگن کی باتوں سے ہر چند غیر معمولی کرب و اضطراب ٹپک رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مقرر
ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجے کے ضبط کو کام میں لا رہی ہے اور عاشقانہ خود داری کو ہاتھ سے نہیں جانے
دیتی۔ جوگن کی اس خصوصی کیفیت نے اس کے درد میں ایک علو اور اس کے عاشقانہ پندار میں ایک قو
پیدا کر دیا ہے جو جوگی کی عریاں بینابی پر بہت زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔

ان دونوں نظموں کو دیکھ کر لاخالیہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نظیر پورے آرٹسٹ تھے۔ صرف جوگی نا
لکھ کر ان کی سیری نہ ہوئی۔ لکھنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ جوگن نامے کے بغیر عشق کے محاکات ادا
نہیں ہو سکتے نہ آرٹ کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مجتہدین سخن ہی ایسا مکمل ذوق لیکر
آتے ہیں۔ ان ہی کا مجددانہ ذہن اپنے ذوق لطیف کی پوری پوری داد دے سکتا ہے۔ اس ذوق کے
لوگ آہ اس عمل میں ناپید ہیں۔ جوگی جوگن نامے میں انگلستان کے مشہور شاعر اور مصور درد و شیلی کی
معروف نظم ایسٹورس کے سے مضامین ہیں۔ ان نظموں کو اردو میں ایسٹورس کا یا ایسٹورس کو انگریزی میں
جوگی جوگن نامے کا مترادف کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ان دونوں کو ساتھ پڑھنے میں عجب لطف آتا ہے۔ اسی

ضمن میں یہ کہ بغیر نہیں رہا جاتا کہ نظیں طول ہو جانے کی وجہ سے کسی قدر بد مزہ ہو گئی ہیں اور تفصیل کی کثرت نے بھی لطف میں کمی کر دی ہے۔ کہیں تصنع بھی پیدا ہو گیا ہے جس نے نظم کے صن کا ازالہ کر دیا ہے۔ زبان بہت صاف ہے لیکن ہندو مذہب کی اصطلاحوں اور متروکات کے استعمال سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال اس حالت میں بھی نظم کا مجموعی اثر ایک خاص انداز رکھتا ہے جو کسی نوع دلچسپی اور جدت سے خالی نہیں۔

موتی ایک وصافانہ نظم ہے جس میں موتی کی طرح طرح سے تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ موتی کی اس قدر ثنا و صفت کرنا اور ہر زور میں موتی ہی کے صن پر نظر ڈالنا اور صرف اسی کی داد دینا بے معنی نہیں۔ شہباز اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ موتی نظیر کی مشوقہ کا نام تھا اور یہ نظم اسی کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ اب تو نظیر کے موتی کی داد دے بغیر نہیں رہا جاتا۔ نظیر کی 'موتی' ضرور گوہر یک دانہ ہوگی۔ اُن کا انتخاب ہی اُن کے ذوق کی پوری پوری داد ہے۔ موتی میں نظیر دیکھئے کیا کیا ادائیں دیکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو اپنی چیز ہے:-

کبھی وہ ناز میں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے وہ سمرن موتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر زور پر موتی

غلط ہے اس لب رنگیں کو برگ گل سے کیا نسبت کہ جن کی ہے عشق اور اپنے اور یا قوت کو حسرت
اُداسٹ کچھ مہی کی اور کچھ اس پر پان کی رنگت وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جو اہر خانہ قدرت
ادھر نعل اور ادھر نعلیم ادھر مرجاں ادھر موتی

دوسرے بند کا چوتھا مصرع المامی ہے اور اس دنیا کی چیز نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر آباد ایک وصافانہ نظم ہے جس میں نظیر نے اپنے شہر کی خصوصیات بیان کر کے وطن کی محبت

کا حق ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں :-

شہر سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں اگر سے میں بہت ہم نے خوبیاں ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں
رکھو الہی اس کو تو آباد جاوداں

پہلے مصرعے میں نظیر اکبر آباد کو شہر سخن فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں یہاں شعرو سخن کا بڑا چرچا تھا۔ کیونکہ نہ ہو نظیر کا زمانہ تھا۔ جیف صد حیف اب یہاں ذوق کی جنس کس قدر کم یاب ہے۔ اب ذرا اس بند کی شعری لطافتیں ملاحظہ کیجئے۔ مصرعے کس قدر بے ساختہ۔ زبان کس قدر پاکیزہ اور تشبیہیں کس قدر مکمل ہیں :-

ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نور گستری شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو عارض پری
ہر شام بھی وہ مشک ملاحت سے ہے بھری لیلیٰ کی جلد کرنے سکے جس کی ہمسری
دن روئے مہر طلعت و شب زلفِ مہوشاں

اکبر آباد کی آب و ہوا ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہاں کوئی وبانہ پھیلتی تھی۔ اسی خصوصیت پر ناز کرتے ہیں :-

آب و ہوا کے لطف کوئی کیا کیا اب کہے دیکھو جدھر ادھر گلِ عشرت ہیں کھل رہے
ایدھر کو تھمتے ہیں تو ادھر کو چھپے اشجارِ باغ و شہرہ سبز لہلہ
سبزوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں

نظیر نے اپنے شہر میں جو خوبیاں دکھیں وہ آپ کے سامنے کس خوبی سے بیان کی ہیں۔ اس نظم کی زبان کی صفائی اور شعری لطافت کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ سادگی اور شیرینی میں ادبِ قدما کی ہم پلہ ہے۔ یہ نظم شروع بھی نظیر نے دعا کے ساتھ کی تھی اور دعا ہی پختہ بھی کرتے ہیں :-

یاد و عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہا
 ہر طور خوش رہے دل اور طبع شاد کام میری نظیر دل سے یہی ہے دعا دام
 ہنسا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

ذیل کا حصہ دوسری اشاعت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

پوری کا سراپا ایک مصورانہ نظم ہے جس میں نظیر نے اپنا پورا اشعارانہ کمال صرف کیا ہے۔ یہ شاہکار
 لفظی مصوری کا جیتا جاگتا معجزہ اور جزئیات نگاری کا زندہ جاوید کرشمہ ہے۔ اردو زبان کے شعری سرمائے
 میں یہ ایک عظیم النظیر جمال پارہ ہے جسے دنیا کے کسی ادب کے بہترین عہد کے کارناموں کے مقابلے
 میں آسانی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس میں نظیر کا آرٹ اپنی پوری ندرت و قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔
 اس کا لفظی سرمایہ جس سے وہ ہر نوع کی صورت گری پر قادر ہے، ایک بے نہایت گنجینہ ہے جس کے علاوہ
 فطرت نے اسے انتخاب کا لازوال و بے خطا ذوق بھی عطا کیا ہے۔ چنانچہ اس نظم کی مرصع کاری کے لئے
 اس نے اس ودیعی سے پیش از پیش مدد لی ہے اور اپنے بے حساب خزانے کے بہترین جواہر منتخب
 کر کے صورت و معنی کی حیرت ناک طلسم بندی کی ہے۔ لفظوں کی ترتیب، ان کا توازن، ان کا ترنم، سارا اہتمام
 لا جواب و بے نظیر ہے بحر کی موسیقیت ان محاسن پر مستزاد اور اپنی جگہ خود ایک لذت و مسرت ہے۔ پوری
 نظم اول سے آخر تک، انیسویں صدی کی ڈیرے دار میسوا کی ہو بہو تصویر اور اس کے کردار کا سچا مرقع ہے۔
 جس طرح چارلس کنگسلی (۱۸۱۹-۱۸۷۶) نے اپنی مشہور تصنیف ہائیکیشیا میں فریجیا کے وجود اور ناطول فرانس
 (۱۸۴۴-۱۹۲۴) نے طاعن کے لباس میں مصر کی ماقبل و مابعد مسیح سوسائٹی کی طوائف کا کردار پیش کیا ہے،

اسی طرح نظیر نے اس نظم میں بری کے نام سے ایسویں صدی کی ڈیرے دار (طوائف) کے لباس، معاشرت اور کردار کی مصوری کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے نظیر پہلے کا قدرے معاصر اور دوسرے کا مقدم ہے۔ نظم کا مفاد صرف ہمیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بری کے پردے میں، عورت کی فطرت کے بہت سے روز بے نقاب کئے گئے ہیں۔ نسوانی نفسیات کی مرقع کشی، اس وقت نظر کے ساتھ کی ہے کہ جگہ جگہ واقعت کے ساتھ محاکات کا بھی پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ مصوری میں اتنی وضاحت و جامعیت ہے کہ حسن و شباب کی صورتی انراکش و زربائش اور دلستانی کے معنوی اسباب و ذرائع کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نظر انداز نہیں ہوئی۔ عورت کے ناز اور غمزے، عشوے اور کرشمے کے بیان کے ساتھ، عہد کے زمانہ فیشن، لباس اور زیور دہن کا بھی مکمل جائزہ لیا ہے۔ ایسویں صدی کی ایک پُر جمال نازنین، اپنے بھرپور شباب اپنے قاتل الطہ بن اور دلربائی کے سارے فنون و لوازم سے آراستہ پیراستہ ہو کر، اس طرح سامنے آکھڑی ہوتی ہے کہ یکایک آنکھیں چاندھیا جاتی ہیں اور بے اختیار دل پر بجلی سی گر پڑتی ہے۔ فیشن کی تبدیلی کے ساتھ، بہت سے پُراٹے زیور اور کپڑے موقت سلع کی مجاہدہ کرتے ہوئے ہیں لیکن ان کے نام اور ان کی لفظی تصویریں اس نظم میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ یہی حال اداؤں اور دل بھانے کے بہت سے طریقوں کا بھی ہے۔ چنانچہ، اپنے حدود کے اندر، یہ نظم، لباس اور زیور دہن کے ناموں کی ایک قاموس اور عشوہ گرمی کے مرقعوں کی ایک انجم ہے، جو معاشرت کی تاریخ کے ایک باب کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان محاسن سے بالاتر، صفت اور اسم صفت کا جیسا نادر و بدیع استعمال، اس نظم میں میسر آتا ہے وہ اردو ادب کا ایک لسانی انگوٹہ ہے۔ ملن کی طرح، نظیر کو بھی دو صفتیں استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے۔ چنانچہ، اس نظم کے مصرعے مصرعے میں ایک اسم کے لئے دو دو صفتیں نظر آتی ہیں۔ پہلے بند کے پانچوں مصرعوں اور پھر ہر بند کے پانچوں مصرعے میں، اسم صفت بہ طور قافیہ استعمال ہوا ہے اور لفظی حیثیت سے ہر محل پر نینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ معنوی اعتبار سے، پانچواں مصرعہ، کیفیات و تاثرات کا نقطہ شروع ہے جس کی بنیاد

لطافت و موسیقیت بر قائم ہے۔ اس نظم میں نظیر کے تصور کی نزاکت و شگفتگی نے، الہامی و ماورائی قوت کا مظاہرہ کیا ہے جو اس کے عظیم الشان فطن ہونے کی گھلی ہوئی دلیں ہے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے:-
 خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غمزدوں کی جھکاوٹ ویسی ہے مرزگوں کی سناں، انظروں کی اتنی، ابرو کی کھچاؤٹ ویسی ہے
 عیار نظر، مکارا داد، تیوری کی چڑھاؤٹ ویسی ہے قتال نگہ اور دشت غضب، آنکھوں کی لگاؤٹ ویسی ہے
 ہلکوں کی جھپک پتلی کی پھرت، سرے کی کھلاؤٹ ویسی ہے

اس بند میں تشبیہوں کے اہتمام نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ مجوبیت و عشوہ گری کے سارے لوازم کو، ایک نوع کی چیزوں سے تشبیہ دے کر، شاعر نے اپنی صناعتانہ عظمت ظاہر کی ہے۔ تیسرے مصرعے میں ”نگہ“ کو ”قتال“ کہہ کر اس کی بار بار قتل کرنے کی عادت بتائی ہے۔ یہ استعمال نظیر کی اختراع و ذائقہ ہے لیکن غمزدوں کی جھکاوٹ، ابرو کی کھچاؤٹ، تیوری کی چڑھاؤٹ، آنکھوں کی لگاؤٹ، ہلکوں کی جھپک پتلی کی پھرت، سرے کی کھلاؤٹ جیسے جلوں کی وضع و تراش اور ان میں اسم صفت کا نادر و غیر منکر استعمال، غائب نمیکری و نفسی مطالعے کی شہادت اور نظیر کے حصے کی جدت طرازی ہے۔ ان جلوں میں دنیائے معانی پنہاں ہے اور ان لفظوں کا یہ استعمال اردو میں کہیں میسر نہیں آتا۔ دوسرا بند ملاحظہ ہو:-

جو کافر اس کا عالم ہے، وہ عالم جو رکساں پاوے گر پردہ منہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجائے
 جب ایسا حسن بھجھو کا ہو، دل تاب بھلا پھر کیا لائے وہ کھڑا جانکد کا کھڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے
 گالوں کی دھک، خوبی کی جھک، رنگوں کی کھلاؤٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں ”کافر“ پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے اور آگے کے بندوں میں مختلف تنوعات کے ساتھ بار بار سامنے آتا ہے۔ اس مصرعے میں ”عالم“ کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ، اس ایک لفظ میں دلربائی کی وہ پوری کیفیت سمودی ہے جو حسن، شباب، آرائش اور ناز و غمزدے کے مجموعی اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ”ایک نور صورت، ہزار نور کپڑا، لاکھ نور خرا“۔ یہاں ”عالم“ کی معنویت دہم گہری صورت

آرائش اور دلستانی کے فنوں کی مجموعی کیفیت کو محیط ہے۔ دوسرے مصرعے میں ”پردے“ سے گھونٹ مراد ہے۔ اس عہد کا یہ فیشن تھا کہ ہر عورت خود کسی بطعے کی ہو، قدرے قلیل گھونٹ ضرور نکالتی تھی۔ اس نوع کا گھونٹ اصطلاح میں کانٹا گھونٹ کہلاتا ہے۔ یہ عواند کا جزو اعظم تو تھا ہی لیکن اس سے عورت کی جاذبیت بہ مدارج بڑھ جاتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں ”پردے“ کی جگہ ”نظیر“ نے گھونٹ ہی استعمال کیا ہو اور کتابت کی حرفت سے بدل کر ”پردہ“ ہو گیا ہو۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں ”محسن“ کے لئے ”بہ بھجھو کا“ اور کھڑے کے لئے ”چاند کا ٹکڑا“ کیسی محبوبہ ہو، مفصل اور نام تشبیہیں ہیں۔ میں اپنی پسند کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، لیکن مجھے ”چاند“ کی جگہ ”چاند کا ٹکڑا“ کہنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ پانچویں مصرعے میں ”گالوں کی دھک“، ”خوبی کی جھک“، ”رنگوں کی کھلاوٹ“، ”بڑے پر مغز جٹے اور بڑا کیزہ بیان ہے۔ گالوں کے لئے ”دھک“ اور رنگوں کے لئے ”کھلاوٹ“ کا انتخاب ایک دقیقہ رس مصور سے ممکن ہے لیکن ”دھک“ اور ”کھلاوٹ“ جیسی دو کیفیات میں خود امتیاز کرنا اور دوسروں کے پیش نظر کر دینا صرف نظیر کی نظر اور قوت بیان کا حصہ ہے۔ ”خوبی کی جھک“ بھی اپنی جگہ نہایت نادر و بدیع ہے۔ تیسرا بند ملاحظہ ہو:-

تھی زورِ ادا سے سرا پر، سنجاف ڈوپٹے کی اُلٹی بدلائیں، تصویرِ جبین، جگر کی مینڈیں، نیچی کسنگھی
دل چنچ نہ کھاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ اُسے لکھے کیونکر جی وہ رات اندھیری بالوں کی، وہ مانگ چمکتی بجلی سی

زلفوں کی کھلت، پٹی کی جبت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں ”زور“ نظیر کا خاص لفظ ہے جسے وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ خوب، بڑے عجیب وغیرہ وغیرہ الفاظ کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ یہاں ”زور“ عجیب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ ڈوپٹے کی سنجاف سر پر جس ادا سے اُلٹی ہوئی تھی، اُس کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔ ڈوپٹے کی سنجاف اُلٹ کر یہاں شاعر نے بڑی مصوری کی ہے۔ بقیہ چار مصرعوں میں ربط و تسلسل صرف، اس اشارے سے پیدا کیا ہے۔ سنجاف اُلٹنے سے سر کھل گیا ہے اور بدلائیں، تصویرِ جبین، جگر کی مینڈیں اور نیچی کسنگھی

نمایاں ہو گئی ہے۔ کنپٹی کے چھترے بال زلف کہلاتے ہیں۔ اس بند میں نظیر نے زلف کی جگہ ہندی لفظ لٹ استعمال کیا ہے جو بلدار کے ساتھ ترکیب پاکر اس سیاق میں زلف سے زیادہ حین معلوم ہوتا ہے۔ بل دار زلفیں اگر کہا جاتا تو بل دار لٹوں سے زیادہ حین نہ ہوتا۔ انیسویں صدی اور بیسویں کے پہلے ربع تک مینڈیں گوندھنے کا رواج تھا۔ سنگھار کے وقت کنپٹی کے بال تو آزاد چھوڑ دئے جاتے تھے اور کانوں کے تھے کے کچھ بال گوندھ کر، باریک چٹیاں بنائی جاتی تھیں جو سر کے دونوں پہلوؤں پر سے گزر کر، چوٹی کے ساتھ گوندھ جاتی تھیں۔ اس نوع کی گندھاوٹ کا نام مینڈیں تھا۔ جگر طمی مینڈیں سے، یہاں کسی ہونی مینڈیں مراد ہے۔ جس کو تصویر کہنا بھی بڑا یا کینرہ استعارہ ہے۔ مینڈیں گوندھنے کی طرح، اس عہد میں پٹی جھکانے کا بھی رواج تھا۔ مانگ کے دو طرفہ، پیشانی پر بال جھکا کر، اس طرح جمائے جاتے تھے کہ ماتھے پر، ابروؤں کے مقابل دو ہلائی شکلیں بن جاتی تھیں۔ اس کو پٹی جھکانا کہا جاتا ہے اور اسی کا نام نیچی کنگھی بھی تھا۔ تیسرے مصرعے میں بلدار لٹوں اور نیچی کنگھی کا قلب پر اثر دکھایا ہے۔ چوتھے مصرعے میں نیچی کنگھی یعنی پٹی کو معنائیں دھری را کے جھکاؤ سے مشابہ کیا ہے اور استعارہ بالکنایہ سے یہ لطیف پہلو پیدا کیا ہے۔ چلتی بجلی سے مانگ کی تشبیہ بھی نہایت نادر ہے اور ”سی“ کے اضافے سے، حُسن بیان کا حق ادا کیا ہے۔ پانچویں مصرعے میں زلفوں کی طغلت سے بلدار لٹوں، پٹی کی جمّت سے نیچی کنگھی اور چوٹی کی گندھاوٹ سے جگر طمی مینڈوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس اشارے سے، اس بند کا معنوی تسلسل اور مضورانہ کیفیت و اثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اسمائے صفت کے بدیع استعمال کا حوالہ التزام پہلے بند کے قافیوں سے شروع ہوا ہے، وہ اس بند میں بھی موجود ہے اور پوری نظم میں قائم ہے۔ اب چوتھا بند ملاحظہ ہو:-

دل تحت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
وہ آنکھیں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی پسیلی سی
بے درد و مستم گر بے پرواہ، بچھل، بے کل، چٹکیلی سی
دوروں کی بان رنگیلی سی، کاجل کی آن کشتیلی سی
چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ دیسی

اس بند کے پہلے دو مصرعوں میں پری کے کردار کے چند پیش پا افتادہ اور نمایاں اجزا پیش کئے ہیں۔ تیسرے میں جسمانی آرائش کا کچھ بیان ہے اور چوتھے اور پانچویں میں سخن صورت کے دلبرانہ عنوانات کی تفصیل ہے۔ پہلے مصرعے میں صوری اعتبار سے ہائے موحده اور جیم فارسی کا مخلوط الیٹریشن (تواتر حروف) اور چھل اور چٹکیلی جیسے لفظوں کا انتخاب اور حسن استعمال قابلِ داد ہے تیسرا مصرعہ خصوصیت سے بڑا مصورانہ ہے۔

دوہوں سے آنکھوں کے لال لال ڈورے مراد ہیں۔ دُوروں کی صفت بان اور بان کی صفت رنگیلی ہے۔ اسی طرح کاجل کی صفت آن اور آن کی صفت کیشلی ہے۔ بان کے مقابلے پر آن اور رنگیلی کے مقابلے پر کیشلی لانا قادرا لکھامی اور مصوری کے کمال کا ثبوت ہے۔ چوتھے مصرعے میں آنکھوں کی تعریف میں بھی ایسی ہی مصوری اور ایسے ہی متوازن الفاظ سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ ”سی“ کے استعمال نے اس پورے بند میں بڑی معنویت پیدا کر دی ہے۔ چار مصرعوں میں ”سی“ ردیف کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے درمیان میں بھی ”سا“ اور ”سی“ کے وجود نے ایسی ہی لذت پیدا کر دی ہے۔ الفاظِ نظیر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ پانچویں مصرعے میں جتوں کے لئے دغا کہنے کے بعد نظروں کے لئے کپٹ تلاش کر لینا، قوتِ انتخاب و جویائی کا کارنامہ ہے۔

”سینوں کی لڑاوٹ“ بالکل نیا اور انوکھا انداز بیان ہے اور نظیر کے اولیات میں سے ہے۔ اس سے شباب کے جارحانہ عالم کی عکاسی کی ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا مترادف، ایگریسولی یوتھفل، موجود ہے مگر اردو میں اس کے وضع کرنے کا شرفِ نظیر کو حاصل ہے۔ اب پانچواں بند ملاحظہ ہو:-

اس کافر بنی اور تہ کے انداز قیامت شان بھرے اور گھرے چادرِ زخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے وہ نئے صاف ستارہ سے اور موتی سے دامان بھرے وہ کانِ زبے طوفان بھرے، کن پھولوں با جان بھرے

بندوں کی ہلت، بھٹکوں کی بھٹکت، بالے کی ہلاوٹ دسی ہے

اس بند میں ناک اور کان کے حسن اور ان کے زیوروں کی دلکشی کا ذکر ہے۔ ملن نے اپنے کلام میں جابجا دو

صفتیں اس طور پر استعمال کی ہیں کہ ایک اسم سے پہلے آتی ہے اور دوسری بعد کو۔ اسی طرح نظم کو بھی کئی کئی صفتیں استعمال کرنے کا شوق ہے اور اس نظم میں یہ التزام ہر بند میں موجود ہے۔ اس بند کے پہلے مصرعے میں پہلے تو بینی اور نتھ کو کافر کہا ہے اور پھر ان کے انداز کو ”قیامت“ اور ”شان بھرے“ کہا ہے۔ ”قیامت“ شان، ”گواگر“ ستم ظریف“ کی قسم کی ترکیب سمجھا جائے تو معنی میں دوسری قسم کی ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناگ میں نتھ پہننے کا رواج، ہندی عوام اندرین کا ایک اہم جزو ہے۔ اس لئے اس کو کافر کا لقب دینا، بڑا دلکش انداز بیان ہے۔ اس نظم میں جس عہد کا کردار پیش کیا گیا ہے، اس میں نتھ کا رواج عام تھا اور یہ زیور سہاگ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہاں نتھ کو نتھنی سے تمیز کرنے کی ضرورت ہے۔ نتھنی کنواری لڑکیوں اور نتھ سب ہی عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ دوسرے مصرعے میں، زرخداں کو چاہ کہا ہے جو اردو شاعری کا ایک عامۃ الوردو استعارہ ہے لیکن اس کو ”گھر“ اور ”آفت کے طوفان سے بھرتا کر، اپنے مخصوص انداز بیان کے سلیخے میں ڈھال دیا ہے۔ یہ بند چہرے کے بعض خاص اجزاء کے جن کی تعریف کے لئے مخصوص ہے، اس لئے زرخداں کا ذکر ہے، لیکن زرخداں چونکہ نتھ کے پس منظر کے طور پر بھی سامنے آتی ہے، اس لئے بھی اس کا ذکر ضروری تھا۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں کان کی لوا اور کان کے زیوروں کا ذکر ہے۔ کانوں کی آرائش کن پھولوں سے کی ہے اور کن پھولوں میں بالے پڑے ہیں۔ یہ سب چیزیں گول ہوتی ہیں اور ہمیشہ کم و بیش جنبش کرتی رہتی ہیں۔ ان کی گولائی اور جنبش سے ذہن، چکر کی طرف منتقل ہوتا ہے اور چکر، طوفان کا لازمہ ہے۔ اس نسبت سے کان کو طوفان بھرا کہا ہے۔ استعارہ بالکنایہ کی یہ ایک نہایت لطیف و نازک مثال ہے جس کی بنا پر نظم کو اعلیٰ فن کا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ پانچواں بند بتاتا ہے کہ کن پھولوں اور بالوں کے علاوہ کانوں میں بندے اور سجھکے بھی ہیں۔ چنانچہ بندوں، جھکوں اور بالوں کی دلربائی کا طریقہ الگ الگ اسم صفت سے ظاہر کیا ہے۔ بندوں کے لئے ہلت، جھکوں کے لئے جھکت اور بالے کے لئے ہلاوٹ کہہ کر ان کے مخصوص انداز دلربائی کی مصوری کی ہے۔ الفاظ کی اس نوع کی فطرت شناسی، مصوری کے علاوہ، لسانی

بصیرت کا بھی معجزہ ہے۔ اب چھٹا بند ملاحظہ ہو:-

چہرے پر حسن کی گرمی سے ہر آن جھلکتے موتی سے خوش رنگ پسینے کی بوندیں، سوار جھلکتے موتی سے ہنسنے کی ادائیں پھول جھڑپیں، باتوں میں ٹپکتے موتی

پاؤں کی رنگاؤں، دھڑکیوں کی جاوٹ ویسی ہے

یہ بند، نظیر کی خلاقانہ قدرت کا شاہکار ہے۔ حسن کی گرمی، حسن کی شدت و فراوانی سے ہے اور چہرے پر پسینے کی بوندیں حسن کی گرمی نے پیدا کی ہیں۔ پسینے کی بوندیں گول اور چمکیلی ہوتی ہیں اس لئے موتی کی طرح جھلک رہی ہیں۔ یہ بوندیں، پری کے چہرے کے پسینے کی بوندیں ہیں، اس لئے خوش رنگ ہیں اور ایک بار کی جگہ سو سو بار جھلک رہی ہیں۔ اس بند میں اگرچہ قوس قزح کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر خوش رنگ پسینے کے موتیوں کی جھلک سے میرا ذہن خواہ مخواہ اس طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہنسنے میں پھول جھڑپا، باتوں میں موتی ٹپکتا، ہونٹوں کا پتلہ پن اور دانتوں کا موتی کی طرح چمکنا، سب حسن صورت کے نہایت پاکیزہ اور دل فریب لوازمات ہیں جن سے پری کے حسن کی شگفتگی و دل پذیری کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ پانچویں مصرعے میں پاؤں کی مہندی کو بجا طور پر تہر وستم بتایا ہے۔ بیسویں صدی کے اول ربع تک ہونٹوں پر مٹی کی دھڑی جمانے کا فیشن تھا۔ مٹی کی سیاہی، پان کی سرخی سے مل جل کر، ہونٹوں پر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی جو قلب و نظر کو بہت متاثر کرتی تھی۔ اس کو لاکھا جمانا بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی ساری کیفیت، جاوٹ سے ظاہر کی ہے۔ اب ساتواں بند ملاحظہ ہو:-

تقریر بیان سے باہر ہے وہ کاف حسن ادا ہا کچھ آپ نئی، کچھ حُسن نیا، کچھ خوش جوانی کا ادھکا لپکیں، جھپکیں، ان باہوں کی یار ویں واہ کہوں کیا کیا وہ بانجھے باز و ہوش رہا، عاشق سے کھیلےں بانجھ پٹا

پہنچی کی پہنچ، پھونچے پر غضب، بانگوں کی بندھاؤٹ ویسی ہے

اس بند میں حسن اور شباب کی منح سرائی ہے۔ اٹھتی جوانی کا عالم ہے اور حسن میں شگفتگی ہے۔ پہلے مصرعے

میں ”ابا بابا“ کے فحاشیہ استعمال سے، قلب پر اُحس اور شباب کا متحدہ اثر دکھایا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ”اپنی“ سے جوانی کے اٹھان اور اللہ پن کی طرف اشارہ ہے۔ ”حسن نیا“ سے تازگی و شگفتگی مراد ہے۔ ان دونوں جملوں کے ساتھ ”کچھ“ نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ ”او مکا“ کے معنی، میں تحقیق نہ کر سکا مگر قریب سے ”چھجا جانا“ معلوم ہوتے ہیں یعنی جوانی کا جوش چھایا ہوا تھا۔ تیسرے مصرعے میں جوانی کے جوش کے اثر و اقتضا کی مصوری کی ہے۔ باہوں کی لپک جھپک، طبیعت کی شوخی، چلبیلے اور بچکے پن سے پیدا ہے۔ تیزی و طراری کے لئے لپک جھپک کا انتخاب نہایت موزوں ہے اور باہوں کی حسین اضطرابی حرکات کی سچی مصوری ہے۔ ”لپک جھپک“ کے لفظ کو اپنی حرکت سے کچھ ایسی صوتی مناسبت ہے کہ اس کا تلفظ اپنے متلازم فعل کی خود بخود صورت گری کرنے لگتا ہے۔ ایسے الفاظ بردے کار آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان پر عسرت و تہی مائیکسی کا الزام بے بنیاد ہے۔ یہ زبان نوع بہ نوع تصورات و مفاہیم سے مالا مال ہے اور کسی قسم کے اظہار و بیان سے عاجز و قاصر نہیں۔ تلاش و نظر کی شرط سے ہر قسم کا لفظ اور انداز بیان میسر آ سکتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں، نظیر نے پہلے لپک جھپک کی مصوری کی ہے اور پھر خود ہی ”سواہ“ کہہ کر اس کی داد بھی دی ہے۔ چوتھا مصرعہ اعلیٰ شاعری اور اعلیٰ مصوری کی جان ہے۔ پری کی اٹھتی جوانی ہے۔ اس کے بازو بھرے بھرے جوش شباب سے صحت و در تنومند اور گول گول ہیں۔ صحت وری عورت کا بڑا اُحس ہے اور بعض کے نزدیک عین اُحس ہے۔ بانکا اس زمانے کا فیشن ابل سپاہی تھا، اس لئے حسین اور چمکی چیزوں کا بانکے سے استعارہ کیا جاتا تھا۔ نظیر نے بھی پری کے بازوؤں کی صحت وری اور تنومندی کا بانکے سے استعارہ کیا ہے۔ اسم کے دائیں بائیں، دو صفت لانے کا التزام و اہتمام یہاں بھی موجود ہے۔ بازو بانکے بھی ہیں اور ہوش ربا بھی ہیں۔ اپنے سڈول پن کے حسن اور اپنی صحت وری کے گداز دونوں سے ہوش ربانی کرتے ہیں۔ یہ تو ان کا ہر نظارگی کے ساتھ عام سلوک ہے لیکن عاشق سے بانک پٹا کھیلے ہیں گویا جھک کر برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پانچویں مصرعے میں، پنہنی کی تقدیر کی رسائی پر بالکل نیا یہ رشک کیا ہے۔

غضب کہہ کر رشک و تحین دونوں جذبوں کو ایک بیان میں سمویا ہے۔ اس مصرعے کا آخری ٹکڑا ”بانگوں کی بندھاوٹ ویسی ہے“ نظیر کے حصے کا شاہدہ اور بیان ہے۔ ذوقِ حسنِ نگر کا یہ انتہائی کمال ہے کہ اُسے ”بندھاوٹ“ میں بھی حسنِ نظر آئے۔ نظیر کی حسنِ پرستی کا یہ نقطہ عروج ہے کہ اُسے پری کے بازو پر بانگ کی بندھاوٹ بھی ایک منفرد جمالِ نظر آتی ہے۔ بانگے، بانگ پٹا اور بانگ میں جو تھیں ہے وہ لطف بالائے لطف ہے اور چوتھے پانچویں مصرعوں میں بائے موحہ اور بائے فارسی کا جو الٹیریشن (تواثرِ حرف) ہے وہ اس پرستِ زاد ہے۔ اب آٹھواں بند ملاحظہ ہو:-

وہ گوئے گوئے ہاتھ غضب وہ نرم کلائی ناز بھری کچھ شوخ کرٹوں کی جھنکاریں کچھ جھنکے چوڑی ہاتھوں کی
یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینے میں نہ تڑپے کیونکر جی وہ پیاری پیاری انگشتیں، وہ پوریں نازک نازک سی
ہندی کی رنگت، اندق کی بنت پھلوں کی بھلاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں ”گوئے گوئے سے“ صرف ہاتھوں کی فطری سادگی اور سحر اپن دکھایا ہے۔ پھر کلائی کو دو صفتوں سے موصوف کر کے ”نرم اور ناز بھرا“ کہا ہے۔ یہاں پھر نظیر نے اپنی رمز شاسی اور زبانِ مافیٰ کا ثبوت دیا ہے۔ کلائی بازو کے مقابلے میں نازک تر عضو بدن ہے اور عورت کی کلائی خصوصیت سے، اپنی نزاکت کے لئے ضربِ المثل ہے۔ ہاتھ کا حُسن یہ ہے کہ وہ بھری بھری اور نرم مند ہو۔ کلائی کا کمال یہ ہے کہ وہ پتلی اور نازک ہو۔ دوسرے مصرعے میں کرٹوں کے لئے جھنکار اور چوڑی کے لئے جھنک کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ کا صوتی فرق، فوراً جلبِ توجہ کرتا ہے۔ چوڑی کرٹے کے مقابلے میں نازک زیور ہے اس لئے اس کی آواز، کرٹے کی آواز سے زیادہ نرم اور شیریں ہے۔ جھنکار اور جھنک کا صوتی فرق سمجھنے والے، شاعر کی قوتِ امتیاز کی نزاکت کی داد دے سکتے ہیں۔ تیسرا مصرعہ خالص شاعرانہ ہے اور چوتھے میں انگلیوں اور پوروں کے حُسن و محبوبیت کی تعریف کی ہے۔ پانچویں مصرعے کو چوتھے سے خاص ربط ہے۔ ہندی کی رنگت سے مراد یہ ہے کہ تلوؤں اور انگلیوں میں ہندی رچی ہوئی ہے۔ ”اندق، خوابہ، سر انگشت کو کہتے ہیں۔

اس جزو کا ذکر علیحدہ کر کے یہ بتایا ہے کہ پور کا حُن، انگلی کے حن پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس فوقیت کی وجہ یہ ہے کہ پور پر چھلنے کی موجودگی نے 'خاص جال' پیدا کر دیا ہے جو "بنت" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ پرانی آرائش میں انگلیوں کے پور پر پور چھلا پہنا جاتا تھا۔ اس مصرعے میں نظیر نے لسانی اجتہاد کیا ہے اور لفظ گر (نیو لوجسٹ) کی یہی خدمت بڑی قدرت کے ساتھ انجام دی ہے۔ چھلے سے چھلاوٹ اسم صفت بنا کر، اس نے چھلے کی دلکشی کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وضع کر دیا ہے جو اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اب نواں بند ملاحظہ ہو:-

کچھ ناز واد کی مغروری، کچھ جو رجف کا بانک پنا کچھ آمد حُن کے موسم کی، کچھ کا فر جسم رہا گدرا
یہ شور جوانی اٹھتی کا آتا ہے امتد کجوں دریا وہ سینہ ابھرا جوش بھرا وہ حُن کا عالم جھوم رہا
شاؤں کی اکڑا، گردن کی حرمت، مونڈھوں کی کھنچاؤٹ ویسی ہے

اس بند کا لطف و کیفیت اپنی جگہ نرا لاس ہے۔ اس میں شباب اور لوازم شباب کی مصوری کی گئی ہے۔ پہلے مصرعے میں مغروری کا لفظ نمائش کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور "بانک پنا" تیکھ پن کا مفہوم ادا کر رہا ہے۔ شباب کی آمد کے وقت، خود نمائی کا جذبہ، عورت میں بہ شدت کا فر ماہوتا ہے اور اس نمائش میں ایک قسم کا تیکھ پن پیدا کر دیتا ہے جو نظارگی کے لئے اس عالم کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس عالم کو ایکریسو اور فارسی غاورے میں گوسوز کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں "آمد" رسیدگی اور "موسم" جوانی کا مترادف ہے۔ یہاں موسم کا استعمال باجواب اور قابل داد ہے۔ چونکہ عنوان شباب ہے، اس لئے جسم میں گدرا ہٹ پیدا ہو رہا ہے۔ گدرا ہٹ کا مفہوم کسی شرح و وضاحت کا محتاج نہیں ہے لیکن جو جسم گدرا رہا جو اسی کی صفت میں کا فر لانا مشاہدے، محل شناسی اور مصوری کا انتہائی کمال ہے۔ گدرا ہٹ کے ساتھ جسم میں جو بھرا بھرا پن اور اعضا میں جو گولائی، تناسب اور جا ذمیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ صمیمیت کا لازمی ہے۔ اس لئے اگر گوشت پوست کے جیتے جاگتے صنم کو جو ایمان فریبی دہوش ربائی کے اعتبار سے کفر مجسم ہے،

کافر کہا جائے تو اس کی تائید میں مبالغہ نہ ہوا۔ تیسرے مصرعے میں ”شور“ کے انتخاب سے بڑی شاعرانہ قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ جوانی کے لئے ”شور“ کے استعمال سے جوانی کی عالم آشوبی کا اعلان کیا ہے۔ جمالی کیفیت یا عالم کے لئے، لفظ منتخب کرنے کے سلیقے کا ثبوت اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ جوانی کے جوش، اس کی بیاہی، اس کی بلند آہنگی کے مظاہرے کے لئے ”شور“ سے بہتر لفظ تیسرے نہیں آ سکتا تھا۔ اسی مصرعے میں اٹھتی جوانی کے شور کو امینڈ کرانے والے دریا سے تشبیہ دی ہے جو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ ہندی زبان کے کسی شاعر نے جوش شباب کو بھنور سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے:-

جیسے بھنور پڑے ندیا میں جو بنائے ڈٹے انگیا میں

مگر تشبیہ، نظیر کی تشبیہ سے زیادہ جامع اور مکمل نہیں ہے۔ اس سے جوانی بچھٹی پڑنے کا مفہوم تو پورا پورا ادا ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے دوسرے لوازم و مفاہیم شہنہ رہ جاتے ہیں۔ دریا امینڈ کرانا، خود ایک محاورہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ تشبیہ کے سلیقے میں ایک محاورے کا لطیف استعمال بھی پیش کر دیا ہے۔ چوتھے مصرعے کا پہلا حصہ ”تیسرے مصرعے کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ اسی مصرعے کے آخر میں ”عالم جھوم رہا“ لکھ کر یہ دکھایا ہے کہ حسن و شباب آپ اپنے نشے میں سرشار رہتے ہیں۔ یہاں تصویر کا تکرار ہو جاتا ہے۔ پانچویں مصرعے میں حسن صورت کی مزید تفصیل دی ہے۔ اگر تناؤ کے معنی میں ہے اور طرٹ خم گردن کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ یہ خم، خم ہے جو گردن کو صراحی دار بنا کر مینا کا ہم شکل کر دیتا ہے۔ مونڈھوں کی کھنچاؤٹ کے معنی گداز و تناؤ کے ہیں جو ایک صحت و ر بدن کے حسن کے اہم اجزاء ہیں۔ اب دسواں بند ملاحظہ ہو:-

یہ کافر گدی کا عالم گھبرائے پری بھی دیکھ جسے اور گورا صاف گلا ایسا، بہہ جاوے موتی دیکھ جسے
دل بوٹے ٹپے ہاتھ لے اور غش کھاوے جی کھ جسے وہ گردن اونچی جن بھری، کٹ جائے صراحی دیکھ جسے
دائیں کی طرٹ، بائیں کی بھرت، کوٹھوں کی کھنچاؤٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں، نہایت لطیف کوائے سے، گدی کی سفیدی کو بری کا ہرنگ بتایا ہے۔ پانی پانی ہوا شرمندگی کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں گورے صاف گلے کی چمک کو موتی کی دنگ سے تشبیہ دی ہے لیکن موتی، اس کے مقابلے میں، اپنے کو اتنا حقیر سمجھتا ہے کہ شرم سے پانی پانی ہو کر بہا جا رہا ہے۔ تیسرے مصرعے میں عاشق کے قلب کی کیفیت ظاہر کی ہے۔ چوتھے میں اونچی، حسن بھری گردن کو صراحی سے مشابہ کیا ہے۔ صراحی سے، گردن کی تشبیہ، اگرچہ عامۃ الورد ہے لیکن، اس سے بہتر میسر بھی نہیں آتی۔ نظیر نے اس کی عمومیت کو اپنے انداز بیان سے زائل کیا ہے۔ پانچویں مصرعے کے قافیے میں، کتابت کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔ قلمی نسخے اور شہباز ایڈیشن دونوں میں یہ مصرع ایک ہی طرح ہے، پھر بھی میرا خیال یہ ہے کہ یہاں ”مونڈھوں“ کی جگہ ”گوٹھوں“ ہونا چاہیے۔ مونڈھا، کندھے کو کہتے ہیں اور گوٹھا پتھر کے اوپر کے حصے کا نام ہے۔ اس مصرعے میں، دائیں اور بائیں کے ساتھ، مونڈھوں کے مقابلے میں گوٹھوں زیادہ قرین سیاق ہے چنانچہ اس مصرعے میں چوتڑوں کی منضبط جنبش اور گوٹھوں کے بھاری پن کا بیان ہے۔ گوٹھوں کا گداز، عورت کی صحت کی علامت ہے اور پیکری حسن کا خاص جز سمجھا جاتا ہے۔ اب گیارھواں بند ملاحظہ ہو:-

اس سینے کا وہ چاک ستم، اس کرتی کا تنزیب غضب
اس قد کی زینت تھریلا، اس کا فرحبب کا زیب غضب
اُن ڈبیوں کا آزار بُرا، اُن آگینوں کا آسیب غضب
وہ چھوٹی چھوٹی سخت کپیں، وہ سچے سچے سیب غضب
انگیا کی بھرٹک، گوٹوں کی جھمک، بندوں کی ساوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں، سینے کے چاک سے، کرتی کا گریبان مراد ہے جس میں سے انگیا چمک رہی ہے، نفاست پسند عورتیں ہمیشہ ہمیں سے ہمیں کپڑے کی انگیا پہنتی ہیں۔ بعض کپڑے، اس جزو لباس کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں سے ایک تنزیب بھی ہے۔ تنزیب نہایت باریک قسم کی ٹمبل کا نام ہے۔ چاک کو ستم اور تنزیب کو غضب کہہ کر، دونوں مناظر کے اثر میں توازن پیدا کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں قد

کی موزونیت کو تہربا بتا کر، رعنائی کا مجسمہ بنایا ہے۔ کافر کی طرح، چھب بھی نظیر کا بڑا محبوب لفظ ہے اور کلام میں جگہ جگہ وارد ہوا ہے چھب کے معنی میرے نزدیک یہاں حسن و شباب کا مجموعی اثر ہے۔ لطیف صبا کے خیال میں چھب تختی کے معنی انگریزی لفظ ”پروفیل“ کے مترادف ہیں۔ یہاں ”چھب“ کو کافر کہہ کر پری کی دلربائی کو بہ مدارج بڑھا دیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں، ڈبیوں اور گیندوں سے پستانوں کا استعارہ کیا ہے اور ان کے کیف و اثر کو ایک جگہ آزار اور دوسری جگہ آسیب کہا ہے۔ آسیب، آزار سے شدید تر آفت ہے اور قسم میں بھی اس سے جدا ہے۔ آزار کا تعلق مادیت سے بھی ہے مگر آسیب، خالص غیر مادی، بلا ہے۔ اس لئے دوسری تشبیہ پہلی کے مقابلے میں نہ صرف نئی ہے بلکہ قوی اور اہم بھی ہے۔ فیالشباب کے کیف و اثر کو اب تک آسیب سے تشبیہ نہیں دی گئی۔ یہ نظیر کے حصے کی بات ہے۔ چوتھے مصرعے میں، تیسرے کی مفصل شرح و وضاحت کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی، ”سخت“ اور ”کچے کچے“ کے استعمال سے مصوری کا حق ادا کیا ہے۔ پانچواں مصرعہ، تیسرے اور چوتھے سے لازمی طور پر پیدا ہے۔ پستانوں کی لغزش کے ساتھ، انگلیا کی تباہی لازمی ہے۔ ”بھڑک“ انتہائی دلکشی کے انہماک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انگلیا، نہایت بھڑک دار ہے۔ عہد کے فیشن کے مطابق، اس میں نظر فریب گوٹ بھی لگی ہوئی ہے جو اپنی بھڑک الگ دکھا رہی ہے۔ انگلیا کے بندہ کس کس کر باندھے گئے ہیں، جو جوانی کا اقتضا ہے۔ جوان عورت، عادتاً، انگلیا کے بندہ کس کس کر باندھتی ہے۔ تیسرے چوتھے اور پانچویں مصرعوں میں جس نقطہ نظر سے مصوری کی گئی ہے، اس کا مطالبہ یہی ہے کہ سنگھار کے التزام و انتہام کا عروج، ”کساوٹ“ سے ظاہر کیا جائے۔ اب بارہواں بندہ ملاحظہ ہو:-

اس گورے گورے سینے پر وہ گنے کی گلزار کھلی
چھپے کی کالی ہیرے کی جڑی توڑے جگنو ہیل، بدھی
دل توڑے تڑپے ہاتھ ملے اور جائے نظر ہر دم پھیلی
وہ پیٹ ملائی سا کافر، وہ ناف چسکتی تارا سی
شوخی کی ٹھلاوٹ اور تم، شرموں کی چھپاوٹ، ویسی ہے

اس بندیں زیور کا بدن سے تعاون دکھا دیا ہے۔ ہیرے جڑی جمیا کٹی، توڑے، جگنو، ہیکل اور بدھو نے مل کر گورے گورے سینے پر ایک بلغ کھلا رکھا ہے۔ انواع و اقسام کے زیور ایک چمنستان ہیں اور گورے سینہ اس کا پس منظر ہے۔ اس عالم میں، دل کا لوٹنا، تڑپنا اور بے قابو ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ چوتھے مصرعے میں پیٹ کی ملائی اور ناف کی تارے سے تشبیہ نہایت نادر اور مکمل ہے۔ ملائی جلیو سفید، پاکیزہ، ملائم اور نرم سطح والی چیز سے پیٹ کو اور تارے جیسی گول، چمکیلی اور حین چیز سے ناف کو تشبیہ دینا، اعلیٰ مصوری ہے۔ ان جمال پاروں سے مس ہو کر، نظارگی کی نگاہ اگر پھسلی جاتی ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ شعر میں، اتنی واقعیت اور مبالغے میں اتنی حقیقت باقی رکھنا نظیر ہی کے بلوغ نظر کا کام ہے۔ نظیر، سجاوۃ، قطع نظر اس سے کہ وہ کسی نوع کی ہو، نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ اس بند کا پانچواں مصرعہ، نظیر کے فنی نقطہ نظر کا منطقی نتیجہ ہے۔ اب تیرہواں بند ملاحظہ ہو:-

ہر آن نرمالی ہر ایک سے، اس شوخ پری کی محبوبی کچھ ناز وادائی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محبوبی
اب گھنے کی تعریف کروں، یا کافر جوڑے کی خوبی پوشاک سنہری عطر بھری، سراپاؤں جواہر میں ڈوبی
جگنوں کی دمک، سینے کی صفا، کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہے

یہ بند اپنی خوبی اور دلکشی میں دوسرے بندوں کے برابر ہے۔ پہلے مصرعے میں پری کا جبلی نچلا پن دکھایا ہے۔ محبوبی یہاں عشوہ گری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہر لمحہ، اس سے ایک نہ ایک ایسی ادا ظہور پذیر ہوتی ہے، جو نہ صرف اسی کی پہلی ادا سے مختلف ہے بلکہ اور محبوبوں کی اداؤں سے بھی جدا ہے۔ وہ دلبری کے انداز و طریق میں لمحہ بہ لمحہ تنوع پیدا کرتی رہتی ہے۔ کبھی ناز واداسے دل لہجاتی ہے، کبھی شرم حیا سے قلب کو متاثر کرتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں، محبوبی، مرغوبی اور محبوبی تینوں لفظ جن میں دو قافیہ ہیں، مضروب، مفاہیم سے لبریز ہیں۔ اس بند میں دو گونہ مصوری کا التزام کیا گیا ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں حسن صورت

سے جنم لینے والی اور نفسیاتی اداؤں کا ذکر ہے اور آخر کے تین مصرعوں میں جسمانی آرائش اور سنگھار کی دلکشی و دلفریبی کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں ”اب“ کا استعمال بہت معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب کسی تعریف کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن اگر گنجائش نکالی بھی جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ پہلے گئے کی تعریف کی جائے یا کافر جوڑے کی خوبی بتائی جائے۔ خوبی کا استعمال بھی نظیر کی زبان میں مخصوص ہے۔ وہ اس لفظ کو جاذبیت کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں یہ بھی بتایا ہے کہ پری کی آرائشی محبوبیت کا راز گئے اور جوڑے دونوں کے حسن میں مرکوز ہے مگر قوت انتخاب مجروح ہے۔ یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ کس کو کس پر فوقیت ہے۔ جوڑا سنہرا ہے اور عطر میں بسا ہوا ہے۔ اس حد تک بسا ہوا ہے کہ عطر میں ڈوبا ہوا کہا جائے تو بجائے ہے۔ سر سے پاؤں تک سارا زیور جڑا ہوا ہے جس کو پہن کر پری جواہر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس عہد میں سنہرا جوڑا اور مصرع زیور، خصوصیت کے ساتھ دولت مندوں اور امیر زادیوں کی پوشاک تھا۔ پانچواں مصرعہ حسب معمول، عروج تک رہبری کرتا ہے چمک اور دمک کے مفاہیم میں تین فرق ہے۔ گورے سینے میں اگر چمک ہے تو جگنو کو جو خود مصرع بھی ہے اس سے متمیز ہونے کے لئے دکنا چاہئے۔ چت لباس، ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان آرائش کا جزو رہا ہے اور سینے کا لباس ہر قوم و ملت میں چست ہی پسند کیا جاتا ہے۔ پری کی کرتی اس کے بدن پر خوب چست ہے اور اس کی پھنساوٹ، جو کوشش کر کے پیدا کی گئی ہے، قیامت برپا کر رہی ہے۔ اب چودھواں بند ملاحظہ ہو:-

دو کافر دھج جی دیکھ جے سو بار قیامت کا لرزے پازیب کرٹے پابل گھنگرو کرٹیاں چھڑیاں بگڑے توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں، ہر ایک قدم پر سو جھکے دو چنچل چال جوانی کی اونچی ایڑی نیچے نیچے
کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ دیسی ہے

اس نظم میں ”کافر“ بار بار استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ نیا لطف رکھتا ہے۔ نظیر کو یہ لفظ اس لئے بہت عزیز ہے کہ فارسی اور اردو زبانوں میں، یہ معشوق کی صنیت کے اظہار کے لئے بہت موزوں اور بڑے

سلیع مفاہیم کا حامل ہے۔ پہلے مصرعے میں یہ لفظ صبح کی تعریف کرتا ہے۔ صبح یہاں ”عالم“ یا سمجھاؤ یا قیامت انگریزی لفظ بئرنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ”کافر صبح“ کہہ کر خوش قیامت کی تعریف کی ہے۔ اردو اور ایسی شاعری میں چال کا قیامت سے استعارہ کیا جاتا ہے۔ اس بند میں چونکہ پاؤں، پاؤں کے زیور، بندش، قدم، چال، ایڑی، پنچے، کفش، ٹھوکر کا ذکر ہے، اس لئے اول ہی سے قیامت کا دل لرز رہا ہے دوسو سو بار لرزتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں پاؤں کے زیوروں کا ذکر ہے۔ نظیر کو بیان پر یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک قسم کے سارے زیوروں کے نام بے تکرار ایک ہی مصرعے میں گنوا دئے ہیں۔ جس طرح انچوں بند میں کانوں اور ناک کے زیوروں، ساتویں میں بازو اور پنچے کے زیوروں، اور آٹھویں میں گلانی، اور انگلیوں کے زیوروں کا ذکر ہے اسی طرح بارہویں اور چودھویں بندوں کے دوسرے مصرعوں میں گلے اور پاؤں کے زیوروں کا ذکر ہے۔ پاؤں میں انواع و اقسام کے گھنے کی موجودگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جنبش میں سو جھنکاریں اور ہر قدم پر سو جھکے پیدا ہوتے ہیں۔ جھکے سے یہاں کمر کی لچک مراد ہے جو ان کی چال میں مستی اور شوخی فطرتاً موجود ہوتی ہے لیکن برسی کی چال میں جھیل پن بھی ہے اور وہ ایڑی اور پنچے اور پنچے پیچے کر لینے سے پیدا ہوا ہے۔ اونچی ایڑی اور نیچے پنچے کا فیشن بیسویں صدی کی ابتداء میں فرانس میں پیدا ہوا اور عورتوں کی دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ چونکہ مصرعے سے ثابت ہے کہ نظیر کو اس نوع کی رفتار کے حسن و دلربائی کا احساس بد اہتاً ڈیڑھ صدی پہلے سے تھا۔ ایران اور ہندوستان کے شعرا نے چال کی طرح طرح سے تعریف کی ہے لیکن اس پہلو سے کسی نے روشناس نہیں کرایا۔ جس دلداری کی رفتار کی شوخی و طرازی کا یہ عالم ہو کہ زمین پر بہ مشکل پاؤں لگائے وہ دامن جھٹک کر الگ ہی الگ رہنا پسند کرتی ہے۔ دامن کی جھٹک سے حسن کی نخوت و تکنت اور ٹھوکر کی لگاؤٹ سے شباب کے پندار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محبوبہ کی ٹھوکر سے، مردہ زندہ ہو جانا، مشہور بات ہے۔ اب پندار کا بند ملاحظہ ہو:-

قاتل ہر آن نیا عالم، کافر ہر آن نئی جھمکیں
 بانگی نظریں، ترچھی پلکیں، بھولی صورت، میٹھی باتیں
 دل بس کرنے کے لاکھوں ڈھب، جی لینے کی سو گھائیں
 ہر آن پھبن، ہر آن سخن، ہر دم میں بدلے لاکھ دھجیں
 آنکھوں کی لگاؤٹ، تھرستہ باتوں کی رکھاؤٹ ویسی ہے

اس بند میں پری کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے۔ پہلے مصرعے میں ”عالم“ اور ”جھمک“ کا
 مقابل ہے۔ ہر لمحہ اس کا سُن ایک نیا رُوپ بھرتا ہے جو عاشق کو قتل کر دیتا ہے اور ہر لمحہ
 اس کے پیکر پر ایک نئی صنمیت طاری ہوتی ہے جو ایمان میں خلل ڈال دیتی ہے۔ یہ عشوہ گری
 وہ اپنی بانگی نظروں، ترچھی پلکوں، بھولی صورت اور میٹھی باتوں سے کرتی رہتی ہے۔ نظیر
 مغلیہ آرٹ کا سچا پرستار ہے۔ جس طرح مغلوں کو اپنی عمارت میں جواب بنانے کا شوق ہے
 اسی طرح نظیر کو اپنے کلام میں مترادفات و مقابلات جمع کرنے کا شوق ہے۔ بانگی نظیر کے
 مقابل ترچھی پلک اور بھولی صورت کے مقابل میٹھی بات لانا، اس کا شعری و لسانی ایمان ہے۔ اس
 سے اس کی تلاش کی قوت اور انتخاب کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے کے پہلے ٹکڑے کو
 قاتل اور دوسرے کو کافر سے شروع کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کو علی الترتیب، دوسرے مصرعے کے
 دونوں ٹکڑوں سے نسبت ہے۔ بانگی نظریں اور ترچھی پلکیں قاتل اور بھولی صورت اور میٹھی باتیں کافر ہیں
 یہ ہر لمحہ نیا عالم پیدا کر کے قتل کرتی ہیں اور وہ ہر لمحے نئے جھمکیں سے دین و ایمان ہر لیتی ہیں۔ تیسرے مصرعے
 میں ”دل بس کرنے“ کے بعد ”جی لینے“ کما نظیر کا حصہ ہے۔ دوسرا شاعر، ایسا متوازن جملہ پیدا کرنے سے
 قاصر رہتا۔ چوتھے مصرعے میں ”پھبن“ اور ”سخن“ جیسے مترادف اسمائے صفت کا استعمال لفظی جادو گری کا
 معجزہ ہے۔ پانچواں مصرعہ ہر بند کی طرح اس بند میں بھی عروج پیدا کرتا ہے۔ اس مصرعے میں عورت کے
 کردار کا ایک اہم ماز بے نقاب کیا ہے۔ آنکھیں عورت کی فحش دی کا بڑا کامیاب دموغذ ذریعہ ہیں۔ سارے
 وار خالی جانے کے بعد بھی، ان کا وار ختمافشا نے پر پڑتا اور بارور ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ پری اس

ہتیار کا بھریور وار نہیں کرتی۔ محض لگاوٹ سے کام لیتی ہے۔ لگاوٹ، لنگاہوں کے تبسم کا دوسرا نام ہے۔ یہ تبسم ہی اپنی جگہ قسروں کی اہمیت رکھتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک طرف لنگاہوں سے لگاوٹ کرتی ہے اور دوسری طرف باتوں کی رکھائی سے، اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ سادہ لوح عاشق اقرا انکار کی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے اشاروں پر نلچنے لگتا ہے۔ اب سوطواں بسند ملاحظہ ہوا۔

تصویر کا عالم نکد سکھ سے، چھب تختی صاف بری کی سی کچھ چین چین کے اینڈر ہے اور ہونٹوں میں کچھ گالی سی
مید فزی سختی بہتیری اور ہر محبت ٹھوڑی سی جھوٹی تعیاری ناک چڑھی، بھولی سیانی، پکی پیسی
ٹھٹھوں کی آڑاوٹ اور غضب قہقہ کی ہنساوٹ دیسی ہے

اس بند میں طیر سے دار کا نوعی کردار پیش کیا ہے۔ پہلا مصرعہ سنگھار کے بیان سے شروع ہے۔ بری خوب بن ٹھن کر، نوک پلک سے درست ہو کر دل ستانی پر آمادہ ہے۔ اس کی نکد سکھ میں تصویر کا عالم ہے۔ جہانی آرائش بہر تفصیل کے اعتبار سے، تصویر کے حسن کی طرح بے عیب ہے۔ تصویر، مکملے کا نمونہ سمجھی جاتی ہے اس لئے تصویر سے تشبیہ دے کر ہر طرح مکمل اور بے عیب دکھانے کی کوشش ہے۔ اس بناؤ سنگھار کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر بالمقابل نظر پڑے تو ایک پیکر تصویر معلوم ہوتی ہے اور اگر پہلو سے دیکھی جائے یعنی چھب تختی (بروفیل) سامنے ہو تو بری نظر آتی ہے۔ اس مصرعے میں، مریات، نئے ایک اہم مسئلے کی حیرت ناک شرح کی گئی ہے۔ مصوری کے فن میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مقابل اور پہلو کی تصویروں میں فرق ہوتا ہے بعض صورتوں میں یہ فرق اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ ایک ہی فرد کی دو طرح کی تصویریں، دو الگ الگ آدمیوں کی تصویریں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ نظیر کی اعلیٰ مصورا نہ قدرت کا ثبوت ہے کہ اس نے اس نکتے کی مدد سے، پری کی دور تختی تصویر پیش کی ہے۔ بہر عنوان پری اس طرح بن ٹھن کر سامنے آتی ہے کہ جس طرف سے نظر ڈالو یا کیا دنیا عالم نظر آتا ہے لیکن اسی کے ساتھ انہوں پر بل بھی ڈالے

رکھتی ہے تاکہ تیوری چڑھی دیکھ کر کوئی حرف مدعالب تک نہ لانے پائے۔ اس خشونت کی تصویر دوسرے مصرعے میں پیش کی ہے۔ ابروؤں کے بل سے غمگی و ہزیری ظاہر ہوتی ہے اور مونٹ برا بھلا کہنے پر آمادہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کے تین مصرعوں میں کردار کی خوب وضاحت کر دی ہے۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ بیداری اور سختی کا عنصر اس میں بہت زیادہ اور مروت کا بہت کم ہے۔ چوتھے میں بتایا ہے کہ جھوٹی مکاریاں کرتی ہے، روکھی ہے، خوب سیانی ہے مگر بھولی بنتی ہے اور بے مروتی میں کامل ہے۔ چوتھے مصرعے میں پکی پیسی کا سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ یہ اکبر آباد اور مضافات اکبر آباد کا خاص محاورہ ہے۔ ڈھیٹ اور بے مروت انسان کو پکے پیسے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں نظیر نے پکے پیسے سے مونٹ کا صیغہ بنایا ہے۔ اس نوح کے روزمرہ کے کاروبار میں کسی زمانے میں پکا پیسہ چلتا تھا۔ پکے پیسے کی اہمیت یہ تھی کہ اس کے قبول کرنے سے کسی حالت میں انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پکی پیسی سے نظیر نے یہاں یہ مفہوم رکھا ہے کہ وہ اپنی حرفت میں اتنی کامل ہے کہ جس طرح پکا پیسا رائج الوقت سکے کی حیثیت سے ہر جگہ اور ہر وقت نافذ ہے، اسی طرح، اس کے فنون ہر جگہ اور ہر وقت کامیاب ہیں۔ اگرچہ عمر کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس میں اس نوع کی عیاری اور متکاری پیدا ہو جائے مگر ماحول اور معاشرت نے اس کو سب کچھ سکھا پڑھا کر پکا کر دیا ہے۔ اس خشونت اور پکے پن کے علاوہ اس میں یہ بھی وصف ہے کہ عاشقوں کو ٹھٹھے میں اڑاتی ہے۔ ٹھٹھے میں اڑانا ایک محاورہ ہے جس کے معنی مذاق میں بات ٹال دینے کے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بات مذاق میں ٹال دیتی ہے بلکہ اس کے تمقنوں میں بھی سچی ہنسی نہیں ہے۔ اس کی ہنسی بناوٹی ہنسی ہے جو صرف وقت گزارنے اور بات ٹالنے کے لئے ظاہری کی جاتی ہے۔ اب ستر حواں بند ملاحظہ ہو:-

نظروں میں صاف اڑالے دل اس طور کی کافر عیاری
 کہنی مائے بچھلی لے لے پچھڑے، جھڑکے، دیوے گالی
 اور ہٹ جاوے سو کوں پرے گزرات کہو کچھ مطلب کی
 ہر آن چہ خوش ہر دم اچھا، ہر بات ہنسی کی پچھل بھری

رمزوں کے ضلع، غمزوں کے جلّت پھبتی کی پھباوٹ ویسی؟

اس بندیں بھی ڈیرے دار کا کردار ہے۔ پہلے مصرعے میں بتایا ہے کہ پری، دلبری کے فن میں اتنی طاق ہے کہ نظروں سے دل چھین لیتی ہے۔ ”صاف“ سے عیاری کا کمال ظاہر کیا ہے۔ ”نظروں ہی نظروں میں اڑانا“ بھی ایک محاورہ ہے جس کے معنی ”کھلم کھلا“ یا ”سب کے سامنے“ ہیں۔ لیکن اس مصرعے میں چونکہ نظروں کی تکرار نہیں ہے اس لئے، یہ معنی قرین قیاس نہیں ہیں۔ دوسرے مصرعے میں کردار کا ایک اور دقیق رمز بے نقاب کیا ہے۔ اس جلتے کے افراد کو دل لینے میں جیسی مہارت ہوتی ہے؟ ویسا ہی امیدیں بندھانے اور ریمانے میں بھی کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں، انیسویں صدی کی ڈیرے دار کو فن کی حیثیت سے سکھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ، پری سے، جب مدعا بیان کیا جاتا ہے تو وہ اتنی بیگانی بن جاتی ہے کہ گویا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ ”پرے“ اس زمانے میں اگر سے میں نہیں بولا جاتا لیکن اس مصرعے میں اس لفظ کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ نظیر کے زمانے میں، یہ لفظ یہاں رائج تھا۔ تیسرے مصرعے میں بتایا ہے کہ وہ اس حد تک بے تکلف ہو جاتی ہے کہ جسمانی چھیر چھڑ بھی شروع کر دیتی ہے لیکن یہ اس کی جذبہ بھی ہے۔ وہ اس سے آگے ہرگز نہیں بڑھتی۔ اس نوع کی ہمت افزائی سے اگر کوئی کچھ اور اقدام کرتا ہے تو پھر اس کو بنانے کی کوشش کرتی ہے اور بات بات پر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ چوتھے مصرعے میں مذاق اڑانے کے طریقے بتائے ہیں۔ لکھ بہ لکھ ”چہ خوش“ اور ”اچھا“ کہہ کر بات ٹالنے اور سوال کو مہنسی میں اڑانے کی کوشش کرتی ہے پانچویں مصرعے میں بتایا ہے کہ وہ ضلع اور جلّت میں بھی طاق ہے اور بات ٹالنے کے لئے اس تبصرے رمز و غمزے کی نمائش شروع کر دیتی ہے اور آخر کار نوبت یہاں تک پھونچتی ہے کہ کھل کر پھبتی کہنے لگتی ہے۔ انیسویں صدی کی لطائف کو خصوصیت سے ان باتوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ وہ امرار کی دربار داری کے قرائن اور محفل آرائی کے آداب سے خوب واقف ہوتی تھی۔ اس میں آنا و بی سلیقہ بھی ہوتا تھا کہ ادبی لطائف کو سمجھے اور

ان میں برابر کا حصہ لے سکے۔ اب اٹھارواں بند ملاحظہ ہو:-

یہ ہوش قیامت کا فرکاجو بات کہوں وہ سب سمجھے روٹھے، چلے، سو سوانگ کرے باتوں میں لٹے نظر میں لٹے
یہ شوخی، پھرتی، بیتابی، ایک سن کبھی بخلی نہ رہے چنچل، اچل، ملے، چکے، سرکھولے ڈھاپے، ہنس، ہنس کے
باہوں کی جھٹک، گھونٹ کی ادا، جون کی دکھاوٹ ویسی ہے

اس بند میں دوسرے پہلو سے، پھر کردار کی مصوری کی ہے۔ پہلے مصرعے میں ہوش سے ہوش مندی مراد ہے۔ یعنی وہ اس قدر بیدار و ہوش مند ہے کہ کوئی بات کیسے ہی تیج سے کہی جائے مگر فوراً سمجھ لیتی ہے۔ نہ صرف بات تازے میں اتنی کامل ہے بلکہ طرح طرح کے چرتروں سے بھی خوب واقف ہے۔ کبھی روٹھ جاتی ہے کہ آپ منائیں، کبھی محل جاتی ہے کہ آپ خوش آمد کریں۔ بہر حال عاشق کو اپنی ذات میں ہر وقت مصروف رکھنے کے لئے قسم قسم کی تدبیریں کرتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے لٹنے لگتی ہے کہ عاشق کہیں زیادہ بے تکلف نہ ہو جائے۔ اس دوران میں یکایک اس کو یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ عاشق کہیں اس برتاؤ کا بُرا نہ مان جائے، تو قبل اس کے کہ یہ کسی نتیجے پر پہنچ کر کوئی فیصلہ کرے، وہ خود التفات کی نگاہوں سے مداوا شروع کر دیتی ہے اور اس کا دل لہانے لگتی ہے۔ تیسرے مصرعے میں جہانی حرکات کی شیخوں کو اُجاگر کیا ہے اور چوتھے میں نفسی کیفیات کی مصوری سے ایک فلم سا دکھایا ہے۔ وہ اپنی شوخی اور چلبلی پن، اپنی مٹک چٹک سے لہجاتی ہے، بار بار سرکھولتی اور ڈھانپتی ہے اور ساتھ ساتھ ہنستی بھی جاتی ہے۔ سرکھولے ڈھانپے، لکھ کر نظیر لے بتایا ہے کہ وہ عورت کی فطری نمائش پسندی کا دقیق مطالعہ کر چکا ہے۔ عورت کی یہ ایک خلقی عادت ہے کہ وہ سر ڈھکنے اور آچل سنبھالنے کے بہانے سے بار بار اپنی نمائش کرتی رہتی ہے۔ عموماً یہ نمائش غیر ارادی ہوتی ہے لیکن جب اس میں اہتمام اور تواتر و تسلسل بھی نظر آئے تو اس کی بنیادیں ارادے کی موجودگی کا یقین سا ہونے لگتا ہے۔ بہر حال اس لمحے میں جب وہ کسی طرح یہ محسوس کر لے کہ اس کے گلشن حسن و شباب کی فطری خوشہ چینی کی جارہی ہے، اس کے

وجود میں، اضطراب کی ایک برقی رگ دوڑ جاتی ہے اور یہ مشق ستم تیز تر ہو جاتی ہے۔ نظیر نے اپنے عہد میں عورت کی اس دلکش ادا کا مطالعہ کیا تھا اور عہد حاضر کی سوسائٹی میں بھی یہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ نظیر نے جس پری کا سراپا نظر کیا ہے اس میں، یہ ادا مستزاد ہے کہ وہ سر کھولنے ڈھکانے کے وقت ہنستی بھی جاتی ہے۔ ”ہنس ہنس کے“ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس کو اپنی کوشش کا احساس اور اپنی فتح مندی پر ناز ہے۔ باتوں باتوں میں لڑا لینے کے بعد دوبارہ سرور و بے لطف نظر آنے کے دوران میں جن جن داؤں کی نمائش ہوتی ہے، ان کا ذکر پانچویں مصرعے میں ہے۔ سر کھولنے، ڈھکانے کے لئے، اس کی باہیں بار بار اور مختلف انداز میں جنبش کرتی ہیں۔ یہ جنبش کبھی ہلکی ہوتی ہے اور کبھی جھٹک کی حد تک بھونچ جاتی ہے۔ اس خود نمائی کے ڈرامے کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ یکایک گھونٹ نکال لیتی ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ اب بالکل ہی چھپ رہنا مقصود ہے لیکن یہ غمزہ بھی آتی اور آتش شوق کے تیز تر کرنے کی ایک نئی تدبیر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ چھپنے اور سامنے آنے کی اکاؤں کے دوران و تسلسل میں اس کے جو بن کی خوب خوب نمائش ہوتی رہتی ہے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ اب انیسواں بند ملاحظہ ہو:-

ایک شور قیامت ساتھ چلے نکلے کافر جس دم بن ٹھن بلخ ارکمر ز فدا غضب دل کی قاتل جی کی دشمن
مذکور کروں میں اب یارو اس شیخ کے کیا کیا تجل بن کچھ ہاتھ ملیں کچھ پاؤں ملیں اچھلیں بازو پھر کے سب تن
گاتی وہ بلا تالی وہ ستم انگلی کی نجاوٹ ویسی ہے

یہ بند چال کی تعریف میں ہے۔ پہلے مصرعے میں قیامت کے شور سے رفتار کا استعارہ کیا ہے۔ جس وقت وہ آراستہ پر استہ ہو کر نکلتی ہے تو دُوبانی پڑ جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں لف و نشر مرتب ہے۔ بل دار کمر کو ”دل کی قاتل“ اور رفتار کو ”غضب“ اور جی کی دشمن ”کمر اتنی نازک ہے کہ بار بار ٹکچتی ہے اور ٹکچنے میں بار بار بل کھاتی ہے۔ کمر کی نزاکت کا بیان، اس سے حسین تر الفاظ میں دشوار ہے۔ تیسرے مصرعے میں اشارہ ہے کہ خرام ناز کے وقت مارے بدن میں ایک لطیف و جمیل

قصہ نگاری سبید ہو جاتی ہے جس کو لفظوں میں ظاہر کرنا دشوار ہے چوتھے میں اعلیٰ مصوری کی مدد سے چنچل پن کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ ہاتھ پاؤں بازو، غرض سارا جسم نائل بہ قص نظر آتا ہے۔ ایسی چال جس کے یہ لوازم ہوں ہر عنوان قص کی مترادف ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کے لئے ہلکا، بازو کے لئے اچھلنا اور تن کے لئے پھڑکنا کہہ کر نظیر نے پھر کثیر زبان سے واقفیت اور حسن بیان کی قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ پانچواں مصرعہ قص کے عالم کی بے نقاب تصویر ہے۔ سینے اور کمر کے درمیانی حصے یعنی پیٹھ کو گاتی بھی کہتے ہیں۔ قص کے عالم میں عورت کے بدن کا یہ حصہ خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ گاتی کی انتہائی جاذبیت و دلفریبی کو ”بلا“ کہا ہے۔ ناپچھنے میں تالی عموماً بجائی جاتی ہے اور ایک خاص انداز سے بجائی جاتی ہے، انگلیاں نچانے کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ نظیر نے گاتی کے حسن و جمال کے ساتھ ان دونوں اداؤں کی بھی داد دی ہے۔ اب بیسواں اور آخری بند ملاحظہ ہو:-

جو ایسا حسن کا دریا ہو کس طور نہ لہروں میں بہتے گر مہر و محبت ہو بہتر از در جو رجفا ہو تو سہتے
دل لٹ گیا ہے غش ہو کر بس اور تو آگے کیا کہتے مل جائے نظیر ایسی جو پری پھاتی سے لپٹ کر سورتے
بوسوں کی چیک، بغلیوں کی لپٹ، سینوں کی ملاوٹ ویسی ہے

اس بند میں نظیر کے مزاج کی فطری شوخی بدرجہ اتم کا فرما ہے۔ ایک سچے واقعیت نگار کی طرح اس نے اپنے جذبات کی سچی تصویر پیش کر دی ہے۔ پہلے مصرعے میں حسن کو بہتے ہوئے دریا سے تشبیہ دی ہے جو نہایت نادر ہے۔ زندگی کو کبھی دریا سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن حسن و شباب کو دریا کی روانی سے زیادہ اور قوی تر مناسبت ہے۔ اس تشبیہ کے بعد اس دریا کی لہروں میں بہنے اور بہ جانے کی خواہش بڑھ چکی ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی حقیقت و رجائیت پسندی کی سچی ذہنیت کا مرقع ہے۔ عاشق صادق کی طرح یہ قبول کر لیا ہے کہ محبت میں جو کچھ پیش آئے سہنا چاہیے۔ محبت کا جواب اگر محبت سے دیا جائے تو فہمادر نہ جو رج و جفا برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیے۔ تیسرے مصرعے میں ہر نوع کا سدیک قبول کرنے

کی وجہ بھی صاف صاف بتا دی ہے۔ دل کا لوٹ جانا، نظیر کا خاص محاورہ ہے۔ چوتھے مصرعے میں اپنی انتہائی آرزو مندی اور فطری شوخی کا اظہار ہے۔ پانچویں میں جو تین اسمائے صفت چمک، لپٹ اور ملاوٹ نظیر نے استعمال کئے ہیں، ان میں پہلا خاص اسی کا وضع کردہ ہے۔ دوسرے اور تیسرے کا استعمال بالکل نیا ہے۔ بہر حال یہ تینوں الفاظ، اردو کے انداز بیان میں نئے اسالیب کا اضافہ اور ایک مستقل و معتد بہ سرمایہ ہیں۔

آئینہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے جس میں نظیر نے انسان اور نفس انسان کی عظمت کا گیت گایا ہے۔ کیٹس (۱۷۹۵-۱۸۲۱) حیات کا شاعر اور جالیات کا والد و شہید ہے۔ وہ مرئیات کے جذب و سحر پر مفتوں نظر آتا ہے۔ نظیر پر بھی واقعیت کے ردِ عمل کی حیثیت سے اکثر جمال پرستی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس نظم میں اس نے واقعیت و مرئیات، رومان و روایات اسب سے قطع نظر کر کے ذہنیات کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگایا ہے۔ اس کے عہد کا موت مغربی معیار جس نے آخر کار روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) کے سیاہی عقائد و تلقین کی صورت اختیار کی اور جس سے وہ ایک نظر سے کی حیثیت سے قطعی نابلد تھا، نظیر پر بدلتا ہو کر ہوا۔ وہ روح حیات سے جو کائنات پر ساری و طاری ہے متاثر ہو کر، خود انسان کو مخاطب کرتا اور کہتا ہے :-

لے آئے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ زلف دراز و طرہ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آب ہی بہا دیکھ

مشہور انگلستانی شاعر و رڈ سوئٹھ (۱۷۷۰-۱۸۵۰) کی طرح جو نظیر کا معاصر ہے، نظیر کے نزدیک بھی ساری مخلوق میں انسان سب سے زیادہ اہم اور محترم ہے۔ و رڈ سوئٹھ میں انسان کی محبت، اس کے

ذہنی نشوونما کے تیسرے دور میں پیدا ہوئی۔ اس بیداری کے دھڑک بتائے جاتے ہیں۔ پہلا فرانس کا انقلاب اور دوسرا کولرج (۱۷۷۲-۱۸۳۴) سے ملاقات جس کے واسطے سے وہ جرمن معیارین کے فلسفے سے روشناس ہوا۔ ہمیں نظیر کی زندگی کے حالات تفصیل و تسلسل کے ساتھ معلوم نہیں ہوئے۔ جو واقعات جستہ جستہ میسر آئے ہیں، ان کا اب تک اس نظر سے مطالعہ نہیں کیا گیا کہ اُن سے شاعر کے ذہنی نشوونما کے مدارج پر روشنی ڈالی جائے۔ بہر حال، اس کے دل میں انسان کی محبت و عظمت کے پاکیزہ جذبات موجود ہیں اور اس وقت موج زن ہیں جب مغرب میں ان کی نمائش پر فخر کیا جاتا ہے۔ آئینے میں نظیر نے بتایا ہے کہ انسان کائنات کی اہم ترین حقیقت ہے اور دنیا اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کا پسلا فرض یہ ہے کہ وہ خود اپنا مطالعہ کرے۔ مقطع کے بند میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مظاہر کی خارجی خوبیوں سے ہونڈھیا کر، ان پر مفتوں ہو جانا غلط طریقہ کار ہے۔ کائنات میں مفتوں کرنے کی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف انسان ہے:-

بلغ جہاں کے غمخ و گل میں نہ ہوا سیر
قمری کی سن نظیر نہ بلبل کی سن صغیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے بے نظیر
ہیں حرف من عرق کے ہی معنی لے نظیر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آب ہی بہا دیکھ

اس نظم میں دل کو آئینے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تلاش خود نہایت بصیرت افروز اور قابلِ داد ہے۔ اس کے علاوہ، اس میں اور بھی بہت سی لسانی، ادبی اور فلسفیانہ خوبیاں ہیں جو مطالعے سے بروئے کار آسکتی ہیں۔ کسی شاعر کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے اس کے داخلی حقائق پر بار بار غور کرنے کی ضرورت ہے۔ روٹی نامہ ایک طنز ہے جس کی تفسیر کئی پہلو سے ہو سکتی ہے اور اشتراکی اصولوں کی روشنی میں بھی ممکن ہے۔ یہ نظم خالص اقتصاد دی اور معاشرتی قدروں سے لبریز ہے۔ اس سے کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳)

کے فلسفے کا بنیادی اصول بھی مستنبط ہوتا ہے۔ نظیر، حقائق کے علاوہ، جزویات کا شاعر بھی ہے اور ادنیٰ ادنیٰ اور پیش پا افتادہ باتوں سے اہم نتائج اخذ کرنے کی قدرت و بصیرت رکھتا ہے۔ بادی النظر میں، خصوصاً، ان کے نزدیک جن کو بے فکری سے میسر آتی ہے روٹی ایک حقیر و فرومایہ چیز ہے۔ ان کا ذہن اس کے حصول کی دشواری و اہمیت کی طرف بھی منتقل نہیں ہوتا۔ لیکن، اگر ایک مفکر کی نظر سے دیکھا جائے تو روٹی کے حصول کی کشمکش سے اہم تر کام، دنیا میں کوئی نہیں۔ زندگی کی ساری تگ و دو اور تنازع للبقا کی ساری جدوجہد، اسی کے لیے ہے۔ لطف یہ ہے کہ صاحبان ثروت پر جب اس کا نشہ چڑھتا ہے تو انہیں دور کی سوچنے لگتی ہے۔ نظیر نے کیا خوب کہا ہے:-

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا کرتا پھر سے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار بچاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا ٹھٹھا، ہنسی، شرب، صہم، سانی، اس سوا

سو سطح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

خصوص مقصد کے ساتھ سچائی، نظیر کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جب وہ کہنے پر آتا ہے تو لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ کھل کر کہہ گزرتا ہے۔ اس نے آخر کار صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ لوگ جو روحانیت اور تصوف کا کر کا نٹھے بیٹھے ہیں، یہ اصل میں روٹی کمانے کا ڈھونگ ہے اور بس۔ جو فقیر حقیقت میں کامل ہے وہ اس راز سے خوب واقف ہے۔ کیا خوب کہا ہے ملاحظہ ہو:-

پوچھا کسی نے یہ کسی کا مل فقیر سے یہ مہرواہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا، بابا، خدا تجھ کو خیر دے ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا، ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا، اس نے، کہنے یہ ہے دل کا نور کیا اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے، شعور کیا کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا

جتنے ہیں کشف، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
روٹی میں یہ قوت ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا کوئی کام یہاں تک کہ عبادت بھی ممکن نہیں۔ سعدیؒ نے
اسی فلسفے کو، دوسری طرح بیان کیا ہے:-

شب جو عقدِ نسا ز بر بندم چہ خور و بامداد من ز ندم
نظیر نے اسی حقیقت کو ذرا شرح و وضاحت سے بیان کیا ہے:-

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو نیلے کی شیر خواہش باغ و چین نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

نظیر نے اس نظم کے چھٹے بند کے پہلے مصرعے میں ”روٹی کا ناچ“ باندھا ہے۔ یہ اسلوب بیان خود اس کا
پیدا کردہ ہے۔ اسی معنی کا ایک محاورہ ”ڈانس اینڈ ڈینس“ یا قص حاضر باشی“ انگریزی زبان میں بھی ہے،
جس میں اتنا ہی ذم ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ حصولِ منفعت کے لئے جو اصل میں روٹی کمانے کا دوسرا
نام ہے، ذیلِ نعم کی حاضر باشی کی جائے۔ ساتویں بند کے چوتھے مصرعے میں رندسی کے کردار پر قدے
قلیل روشنی ڈالی ہے۔ ساری نظم، اجتماعی زندگی کی مالی کشمکش کا سچا تبصرہ ہے۔ ہندوستان کا موجودہ
فرقہ وارانہ تنازعہ اصل میں روٹیوں ہی کا رونا ہے اور بس۔ نظم کی موضوعی خوبیوں کی یہ کثرت ہے کہ
لسانی اور ادبی خوبیوں پر، جو بد کر رہ گئی ہیں، نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ملتی۔

آندھی ایک زندانہ نظم ہے جس میں نظیر نے دل بھینک عاشق کی زندگی کا ایک دلچپ واقعہ
بیان کیا ہے۔ مزاج کا عنصر، نظم کے اور محاسن پر غالب ہے۔ آندھی میں انیسویں صدی کے بانکے کی
تصویر ہے جو شکسپیر کے ڈرامے ہینری چہارم کے ایک کردار فولسٹاف سے بہت مشابہ ہے۔ ساری
نظم رجائیت کا ایک حین و ہر جہاں مرقع ہے۔ بانکے کے کردار کے پہلو بہ پہلو آندھی کے خصوصیات و

جزویات کی تفصیل بھی نہایت پر لطف انداز میں پیش کی ہے۔ جمالیات کا یہ ایک اہم مسلمہ ہے کہ کوئی منظر اپنے پس منظر کی مدد کے بغیر حسین و نظیر فریب نہیں بنتا۔ نہ خود اس کے وجود کی دستور جا ذہیت بروئے کار آتی ہے نہ وہ اپنی فطرت کا حقیقی جمال بے نقاب کر سکتا ہے۔ چنانچہ آندھی کے سماں کو بانگے کی فریب کا رخ چھل اور دل لگی بازی کی آماجگاہ کا پس منظر بنایا ہے۔ نظیر کے آرٹ کی خلاقی اور کمال بالائے کمال یہ ہے کہ ایک شوخ و سنگ اور طبعاً خود نما فطرت کی نمائش کا پس منظر بنانے کے لئے آندھی کو منتخب کیا ہے جو کارگاہ فطرت کا خود ایک خود نما اور طوفانی مظاہرہ ہے۔ اس التزام سے شاعر کے ذہن کے توازن تناسب اور اس کی فطرت کی یکسانی و ہمواری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آندھی کے محاکات اور ذمی حیات ہیجان و اضطراب کی تفصیل قریب قریب ہر بند میں موجود ہے۔ ساتویں بند میں آندھی کا اپنی ذات پر داخلی اثر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اسی آندھی نے گلشن کر دیا یار دمرے گھر کو
بچھایا شاد ہو میں نے پلنگ پر بچھا بستر کو
صریح کی خبر لی اور سنبھالا جا کے ساغر کو
اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا بچھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے گیا کیا کیا دل سیر آندھی میں

نظیر کی دقیقہ رسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی ضروری تفصیل اس سے نظر انداز نہیں ہوتی۔ آندھی میں بستر پر خاک پڑ جانی لازمی بات ہے۔ چنانچہ دوسرے مصرعے میں جب وہ شاد ہو کر پلنگ پر بستر بچھا تا ہے تو پہلے اس کو بچھاڑ لیتا ہے تاکہ خاک نکل جائے۔ اس کی رجائیت پسندی کی حد ہے کہ فطرت کا آندھی جیسا غفر و گلش مظاہرہ جو دوسرے انسانوں کے لئے آلام و مصائب کا پیش خیمہ ہے، اس کے لئے مسرت کی نوید لاتا ہے۔ چنانچہ کہا ہے:-

یہ دن آندھی کے یار دیوں تو سب کے ہوش کھوتے ہیں
مزا ہے جن کو ہنستے ہیں جنہیں غم ہے سوردتے ہیں
جنہیں ہے عیش وہ آندھی میں موتی سے پروتے ہیں
نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں

میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں بریاں گھیر آندھی میں

داخلی محاسن کے علاوہ، اس نظم میں زبان، محاورے اور حسن بیان کی بھی بے شمار خوبیاں ہیں۔
 اژدہ کا بچہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے۔ اس میں اژدہ کے بچے سے فطن کی انفرادیت مراد ہے۔
 یہ نظم نظم کے خیال کی عظمت اور فکر کی گہرائی کی ایک اختراع فائقہ ہے۔ اس میں زندگی کی ایک اہم حقیقت
 سے ایک پر مغز نسبت پیدا کر کے جدت طرازی کا حق ادا کیا ہے۔ معنوی محاسن کے علاوہ صوری حیثیت
 سے بھی یہ نظم ایک کارنامہ ہے۔ قلندر کے پیشے کو خیال کے اظہار کا ذریعہ اور اس کے لب و لہجے کو بیان
 کا عنوان بنایا ہے جس سے نظم میں ایک خاص کیفیت و ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ صاحب فطنت کی عظیم الشان
 ذہنیت زندگی کے میدان عمل میں ہمیشہ سر بلند نظر آتی ہے۔ اس کا انوکھا مذاق اپنی نوعیت میں جداگانہ
 اور اس کا رویہ اپنے انداز میں بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی و اخلاقی بے راہ روی کی وجہ
 سے سوسائٹی عموماً اس کی مخالف رہتی ہے۔ پہلے بند میں عام ذہنیت کی فرومایگی اور فطن کی شخصیت
 کے وقار کی طرف اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بیچے ہے اب تو کوئی بلبل بے کا بچہ اور یہ سچا ہے کوئی، طوطے ہرے کا بچہ
 مینا، بیا، لٹورے اور ابلٹے کا بچہ تیترا، بیڑ، سارس، شکرے، لوسے کا بچہ

سب بیچے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچہ

ہم بیچے ہیں یارو لو اژدہ کا بچہ

فطن کی وہ امتیازی خصوصیت جو اس کو سماج کے عام ذہن سے تمیز کرتی ہے اور جس کے سمجھنے سے
 اجتماعی ذہن ابتدا میں عموماً قاصر رہتا ہے، بسا اوقات خود اس کے لئے وبال جان بن کر رہ جاتی ہے۔
 دوسرے بند میں نظم نے صاحب فطنت کی روشنی طبع کا چالیں من کی ڈلیا سے استعارہ کیا ہے۔ جس
 طرح قلندر چالیں من کی ڈلیا کے بوجھ سے عاجز آجاتا ہے، اسی طرح صاحب فطنت کی فطنت، عموماً اس کے

لے بلا ہو جاتی ہے۔ تیسرے بندیں پرانے آؤد ہے سے قدیم زمانے کے ارباب فطنت مراد ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے ابتدائی دور میں اہل کمال کی جو قدر تھی، وہ اس دور میں نہیں ہے۔ نظیر کا زمانہ، مغلیہ دور کا وہ زمانہ ہے جب یہ حکومت روز بہ روز تنزل کی طرف مائل تھی۔ اس زمانے کے نام نہاد بادشاہوں کو اپنے ذاتی عیش و عشرت اور روزمرہ کے خانگی اور سیاسی جھگڑوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کمال اور اہل کمال کی طرف اعتنا کریں۔ چھٹے بند میں سو من گہیوں اور سو کچھال پانی سے، فطن کی ذہنی و اخلاقی ضروریات مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فطن کے عہد میں اس کی ناز برداری نہیں کی جاتی۔ نویں بند میں سلج کے ذہنی و اخلاقی تنزل پر افسوس کیا ہے:-

سب اٹھ گئے جہاں سے وہ تھے جو لوگ جیا وہ رہ گئے ہیں جن کے گھر میں نہیں ہے ہنسیا
اس بات کو تو عمدہ ہو بھوک کا بسیا جو آؤد ہے کو پالے ایسا ہے کون رسیا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے گھر سے کا بجھ

ہم بیچتے ہیں یارو، لو آؤد ہے کا بجھ

آخر بندیں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ دور انحطاط میں اہل کمال کی پرداخت خدا کرتا اور وہی اس

کی آبرورکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

آگے تو گھر بہ گھر تھے اکشر تمام داتا سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا بیج ہے نظیر آخر، جس گھر کے رام داتا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے گھر سے کا بجھ

ہم بیچتے ہیں یارو، لو آؤد ہے کا بجھ

گکڑی ایک مصورانہ نظم ہے جو خالص شاعرانہ قدروں سے لبریز ہے۔ اس کے بیان کی لطافت و سادگی اور تشبیہوں کی ندرت و تازگی نگاہوں کے سامنے، جمال کا ایک عالم پیدا کر دیتی اور

قلب پر خاص اثر کرتی ہے۔ اس نظم میں بیان کے سارے اسالیب اور قافیہ خاص نظیر کے مذاق اور حصے کے ہیں۔ پہلے بند کے دوسرے مصرعے میں، کچھ کو خوبی بھرا کہہ کر بیان کی پاکیزگی اور قافیہ کی خلاقیت کا ثبوت دیا ہے۔ تیسرے بند میں پرے اور دورے کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کے عہد میں یہ الفاظ اگر سے میں بھی رائج تھے۔ دوسرے بند کے پہلے اور دوسرے مصرعوں میں پتلی پتلیاں اور ریشم کی نکلیاں نہایت حسین ترکیبیں ہیں اور زبان کی شیرینی سے لبریز ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں، فر باد و شیریں اور مجنون و تیلی کے افسانوں سے تشبیہ پیدا کرنے میں مدد ملی ہے اور تیسرے بند میں یہی کام ہمیر اور رائج کی روایت سے لے کر وطنیت کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کوئی ہے زردی ہائل، کوئی ہری بھری ہے کھراج منفعل ہے، پتے کو تھر تھری ہے
ٹھٹھی ہے سو تو چوڑی وہ ہمیر کی ہری ہے سیدھی ہے سو وہ یارو رائج کی بانسری ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

پانچویں بند میں لکڑی کو ”آنکھوں سکھ“ ”کلیجے ٹھنڈک“ اور ”ہری“ کہہ کر بیان کے نہایت حسین و دلنشین اسالیب پیدا کئے ہیں لیکن چھٹا بند اپنی مصورانہ نوعیت کے لحاظ سے لاجواب اور داد سے مستغنی ہے:-

بل اس کی ایسی نازک ہوں زلف بچ کھائی بچ ایسے چھوٹے چھوٹے خشتاں یا کہ رائی
دیکھ اس کی ایسی نرمی باریکی اور گھائی آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کھائی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

نظیر زندگی کا شاعر ہے اور ہر چیز کی معاشری اہمیت اسے خصوصیت سے متاثر کرتی ہے۔ لکڑی سے معاشرت میں جو وچسپیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو اس طرح بیان کیا ہے:-

لیتے ہیں بول اس کو گل کی طرح سے کھل کے معشوق اور عاشق کھاتے ہیں دونوں مل کے
 عاشق تو ہیں بجھاتے شعلوں کو اپنے دل کے معشوق ہیں لگاتے ماتھے پر اپنے چھلکے
 کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی
 اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی
 چھٹے بند میں ”زلف بچ کھائی“ اور ”گلانی“ ساتویں میں ”گل کی طرح سے کھل کے“ اور آٹھویں کا یہ مصرعہ
 کڑوی ہیں سو بھی گویا خوابوں کی گالیاں ہیں
 حسن بیان اور شاعرانہ لطافت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

بھونچال ایک بیانیہ نظم ہے جس میں جزویات کی مصوری سے محاکات کا حق ادا کیا گیا ہے اور
 فطرت کے ایک عظیم الشان مظاہرے سے انسان کو عبرت دلائی ہے۔ یہ بھونچال محض خیالی یا رد مانی
 نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا سنہ ’تاریخ‘ دن اور وقت خود نظیر نے تیسرے بند میں نظم کیا ہے۔
 نظیر واقعات و حیات کا شاعر ہے۔ اس کا اتنے بڑے حادثے سے مستثر ہو کر نظم لکھنا،
 کوئی تعجب کی بات نہیں اگر نہ لکھتا تو ضرور تعجب کیا جاسکتا تھا۔ نظم کا انداز بیان اور قافیہ، خصوصیت سے
 نظیر کے رنگ کے ہیں اور بجا بجا ایسے الفاظ اور جملے نظر آتے تھے جو اب متروک ہیں لیکن جن کا نعم البدل
 زبان اب تک پیدا نہیں کر سکی۔ ان کو پھر سے زبان میں شامل کر لینا اور رواج دینا ضروری ہے تاکہ بہت
 سے وہ مفاہیم جو اس وقت الفاظ کی کمی کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے، ادا ہونے لگیں۔ چوتھے بند میں
 طوفان کی شدت و عالمگیری کی طرف اشارہ ہے اور پانچویں میں، حیات پر اس کا اثر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:-
 جزائے ارض قاف سے ناقاف ہل پڑے اب اگر چل اٹل کے کیجیے اگل پڑے
 انسان گھر سے دشت سے وحشی نکل پڑے طاہر کبھی آشیانوں میں اپنے اچھل پڑے
 دریا و کوہ، شمشیر و جنگل، سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

پہلے مصرے میں ”قاف سے قاف“ کے معنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہیں۔ انگریزی زبان میں، ”فروم پول ٹو پول“ اس جملے کا مترادف موجود ہے۔ اس مصرعے کے قافیے میں ہائے ہوز کی حرکت موجودہ تلفظ کے خلاف فتح ہے۔ نظیر کے عہد میں، اس فعل کا یہی تلفظ تھا اور اب بھی خال خال سننے میں آتا ہے۔ دوسرا مصرعہ اپنے بیان کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ اگر کی تعریف، اجل اور اٹل سے کی ہے۔ یعنی ایسے دیو سکر اژدہوں کے بھی کیلجے نکل پڑے جو اپنے قامت کی بزرگی و نقل کی وجہ سے نہ جنبش کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ اجل اور اٹل دونوں الفاظ، مفاہیم سے لبریز ہیں۔ ان میں اٹل تو اب بھی رائج ہے مگر اجل متروک ہے جس کو پھر رائج کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کے قافیے ”اوگل“ سے اضطرار کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ اژدہوں نے، اپنے کیلجے خود نہیں اوگلے۔ طوفان کی شدت نے، غیر عموماً طریقے پر انھیں خود بخود ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا ہی اضطرار تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے قافیوں نکل اور اوچھل سے ظاہر ہے۔ چھٹے بند میں بھونچال کا اثر، غیر ذی حیات پر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گڑھ، کوٹ، قلعہ، ریوئے زمین پر دہل گئے کانپیں انگلیں، برج کے لنگور سے ہل گئے
سنگین محل، مکان تھے سو وہ بھی اوٹل گئے اینٹوں کے زہرے پھٹ گئے پتھر ٹپل گئے

دریا و کوہ شہر و جنگل، سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اس بند کے دوسرے مصرعے میں النگ کے معنی سلسلے یا قطار کے ہیں مگر ان دونوں سے النگ کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ تیسرے مصرعے میں اوٹل بہت معنی خیز ہے۔ سٹلنا، مرتب کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اکثر النگ کے ساتھ آتا ہے۔ یہ لفظ بڑھی اور لکڑی کا کام کرنے والوں کے زباں زد ہوتا ہے۔ پلنگ سٹلنے کے معنی، پلنگ مرتب کرنے کے ہیں۔ جس طرح سٹلنے کے معنی جڑنے اور

مرتب کرنے کے ہیں، اس کے خلاف، اوسلنے کے معنی بگاڑنے اور اکھاڑنے کے ہیں۔ بہر حال اوسلنا، سلنے کا متضاد ہے اور بس۔ ان میں، سلنا اب بھی بولا جاتا ہے لیکن اوسلنا، کم سے کم ثقافت اور اہل علم و ادب کی زبان پر نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ اور جملے اس نظم میں جا بجا میسر آتے ہیں۔ ان محاسن کے علاوہ یہ نظم بہت سی خالص شاعرانہ قدروں سے لبریز ہے۔ گیارھویں، چودھویں، پندرھویں، سوٹھویں، استرویں اور انیسویں بندوں میں قدیم عقائد اور مذہبی روایات کی تلخیصیں ہیں۔ تیسویں بند میں، حکیمانہ خیالات و محسوسات کو شاعری کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بھونچال میں کہاں تھا یہ عالم جال کا سب حکم تھا یہ حضرت ایزد تعال کا
ایک دم میں یوں بڑھا دیا خلیہ جلال کا ایک دم میں یوں دکھا دیا جھکا جمال کا
دریا و کوہ، شہر و جنگل، سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

کوٹری نامہ، ایک طنز ہے جو روٹی نامے کی طرح اقتصادی نقطہ نظر سے پیدا ہے۔ نظیر نے اس قسم کی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ روٹی نامے، کوٹری نامے کے علاوہ پیسے نامہ بھی ہے۔ یہ سب ایک ہی خیال کے نئے نئے پہلو اور ایک ہی قسم کے مطالعے کے مختلف نتیجے ہیں۔ دنیا میں مدارج کی ناہمواری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو نظیر بہت ناپسند کرتا ہے۔ سماج کے اس غلط نظام پر اس نے، اپنے کلام میں جگہ جگہ طنز کیا ہے۔ کہیں یہ طنز بالکلیا یہ ہے، کہیں بالراست ہے اور کہیں زیادہ قوی ہو کر ہزاروں کی حد تک پھونچ جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں، مسلمانوں کی ذہنی و اخلاقی پستی نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ اہل ثروت کو اہل دل اور اہل وجاہت کو اہل باطن بھی تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس مفروضہ بزرگی کی بنا پر، پیری مریدی کے واسطے بھی پیدا کر لے جاتے تھے، دست بوسی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ نظیر نے پہلے بند کے پہلے مصرعے میں اسی قومی تنزل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہل یقین ہیں کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
 کپڑے بھی ان کے تن کے نہایت مہین ہیں سمجھتے ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

مریدوں میں کشف و کرامت کی شہرت ہو جانے پر یہ صاحب کے لئے تحفے اور سوغاتیں آنا شروع
 ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کھانے کے لئے نعمتیں اور پہننے کے لئے مہین کپڑے آسانی سے میسر آنے لگتے ہیں
 لیکن وہ لوگ جو اہل نظر ہیں ان تدبیروں کو خوب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چین اس بند کے جو تھے مصرعے میں ذی فہم و
 دقیقہ رس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تیسرے بند کے دوسرے مصرعے میں، اپنے عہد کے پیشہ ور
 فوجی جنرلوں اور ہرجائی فوج کی طرف اشارہ ہے۔ چوتھا بند بڑا معنی خیر ہے اور اس کو جو تھا مصرعہ خصوصیت کے
 ساتھ نہایت بلیغ ہے۔ یہاں سائیں کے میلے کے معنی بہت وسیع ہیں اور زندگی کے ہر پہلو پر منطبق ہو سکتے
 ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو رتھ خانہ، فیل خانہ، ٹیلا کہاں سے ہو
 منڈوا کے سرفیئر کا چیلہ کہاں سے ہو کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پانچویں بند میں زر کی محبت کی حد دکھائی ہے اور ساتویں میں بتایا ہے کہ یہ عقائد و ایمان ہمک
 خلل ڈال دیتی ہے۔ انگلستان کے مشہور وزیر اعظم و ایبول (۱۶۷۶ - ۱۷۴۵) کا مقولہ ہے کہ ہر آدمی
 خرید و اجا سکتا ہے۔ نظیر نے بھی بالکنایہ اسی حقیقت کو اپنے نقاب کیا ہے۔ قبرستان بیچنے اور مسجد کھدوانے
 کا الزام اسی عہد کے بعض ایمان فروش مسلمانوں پر نہیں، نظیر کے زمانے میں بھی اس قسم کے زر پرست موجود

تھے جو ذاتی منفعت کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے۔ بہر حال، یہاں کسی خاص فرد کی طرف اشارہ نہیں، محض زیر کی قوت و کار فرمائی دکھانی مقصود ہے۔ نوں بند میں کوڑیوں کے بھاڑ کا حالہ ہے۔ یہ آگرے کی ایک خاص سطح ہے۔ ذاتی اغراض کی بنا پر، ایک خاص طبقے کے لوگوں نے کسی زمانے میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ گیارہ سڈھی کے کنویں میں پیسے کوڑی کا بھاڑ آویزاں ہے۔ جننا کے بائیں کنارے پر ایک امرود کا باغ ہے جو گیارہ سڈھی کہلاتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ نور جہاں کا امرودوں کا باغ ہے اور اس کے درخت گلاب اور کیوڑے سے سینچے جاتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک سالم پتھر سے گیارہ سیڑھیاں تراش کر، یہاں ایک جگہ نصب کر دی گئی ہیں۔ یہاں ایک باؤلی بھی ہے جو اپنی قدامت اور طرز عمارت سے اپنے مغلیہ ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان سیڑھیوں کا نجوم و فلکیات سے کوئی تعلق ہے۔ چنانچہ نو عمر اور نا تجربہ کار لڑکوں کو ہلکا پھسلا کر، کوڑی پیسے کا بھاڑ دکھانے کے بہانے سے، فریب دے کر، یہاں لایا جاتا تھا۔ نظیر اپنے سماج کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اس نے اپنے عہد کی اس مذہم شرمناک عادت پر طنز کیا ہے۔ دسویں بند میں دکھایا ہے کہ دولت چند ہی روز میں انسان کا معاشری درجہ کہاں سے کہاں پھونچا دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بن کوڑی، خردئے کے برابر بھی پت تھی کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
 آگے گماشتوں کے کھسلی ہر طرف ہی پھر وہ جو کچھ کہیں تو وہی بات ہے، سہی
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

اس بند کے چوتھے مصرعے میں ”سہی“ کا استعمال نہایت غیر معمولی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظیر کو چونکہ عامۃ الناس کا لفظ پسند ہے اس لئے صحیح کو ”سہی“ نظم کر دیا ہے۔ یہ خیال اگر قائم ہو تو غلط ہے۔ یہاں ”سہی“ اپنی اصل حیثیت اور قبول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ زبان کے رموز و احکم سے واقف ہیں وہ خوب

جانتے ہیں کہ ”سہی“ قبول کے معنی میں مستعمل ہے۔ ”اچھا تو یوں سہی“ میں ”سہی“ قبول کا مترادف ہے۔ اس نظم میں بند کے آخری دو مصرعوں میں زندگی کے تجربوں کی روح، حلول کر دی گئی ہے اور چٹا مصرعہ تو اتنا فلسفیانہ ہے کہ ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے۔

وجد و حال ایک عارفانہ نظم ہے جس میں حقیقت آشنا شاعر نے خلقت و کائنات کے رموز و حکم پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں تصوف کے اسرار و مسائل کو موسیقی کی زبان میں نظم کیا ہے۔ نظم کی زبان، انداز بیان اور لب و لہجہ تلمسی داس کی راہ میں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ بحر کا ترنم، موضوع کی پُر رمز سی پوری پوری مطابقت کرتا ہے۔ اس میں یہ راز آشکارا کیا ہے کہ ترکِ علاق کے بعد انسان کے لئے فطرت کی حقیقی موسیقی سننے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ انسان اگر اپنے داخلی وجود کو نشوونما دینا چاہے تو خارجی وجود سے قطع نظر کر لینا ضروری ہے۔ تصنیفِ نفس کے لئے تزکیہ باطن پہلی شرط ہے۔ جسم و جہانیاں سے مبرا ہونے کے بعد دل آگاہ سے واسطہ پیدا ہوتا اور فطرت کے مستور حقائق کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ مشرقی ریاضت و پرہیزگاری کا فلسفہ جس نے روح کی بقا کو جسم کی فنا پر منحصر کر کے، آثار و ضبطِ نفس کا پرچار کیا ہے نظیر نے نہایت حسن و خوبی اور بڑی شہر و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے مگر یونان کا نظریہ اس فلسفے کے خلاف ہے۔ اہل یونان کی تلقین یہ ہے کہ روح کی قوت جسم کے حسن و صحت پر منحصر ہے اس لئے جسم کی پرداخت بیش از بیش ضروری ہے۔ ورڈسورٹھ جس کے کلام میں مشرقی تصوف و روحانیت کا بڑا عنصر موجود ہے نظیر سے ہم آہنگ ہے۔ وہ کہتا ہے:-

”میں اس متبرک کیفیتِ نفس کا جو یا ہوں۔ جس میں اس رمز کا بار اس مارے ناقابلِ فہم عالم کا تھکا دینے والا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ پرسکون اور متبرک کیفیت جس میں نعت بہ شفقت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس جہانی ڈھانچے کی سانس اور ہمارے بشری خون کی حرکت بھی قریب قریب معطل ہو جاتی ہے، ہم جہانی طور پر سلا دئے جاتے ہیں اور ایک پرجیات روح بن جاتے ہیں اور اس آنکھ سے جسے ہم آہنگی کے

زور اور انبساط کی راسخ قوت نے ساکت کر دیا ہے، ہمیں اشیاء کی ماہیت نظر آنے لگتی ہے۔

انہی مغاہیم کو دوسری طرح، نظیر نے وجد و حال کے دوسرے اوڑھیسے بندوں میں بیان کیا ہے۔
ملاحظہ ہو:-

کل باجے بج کر ٹوٹ گئے، آواز لگی جب لہرانے اور چم چم چم کر رہا ہوئے، تب گت کا انت لگے پانے
سنگیت نہیں یہ سنگت ہے، ٹوٹے بھی جس سے ٹٹ مٹانے یہ نالچ کوئی کیا پچانے، اس نالچ کو نالچے سو جانے
ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں

جو بے گت، بے سُر تال ہوئے، بن تال نکھا دج نا سچے ہیں

جب ہاتھ کو دھویا ہاتھوں سے جب ہاتھ لگے تھرکانے کو اور پاؤں کو کھینچا پاؤں سے جب پاؤں لگے گت پانے کو
جب اکٹھا اٹھالی ہستی سے جب نین لگے مٹکانے کو سب کا کچھ کچھ، سب نالچ سچے اُس ریا پھیل بھجانے کو

ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں

جو بے گت، بے سُر تال ہوئے، بن تال نکھا دج نا سچے ہیں

شعب و شباب، ایک مصورانہ نظم ہے جس میں بڑھاپے اور جوانی کے امتیازی خصوصیات کی محاکات نگاری کی گئی ہے۔ نظیر کی بہت سی نظمیں کائناتی قدروں کی حامل ہیں اور یہ اسی قسم کا ایک شہ پارہ اور زندہ جواوید کا نامہ ہے۔ انسانی زندگی کے یہ دو دور، حیات کی دو قہری حقیقتیں ہیں جن سے دنیا کے بیشتر انسانوں کو لازماً سابقہ پڑتا ہے۔ ان حقائق کے کیفیت و مزاج میں ازل سے آج تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا اور آج سے ابد تک بھی کسی تغیر کا امکان نہیں۔ بوڑھاپے اور جوانی کے لوازم ہر زمانے، ہر ملک، ہر قوم پر یکساں صادق آتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ اگر گزرنے پر بوڑھاپے کی فراست، شباب کی خامیوں کا جائزہ لیتی اور نوجوانوں کو حذر کی ہدایت کرتی نظر آتی ہے مگر ایسی بے شمار مساعی کے باوجود، جوانی کی خامیاں اور بوڑھاپے کی اس نوع کی ناکام کوششیں، جہاں سے شروع ہوتی تھیں، آج بھی وہیں ہیں۔ جوانی اور بوڑھاپا، اپنے

حدود کے دائرے میں محصور اپنی جبلت کے تقاضے پر ہنوز کاربند ہیں۔ اسی کا نام فطرت ہے۔ نظیر نے اسی واقعیت کی مصوری کی ہے۔ پوری نظم، اول سے آخر تک فطرت کا وسیع و فائز مفصل و دقیقہ رس مطالعہ ہے۔ جس بالائے حق یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشرت کے لوکل کلر کی آمیزش سے، موضوع کے آب و رنگ کو ملی مذاق کے مطابق بھی بنا دیا ہے۔ ماحول سے مطابقت نظیر کے بیان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے بوڑھا پے اور جوانی کے منفرد تصورات کو ان کی مخصوص دہرنگ زبان اور اصطلاحوں کے جاسے میں ملبوس کر کے پیش کیا ہے جس سے بیان کا کثرت و اثر دوبالا ہو گیا ہے۔ کردار نگاری پر نظیر کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جب وہ اس فن کی طرف مائل ہوتا ہے تو زندگی کے جیسے جاگتے افراد بنا کر کھڑے کر دیتا ہے۔ اس نظم میں جوانی اور بوڑھاپا، اپنے اصل رنگ روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔ سیدھی سادھی، بے ریا اور بے تصنع واقعیت اس نظم کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔ اس خوبی نے، قوت کے ساتھ، اثر بھی، اس نظم میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ موضوع کے جذباتی و روانی پہلو سے قطع نظر کر کے، روزمرہ زندگی کا علمی و واقعاتی پہلو پیش کیا ہے جو اعلیٰ سے ادنیٰ تک ہر ذہنیت کے لئے دلچسپ اور قابل فہم ہے۔ اس کے بیان کی ایک ندرت یہ بھی ہے کہ بندوں کو مکالمے کے ڈھنگ پر مرتب کیا ہے۔ اس انداز نے، نظم میں ایک ڈرامائی حق بھی پیدا کر دیا ہے جو اشیاء کے ماحول سے بھی پوری مطابقت کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی سادگی اور صفائی بے مثال اور حسب حال محاوروں، ترکیبوں اور ضرب الامثال کا استعمال لاجواب ہے۔ پہلا بند خصوصیت کے ساتھ انسانی فطرت کی سچی مصوری ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں زندگی کا ایک اہم مشاہدہ مرکوز ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جہاں میں یار و خدا کی عجب خدائی ہے کہ ہر کسی کو کبتر ہے خود نائی ہے
ادھر جوانی، بوڑھاپے پہ چڑھ کے آئی ہے ادھر بوڑھاپے کی اُس پہ ہوتی چڑھائی ہے

عجب جوانی، بوڑھاپے کی اب لڑائی ہے

انسان اپنی نوع کے اعتبار سے مکمل مخلوق ہے مگر اکثر اس کا غریبا کمال کبتر کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

مجھے اس سلسلے میں مشہور فرانسیسی مصنف پیکل (۱۶۲۳-۱۶۶۲) کا ایک قول یاد آگیا جو حسب ذیل ہے:-

”انسان ایک سرپتے کے سوا کچھ نہیں۔ نطرت کا سب سے اتواں سرپتا، لیکن وہ مفکر سرپتا ہے۔

کیا ضرور ہے کہ ساری اہی کائنات اُسے پا مال کرنے کو مسلح ہو جائے، ایک انخرہ، پانی کا ایک قطرہ، اُسے فنا

کرنے کو کافی ہے۔ لیکن جب کائنات اُسے پا مال کر دیتی ہے تو انسان پھر بھی اُس چیز سے کہیں انفسل

رہتا ہے جس نے اُسے فنا کیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہے کہ کائنات مجھ

سے کہیں زیادہ قوی ہے، کائنات کو اس سب کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا“

پیکل کا مشاہدہ ایک دقیق فلسفیانہ حقیقت ہے اور انسان کی عظمت و برتری کی ایک اہم اور اٹل دلیل ہے۔

نظیر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتاتا ہے کہ انسان کا احساس عظمت، کبھی تکبر و خودنمائی کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔

نظیر نے اوپر کے بند میں، اسی تکبر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے بندوں میں جوانی اور بوڑھا:

کے مزاج کا تقابل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جوانی اپنی جوانی میں ہو رہی سرشار بوڑھا پا، اپنے بوڑھا پے کا ہو رہا دم مار

ہوئے ہیں دونوں بولنے کے واسطے تیار ادھر جوانی نے چھینچی ہے آسپر تلوار

بوڑھا پے نے بھی ادھر لاٹھی ایک اٹھائی ہے

ادھر ہے تیر سا قامت ادھر ہے پشت کماں ادھر ہے کھڑی کمر اور ادھر اکڑ کی شاں

جوانی کہتی ہے بڑھ کر سن لے بوڑھا پے میاں تری ہے خیر اسی میں کہ جاسرگ اب ہاں

وگر نہ تیری اجل، میرے ہاتھ آئی ہے

ان بندوں میں متقابل الفاظ اور جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ جوانی، سرشار ہے اور بوڑھا پا دم مارتا ہے،

جوانی سپر تلوار، چھینچتی ہے اور بوڑھا پا لاٹھی اٹھاتا ہے، جوانی کا قامت تیر کی طرح سیدھا ہے اور بوڑھا پے

کی پیٹھ کمان کی طرح خم ہے، جوانی میں اکڑ کی شان ہے، بوڑھا پے کی کمر کھڑی ہے۔ ان اسالیب اور محاوروں

کے استعمال سے جوانی کے جوش و خروش اور بوڑھاپے کی منانت و بنیدگی کی سچی مصوری کی ہے۔ چوتھے بند میں خالص جوانی کا کردار پیش کیا ہے اور چھٹے میں 'کان مروڑنا' لکھ کر بوڑھاپے کی بزرگانہ اعتدال پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساتویں میں جوانی، بوڑھاپے کی ڈارٹھی پر طنز کرتی ہے اور آٹھویں میں بوڑھاپا، جوانی کو مونچھ اٹھانے کی دھمکی دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں، مونچھ جوانی اور اکبر کی علامت و طرہ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بوڑھاپا، مجبور ہو کر اسی خصوصیت پر حملہ کرتا ہے جس پر جوانی کو سب سے زیادہ ناز و غرور ہے۔ نویں بند میں، جوانی، بوڑھاپے کے جیسے کو بے حیائی بتاتی ہے۔ دسویں میں بوڑھاپا اس کا جواب دیتا ہے اور اپنی دلیل کو ضرب الامثال سے قوی اور قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے۔ گیارھویں بند میں، بوڑھاپے نے جوانی کے متعلق ایک نہایت دل شکن حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

تیری بو پوچھو تو ہے چار دن کی سب کو چاہ جہاں تو ہو چکی، بس ہے گاتیرا حال تباہ
ہمیں ہیں وہ جو کریں ہیں تمام عمر نباہ تو ٹک تو دیکھ، گریبان میں ڈال کر منہ آہ
کہ اب ہے کس میں وفا، کس میں بے وفائی ہے

بارہواں بند لاجواب ہے۔ ملٹن نے اپنی مشہور نظم 'کوس میں' بدی کی طرف سے، جو دلائل، خود کوس کی زبان سے پیش کئے ہیں وہ بادی النظر میں، نیکی کے دلائل سے زیادہ قوی ہیں۔ ایسی ہی دلیل، نظیر نے، جوانی کی طرف سے، اس بند میں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

جوانی جب تو یہ بولی بوڑھاپے سے سن کر تیری وفا سے، مری بے وفائی ہے بہتر
میں جب تلک ہوں بہاریں مزیں ہیں سرتاسر جو سلطنت ہو گھڑی بھر تو وہ بھی ہے خوش تر
میرے تو لوٹ لئے گو کہ پھر گردائی ہے

اس طرح بارھویں بند کی بنیاد، ابقوریس کے فلسفے کے مطبی مفاہیم پر قائم ہے، اسی طرح تیرہواں بند رواقیون کے نقطہ نظر سے متاثر ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کہا بوڑھا پے نے سن کروہ سلطنت ہے کیا کہ جس کے سات لگا ہوزوال کا دمھڑکا
ہمیں ملی ہے بزرگی کی وہ سند اس جا کہ جب تنگ ہے رہے گی ہمارے ساسدا
خدا نے ایسی ہی دولت ہمیں دلائی ہے

اٹھارویں بندیں بوڑھا پے کی خلقی فراست وزیر کی مصلحت اندیشی و تجربہ کاری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس
مصرعے سے کہ :-

ہم اپنی دھوکے کی ٹٹی میں کھیلتے ہیں شکار

سعدی کا یہ مشہور مصرعہ :-

جہاں دیدہ بسیار گوید یر و رخ

یاد آجاتا ہے۔ بیسیوں اور اکیسویں بندوں میں ہندوستان کی بازدارمی لڑائی کا سماں کھینچا ہے۔ بانیسویں بندیں
اس حجت و تکرار کا نتیجہ نکالا ہے۔ اس بند کا تصور خاص نظیر کے حصے کی بات ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور عملی
پہلوؤں سے بچتا رہتا ہے اور درمیانی راستے کو زندگی کی مشکلوں کا حل سمجھتا ہے۔ جس طرح دو عالموں کے
درمیان برزخ اور بہشت و دوزخ کے مابین اعراف کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرح جوانی اور بوڑھا پے کے
درمیان ادھیرپن کا وجود مسلم ہے۔ نظیر نے خود اپنے آپ کو، ادھیرپن کے روپ میں پیش کیا ہے، یہ جوانی کو روکتا
اور بوڑھا پے کو سمجھاتا ہے اور معاملے کو رفع دفع کر دیتا ہے۔ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ جوانی اور بوڑھا پے،
دونوں اپنی اپنی جگہ زندگی کی اہم منزلیں ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں۔

بلدیو جی کا میلہ، ایک بیانیہ شاہکار ہے جس میں نظیر کی حاکمانہ عظمت، اپنی پوری قوت، سادگی اور تنوع
کے ساتھ کارفرما ہے اور جس میں رسوم و رواج، کردار و خصائص، جذبات و تصورات اور مناظر و شواہد کی صورت گئی
ملکی و معاشری مواد سے کی گئی ہے۔ یہ نظم برہنس کی بعض نظموں سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں بھی ہندوستانی
زندگی کی سادہ اور بے رنگ تصویریں، واقعات کی صحت اور شاعرانہ نزاکت و لطافت کے پس منظر میں نظر آتی ہیں۔

بلدیو، ایک قصبہ ہے جو تھرا کے قریب ہندوؤں کا ایک مشہور تیرتھ ہے۔ بلدیو، کرشن جی کے بڑے بھائی بلرام کا لقب ہے اور انہی کے نام پر اس قصبہ کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ میلے کے نزعات کا ذہنی جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹے پیمانے پر ایک دنیا تعمیر کر کے، زندگی کی کشمکش، گونا گونی، روادروی، نفسی نفسی اور ہر کس بہ خیال خویش خطے دارد کے جیسے جاگتے مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ میلے کی بھیڑ بھاڑ، باجم و انبوہ میں، ہر قسم، ہر مذاق، ہر معاشرت کا انسان، اپنے رنگ میں رنگا، اپنے خیال میں گم اور اپنے حال میں مست نظر آتا ہے۔ حیات و مشاغل حیات سے شاعر کی محبت کا پورا ثبوت اس نظم میں موجود ہے۔ میلے کی چہل پہل اور وہاں کی آنا و بٹاش زندگی کو مصورانہ کے علاوہ، فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیانہ رموز کی وضاحت سے حقائق و معارف بھی بے نقاب کئے ہیں۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو تعجب ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان شاعر، ہندو مذاق کے میلے کا حال ایسے شغف و انہماک، ایسی تفصیل و تشریح اور اتنی محبت و عقیدت سے کیونکر قلم بند کر سکا۔ لیکن یہ سمجھ لینے کے بعد کہ نظیر کا قلب صرف اسلامی قلب نہیں، انسانی قلب ہے اور اس کی ہمدردیاں مذہبی یا فرقہ وارانہ نہیں کاٹتی ہیں، یہ تعجب بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ زبان کی سادگی و لطافت اور محاورے کی صحت و شیرینی، اس نظم میں عروج پر ہے۔ بعض لفظوں اور محاوروں کے استعمال پر نظیر کی انفرادیت کی تہنیت ہے۔ نظم کی بحر، مصرعوں کی بیباختگی اور بے تکلفی سے شیر و شکر ہو کر ایسی موسیقیت پیدا کر دیتی ہے جس کا اثر داخلی اور دائمی ہے۔ پہلا بند صوفیانہ ہے اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کیا وہ دلبر کوئی نوہلا ہے	ناتھ ہے اور کہیں وہ چہلا ہے
موتیا ہے چنبیلی، بیلا ہے	بھیڑ، انبوہ ہے، اکیلا ہے
شہری، قصبائی اور گنویلا ہے	زرا شرفی ہے، پیا، دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے	بھیڑ ہے خلقوں کا ریلا ہے

رنگ ہے، روپ ہے، بھمیلہ ہے

زور بلد یو جی کا میلا ہے

اناطول فرانس کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ اہل علم کا مصنف ہے۔ اگر محض دیوالا، روایات اور تلحیات کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ خطاب نظیر بھی صادق آتا ہے لیکن نظیر نے اپنے نقطہ نظر اور اپنی ہمہ دانی کو اس قدر مل اور عام فہم بنا دیا ہے کہ وہ خواص کی جگہ عوام کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کو ہندو دیوالا سے پوری واقفیت اور بڑی محبت ہے جس طرح اناطول فرانس کے افسانوں میں توریت و انجیل کے حوالوں اور مسیحی تلحیات کی کثرت ہے، اسی طرح نظیر کے کلام میں ہندو دیوالا کے حوالے جا بجا پائے جاتے ہیں۔ تیسرے بند میں بشن کے بارہ اوتاروں کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن	کہیں کچھ مجھ ہے اور کہیں رلون
کہیں بارہ، کہیں مدن موہن	کہیں بلد یو اور کہیں سیکشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن	کہیں نہ سنگھ ہے، وہ ناراین
کہیں نکلا ہے سپر کو بن بن	کہیں پھر تا پھر ہے سہ یوں بن بن

رنگ ہے، روپ ہے، بھمیلہ ہے

زور بلد یو جی کا میلا ہے

اس نظم کا ہر بند اپنی جگہ مکمل اور زندگی کا سچا مرقع ہے۔ ہر بند سے ایک تصویر بنائی جاسکتی ہے، اور پوری نظم سے ملنے کا ایک لاجواب فلم تیار ہو سکتا ہے۔ بارہویں بند کی حسین و پاکیزہ واقعیت رومان و شعر کی جان ہے۔ تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ حسن بیان اور ندرت تشبیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بند ملاحظہ ہو:-

نازنین ہیں وہ سانوری گوری	جن کی نازک ہر اک پری پوری
کر کے چتون، نگاہ کی ڈوری	دل کو چھینے ہیں سب برا ڈوری

دھوم، ناز و ادا، جھکا بھوری
برج میں جیسے نچی رہی ہو ری
گھونٹوں میں ہیں کر رہی پوری
پوری کیسی کہ صاف سر زوری
رنگ ہے، روپ ہے، بھمیلہ ہے
زور، بلدیو جی کا میلا ہے

زمانے کے امتداد اور مغربی تمدن کے روز افزوں اثر سے ہندوستان کا قدیم تمدن دم توڑ رہا ہے۔ پرانی سماجی زندگی کے تفریحات و مشاغل کے مزے پھینک پھینک کر یہاں کی رنگینیاں ماند پڑ کر رہ گئی ہیں۔ نقیرنے اٹھارویں انیسویں صدیوں کی معاشرت کے بہت سے لطائف و کوائف کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ جب تک اس کا کلام زندہ ہے بلدیو جی کے میلے کی چیل پیل اور برج کی ہو ری کی رنگ رلیاں زندہ ہیں۔ ہندوستان زندہ باد۔

پندرہویں بند میں دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ایک لفظ ”ساگے“ استعمال ہوا ہے۔ یہ ساگہ کی تصریحی صورت ہے مگر یہاں جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ناچ اور رنگ کے کھڑائے ہیں گھنگرو اور تال کے جھنکے ہیں
نقلیں، تھپے، کہانی، ساگے ہیں کھنڈ، دوہرے، کبت، کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپا کے ہیں کہیں بوسوں کے سو جھپا کے ہیں
تھر تھری، دانت پر کڑا کے ہیں تپ پچاڑے کے سو جھڑا کے ہیں
رنگ ہے، روپ ہے، بھمیلہ ہے
زور، بلدیو جی کا میلا ہے

اس لفظ سے پڑھنے والے کا ذہن فوراً انگریزی لفظ ”ساگہ“ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس لفظ کے معنی، سویڈن، نوروے اور آئس لینڈ کی تاریخی داستان بالخصوص وہ داستان ہیں جن میں ہرستانی خاندانوں

یا شاہانِ نوروں کے کارنامے بیان ہوئے ہوں بجز آیہِ نظرِ زمیہ داستان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں بھی یہ لفظ بہادروں کے کارناموں کا مترادف ہے اور آٹھا اودل کی لڑائی اور کنور بجے کے معرکوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بروج بھاشا کے یہ قصے داستانِ امیر حمزہ اور شاہنامے کی قسم کی تصانیف ہیں۔ اس بند کے قافیہ نظیر کی زبانِ دانی کے معجزے ہیں۔

اکیسویں ہند میں ہندوستان کے اس طبقے کی معاشرت کا ایک منظر پیش کیا ہے جو ہر حاضر کی سیاسی زبان میں پروتاریہ (پرو لیٹیٹ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظیر کو اس طبقے اور اس کی معاشرت سے خاص محبت ہے۔ اس کی زبان اور اس کی زندگی کا بھی وہ بڑا مبصر ہے۔ ملاحظہ ہو:-

لاٹھوں بیٹھے باطلی اور منہدار	اینا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی، بنگڑی کی اک طرف جھنگار	لوگر ہی پوتھ، انگوٹھی چھلے ہار
ٹوٹے ٹوٹے گنوار سی اور گنوار	جس گنوار کو چلئے دھکا مار
گر کے فے گائی، یوں کے ہے پکا	سکیسوا ٹھلا چلے ہے ڈاڑھی جلا

رنگ ہے اروپا، جھمبلا ہے

زور بلدیو جی کا میلہ ہے

شاعری کی فضا میں پرواز خیال کا نام عظمت، جذبات کی مصوری کا نام تغزل اور نئیات کی مرقع کشی کا نام محاکات ہے۔ خیالِ آرائی کے ساتھ نظیر کو جذبات نگاری اور واقعات کی مصوری میں بھی یدِ طولی ہے۔ اس کا کلام ان سب اجزائے دل کی صورتِ بزیں ہوتا ہے۔ جاذبیت و اثر، سرشاری و مہوشی کی جو کیفیت اس کی غزلوں میں سمیٹی ہوئی ہے وہ غزل گوئی کی انتہا ہے۔ غزل کے احاطے کے باہر نظموں میں بھی وہ کہیں **تغزل** کہیں یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تہیں ڈوب کر شعر کہتا ہے اور قلب میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے وجود پر ہمہ وقت ایک لذت و تجویدی، ایک سرسستی و سرخوشی طاری رہتی ہے اور یہی وجدانی عالم وہ

پڑھنے والے پر بہ وجہ اولی طاری کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ لذت اردو زبان کی ایک لازوال و دائمی دولت ہے۔ جذبات کو براہِ نیغہ کر کے، رومانی سماں پیدا کرنے اور محبت کے عالم میں گم کر دینے میں بھی اس کو کمال حاصل ہے۔ لیکن یہ پہلو اس کے کلام کا ایک آنی و وقتی کرشمہ ہے۔ اس کی اس نوع کی رومانیت کو اس کی واقعیت سے مخلوط نہ کر دینا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ نظیر کے یہاں تغزل نہیں ہے۔ یہ الزام قطعی غلط اور مطالعے کی کمی پر مبنی ہے۔ نظیر تھوک فروش تاجر کی قسم کا شاعر ہے اور غزل ایک قسم کی خردہ فروشی ہے۔ تھوک فروش جس کی دوکان میں وہ سارا مال بڑی مقدار میں میسر آتا ہے جو خردہ فروش تھوڑا تھوڑا کر کے بیچتا رہتا ہے۔ جو شاعر نظیر کی طرح انسان کے تمام و کمال نفسیات کا ماہر ہو، وہ اس نوع کے جزوی نفسیات سے کیونکر آسٹھنا نہ ہو گا جو غزل میں باندھے جاتے ہیں۔ جو شاعر انسان کے قلب کی جملہ کیفیات کو کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہے، وہ اس کیفیت کا بھی نبض شناس ضرور ہو گا جس کا نام محبت ہے اور اس نوع کی محبت کا بھی جو عاشق کو معشوق سے ہوتی ہے جب وہ بیان کے جملہ اصناف پر قدرت رکھتا ہے تو زبان کے ان لطیف و نازک اشاروں اور کنایوں سے بھی خوب واقف ہو گا جن سے ”راز گفتن بہ معشوق“ کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ یونان قدیم کا وہ نامعلوم صنّاع جس نے وقار و تناسب کو اپنے لمس و نظر میں سمو کر، قلب مرمر سے ٹائکو وینس کا وہ دی حیات پیکر تراشا جو آج بھی نسائی رعنائی کا معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور پہلی مرتبہ جمال کی پرستش کا مرئی موضوع خلق کیا، حقیقت میں نوع انسان کا سچا شفیق تھا۔ اس کے چند عالمی لعلوں نے، اپنی بیتاب روح کی اس دقیق و مبہم آرزو کی صورت گری کر دی، جس کو مشکل و محتمل دیکھنے کے لئے نوع انسان کی آنکھیں یوم خلقت سے ترس رہی تھیں۔ اس نے انکشاف ذات کی ایسی سیدھی سچی راہ نکالی جو نفس انسان سے اب تک پوشیدہ تھی۔ اس نے

لہٰذا ناٹو ایک یونانی جزیرے کا نام ہے۔ سسٹنڈہ میں اس جزیرے کے صدر مقام ناٹو کے کھنڈروں میں یونان کی مشہور دیوی وینس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جو وینس کا بہترین مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ ناٹو وینس کہلاتا ہے اور اب پیرس میں ہے۔

جذبات پرستش کو خود اپنے وجود کے مطالبوں سے آگاہ کرویا۔ اسی طرح وہ شاعر جو اپنے جذبات محبت کو صحت و تغزل کا جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے بڑا اور سچا شاعر ہے۔ نظیر ایسا ہی شاعر ہے۔ اس کے تغزل میں صحت و خلوص کے ساتھ نقاشانہ نظر فریبی اور مصورانہ دلنوازی بھی ہے جس وقت وہ مزے مزے کی لطیف باتیں کرتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ چنبیلی میں بسی ہوئی نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے دماغ کو معطر اور روح کو مسرور کر رہے ہیں۔ اس کی غزلیں حسن و رنگ، مسرت و طرب، سرشاری و سرخوشی کی نوید ہیں جو طول لحوں کو مسرور بنا دیتی ہیں۔ اس نے شکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسی ہی آسانی سے غزلیں کہی ہیں جیسی سادہ اور سہل متنوع میں۔ بعض زمینیں اس نے خود پیدا کی ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی جگہ جگہ مکالمے کا التزام نظر آتا ہے۔ شوخی، شہرت، پھیر چھاڑ، اور معاملہ بندی جو بعض کے نزدیک غزل کی جان ہے اس کے یہاں کافی مقدار میں موجود ہے۔ بوسے سے نظیر کو خاص محبت تھی۔ اس کا ذکر جگہ جگہ اور بالکل صاف صاف ہے۔ اس کے تغزل کے چند پاکیزہ نمونے ملاحظہ ہوں :-

بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے ہے پرئی	وگر نہ سینے سے دل تڑپ کر نگہ میں آکر مقام کرتا
ساتی نے سب کو بھر کے دئے جام بزم میں	ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا
یہ غنچہ جو بے درد گلچیں نے توڑا	خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا
گلے کا ہار جو اس گل بدن کے ٹوٹ بڑا	تو ڈر نظر کا وہیں اس کو ایک بار ہوا

نکل اپنا نہ خارا اپنا نہ ظالم باغیاں اپنا
مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے
اسی کی مہربانی سے سبھوں کی مہربانی ہے
ان اشعار میں اردو شاعری کا اعلیٰ ترین تغزل موجود ہے۔ بعض شعرا ایسے ہیں جو میر کے کلام سے برابر

کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آخر کے تین اشعار میں زبان اور محاورے کی بیش از بیش لطافتیں میسر آتی ہیں۔ اور مثال ملاحظہ ہو:-

چمک جا پھر خدا کے واسطے اسے طرے کے شعلے کہ مثل آتش افسردہ پھر کچھ دل چلا گھلا
اس غزل میں بھلا اور دہلا وغیرہ قافیے ہیں اور گھلا بھی ہے۔ یہ لفظ اس وقت نیا نیا سا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سرد یا افسردہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ہزاروں قافلے جس شوخ نے کئے غارت نظیر کو بھی اسی بے وفائے لوٹ لیا
طور کو پھونک دیا اس نے تمھاری خاطر جہنم کے واسطے جب سرمے کا سامان کیا
دل یار کی گلی میں کر کر ام رہ گیا پایا جہاں فقیر نے بسر ام رہ گیا
دیادول ہم نے تم کو اور تو اب کیا کہیں لیکن یہ دیر نہ تمھارا ہے اسے معمور رکھے گا
یہ سارے اشعار غزل کی نہایت پاکیزہ مثالیں ہیں لیکن آخر کے شعر میں محبت کا جذبہ انتہائی خلوص کے ساتھ کارفرما ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بیان کا لب و لہجہ اتنا سادہ اور بے ریا ہے کہ فوراً دل پر اثر کرتا ہے۔ اور دلچسپ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

آغوش تصور میں جب ہم نے اسے مکا بہائے نزاکت سے اک شور تھا بس بس کا
سوا بحر اس کا مکا نگہ گل سے شبنم سے کب لے بلبل پیرا ہن گل مس کا
اس تن کو نہیں طاقت شبنم کے تلبس کی لے دست ہو اس پر تو قصد نہ کر مس کا
ان اشعار میں میر تقی میر کا سا تغزل اور انیس کے کلام کی سی نزاکت و لطافت سمونی ہوئی ہے۔ اور حسین مثالیں یہ ہیں:-

لڑی، منہ سے نہ بولی رد ٹھ بیٹھی بھر طکیاں دے لیں اسے سب کچھ بن آتا ہے مجھے کچھ بن نہیں آتا
تیشے کی کیا مجال تھی جو ترانے بے سبوں تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھلایا

کیا ہے کیا مہ کنعاں پہ حسن نے احسا
بہار دیکھو دے رشک سے یہ کہتی ہے
نظیر آج تصدق کو کچھ نہ تھا ہم پاس
نہ جلوں میں تو اس کے پاس لیکن کیا کروں یا رو
نظیر اک دو لگے کرنے بہت ہوتے ہیں خواب سے
گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا
اس مطلع کا لب و لہجہ خسرو کے مقطع سے بہت ملتا جلتا ہے جو یہ ہے :-

خلق میگوید کہ خسرو بہت پرستی می کند
نظیر کے تغزل کی اور دل آویز مثالیں ملاحظہ ہوں :-

فلک بھی پہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
سبھوں کو سنے ہیں تو تاباں دل پلانا تھا
کہ تھا جو گھر سوہارا وہ قید خانہ تھا
شب فراق کی ادنیٰ سی اک یہ حالت ہے
سراپا پاننتی اور پاننتی سراپا تھا
غرض یہ سمر کی خبر تھی نہ پا کا ہوش نظیر
میں محقق کا جلاہوں مرا کچھ نہیں علاج

اُکھٹ اب متروک ہے۔ یہ لفظ نظیر کے زمانے میں اورانیسویں صدی کے آخر تک، اکبر آباد اور مضافات میں اُکھڑ کے معنی میں رائج تھا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کو سننے والا
مرا مجھے کہتا تھا سو مہرتا ہوں میں بارو
صدقے ترے پھر ایک نظر ہم کو دکھلا لا
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں
فرہاد کے لہو کا پھلکتا ہے پیالا
شیریں کے دریا پر یہ جوئے شیر نہ جانو
دل آج مرا سلمہ اللہ تعالیٰ
کیا جانے کس حال میں ہووے گا نظیر آہ

نظیر کا قطع عموماً قیامت ہوتا ہے لیکن اس مقطعے کا تغزل بے پناہ ہے۔ اور اشعار ملاحظہ ہوں:-
 بے کلی کج بھی واں لے گئی مجھ کو تو نظیر
 میں نے ہر خند یہ چاہا تھا کہ کل جاؤں گا
 بے صدا آکر لگا اور ہو گا سینے کے پار
 یہ خدنگ ناز تھا کس بے نشان کی شست کا
 سب بات کچھ کہتا ہے اور نکلتے ہے کچھ منہ سے نظیر
 یہ نشہ ایسا ہوا کس کی نگاہ مست کا

ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر
 مہ کو لگیں چار چاند مہر کو چار آفتاب
 جیسے یہ ہیں مہرومہ ایسے تو اس کے نظیر
 چمکیں ہیں سو ماہتاب اور ہزار آفتاب
 ان دو شعروں میں سے پہلے میں ”چار چاند“ کا محاورہ بڑے حسن سے نقل ہوا ہے لیکن جن بالا سے حسن یہ ہے کہ
 نظیر نے اس کے مقابل ”چار آفتاب“ دوسرا محاورہ وضع کیا ہے۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-
 یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر
 ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب
 ساغر کے لب سے پوچھئے اب اس کی لذتیں
 کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب
 جس دل کو چاہتا ہوں اُسے بھی خبر نہ ہو
 اپنے تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب
 کیسا ہی وہ بُرا ہو تو لگ جائے جس کے دل
 لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب
 ان دو شعروں میں سے پہلے میں محبت کی رازداری کا معیار اور دوسرے میں محبت کی انفرادیت کا فلسفہ پیش
 کیا ہے۔ دونوں شعرا اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

جلد آیار کہ اب ہم کو ستاتے ہیں بہت
 گوش گفتار طلب دیدہ دیدا طلب
 کس کے لئے کیجئے جامہٴ دیبا طلب
 دل تو کرے ہے مدام وامن صحر طلب
 ایک تمنا ہو تو یار سے کیجئے نظیر
 دل ہے پُر از آرزو کیجئے کیا کیا طلب
 نظیر کے مقطعے سے ”وہن فوراً“ فارسی کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے:-

تغزل کی یہ مثالیں کیسی لاجواب ہیں۔ مطلع میں شوق کی دنیا پنہاں نظر آتی ہے۔
 تن ہمہ ریش ریش شد پنیہ کجا کجا نہم
 یک دل و خیل آرزو دل بہرہ مدعا برم
 ہے اب تو وہ ہمیں اُس سرورِ سیم بر کی طلب کہ طائران ہوا سے ہے بال و پر کی طلب
 خواب کر جاتا ہے ہم ایک کھنٹ آنکھوں سے نظیر یاد آجاتی ہے جب ساقی کی چشم نیم خواب
 جو کچھ ہے حسن میں ہر مہر لقا کو عیش و طرب وہی ہے عشق میں ہر مبتلا کو عیش و طرب
 اس مطلع میں معشوق و عاشق کے متبائن قلوب کی کیفیت کے تقابل سے ان کے مطلعن بالذات ہونے کا کیسا
 اچھا ثبوت دیا ہے۔ تغزل کی اور لاجواب مثالیں ملاحظہ ہوں:-

بہ قول حضرت صائب ہزار حیف نظیر کہ در بہار ندام بہ کف بہائے شراب
 جو اپنے یار کے جور و جفا میں ہیں مسرور انھیں پھر اور کے جور و جفا سے کیا مطلب
 دل سادریتیم بکا اک نگہ کے مول کیا کہنے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب
 غش تھے معالفتے کی تمنا میں ہم ولے وہ بھی سنا کہ اب کے ہوا ہار کے نصیب
 کو چے سے اس کے آتا ہوں یوں ہو کے ناامید نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب
 ہیں گو کہ یوں تو ادھر بھی محبوب خوب خوب لیکن اسی کو کہتے ہیں سب خوب خج خج ب
 نظیر بھی تھیں اب دیکھ کر یہ کہتا ہے الہی خلق ہو اور میں ہوں اور مرا محبوب
 یاد آتا ہے ہمیں جب وطن اپنا تو نظیر سر کو حسرت سے پٹک کہتے ہیں ہم ہا نصیب
 تمھارے ہاتھ سے کل ہم بھی روئے صاب جگر کے داغ جو دھونے تھے دھولے صاب

نظیر محفل میں گل رخوں کی جو ہم نے دیکھا تو ان سبھوں میں
 خدا ہوا ہے دل اپنا جس پر اسی کی ہم کو خوش آئی صورت
 آگے ہی دل اپنا تو یہ سودا ہی ہے کم بخت اور تیس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

یارو ہمیں تکلیف نہ دو سیر چین کی
 آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت
 ان اشعار میں دل کو دریتیم بتانا، معاملے کی تمنائیں غش ہونا، نوکر شکستہ حال کی ترکیب مشرقی شاعر کے مزاج
 کے خلاف وطن کی محبت کا جذبہ اور بہار کو کم بخت کہنا تغزل اور حسن بیان کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ اور دیکھ پاشعار
 جن میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ملاحظہ ہوں:-

وہ دیکھ جھڑکتا ہے ہم کو کر غصہ ہر دم اور ہمیں
 ہے چین اسی کے ملنے سے زہنا نہیں گل اور طرح
 ہمارے آگے نہ لو نام گل کوئی در نہ
 وہ گل بدن ہمیں آوے گا گل کے نام سے یاد
 نئے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا دقار
 جیسے اسلام میں ہے محاسب و صدر کی قد
 جوش کا سالار زندانہ کلام اس ایک شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ تغزل کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-
 داغ مرنے کا دہری محروم جانے جس کو آہ
 موت آچھو بچی شتاب اور یار آیا دیر کر
 اتنا ہوں جائے رحم جو کرتے ہیں وہ جفا
 تو اس سے روکے کہتے ہیں اغیار بس جی بس
 ہوں نا امید وصل سے یوں جیسے وقت نزع
 رو کر کے طیب سے بیمار بس جی بس
 ابھی تازہ حلقہ زلف میں جو پھسا ہے طائر دل بھلا
 اُسے رنج پھونچے ہے لے صبا نو گھڑی گھڑی نہ ہلا
 لگا کے ٹھوکر ہمارے سر پر بلا تھاری کرے تاسف
 کہ ہم تو سمجھتے ہیں اس کو دل سے تمھارے سر کی ستم نوازش
 اٹھائیں نازان کے ہم کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہویں
 جفا تلف عتاب شفقت غضب توجہ ستم نوازش
 چھد گیا دل زباں تلک آتے
 ہم نے جب کی نگہ کے تیر کی عرض
 آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے حل کر
 حسن کی گرمی بازار میں مشہور کی شمع
 مستی کے سودور میں اس چشم سیہ کے
 مگر کبھی تہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ
 صیاد کی الفت میں پھنسنے آن کے ورنہ
 کافر ہو جو گردش ایام سے واقف
 لے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف
 تھے کا ہے کو ہم اس نفس و دام سے انف

جب سے مُوا ہے کو کہن کرتے ہیں اس کا غم سدا
 آوے اگر بتاں کے تئیں رسمِ دلبری
 کوہ سے کوہِ جو سے جو، نگ سے نگ، سل سے سل
 تو توہماں میں پھر کہیں ڈھونڈا نہ پائے دل
 شیدا ہوں میں تو لیلیٰ و مجنوں کی چاہ پر
 خالق نے کیا ہی خوب تھے ان کے بتا دل
 تھے اس کے پا کے آبلے جھاتی یہ اس کی آہ
 کیا اتھا جسم تھا اور کیا صفائے دل
 ہیں یہاں بڑے جاہل دل اکثر یہ کہتے ہیں
 چھوٹا سا اک نظیر بھی ہے خاکِ پائے دل
 دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
 بس ترستے ہی چلے افسوس پیانے کو ہم
 مے بھی ہے مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے ساقی نہیں
 دل میں آتا ہے لگا دیں آگ سے خانیے کو ہم
 طاقِ ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی
 اب تو پوچھیں گے اسی کا فر کے بت خا کو ہم
 کیا ہوئی تقصیر ہم سے تو بتا دے لے نظیر
 تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم
 ان اشعار میں جا بجا تیسر کا سا تغزل بھلکتا نظر آتا ہے۔ ”ہم“ کی روایت والی غزل اس قدر مشہور ہوئی کہ اکبر آباد
 اور قرب و جوار میں آج بھی خلائق کے زبان زد ہے۔ ذیل کی پوری کی پوری غزل تغزل کا ایک بے مثل گنجینہ
 ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کعبو دیکھوں نہ سنبلِ باغ کو میں مجھے اس خمِ زلفِ دو تا کی قسم،
 نہ نگہ کروں عارضِ گل کی طرف مجھے اس رخِ مہر و وفا کی قسم
 یوں پھر سے ہے چین کی فضا میں ہوا، وہ ہزار طرح سے ہوا فرشتا
 مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم
 جو نہی آیا ادھر کو وہ چشمِ سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیرِ نگہ
 رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوشِ ربا کی قسم
 بدن اس کا ہے روکشِ برگِ سمن، مے بریں جو کھسے وہ رشکِ چین

کھلے غنچہ دل مرا گل کے نمں مجھے اس کھلے بند قبا کی قسم
 ترے عشق نے دل میں درد دیا، تو کچھ اس سے مزا میں ایسا لیا
 نہ کروں نہ کروں نہ کروں میں دوا، میں نے کھائی ہے اب تو دوا کی قسم
 لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ نشا
 وہ شفق ہے جو صبح کو ہو بکریاں سو وہ کھاتی ہے اس کی خاکی قسم
 میں نے دیکھا نظیر جواس کے تئیں تو شرم حیا سے وہ ہر در و قریں
 لیا نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم
 یہاں ایک اور پوری غزل نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جس کی ردیف ”بیچتا ہوں“ ہے۔ اس ردیف سے
 مجھے فارسی کی ایک ردیف می فروشم یاد آتی ہے جس میں خسرو با حافظ کی غزل موجود ہے۔ نظیر نے اپنی غزل غالباً
 یہ غزل دیکھ کر کہی ہے۔ اس لئے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو:-
 بہ تیغ ادائے تو سمری فروشم بہ نوکِ سناست جگر می فروشم
 اب نظیر کی غزل ملاحظہ ہو:-

نہیں دل کو اب ہر مکان بیچتا ہوں	کوئی خوب رو ہو تو ہاں بیچتا ہوں
وہ ہے جس کو سب بیچتے ہیں بچھا کر	میں اس سے کو یا رو عیاں بیچتا ہوں
یہ دل جس کو کہتے ہیں غرضش الہی	سو اس دل کو یا رو میں یہاں بیچتا ہوں
ذرا میری ہمت تو دیکھو عزیزو	کہاں کی ہے جس در کمان بیچتا ہوں
لئے ہاتھ پر دل کو پھرتا ہوں یا رو	کوئی مول لیو سے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ کہتا ہے جی کوئی بیچے تو ہم لیں	تو کہتا ہوں لو ہاں میاں بیچتا ہوں
میں ایک اپنے یوسف کی خاطر عزیزو	یہ ہستی کا سب کارواں بیچتا ہوں

جو پورا خسرو بادشاہوں تو یارو
 زمین آسمان عرش کرسی بھی کیا ہے
 جسے مول لینا ہو لے لے خوشی سے
 بکی جنس خالی دوکان رہ گئی ہے
 محبت کے بازار میں لے نظیر اب
 اب جوش کی غزل ملاحظہ ہو جو نظیر کے بعد لکھی گئی ہے :-

لگنوں میں داغ جگر بیچتا ہوں
 جہاں منگ ریزوں پہ گرتے ہیں گاہک
 جہاں تندر داس جمع ہیں تلخیوں کے
 جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں
 پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی
 جہاں درد و دل کا مخالف ہے عالم
 جہاں جستجوئے سکون حاضر ہے
 جہاں سات پردوں میں رہتی ہے جزات
 جہاں پستی بام و در ہے گوارا
 جہاں ہر گہو تر ہے قانع نفس میں
 جہاں برفِ شبنم سے وابستگی ہے
 جہاں مست و پاشل ہیں پساؤں سے
 جہاں ترک یک نم بھی ممکن نہیں ہے

بہ نرخ خرف تاج زر جیتا ہوں
 وہاں جنسِ عسل و گہر بیچتا ہوں
 وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں
 وہاں موجِ گلہائے تربیتا ہوں
 وہاں نور شمس و قمر بیچتا ہوں
 وہاں درد و دل کا اثر بیچتا ہوں
 وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں
 وہاں جذبہ پردہ در بیچتا ہوں
 وہاں رفعت بام و در بیچتا ہوں
 وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں
 وہاں ذوقِ برق و شرر بیچتا ہوں
 وہاں تیغِ فتح و ظفر بیچتا ہوں
 وہاں خواہشِ ترکِ سر بیچتا ہوں

جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے وہاں وسعتِ جستِ بریجتا ہوں
 چھپا کر دلیف و توانی کے اندر میں دل بیتا ہوں جگر بیتا ہوں
 گدا ہوں مگر وہ گداے غنی ہوں کہ تاج و کلاہ و کمر بیتا ہوں
 صدا دو کہ بازارِ نوحِ بشر میں تمنائے روح بشر بیتا ہوں
 نہ ہو گا کوئی نجمہ سا بھی تیرہ قسمت کہ بازارِ شب میں سحر بیتا ہوں
 کوئی مشتری ہو تو آواز دیدے میں کم بخت جنسِ بشر بیتا ہوں
 سخن کے ہیں یوں تو بہت جوشِ تاجر
 مگر میں بہ نوحِ دگر بیتا ہوں

میں ان تینوں غزلوں کے مشترکات و مختلفات پر فیصلہ دے کر فارمین کو ایک نقطہ نظر سے مرعوب کرنا نہیں چاہتا فیصلہ ایک داخلی کیفیت ہے جس کا انفرادیت سے بیش از بیش تعلق ہے اور جو اگر بطون ذات و بطون موضوع کے تعاون سے پیدا نہ ہو تو ذہن کے صحت و نشوونما میں معین نہیں ہوتا۔ اس لئے خارجی فیصلے سے متاثر کرنا مفاد و دیانت دونوں کے خلاف ہے چنانچہ میں سلامت ذوق پر اس کا حصر کرتا ہوں مگر اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں نظیر کی غزل کے تیسرے چوتھے آٹھویں نویں اور دسویں شعروں کے درجے کا شعر فارسی اتنا اور جوشِ دونوں کی غزلوں میں میسر نہیں آتا۔ تغزل کے اور اعلیٰ نمونے ملاحظہ ہوں :-
 چاہت کے اب افشا کن اسرار تو ہم ہیں کیوں دل سے جھگڑتے ہو گنگار تو ہم ہیں

کہیں بیٹھے دئے دل اب مجھ جو اس ملک میں بجا کروں
 جو نبی بو ستر میں طلب کیا تو کہا تجھے تو نہیں ہے ڈر
 نہیں تاب مجھ میں کہ جب تک تو پھرے تو میں بھی پھرا کروں
 مجھے خوف ہے کہ مباد اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں
 تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کہ اس میں سنا کروں
 مجھے مدتوں سے ہے دردِ دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر

ان تین شعروں میں میر کا رنگ ہے۔ دوسرے میں عورت کی فطرت کی سچی مصوری ہے۔ اب تغزل میں خالص نظیر کے رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

عجیب چمن میں نہیں گل غدار آتے ہیں	گلوں کو اپنی دکھانے بہا آتے ہیں
جو سادی وضع میں گل لے گئے تھے ہنسلے دل	سنا ہے کج وہ کر کر سنگھار آتے ہیں
قسم ہے چشم گلابی کی تیرے لے گل رو	کہ یہاں کچھ ہے پڑانت گلاب آنکھوں میں
خدا کی بات جنھیں بات بھی نہ آتی تھی	وہ اب کریں ہیں سوال جواب آنکھوں میں
قدرت کہاں جو اس سے کہوں میں یہ بات آہ	صاحب تم ہی تو ڈال گئے ہو عذاب میں
لطف جو چاہت کے ہیں تو وہ جتانے نہیں	چاہ چھپی کیجئے تاکوئی جانے نہیں
قتل پر باندھ چکا وہ بت گمراہ میاں	دیکھیں اب کس کی طرف ہوتے ہیں اندریاں
جب سنتا ہے احوال مراویں کہتا ہے عیاری سے	ہے کون وہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں
دل بھنس کر اس کی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر	کب چھوٹے اس کے دام سے تو وہ داناس ہے نادان نہیں
تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں	مے کہیں شیشہ کہیں، ساقی کہیں جام کہیں
تلا نہ حسن تمھارا ورنہ میزان نے	فلک کی شمس و قمر لاکھ بار تو لے ہیں
عافیت کی گرہاں خواہی تمھیں ہے تو نظیر	تم ہو امیں ہم سے بے دردوں کی مت برباد ہو
ڈرہم کو بناوٹ کی اداؤں کا نہیں ہے	وہ آن غضب ہے جو خدا داد کوئی ہو
الفت کا تار توڑ کے جوڑا تو کیا ہوا	خوبی بھی تلک ہے کہ جب تک نہیں گرہ
ڈوری کی یہ گرہ نہیں جو لے تو اس کو کھول	نامح ہے میرے اُس کے توب ریشیں گرہ
رفقار سے دلوں کو کچھلتے ہیں وہ جواہ	اپنا یہ بد چلن دل انہیں کا ہے خاک راہ
بیچ پوچھے تو اس میں خطا دل کی کچھ نہیں	خواب کی شوخیاں ہی بڑھاتی ہیں دل کی چاہ

کُہنی کے التماس کا رہتا ہے جاں کو عزم ٹھوکر کے اشتیاق میں پھرتا ہے دل تباہ
ٹھوکر کا شعر میں ذکر ایک پرانی بات ہے لیکن کُہنی کا ذکر نظیر کی ایجاد ہے۔ عرفی کی طرح، نظیر کو متوازن الفاظ اور
جملوں کا بڑا شوق ہے۔ پہلے مصرعے میں ”کُہنی کا التماس“ ہے تو دوسرے میں ٹھوکر کا اشتیاق موجود ہے۔
تغزل کی اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ہیں جو وہ کشتہ شمشیر نگاہِ قاتل جا کے ان گنج شہیداں سے کمو عشق اللہ
غم نہیں گردِ بیری سے دل کو لے جاتا ہے وہ پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ
پہلے شعر میں ”عشق اللہ“ نظیر کی ترکیب ہے اور دوسرے شعر میں ”دل پانا“ نہایت دلنشین محاورہ ہے۔ تغزل
کی اور اعلیٰ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

کیوں نہ لالے کی طرح دل ہو ہمارا دلخ دار کس مزے میں چھوڑ کر گلزارِ رخصت ہو چلے
آنے کی قسم کھا کر بھر منہ بھی نہ دکھ لایا سادہ جھنیں سمجھے تھے سوان میں یہ فن نکلے
اب روئیے الفت کو یا ٹھونکے قسمت کو جو قول کے پورے تھے وہ عہد شکن نکلے

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی
کہا جو تم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر و فن کی سی
ہنسے روئے پھرے رُوا ہوئے جاگے بندھے چھوئے غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے
تفاوت کچھ نہیں گل چیں میں اور بے دردِ خواہاں میں جو اس کے ہاتھ گل لٹوئے تو ان کے ہاتھ دل لٹوئے

جو تم زور آوری کرتے ہو ہم سے دل لگانے میں کسی نے دل لگایا ہے کہیں لوگو زبردستی
نظیر اب تو ہمارے بس ہیں ہے کچھ کہہ نہیں سکتا کرد جو ہو سکے تم سے زبردست و زبردستی

جو تم نے پوچھا تو حرف الفت بڑا کیا صاحب ہمارے لب سے
جو ایک دلبر سے دل چھڑایا تو دوسرے سے وہیں لگایا

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہش خون ہے
عشاق سے ملنے کی عبت پوچھو ہو ساعت

کا کل مشکیں کا تجھ کو شوق بیتا بانہ ہے
حال دل ہم نے کہا جس دم تو بولا بیچ کو

ناگن ہے نئی زلف کی دل کو نہ ڈر جائے
نکل و بن و زیور و پوشاک بب اس کی

ہے حسن برتی بھی عجب چیز و فاکیش
پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو بڑے لوٹتے

عشق بھلا ہے تجھے زلف بتاں کی قسم
اتنے میں ساتی نے دی اس سے کڑی اور بھی

ان اشعار میں سے پانچویں شعر میں ”منکا ڈھلا“ بڑا حین محاورہ ہے اور آخر شعر میں ”بھلا“ کا استعمال بڑا
نادرا اور نظیر کے حصے کی چیز ہے۔ نظیر کی غزلوں میں لگاوٹ، چوچلے اور چھیر چھار کا مزہ بھی موجود ہے۔ معاملہ بنی

میں بھی اسے پورا کمال حاصل ہے۔ راز و نیاز کا بھی وہ سچا مصور ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ سارے جزئیات
بلکسی تصنع اور خارجی آمیزش کے فطری سادگی کے ساتھ غزل کے قالب میں ڈھلے ہوئے میسر آتے ہیں۔

”سو بھی“ کی ردیف میں نظیر کی غزل کو جرأت اور انشا کی غزلوں پر کھلی ہوئی فوقیت ہے
شہباز کے قول کے مطابق ”جرأت خود اس زمین کا موجد ہے۔ اس سے پہلے ان قافیوں اور ردیف

میں غالباً کسی استاد کی غزل موجود نہیں ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا بھی لطف سے خالی نہیں کہ جہرات

آخر عمر میں باسینا ہو گیا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک روز انشا سے ملاقات ہوئی تو ہجرت نے کہا کہ سید صاحب، میں نے ایک مطلع کہا ہے، سنئے، ابھی وہ اتن ہی پڑھنے پایا تھا کہ :-

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیو کی سو جھی

کہ انشا نے جو بید ظریف اور طبع انسان تھا، میا ختمہ کہا :-

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سو جھی

اس ہجرت مارنے کو اٹھیا اور مذاق یہیں ختم ہو کر رہ گیا۔ اس واقعے کے بعد غالباً انشا نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہو۔

انشا کی غزل ملاحظہ ہو :-

لا تھا ادھر دے کہ بہت دور کی سو جھی

ہے اس پہ مجھے بلغمِ باعور کی سو جھی

ہے اس پہ مجھے خوشہ انگوڑ کی سو جھی

یاروں کو یہاں روئی کے لنگور کی سو جھی

اس پر مجھے شیطان کے ہے پور کی سو جھی

تب اس کے تڑپنے پہ مقتور کی سو جھی

شجر کی سو جھی مجھے کافور کی سو جھی

پھبتی ترے کھڑے پہ مجھے عور کی سو جھی

ٹک دیکھئے گا جب ستہ و عامہ زائد

کیوں میں دل پُرا بلہ پرتاک نہ باندھوں

ہے شیخ سیہ چہرہ جو مجلس میں بچھد کتا

واعظ جو پڑھا جن بتختر ہے نہایت

ہاتھ اپنے سے جب چھٹ گئی اس ٹڈ کی چھلی

ہاں اے شفق صبح تری دیکھ کے رنگت

جب پھول چھڑے نور کے اس آہ سے میری

اس پر مجھے انشا شجر طور کی سو جھی

اب نظیر کی غزل ملاحظہ ہو :-

دیکھ عقد خریا ہمیں انگور کی سو بھی
 موسیٰ کے تین گونجس طور کی سو بھی
 ہم نے تو اسے دیکھ کے جانا کہ پری ہے
 غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے
 دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا
 سراپوں سے جب پھنس گئے اس زلف سی میں
 جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت
 کیوں بادہ کشو، ہم کو بھی کیا دور کی سو بھی
 پر ختم رسالت کو بہت دور کی سو بھی
 پریوں نے جو دیکھا تو انھیں جو کی سو بھی
 موسیٰ کو بھلا کہئے تو کیا دور کی سو بھی
 بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سو بھی
 تب ہم کو سیاہی شب بیکور کی سو بھی
 کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سو بھی

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیر آہ

نزدیک ہی کیا ہے کہ جہاں دور کی سو بھی

اتفاق سے دونوں غزلیں آٹھ آٹھ شعروں کی ہیں اور دونوں میں کئی کئی قافیہ مشترک ہیں۔ دو استادوں کا
 تقابل کچھ بہت زیادہ مفید اور خوش آئند بات نہیں ہے، لیکن یہاں فرق اس قدر نمایاں ہے کہ خود زبان حال
 سے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

انش کی غزل اول سے آخر تک ذہنی ورزش کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ الفاظ اور قوافی نہایت غیر شاعرانہ
 ہیں اور تغزل کا دور دور پتہ نہیں۔ آخر شعر کے دوسرے مصرعے اور مقطع میں قدرے قلیل تغزل ہے مگر وہ اتنا
 بھونڈا اور دوارا کا رہے کہ قلب کو متاثر نہیں کرتا۔ ساری غزل کا لب و لہجہ نہایت عامیانه ہے اور تعقید تو اتنی
 پیش پا آتا وہ ہے کہ خاص تو جہر دلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ طبع عموماً انگور، پور اور شفق نور کے قافیہ والے
 شعر تو تغزل کیا معنی خود شعریت سے اتنے دور ہیں کہ صرف موزونیت کی بنا پر شعر کے جاسکتے ہیں۔ اس
 غزل کو اگر دو تصنع کی شاعری کی سچی مثال کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

نظیر کی غزل، آہ و بیاختاری، سلامت و روانی، تمانہ گی و شگفتگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے

انداز بیان کو انشا کے بیان پر نمایاں فوقیت ہے۔ اس کے مصرعے، اتنے صاف اور سیدھے، ایسے بے تکلف اور بے تصنع ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ ان کو مگرٹنے یا موزوں کرنے میں کسی جہد و جہد سے کام نہیں لیا گیا۔ ہر مصرع اتنا چمکتا ہے کہ کانٹے کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ سادگی اور صفائی کا یہ عالم ہے کہ شعر انشائیہ کے لئے الفاظ کی نشست میں کوئی تغیر نہیں کرنا پڑتا۔ شاعری کا یہ انتہائی کمال ہے کہ شعر انشائیہ کی ترتیب میں کہا جاسکے۔ ان محاسن کے دوش بدوش، غزل میں، غزل کٹ کٹ کر بھرا ہے۔ کوئی شعر اس سے خالی نہیں۔ لیکن یہ شعر:-

دیکھا جو نہمانے میں وہ گور ابدن اس کا
بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سو بھی

اپنے تخیل کی ندرت، تشبیہ کی تکمیل، کیفیت کی لطافت، بیان کی سنگتگی اور مصوری کی قوت کے اعتبار سے، دنیا کے بہترین ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کا شعر:-

جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت
کی غور جو ظاہر میں تو مردور کی سو بھی

بھی اپنی قسم کا لاجواب شعر ہے۔ ایسے اہم مسئلے کو اس مزے سے بیان کر دینا، نظیر ہی کا کام ہے۔ مقصدی زہد پر دوسرے شعرا نے بھی طنز کیا ہے مگر ایسا لطیف طنز بہ مشکل میسر آتا ہے۔ غالب کا یہ شعر:-

کیوں زہد کو مانوں کہ نہ ہو گر چہ ریائی
باداش عمل کی طمع خام بہت ہے

اور عریضیام کی یہ رباعی:-

من بندہ عاصم رضائے تو کجاست
تاریک دلم، نورِ صفائے تو کجاست

مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی
ایں مُز بود لطف و عطائے تو کجاست

اسی مسئلے سے متعلق ہیں لیکن بیان میں یہ سادگی اور طنز میں یہ لطافت نہیں ہے۔ ان حالات میں، اس کا سخت تعجب ہے کہ آزاد کو یہ غزل نظر نہ آئی۔ آج حیات میں جہاں جرأت، انشا اور مصحفی کے کلام کا تقابل کیا گیا ہے وہاں اس غزل کا بھی حوالہ دیا جاسکتا تھا۔ اگر تقابل کیا جاتا تو آزاد غالباً یہ دکھانے پر مجبور ہوتا کہ نظیر جس پر عموماً و ابتداء کا الزام لگایا جاتا ہے، انشا جیسے مسلم الثبوت استاد کے مقابلے میں ان معائب سے کتنا برتر ہے۔

نظیر کے تغزل کے اور نمونے ملاحظہ ہوں :-

ہے تو مختار جو کچھ چاہے سو کرنا زور و
کل جو گلشن میں گیا میں کہ ذرا غم بھولے
ہے سب سے تو ایسا و اشارات ولیکن
مخمل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور
سمجھے گا جو رتبے کو نظیر اہل وفا کے
گو میں بجا سے مرگیا رگ رنگ کے رویا ہ
اس کی جبین پاک پر اس دم تک لے نسیم
کافر ہوں گر بڑی ہو نظر بے وضو مری

نظیر کے کلام میں جا بجا بڑی شیریں زباں اور نہایت پاکیزہ محاورے میسر آتے ہیں۔ آخر سے پہلے کے شعر میں رگ
رگ کے معنی آہستہ آہستہ اور رگ رگ کر مرنے کے معنی گھل گھل کر مرنے کے ہیں۔ نظیر پر مبتذل محبت کا اتمام
لگایا جاتا ہے۔ آخر شعر میں جس محبت کا معیار سامنے ہے، وہ نفس انسان کی پاک سے پاک تر محبت پر فوقیت
رکھتی ہے۔ ذیل کی غزل، غالب کا سہل تمنع یا د دلالتی ہے ملاحظہ ہو :-

کیا ادا کیا ناز اور کیا آن ہے
جو بھی دیکھے تو ہو جاوے فدا
یہاں پری کا خُن بھی حیران ہے
آج اس عالم کا یہ انسان ہے
اس کے سبز رنگ کی ہے چین میں دھوم
جان و دل ہم نذر کو لائے ہیں آج
دل بھی دل سے ہے تصدق آپ پر
دل کہاں پسلو میں جو ہم دیں تھیں
یہ تو طراک عمر سے ویران ہے
ہاں میاں راک اودھ مونی سی جان ہے
عقل و صبر و ہوش سب جاتے ہے

وہ اگر لینی ہو تو لے جائیے خیر یہ بھی آپ کا احسان ہے
 آن کر مل لو، نظیر اپنے سے جان
 اب وہ کوئی آن کا مہمان ہے

ان چند اشعار میں خاص نظیر کے تغزل کا لطف ہے۔ ملاحظہ ہوں :-

سر شک چشم سے موتی بہت پروئے گئے دلے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
 نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم گئے تھے پار سے ملنے سو آپ کھوئے گئے
 ہمیں اس غنچہ لب کی بات کیا دل سے لگی یاری کہ جس کو بے کلی لینی ہو وہ ہم سے کرے یاری
 جودل کے لینے والے ہیں وہ لے ہی جاتے ہیں خیر دھری رہتی ہے سب اپنی نگہبانی و ہشیاری
 غرض میں تو نظیر اس سے سمجھا ہوں کیسے شاید کسی کا نیل بگڑا ہے کہ یہ طوفان جوڑا ہے

نظیر کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ کسی میں زبان کی شیرینی ہے، کسی میں محاورے کا لطف ہے، کسی میں لفظی رعایت، کسی میں کوئی نہ کوئی اور نکتہ موجود ہے۔ آخری شعر میں "نیل بگڑا" محاورہ نظم کیا ہے۔ یہ محاورہ ذوق کے ایک قصیدے میں نظم ہوا ہے اور پرستاران ذوق کی طرف سے اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی فخر کی بات ہے تو نظیر اس کا بہ درجہ اولیٰ مستحق ہے۔ ذیل کی غزل میں گھرے تغزل کے دوش بدوش زبان اور محاورے کی نزاکتوں اور لطافتوں نے بیان کو نہایت دلنشیں و پُر اثر بنا دیا ہے۔

ملاحظہ ہو :-

بنا کے منہ جو سرا سر ہمیں بُرا کہئے تمہارا ہم نے بگاڑا ہے کیا، بھلا کہئے
 غرض تھی چاہ سے ہم کو سو ہم نے کی آگے گناہ اس کو سمجھ لیجئے خطا کہئے
 وفا جو ہم میں ہے کم سیلانیوں میں بکھے گی اگر ہزار طرح ہم کو بے وفا کہئے
 صریح خوش تھے ہمیں دیکھ کر ہوئے ناخوش یہ اختلاط میں ہے کون سی ادا کہئے

جو چاہے آپ کو دل سے اُسے خفایا کیجے
یہ ناروا ہے محبت میں 'یا روا' کہئے
رہو خوشی سے تم اپنی تو ہے مراد مری
تھارے دل کا جو کچھ ہو وہ مدعا کہئے
ہم آویں جاویں بھلا کیا خوشی سے آپ کے پاس
نہ جانکا لئے لب سے کبھی نہ آ کہئے
جولے کے دل کو کریں رات دن ستمگاری
تو منصفوا نہیں پھر کچھ نہ کہئے کیا کہئے
گلے کی داد نزاکت سے دیتے ہم بھی نظیر
پراس صنم کا ہے نازک مزاج کیا کہئے

وسری غزل کا گہرا تفرل ملاحظہ ہو:-

جان بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل نگار بھی
ترے مرزہ بھی اثلک سے جیب کا تار بھی
طرفہ فوں سرشت ہے چٹم کرشمہ سنجار
لینتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
کوچے میں اس کے بیٹھا، حسن کو اس کے دیکھنا
ہم تو اسی کو سمجھے ہیں بلغ بھی اور بہار بھی
دیکھتے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گات میں
عشوہ پُر فریب بھی غمزہ سحر کار بھی
زُلف کو بھی ہے دم بدم عزم کند افگنی
دام لئے ہے مستعد طرہ تاب دار بھی

گئے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر
اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کیا بھی

ن کے اور چند اعلیٰ نمونے ملاحظہ ہوں:-

نہ کر پہلو تھی اس کے جفا دہر سے لے دل
مزا کیا عشق کے آفات کا جب عافیت چاہی
بتوں کو دل دیا تھا تو نے اب دین کو بھی دے بیٹھا
ارے کچھ تو خدا سے ڈر، نظیر اتنی بھی گمراہی
جس منہ پہ چوٹِ حسن سے تل بھر بھی جانہ ہو
دہاں تل بھی آپڑے تو یہ تل کا کمال ہے
شوق دیدار ہے یا جذبہ الفت ہے غرض
کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

یکس نے آج چمن میں قبا اُٹاری ہے کہ جس کی بوسے ہر ایک گل کو بقیاری ہے
 نہ برق میں ہے نہ سیلاب میں نہ شعلے میں اُسی دل کو کہاں کی یہ بے قیاری ہے
 کہہ کے اس قاتل نے آج ایک بات میرا مانے دل کے دو ٹکڑے کے ہیمات میرے سامنے
 میں تو اس غماز کو کیا کیا سہرا دیتا مگر کیا کروں منکر ہوا بد ذات میرے سامنے
 گئی فلک تئیں پر اس کے دل میں اہ نہ کی ہمارے آہ نے پیدا یہ دست گاہ نہ کی
 کہا میں یار سے اک دن کہ اے مہ تاباں ق ہمارے شام کبھی تم نے صبح گاہ نہ کی
 نہ ہم سے یار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص جو سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی
 یہ سن کے تجھ سے کہا یہاں بھی کچھ اجا رہے نہ کی تو چل بے نہ کی واہ خواہ خواہ نہ کی

یہ شعر نظیر کی زبان دانی کا معجزہ ہے۔ اس کی زبان اور بیان ٹھیکٹ کو کٹھے سے متعلق ہے۔ عاشق جب اپنی
 مجبور سے توجہ نہ کرنے کی شکایت کرتا ہے تو وہ اس کو ڈانٹتی ہے۔ پہلے مصرعے میں بڑے تیکھے پن اور
 منہ زوری سے یہ جتا رہا ہے کہ مجھ پر کسی کا زور نہیں چلتا میری خوشی ہے کہ توجہ کروں یا نہ کروں۔ پھر دوسرے
 مصرعے کے پہلے حصے میں بے مروتی کو تلخ تر بناتی اور ڈھٹائی سے اعتراف کرتی ہے کہ ہاں نہ کی۔ لیکن
 دوسری سانس میں اسی اب دلچسپی میں بات بدلتی اور عاشق کو جھٹلاتی اور بناتی ہے۔ واہ اور خواہ خواہ کا استہسا
 یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ توجہ مجھے اختیار ہے کہ التفات کروں یا نہ کروں لیکن اس موقع پر
 تو حاکم کر رہا ہے۔ میں نے ضرور تجھ پر توجہ کی نگہ کی مگر تو ہی اپنی حماقت سے نہ سمجھا۔ لفظوں کے الٹ پھیر اور
 لہجے کے تغیر تبدیل سے اس شعر میں پورے مکالمے کا لطف آتا ہے۔ یہاں دیدیا کو کوزے میں بند کر کے نظیر
 نے اپنی زبان دانی کا کمال دکھایا ہے۔ اب تغزل کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں:-

چھوڑ کے تجھ کو نیم جاں اب تو چلے ہو تم مگر دیر نہ کیجو مہرباں پھر پوڑا شباب سے
 نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے

بہم ہوا تھا جو کچھ یاں طواف کعبہ سے
اب تو ملک منہ کو دکھایا کہ زنگس بن کر
اس کے دامن سے لگوں پاؤں پڑوں ساتھ جلو
جان کر گو غریباں میں قیامت نہ بچا
ہو چرب زباں سے نہ بری رویوں کی تسخیر
مدت میں نظیر اس نے کیا، دل کے تئیں قتل
ناز اٹھانے میں بجائیں تو اٹھائیں لیکن
زخم اس تیغ نگہ کا مرے دل نے ہنس کر
بہم خاک غم ہیں اگر تم رہے رہے نہ رہے
یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو بیجے
ہاتھ ٹوٹیں تیرے گل حسیں قے کیوں قحطے وہ گل
میں نست و گریاں ہوں دم باز پس سے
گئی گزری وہ اپنی نے کشتی، لگی آگ جب سے فراق کی

کرشمے نے وہ بتوں کے تباہ کی گٹھری
نکلے ہیں خاک چمن سے ترے حیران کئی
خاک ہوں تو بھی محروم ہیں ہیں ارمان کئی
ابھی سوتے ہیں ترے بے سرو سامان کئی
یہ لوگ جو ملتے ہیں تو دل کششوں سے
صد شکر کہ ہم آج چھٹے سب غلطوں سے
لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے
اس مزے داری سے کھایا ہے کہ جی جانے ہے
مژہ پہ آن کے ٹک جم رہے ہے نہ رہے
کہ کل یہ دیدہ بُرغم رہے رہے نہ رہے
حیف کیا گلشن ہوا برباد تیرے ہاتھ سے
ہمدم اُسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے
یہ جلے ہے دل سوک بات ہے، یہ سر شک چشم شراب ہے

نظیر کی غزلیہ شاعری میں مسلسل اور موضوعی غزل بھی میرا کرتی ہے۔ اردو زبان میں نظیر سے پہلے
مسلسل غزل کسی نے نہیں کہی۔ اس کے قدما اور معاصرین کی غزلوں میں قطعے میسر آتے ہیں جن کی صورت یہ ہے
کہ چند درمیان یا آخری اشعار مربوط کر دئے جاتے ہیں۔ نظیر کی اس نوع کی غزلوں میں قطعات کا بھی التزام
ہے جو قدیم طرز بیان سے مطابقت کرتا ہے مگر اس کی مسلسل غزل بالکل دوسری چیز ہے۔ اس نے مطلع سے
مقطع تک تسلسل پیدا کر کے بالکل ایک نئی صنف اردو زبان میں پیدا کی ہے جس کا انداز بیان جداگانہ ہے
اور جو بہر نوع روایتی غزل سے تمیز کی جاسکتی ہے۔ اس صنف میں اس نے قطعوں کے علاوہ، عشق

کی وارداتیں بر ملا پیش کی ہیں، معاملہ بندی کی ہے محبت کے چوچلوں کی تصویریں بنائی ہیں اور راز و نیاز کی حقیقی فطرت بے نقاب کی ہے۔ ان سب سے بالاتر یہ ہے کہ کردار اور سراپے نقش کئے ہیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی ضرب المثل یا کہاوت بھی نظم کر دی ہے۔ ان غزلوں میں جگہ جگہ مکاکے اور ڈرامے کا لطف بھی موجود ہے۔ مسلسل غزل کے علاوہ، نظیر کے کلام میں موضوعی غزل بھی میسر آتی ہے۔ یہ اول سے آخر تک ایک موضوع پر ہوتی ہے۔ اس کا پیکر تمام و کمال غزل کا پیکر ہے اور غزل کے خلاف یہ ایک موضوع کی حامل ہوتی ہے۔ مسلسل غزل سے، اس صنف کو متمیز کرنے کے لئے، یہ نام وضع کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی میں اقبال نے چند اور خوش نے بہت سی مسلسل اور موضوعی غزلیں کہی ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ جوش اس صنف کا موجد ہے لیکن یہ خیال تاریخ ادب کے بدیہات کے سراسر خلاف ہے۔ اردو میں مسلسل اور موضوعی غزل کا موجد نظیر ہے۔ یہ دونوں اصناف صحیح معنی میں فطری عاشقانہ شاعری ہیں۔ جذبات کی لطافت و سادگی اور خیالات کی تازگی و شگفتگی نے ان میں طرفہ جاذبیت و اثر پیدا کر دیا ہے۔ ان میں امید ورجائیت کا عنصر نمایاں طور پر غالب ہے۔ یاس و قنوطیت اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان دونوں قسم کی غزلوں میں داخلی و معنوی کے علاوہ، بہت سی خارجی و پیکری خوبیاں بھی ہیں۔ چنانچہ بلاغت کے بہت سے دقیق محاسن کے ساتھ جن پر یہاں بحث نہیں کی جاسکتی، صنعت لفظ و نشتر جا بجا پائی جاتی ہے۔ ان غزلوں میں تشبیہیں اور استعارے بھی بڑے پُر کیف اور اکثر بالکل نئے ہیں۔ وہ مسی آلود لب کو نیلم سے تشبیہ دیتا ہے اور حقیقت سے کس قدر قریب ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گھٹی رُخ بہ زلفِ یخُم، مسی رشکِ رنگِ نیلم
غرض اس طرح کا عالم کہ پری کے ابا

بعض مثالیں خالص تغزل کی لاجواب ہیں ملاحظہ ہوں:-

ہزاروں گل ہزاروں گل بدن تو نے بنا ڈالے کوئی مٹی سے ایسے گل کھلا سکتا ہے کیا قدر
پہلے جس آن تمھاری نے لیا دل ہم سے اب تلک مانگتے ہیں، دل سے ہم اُس آن کی خیر

قصر رنگیں سے گزر باغ و گلستاں سے نکل ہے وفا پیشہ تو مست کو چہ جاناں سے نکل
 مسلسل غزلوں کے سلسلے میں، دو غزلیں، نہایت دلچسپ ہیں۔ یہ دونوں مل کر ایک مکالمہ بن جاتی ہیں اور
 ان کو پڑھتے وقت ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جو بہترین قسم کے ڈرامائی منظر کا نعم البدل بن سکتا ہے۔
 پہلی غزل جس کا مطلع یہ ہے:-

ہر آن تمہارے پھینے سے ایسا ہی اگر دکھ پائیں گے ہم تو ہمارے آخر اس کی بھی تدبیر کوئی ٹھہرائیں گے ہم
 عاشق کی زبان سے کہی گئی ہے۔ دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہے:-
 تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھہراؤ گے تم ہم اور چھپیں گے یہاں تک جی بوجوب ہی پھر گھبراؤ گے تم
 معشوق کا جواب ہے۔ ذیل میں دو اور غزلوں کے مطلعے درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں:-

نہ لذتیں ہیں وہ ہنسنے میں اور نہ روئی ہیں جو کچھ مزا ہے ترے ساتھ مل کے سونے میں ✓
 گر کسی صورت سے وہ صورت دکھا جائیں تو غم و درد آج یہ صورت نہ دکھلاتے ہیں
 ان غزلوں میں معاشرت اور کردار کی مصوری کے پہلو بہ پہلو، زبان کی شیرینی، محاورے کی قدرت اور حسن بیان
 کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:-

کہا جو ہم نے ”ہمیں درسے کیوں اٹھاتے ہو“ کہا کہ ”اس لئے تم یاں جو غل جچاتے ہو“
 یہ غزل بھی مکالمہ ہے۔ اس کا التزام یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں عاشق کا سوال اور دوسرے میں معشوق
 کا جواب نظم کیا گیا ہے۔ ذیل کی غزل زبان کی سادگی اور محاورے کی لطافت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔
 مطلع ملاحظہ ہو:-

انداز کچھ اور ناز و ادا اور ہی کچھ ہے جو بات ہے وہ نام خدا اور ہی کچھ ہے ✓
 تغزل کی ایک اور اعلیٰ مثال سامنے آتی ہے۔ پوری غزل ایک کیفیت کی تصویر ہے اور اول سے آخر تک
 رجائیت سے لبریز ہے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں ”تو“ کا استعمال توجہ طلب ہے۔ غزل

ملاحظہ ہو:-

پھر ملتی چشم ہے اور شوق بیتابی جاتا ہے
 نگہ بھی لوطہ لوطہ سوئے در آتی ہے سرعت سے
 تو ہم مضطرب ہو دوڑتا ہے دم بدم کہہ کر
 بخومی خود بہ خود آکہہ گیا خوش و قتیاں ہوں گی
 شگوں جتنے معین ہیں جہاں میں شاد ہونے کے
 نگار خوش دلی کرتا ہے وابستہ نقاب اپنا
 خوشی ہے جان بھی اور دل بھی نہیں بھولاساتا ہے
 خیال گوش بھی ہر دم طرف کھٹکے کے جاتا ہے
 چلیں دیکھیں کوئی تو حلقہ در کھٹکھٹاتا ہے
 اُدھر کچھ زارغ بھی پیہم صدا اپنی سناتا ہے
 ہر ایک اُن سے بھی ہر ساعت بروکے کار آتا ہے
 طرب سے دستِ عشرت بھی تکرار کو مٹاتا ہے

نظیر ایسی تو باتوں سے عیاں یہ ہے کہ وہ گل رو
 کوئی دم یا کوئی پل میں ابھی تشریف لاتا ہے

ایک اور حسین مطلع ملاحظہ ہو:-

وہ صنم جو ہر عذر ہے اُسے ہم سے ملنے میں عار ہے
 نظیر ہندوستان کے اب وہ گل کا فرزند ہے۔ وہ یہاں کے مناظر قدرت کا والہ و شہید ہے۔ دہانی کرتی
 اپنی مجبورہ کے گلے میں دیکھ کر اُس کو دہان کا کھیت یاد آجاتا ہے۔ اس کا ایک نام انگریزی بلاغت میں بالکل کلر
 بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

دیکھ کر گرتی گلے میں سبز دہانی آپ کی
 تغزل اور حسن بیان کی یہ مثالیں بھی لاجواب ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-
 دہان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی
 ایامِ شباب اپنے بھی کیا عیش ارشہ تھے
 کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے

کل دیکھ کے اس کے عالم کو، ایک عالم کے اوسان گئے
 دانشہ عجیب کچھ عالم تھا، جو جان گئے سوجان گئے

موضوعی غزلوں میں بسنت، ہولی، برسات، پری، سہجن، موتی، بے نظیر غزلیں ہیں۔ بسنت والی غزل تازگی اور گفتگی میں لاجواب ہے۔ اس کا ہر مصرع عاشق کے جذبات کی سچی تصویر اور لطافت و طراوت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:-

جوش نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا سہ طرفہ روزگار، طرب ز ا بسنت کا
نظیر کی بعض تشبیہوں سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ”پری“ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-
پشت گلبرگ، شکم سیم، کمر تارنگہ شان بلور، گلاوٹ میں ہر ایک ران پری

ہندوستانی شاعری میں، کم و بیش، سارے اعضائے جسم کی تشبیہ موجود ہے، لیکن پشت کی کیا ہے۔ اس تشبیہ میں نظیر کو اختر صرغ کا شرف بھی حاصل ہے پشت کو گلبرگ اور ران کو بلور سے تشبیہ دینا، نفاست پسندی اور نازک خیالی کی انتہا ہے۔ دونوں مثالوں میں، مشابہت ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ ایسی ہی تشبیہ کو تشبیہ تام کہا جاتا ہے۔ نظیر کا تغزل، نظیری، عرفی، تبدیل، شبلی، کیٹس، ٹینیسن اور ٹیگور کے تغزل سے بہت مشابہ ہے۔ اس کے منتخب اشعار کا ان شعرا کے منتخب کلام سے خوب مقابلہ ہو سکتا ہے۔

اس کی تضمینوں اور سترادوں میں بھی اس کا، تغزل، پوری قوت کے ساتھ کار فرما ہے۔

زندگی کے واقعات و حوادث کے مطالعے کے دوران میں، نظیر پر ایسے لمحے بھی طاری ہو جاتے ہیں جب وہ شواہد سے گھرے نتائج اخذ کرنے لگتا ہے۔ اس تک و دو میں وہ حجابات کی تاریکی میں فلسفیت | دور اگر حقیقت کی گنتہ تک پہنچتا ہے اور ایسی بنیادی بات ڈھونڈ نکالتا ہے جو اعلیٰ فلسفی کی دورہ و دقیقہ رس نگاہوں سے ہی ممکن ہے۔ اس کے ضخیم کلام میں کوئی غزل یا نظم ایسی نہیں ملتی جو کوئی نہ کوئی دقیق فلسفیانہ نکتہ پیش نہ کرتی ہو۔ اس پر لطف یہ ہے کہ سارے نکات عام فہم انداز اور سادہ زبان میں پیش کئے گئے ہیں تاکہ عامۃ الناس کی سمجھ میں بھی آسکیں۔ جا بجا اس نوع کے اشعار ملتے ہیں، جن میں شعری محاسن و لطائف کے ساتھ روزمرہ زندگی کا فلسفہ، بڑی قدرت و سہولت کے ساتھ سمودیا گیا ہے۔ یہ کلام بیش از بیش

معلمانہ قدروں کا حامل ہے اور دنیا کے اعلیٰ ترین حقیقی و معیاری کلام کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعض اجزاء یہ ہیں:-

گروہوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا سب کچھ دیا اگر دل بے دعا دیا
خوابِ عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر سوتے تھے لیکن عشق نے آ کر جگا دیا
دل بے مدعا کی خواہش اس نفس میں پیدا ہو سکتی ہے جس نے زندگی کے سارے مراحل و منازل طے کر کے
سکون و طمانیت کی منزل میں قدم رکھ لیا ہو۔ مقطعے میں ”فراغت“ کی بلاغت و وسعت داد سے مستغنی ہے۔
شعور حیات کو عشق کا مترادف قرار دینا، بصیرت کی انتہا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے مفکرانہ اشعار ذہن کو
اہم فلسفیانہ مسائل کی طرف متقل کر دیتے ہیں۔ مثلاً:-

تن مردہ کو کیا تحفہ سے رکھنا گیا وہ توجس کا مزین بدن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ بن تھا
یہ مقطع ایک مشہور فلسفی کا قصہ یاد دلادیتا ہے۔ اس کے خیالات سے اس کا سماج نفرت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ معاشری
مقاطعے (سوشل بائیکوٹ) یعنی حقہ پانی بند کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ آخر لوگوں
نے پوچھا کہ جب مروجہ تو دفن کون کرے گا۔ اس نے جواب دیا کہ تم ہی لوگ کرو گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ
ہم سے یہ توقع نہ کرنا، ہم پاس بھی نہ کھڑے ہوں گے۔ اس نے ہنس کر کہا کہ جب مرکز سڑنے لگوں گا اور
عقونٹ پھیلے گی تو تو باکے اندیشے سے تم ہی مجبوراً دفن کرو گے۔ اس نوع کے معارف کے علاوہ واجب الوجود
اور ہمہ اوست کے مسائل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور نتائج کو جگہ جگہ عام فہم انداز اور سلیس زبان میں پیش کیا
ہے۔ شعر کی اصل غایت اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا پیغام زیادہ سے زیادہ ذہنوں تک پھونچ سکے۔ ملاحظہ ہو
یہ کچھ ہر وہ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی بکھڑا سبز ہونا، املہانا پھر سمٹ جانا
یہ نیکوئی یہ یک رنگی تس اور یہ قیامت ہے نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

✓ نظیر ایسا جو تخیل دلربا ہو دیا ہو وہ تماشا ہے پھر ایسے شوخ سے سو دے کا پٹ جانا
 اول کے دو شعروں کے کوزے میں مسائل و معانی کے سمندر بند کئے ہیں۔ ان سے وحدت الوجود
 ہمہ اوست اور جزو کل کے قدیم مسائل پر جس طرح روشنی پڑتی ہے، اسی طرح ارتقا، انتخاب طبعی، جہد البقا اور
 خلافت الاوفیٰ کے جدید مسائل کی بھی شرح و وضاحت ہوتی ہے۔ مقطعات کا بیان بہ ظاہر عامیانا نہ ہے لیکن اگر زندگی
 کے وسیع و طویل دوران، اس کی مشکلوں اور ان کے حل کا جائزہ لیا جائے تو اس شعر کی معنویت کے دفتر کھلنے
 لگتے ہیں۔ فلسفیت کی اور مثال ملاحظہ ہو:-

✓ ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا
 اس شعر میں حیات کی ایک ایسی بالغ حقیقت اور زندگی کا ایک ایسا اٹل تجربہ بیان کیا ہے جس کی صداقت و
 اہمیت پوری زندگی بسر کر دینے کے بعد خود ہی واضح ہو جاتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے اس پہلو پر
 روشنی ڈالی ہے۔ شکسپیر نے اپنے مشہور ڈرامے ہینری پنجم میں لورڈ اسکروپ نامی ایک کردار پیش کیا ہے۔
 بادشاہ کو اس پر بڑا اعتماد تھا مگر آخر میں اس نے غداری کی۔ بادشاہ اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے:-

”لیکن آہ، میں اب تجھ سے کیا کہوں اے لورڈ اسکروپ، تجھ ظالم احسان فراموش، خونخوار غیر انسانی مخلوق
 سے، تو میرے سارے مشوروں کا راز داں تھا، تو میری روح کے سارے بھیدوں سے واقف تھا، میں تیرے
 لئے روؤں گا، کیونکہ تیری یہ بغاوت، میرے نزدیک انسان کی دوسری مصیبت کے مماثل ہے۔“

سعدی نے اسی خیال کو اس طرح باندھا ہے:-

ل ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویش تن فریاد
 سعدی نے اپنی ذات کے علاوہ، خویش تن سے اقارب و آشنا کی ذات بھی مراد لی ہے۔ نظیر کے شعر کا نیا
 تو زندگی کا ایک پرانا تجربہ ہے لیکن اس کے انوکھے بیان نے شعر کو ایک ادبی نادرہ بنا دیا ہے۔ زندگی کے لئے
 راہ کا استعارہ بہت پر معنی ہے اور اس راہ میں، آشنا جیسے محبوب و معتد کا لوٹ لینا قیامت ہے لیکن مصیبت

بالائے مصیبت یہ ہے کہ کوئی اس حادثے کا یقین کرنے کو ملتا نہیں۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:-

مشرنا عشق کے آفات کے صدور میں نظیر کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا
عشق کو نظیر زندگی کا مترادف سمجھتا ہے۔ مشرقی شاعری میں عموماً زندگی کے مصائب کی بڑی بڑی شکایتیں کی
جاتی ہیں مگر وہ اس انداز بیان کا خوگر نہیں ہے۔ وہ زندگی کو دشوار گزار ضرور سمجھتا ہے، دو بھر نہیں سمجھتا۔ ساتھ ہی ساتھ
اس پر اعتماد رکھتا ہے کہ اگر پامردی سے مقابلہ کیا جائے تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اور نادور مثالیں ملاحظہ ہو:-

کس کس نے اس کے عشق میں لارہ دم ڈلے سب چل بے گروہ دل آرام رہ گیا
جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا
پہلے شعر میں حسن کی ازلیت وابدیت اور دوسرے میں عشق کی ناتمامی و نارسائی کی طرف اشارہ ہے۔
صوری اعتبار سے پہلے میں ”دم مارنا“ اور ”دل آرام“ اور دوسرے میں ”کام“ اور ”خانہ خراب“ حسن بیان کی
پاکیزہ مثالیں ہیں۔ ایک اور فلسفیانہ شعر ملاحظہ ہو:-

میں ہوں تنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھیں جاہا ادھر گھٹا لیا، جاہا ادھر بڑھا دیا
اس شعر میں جبر و قدر کے مسئلے کو کیسی سہولت سے اور کیسے دل نشین و عام فہم انداز میں بیان کر دیا ہے۔
لطف یہ ہے کہ زندگی کو ایک ایسی معروف چیز سے تشبیہ دی ہے جس سے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ واقف ہے اور
تشبیہ کا حسن یہ ہے کہ تام ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

دیکھ لے اس جن دہر کو دل بھر کے نظیر پھر ترا کا ہے کو اس باغ میں آنا ہوگا
اس شعر میں زندگی کو رجائیانہ نظر سے دیکھنے اور اس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی تلقین ہے۔ زندگی کو ایک
عذاب الیم بنا کر اس پر رونادھونا اور گریہ و بکا کرنا نہیں سکھایا گیا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک قلیل مدت کا نام ہے
اور ایک کاروباری انسان کی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
یہ ایک نئی قسم کا شعر ملاحظہ ہو:-

دیکھ لے اس چین نہر کو دل بھر کے نظیر پھر ترا کا ہے کو اس بلغ میں آنا ہوگا
اس شعر میں زندگی کو جانیانہ نظر سے دیکھنے اور اُس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی تلقین ہے۔ زندگی کو ایک
عذاب الیم بنا کر اس پر رونا دھونا اور گریہ و بکا کرنا نہیں سکھایا گیا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک قلیل مدت کا نام
ہے اور ایک کاروباری انسان کی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرنی
چاہئے۔ یہ ایک نئی قسم کا شعر ملاحظہ ہو:-

آپ ہی کیا ہے اپنے گریبان کو ہم نے چاک آپ ہی سیا سیانہ سیا پھر کسی کو کیا
نظیر کے کلام میں محبت اور جنسی محبت ہی کی ہر جگہ بھرا نہیں۔ نفس انسان کے دوسرے اہم جذبات سے بھی
سابقہ پڑتا ہے۔ اس شعر میں حریت اور خودداری کا بلند معیار نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔
فلسفیانہ کلام کی اور چند مثالیں یہ ہیں:-

وصف اس کے حق کا کس سے ہوا کئی مگر جس کے جتنا فہم میں آیا کسا اچھا کما
گزنے جو سوئے خافہ داں بھی بہ شکل جانماز اہل صلح دزد کو فرشش کیا، بچا دیا

موتد بیریں ہم لیک خدا ہی جانے کون سا گل ہے پس پردہ تفتدیر کھلا
سنگ دل محبوب کو کہنا غلط تھا پر نظیر ہم نے جب جانا جب اس بے درد سے پالا پڑا

نیت رہتے ہم تو یہ سیریں کہاں سے دیکھتے یہ فقط احسان ہے اس ذات پاک ہست کا
ان اشعار میں بالترتیب، فہم انسان کے عجز، عشق کی نیازمندی، تدبیر کی عظمت، علمی زندگی کی اہمیت اور حیات
کے سرور و انبساط کی طرف اشارہ ہے۔ اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں:-

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب پھر بزم ہوگی جب تو سمجھ لہو جب کی جب

اس شعر میں زندگی کے ہر عالم کو اہم سمجھنے، اس میں دلچسپی لینے اور ”آج ہے سورا ج ہے“ کے ذریعے و پر منفعت اصول پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ دوسرے مصرعے سے کنیثا حیات بعد المات کا یقین دلایا ہے اور اگر معنی کو زیادہ وسیع کیا جائے تو تنہا پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

بوسہ اس دل سے نہ کر لے دل افکار طلب یہ زیادہ طلبی ہے نہ ہو دشوار طلب
آرزو خوب ہے موقع سے اگر ہو ورنہ اپنے مقصود کو کم بھونچے ہیں بسیار طلب
ان اشعار میں جاوہ اعتدال پر قائم رہنے کی تلقین کی ہے۔ روزمرہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے کیسا سچا اور کتنا عملی طریقہ ہے۔

کس سے کہیں کیا کریں یہ ہے تماشے کی بات وہ تو ہے پردہ نشیں ہم ہیں تماشا طلب
غیر مفکر ذہن میں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی خواہش اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان تقینات کے دائرے میں محصور ہے اور اس کے میلانات اسی دائرے میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تشنگی اگر کچھ سکتی ہے تو جو اس کے ذریعے کچھ سکتی ہے۔ چنانچہ غیر مفکر قسم کا انسان خدا کو اپنے وجود پر قیاس کرتا ہے اور مجسم دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ ذات حقیقی جسم سے منزہ اور غیر مرئی ہے۔ اس کو مجسم دیکھنے کی خواہش حماقت ہے۔

کمال عشق بھی خالی نہیں تمنائے جو ہے اک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب
یہ شعر، نظیر کے معیاری اشعار میں سے ہے اور شاعر کے نفس کی طمانیت اور قلب کے سکون کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نظیر کے نزدیک انسانیت کا کمال، عشق ہے اور عشق کا منتہی یہ ہے کہ کوئی تمنا باقی نہ رہے۔ آہ میں اثر کی طلب دیکھ کر اس کو تعجب ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک عشق جب ہی کامل ہے جب آہ میں بھی اثر کی طلب باقی نہ رہے۔ یہ شعر طنز بالکنایہ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوا سے مطلب دیکھا جو خوب ہم نے دنیا ہے جائے مطلب

جب حرفِ ابرو تک پہنچا نظیر تو پھر کیا کہنے ایسی جاگہ جزیہ کہ ہائے مطلب
 ان دونوں شعروں میں مطلب کے فلسفے کا خوب تجربہ کیا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے
 سارے تعلقات کی بنیاد مطلب پر قائم ہے۔ مقطعی میں انسان کے نفس کی اس پسٹی پر قائم کیا ہے کہ وہ
 مطلب برآری کے لئے بسا اوقات ابرو بھی قربان کر دیتا ہے۔ معیاریت کا دعویٰ یہ ہے کہ ابرو، انسان کی
 اہم ترین دولت ہے۔ اس کے بچانے کے لئے جان بھی قربان کر دینی چاہئے۔ لیکن نظیر حقیقت نگار شاعر ہے۔
 وہ دنیا میں روزمرہ یہ ہوتے دیکھتا ہے کہ مطلب کے لئے ابرو کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔ نظیر کی بعض غزلیں
 پوری کی پوری فلسفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:-

یوں ہے جیسے بہ روئے آبِ جاب	بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب
زردی رنگ ہے شبِ مہتاب	بادِ تاب کیا ہے خونِ جگر
وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب	جس کو قص و سرود کہتے ہیں
خفہ برق و قطرہ سیما ب	حسن اور عشق جن کو کہتے ہیں
پر کا ہے میاں نہ گرداب	گردش آسمان میں ہم کیا ہیں
مثلِ تحریر موج، نقشِ بر آب	عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے
روح کیا ایک سواریا بہرِ رکاب	جسم کیا، روح کی ہے جولاں گاہ
ایک مثلِ خیال و دیگر خواب	زندہ گانی و مرگ بھی کیا ہیں
وصلِ محبوب، گو ہر نایاب	فرصتِ عمر، قطرہ شبِ بنم
اشکِ حسرت بجائے دانہ آب	قفسِ غم ہے مسکنِ وادی

سب کتابوں کے کُل گئے معنی
 جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

یہ غزل فارسی اور اردو کے قدیم و جدید سرمائے کے بہترین فلسفیانہ کلام کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے اور نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ جوشا عرقص و سرود کو ہوائے خانہ خواب احسن کو خطہ برق، عشق کو قطرہ سیما، عمر کو تحریر موج، روح کو سوار یاہر کاہ، زندگی کو خیال، مرگ کو خواب اور فرصت عمر کو قطرہ شبنم کہہ سکتا ہے وہ نہ صرف بہت بڑا شاعر ہے بلکہ دقیقہ رس فلسفی بھی ہے۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے کہ میکشی اور عبادت ثروت اور عمرت، نظیر کی فلسفیانہ نظریں ایک درجہ رکھتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

وہ میگدے میں حلاوت ہے رند میکش کو جو خاقانہ میں ہے پارسا کو عیش و طرب
کمال قدرت حق ہے نظیر کیا کئے جو شاہ کو ہے وہی ہے گدا کو عیش و طرب

ذیل کے اشعار میں طانیت نفس کے حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔ نقطہ نظر کی اہمیت اور انفرادیت کی قوت کی منجر نمائی کی طرف بے حد سادہ اور نہایت لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ہر چاہ میں ملتا ہے اُسے یوسف اقبال جو تشنہ دوا لائے تری چاہ میں یارب

جو خانہ بدوشی میں ہے طالب کو ترے عیش وہ عیش نہیں خیمہ و خمر گاہ میں یارب

اپنا ہی طلبگار نظیر اپنے کو رکھو! ہر طور میں ہر رسم میں ہر راہ میں یارب

نظیر کے کلام میں کہیں کہیں معیاریت کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ جمال مطلق کی پرستش کا معیار کیسے حسین الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

نقطہ جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے انھیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب

بے مدعا ہو جانا غالباً انسانیت کے کمال کا منتہا ہے۔ نظیر نے جگہ جگہ نفس کی اس معیاری کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ تصور خالص مشرقی ممالک کے لئے مخصوص ہے۔ اہل مغرب کے لئے اس فلسفے کا سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا بہت دشوار ہے۔ ملاحظہ ہو:-

✓ نہ سال تازہ رہیں نامیہ کے منت کش درخت خشک کو نشو و نما سے کیا مطلب

مشرقی شعراء و فلسفیوں نے زندگی کو اکثر عالم خواب سے تشبیہ دی ہے، لیکن نظیر نے اس کو خواب در خواب کہہ کر نیا لطف اور بڑی جدت پیدا کی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں آدُل عجب ہمارا دکھا ہے ہم نے خواب میں خواب
زندگی کے حوادث کے جبر و تشدد اور حیات کی اٹل واقعیت کو کیسی دیانت آئے تلخی اور سادگی سے
بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

الم میں چاہت کے اب ہماری بدل گئی ہے خوشک ہدم کسی کو بھرا دیا کہ ہے جب ہمیں نے اپنی بھلائی صورت
آئی و رفتی یاس و ناامیدی، نظیر کے رجائیانہ نفس میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ خوشی اور رنج دونوں فطری جذبے ہیں۔
خوشی کی طرح رنج بھی انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے لیکن اس کا خوگر ہو جانا اور اسے زندگی کا شعار بنالینا
قنوطیت اور غیر فطری ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اس جام نگوں سے مے راحۃ نہ طلب کر یہاں باد و نہیں باد یہ پیائی ہے کم بخت
توڑے ہیں بہت شیشہ دل جس نے نظیر آہ یہ چرخ وہی گنبد مینائی ہے کم بخت
فلسفیانہ اشعار کے اور چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

نہ ہووے دل کی کھل کٹ کے برباد اگر ڈالے نہ وہ تار نظیر بیچ
اس شعر کا انداز بیان خاص نظیر کے حصے کا ہے۔ تخیل، اکبر آباد کی ایک خاص قسم کی پتنگ کا نام ہے۔ نظیر نے یہ
لفظ کئی مرتبہ استعمال کیا ہے۔ مشرق کے مفکر، زندگی کے تنوعات کو خدا کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ نقطہ
نظر، اس قدر عام ہے اور ایسی جڑ بکڑ گیا ہے کہ مشرق کے تمدن کا جزو اعظم بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ تعصبات اور شعر
کی دنیا میں بھی اس کو پورا دخل ہے۔ نظیر نے بار بار اس طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر ملاحظہ ہو:-

ہے کتے دنوں سے غش نظیر اس بار کا ہم کو جس کے ہیں صبح اور برن، شام اور بھین، کج اور روش کل اور طرح
بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

نظیر واقعیت کا شاعر ہے۔ وہ فطرت کے جہاں و کمال کو جتنا محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے جبر و قہر سے بھی متاثر ہے۔ وہ اس کے اٹل اور ناگزیر قانون پر محض واقعے کی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے اس پر آہ و زاری نہیں کرتا۔ ملاحظہ ہو:-
 پڑی ہے خاک گورستاں میں کیا کیا قد موزوں پر اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گل گوں پر
 اپنے وسیع مشاہدے کے دوران میں نظیر کو طرح طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑا ہے، قسم قسم کے مزاج والوں
 سے واسطہ رہا ہے۔ وہ نہ اچھائی کی تعریف کرتا ہے نہ بُرائی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ نفس انسان کے تنوعات
 کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:-

میں کس سے پوچھوں، یہ ندرت مآب، ہے کیا چیز
 جو نرم ہووے تو برگِ گلاب ہے کیا چیز
 خدا ہی جانے، یہ عالی جناب ہے کیا چیز

نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال
 جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا
 گھڑی میں سنگ، گھڑی موم اور گھڑی فولاد
 نفس کے تنوعات کی اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ایک مشکل ہے ہم نشیں اخلاص
 ہووے جس شخص کے تئیں اخلاص

ہے تو کتنے کو ہر کہیں اخلاص
 اس کی بارکیاں وہی جانے

دیکھ اس پوئے نظیر کی عرض
 تھا بہت خانقاہ سے محفوظ
 منجھے کی نگاہ سے محفوظ

اب تلک قصن ہے حسن ونداں کی
 کیا تماشا ہے یار وکل تو نظیر
 آج بیٹھا ہے میکدے کے بیچ

نظیر کی جہاں جاتی جس، نہایت دقیقہ رس ہے۔ وہ حجابات میں در آتی ہے اور حسنِ مطلق کو بے نقاب دکھاتی ہے۔
 اس کا حسن بیان بسا اوقات، شعر میں پُر لگا دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

چشمِ بدو، اسی رخ سے ہوئی تھی روشن
 مشعلِ وادیِ امین، شجرِ طور کی شمع
 شرفِ نفس کا اقتضا ہے کہ وہ انسان کو خود اپنے نفس کی عزت اور دوسرے سے اس کی توقع کرنا سکھاتی ہے۔

نظیر کو اپنی آبرو کا بڑا خیال ہے۔ وہ جناب امیر المومنین کی خدمت میں، صرف ایک التجا لے کر جاتا ہے۔ وہ یہ ہے:-

آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم با امیر المومنین شاہ نجف
عشق کی ازلیت و ابدیت اور جبر محبت کو کیسے لطیف کنا یے میں ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-
کوئی نہیں کرتا جو کیا تو نے نظیر آہ دل اس کو دیا جس کے نہیں نام سے اہت
انگریزی زبان میں ایک مشہور کہاوت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ”کوئی بات کامیابی سے زیادہ
کامیاب نہیں۔“ اردو میں بھی ایک مثل ”چلتے کا نام گاڑی ہے“ کم و بیش اس کی مترادف ہے۔ اس کہاوت
کی روشنی میں، معاشرت کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے مسائل لالعی اور بہت سے عقائد بے بنیاد نظر آنے
لگتے ہیں۔ اتفاقاً کامیابی بعض اوقات اس حد تک پھونچ جاتی ہے کہ معمولی آدمیوں کو حکیم حاذق، مرشد
کامل، صاحب کشف و کرامت کا لقب دیدیتی ہے۔ نظیر کی دقیقہ رس نگاہیں اس نکتہ کی حقیقت تک پھونچی
ہیں۔ کہتا ہے:-

جب دوستی میں قول کے پورے ہوں دونوں شخص ہوتی ہیں بھر تو کیا ہی ملاقاتیں ٹھیک ٹھیک
جب بن پڑی تو شیخ جی! شیخ نہ ماریں کیا ہم سے بھی بھر تو ہو دیں کراماتیں ٹھیک ٹھیک
بیچ ہے بہ قول حضرت سید نظیر آہ بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

چند اور اشعار جن میں فلسفیانہ جھلک ہے، ملاحظہ ہوں:-

بلغمیں لگتا نہیں، صحرائے گھبراتا ہے دل اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم
دیوانگی میری کے تیرے شب و روز ہے حلقہ زنجیر سے زنداں ہم تن چشم نہیں
یہ ناز ہے یا استغفار ہے یا طر ز غافل ہے یارو جو لاکھ کوئی رٹ لپے سکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں

ذیل کے شعر میں محبت کی ازلیت کی طرف کیسا لطیف و عام فہم اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ہم تو اس کے چاہنے والے ہیں مدت سے نظیر اور نیا کرتا ہے، اب تک وہ صنم خجل ہیں اس شعر کے دوسرے مصرعے میں، ”اب تک“ خصوصیت سے توجہ کے قابل ہے۔ اس جملے کی معنویت و وسعت نے اس شعر کو بیدار بلخ بنا دیا ہے۔

نظیر نے، زندگی کے فوائد و نعمت کی طرف متوجہ کر کے، بار بار زندگی کی اہمیت سمجھانے پر اصرار کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے کلام میں روایتی قنوطیت کے بھی کچھ اجزاء موجود ہیں، لیکن یہ محال خال ہیں۔ اس کے کلام میں رجائیت کی روح سموئی ہوئی ہے اور وہ عام طور پر اُسی کا جلوہ دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہا	شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں
جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے	آبِ جنت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں
لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں	پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں
واں تو ہاں حوروں کے گننے کے بہت ہوں گے نیشاں	ان پر یزادوں کے پھلوں کی نشانی پھر کہاں
الفت و مہر و محبت سب ہیں جیتے جی کے ساتھ	مہرباں ہی اٹھ گئے تو مہربانی پھر کہاں
واعظ و مباحس بکس تو ان کے کہنے کو نہ مان	دم غنیمت ہے میاں، یہ نوجوانی پھر کہاں

جا بڑے چپ ہو کے جب شہر خوشاں میں نظیر
یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

اس غزل میں اس نے کھل کر بتا دیا ہے کہ زندگی کو شادمانی پر ترجیح ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ زندگی خود سب سے بڑی شادمانی ہے۔ اس کو جنت میں جانے کا یقین ہے لیکن اس کے نزدیک محبوب کے ہاتھ کا پانی، آبِ جنت سے، خوباں کی میٹھی گالی، جنت کے لذیذ میوے سے اور پر یزاد کا پھل، حور کے گننے سے کہیں بہتر ہے۔ وہ حاضر کو غائب پر اور حال کو مستقبل پر ترجیح دیتا ہے۔ زندگی کو جینے کے لئے سمجھتا ہے اور آئندہ کی

امید میں اس زندگی کو آزار نہیں بنانا چاہتا۔ اس غزل میں اس نے زندگی کی اہمیت اور حیات بعد الممات پر زندگی کی فوقیت کا گیت گایا ہے۔ اب ایک اور فلسفیانہ غزل ملاحظہ ہو:-

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں
اے یار میں تو کشتہ روز است ہوں
اک دم کی زندگی کے لئے مت اٹھا مجھے
اے بے خبر میں نقشِ زین کی نشست ہوں
مت مت اگر شراب سے لے گلبدن مجھے
ظالم میں تیری چشمِ گلابی سے مست ہوں
دور از طریق مجھ کو سمجھو نہ زاید ادا
گر تو خدا پرست ہے میں بت پرست ہوں
ان ننگِ دلِ بتوں کا گلہ کیا کروں نظیر
میں آپ اپنے شیشہِ دل کی شکست ہوں

اس غزل کا دوسرا شعر خصوصیت سے جلبِ توجہ کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی کو آنی و عارضی بتایا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر زندگی کے دوام کا معترف ہے اور نقشِ زمین کی نشست کی طرح اُس کو حکم و استوار سمجھتا ہے۔ چننا اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں:-

ہمارے قطرۂ اشک اُس کی سر و مہری سے
کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں

منظور ہوا دام میں جب دل کو پھنسانا
پھر دوسرے کیا چاہے صیاد کوئی ہو

مر کر بھی اپنا عقدہ مشکل نہ واہوا
بچ پوچھے تو کہتے ہیں اس کے تئیں گرہ

تا ابد آزا دہیں دام و قفس کے جو رہے
قبل تصویر و طاووس خیال آئینہ

ہے اگر منظور سیرِ عالم حیرتِ نظیر
تو دل اپنا کر تو مجھوس خیال آئینہ

ذیل کے اشعار میں زندگی کو ایک سیر اور محبوب کی ملاقات کو آنی و خوش وقتی بتایا ہے۔ اندازِ بیان

نہایت لطیف و دلکش ہے۔ ملاحظہ ہو:-

اب خدا حافظ ہے اہم لے یا رخصت ہو چلے

تم بھی رخصت ہو کہ اب سب یا رخصت ہو چلے

آگے تھے سیر کرتے غم کو دیکھا خوش ہوئے

گلِ رُخوں کی بزم میں کیا بیٹھتے ہو اے نظیر

نظیر کی معاشرتی حس بہت قوی ہے۔ وہ بزم سے اس لئے رخصت ہونا چاہتا ہے کہ اس کے سب بار رخصت ہو گئے اور اب اس کے لئے بزم کے قیام میں کوئی لطف نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی تھری حقیقت جب اس کے سامنے آجاتی ہے تو اس کو ناگزیر سمجھ کر وہ قبول کر لیتا ہے مگر کوئی آہ و زاری، نالہ و بکا نہیں کرتا۔ نظیر کی واقعیت پسندی کی ایک اور فلسفیانہ مثال ملاحظہ ہو:-

✓ مری بھی جاویں گے تو جڑ پیر ہن عریانی آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد ہے
محبت کی ازلیت وابدیت کی ایک اور مثال جس میں حسن بیان نے چار جانہ لگا دئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-
یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت جب اس کی عمر کو شکر اجل کا آن کر کوٹے
ہماری روح تو بچتی ہے معنوتوں کی نگلیوں میں نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس بختال سے چھوٹے
فرست اور دور بینی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:-

دست صیاد سے چھوٹے تو اٹھل پلے دیے ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جستوں سے
زندگی، خوشی خوشی بسر کرنے کا کیا اچھا انداز ہے۔ ملاحظہ ہو:-
جام نہ رکھ ساقیا شب ہے پڑی اور بھی پھر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی
چند اور اہم فلسفیانہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

✓ حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں وہ کہتے ہیں غافل یہ فنا ہے یہ بقا ہے

✓ یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد آواز پا ہوئی نہ صدا آئے درا ہوئی
جو شکل دور باش تھی روزِ رخت کی اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی
آخری شعر میں، نظیر نے یہ بتایا ہے کہ حقائق، ازل سے تعینات کے حجاب میں پوشیدہ ہیں اور ازل تک پوشیدہ رہیں گے۔ اس لئے اُن کے ڈھونڈنے کی کوشش عبث ہے۔ حقائق سے یہاں بالحد الطبیعیاتی

حقائق مراد ہیں، سائنٹفک حقائق مراد نہیں۔ چنانچہ زندگی کے واقعات سے دل لگانا اور زندگی کی جدوجہد کو مسرور و تابناک بنانا، رموز و حقائق کی تلاش سے بہتر و افضل ہے۔ چند اور فلسفیانہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-
 ہم اطوارِ تاسف سے نہ کرتے آج جاں کا ہی اگر بے درد کے طرزوں سے ہوتی کچھ بھی آگاہی
 گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ اس کو تو پھوننا ہے نہ پھولے تو کیا کرے
 جو نا قبول شے کے بسایا قبول کو پھر اس کو وہ بھلا نہ قبولے تو کیا کرے
 ان دو شعروں میں، فطرت کی اہل قوت کو، شاعر کی طرح نہیں بلکہ ایک ماہر طبیعیات کی طرح بیان کیا ہے۔
 ان مقامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کو حقیقت و واقعیت سے کتنا شغف تھا۔ ذیل کے شعر میں جبر حیات کی طرف اشارہ ہے:-

جاگت اہوں تو یہ کہتا ہے کہ جاسو بھی کہیں اور جو سوتا ہوں تو ٹھوکر سے جگاتا ہے مجھے ✓
 ذیل کے پہلے شعر میں معاشرت کا ایک نکتہ بتایا ہے اور دوسرے میں کامرانوں کو ہدایت کی ہے ✓
 کہ ناکامیوں کو فراموش نہ کریں۔ ملاحظہ ہو:-
 جاتی ہے قدر اس میں کچھ اچھا نہیں نظیر گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھر میں گھر میں ✓
 جلد اتنا نہ چل اور جلوہ دکھانے والے ہیں نقاہت زدہ پچھلے ترے آنے والے ✓
 چند اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں:-

کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے لے نظیر ہم کو تو آج کل گیا عقدہ یہ اک جناب سے
 اتنا نہ ہنس دل اس سے ایسا نہ ہو کہ خچل لڑنے کو تجھ سے ہو دے تیار ہنستے ہنستے ✓
 کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھر ڈیال آج کیا مر گئے گھر ڈیال بجانے والے —
 ہے آج تو خوش پر نہیں بسبل کو یہ معلوم کل سر کو پٹکنا ہے چمن کی روشنیوں سے
 کوئی نجات نہیں تجھ میں اور صدمہ میں نظیر مگر تو آپ ہی پردہ ہے آپ ہی ٹٹی ہے

مسلل اور موضوعی غزلوں میں فلسفیانہ اشعار کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن نظیر کی مسلسل غزلوں میں بھی کہیں کہیں فلسفیت کی جھلک موجود ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیہ کرہ سب ارض و سما کی ہے گلستان تماشا
ذیل میں ایک غزل کا مطلع درج کیا جاتا ہے:-

وہ رشک خور جو وقت سحر بے نقاب تھا دیکھا اس کے رخ کو رو بہ زمیں آفتاب تھا
اس غزل کا بقیہ حصہ ایک قطعے پر مشتمل ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:-

ایک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
یہ پورا کا پورا قطعہ مشرقی فلسفیانہ شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ چند اور نمونے پیش کئے جاتے ہیں:-
جدھر کو دیکھے ادھر آپ ہی جھمکتا ہے مزا پڑے نہ اسے کیونکہ شیش محلوں کا

تو ہستی کی گرہ پر عقل کا ناخن نہ توڑے دل کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این مہر
ذیل میں ایک مسلسل غزل کا مطلع درج کیا جاتا ہے:-

یہ جواہر خانہ دنیا جو ہے با آب و تاب اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب
یہ ساری غزل بڑے حقائق و معارف کی حامل ہے اور پوری کی پوری فلسفیانہ رنگ میں ہے۔ ذیل کی غزل کا بھی یہی پروانہ ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:-

کیا کا سہ مے لیجئے اس بزم میں اے ہم نشین دور فلک سے کیا خبر بچو بچے گلاب تک یا نہیں
فلسفیانہ رنگ کی ایک اور مسلسل غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:-

کیا کا سہ مے لیجئے اس بزم میں اے ہم نشین دور فلک سے کیا خبر بچو بچے گلاب تک یا نہیں
شعر کے سلسلے میں جب فلسفے کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ کوئی مربوط و منضبط نظریہ مدلل و مشرح

انداز بیان کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ اشعار جو حقائق و معارف کا جائزہ لیں، زندگی کی بنیاد پر نظر ڈالیں اور فکر کو بیدار کریں فلسفیانہ کئے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظیر کے بھی وہ اشعار جو فکر کے پہلو بہ پہلو، عبرت، غفلت، دور بینی، نال اندیشی وغیرہ، نفس کے سنجیدہ جذبات کو متاثر کرتے ہیں فلسفیانہ کئے گئے ہیں۔ ان میں کسی نوع کا مابعد الطبیعیاتی فلسفہ تلاش کرنا بجا نہ ہوگا۔

فارسی ترکیب کی خلاقی کا فخر مومن اور غالب کی ذات سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ خیال تاریخی غلطی ہے اور عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ مرکبات بنانے اور انھیں مناسب موقعوں پر اردو فارسی ترکیب شعر میں استعمال کرنے کا روانہ نظیر نے پیدا کیا ہے۔ اس کے یہاں ترکیب کی وضع و قطع اتنی خوش گو اور دل پسند ہے کہ بار بار یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خود ہی اس انداز بیان کا موجد ہے اور مومن و غالب نے اس کے کلام کے غائر مطالعے سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ نظیر کی ساری فارسی ترکیبیں ایک جگہ جمع کی جائیں تو ان کا ذخیرہ مومن اور غالب کے مشترکہ سرمائے سے زیادہ ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ ترکیبوں کا بیشتر التزام غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ چند ترکیبوں اور ان کے استعمال کا مطالعہ دیکھی سے خالی نہ ہوگا:-

شورِ افکن جنوں ہے جس جسا نگاہ کرنا رکھتا ہے کام ہمد و اں ضبط آہ کرنا

شرمندہ رُو نہیں عاشق کا چاک جبب کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا
ذیل کی غزل کے سارے قافیے فارسی ترکیب کے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ نظیر کو اردو میں فارسی ترکیب کا پیوند لگانے کی کیسی قدرت ہے۔ ملاحظہ ہو:-

زیر فلک وہ خلق ہوئے ماہ پار ہا دیکھے ہے جن کو رشک سے چشم ستار ہا
ہے تو وہ مہرِ حُسن کہ ہر دم تری طرف کلِ اختر سپہر ہیں گرم نفلار ہا
یوں ننگ بھر توڑے ہے آئینہ ہائے دل مینا کے ٹکڑے کرتے ہیں جوں ننگ خار ہا

پوری غزل کا یہاں نقل کرنا طوالت ہے۔ دوسری غزل کے چند شعر جو اسی نوع کے قافیوں میں ہیں، نئی لذت کے حامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزارہا	دباستہ ایک تار نفس سے ہیں تار ہا
کچھ صید زخم خوردہ جاناں ہمیں نہیں	ہر صید گدیں اس کی ہیں بسمل ہزارہا
اس گل کے چاک چیب کی حسرت بے باغ میں	ہر صبح چاک ہوتی ہیں جیب و کناں ہا
اس سوزن مرثیہ کے تصور میں شانہ ساں	ٹوٹے ہیں ایک خلق کے پہلو میں خار ہا
کس کس کی دیکھے بچمن صنع میں بہار	اپنی فقط دو چشم ہیں اور یساں بہار ہا

ان اشعار کا فارسی مزاج اور ان ترکیبوں کا نادر استعمال، آپ اپنی شرح ہے۔ لیکن ”صید زخم خوردہ جاناں“ اور ”بہار ہا“ سے ثابت ہے کہ نظیر کو فارسی زبان اور محاوروں پر بھی کتنا عبور ہے۔ اور ترکیبیں ملاحظہ ہوں :-

دلِ ندامت چہ جو اے سرو گل اندام ہوا	حلقہ زلف بتاں پھر اسے کب دلام ہوا
ہو گیا دیکھتے ہی مشرقِ خورشیدِ بخت	اس کفِ پا سے مشرق جو سرِ بام ہوا

اس ابروئے خم دار کی صورت سے عیاں ہے	خنجر کی شباہت، دمِ شمشیر کا نقشہ
کیا گردشِ ایام ہیں اے آہِ جگر سوز	الٹا نظر آیا تری ناخوشی کا نقشہ

ذیل کے اشعار میں، ترکیبوں اور مرکبِ ترکیبوں کے علاوہ، دوسرے شعر میں ”رہے“ کا استعمال بڑا شیریں ہے :-

عشق کا جو گل زخمِ دمِ شمشیر کھلا	رہ گیا جسم پر مثلِ گلِ تصویر کھلا
طفلِ اشک لے مرثیہ چاہے کہ بے تک تو اے	پیار سے مہر سے الفت سے یہ تدبیر کھلا
خود تدبیر ہیں ہم ایک خدا ہی جانے	کون سا گل ہے پس پردہ تقدیر کھلا

ذیل کے اشعار کی بندش میں کس قدر فارسیت ہے :-

اک پردہ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا وہ پردہ برانداز ہمیں کیوں نظر آیا

جو وصف زلف کو پوچھا تو حلقے حلقے کو آب و مرجع و بجائے صدا سیر کہا

تو حُسن میں وہ مہر سپر جمال ہے ہر روز جبہ سا ہے ترے در پر آفتاب
ہر لحظہ تیرے چہرہ اُرد کے وصف میں یہ بیت پڑھ رہا ہے فدا ہو کر آفتاب
از بہر دفع چشم بدار دے خوب تو سیارہا پسند شود محرم آفتاب

ذیل کی غزل پوری کی پوری فارسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ غزل اگر ان حضرات میں سے کسی کے سامنے پڑھی جائے جنہیں نظیر سے سرسری واقفیت یا سوئے ظن ہے تو ہرگز نہیں بتا سکتے کہ یہ اس بگو بہ کرد ز کار شاعر کا کلام ہے جسے ہر طرح بات کہنے پر قدرت ہے۔ ملاحظہ ہو :-

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جوئے یارمہ چہرہ اور شب ہمتاب
زور کیشیتیں دکھاتے ہیں ساقی گل عذار و بادۂ ناب
کرتے ہیں تار تار جیب الم تار قانون وین و چنگ و رباب
وقت خلوت یہ ہم نے اس سے کہا اب تو ٹلک منہ سے دور کیئے نقاب
بولی ہم تو ابھی اٹھا دیں مگر لائیں کب آپ دیکھنے کی تاب

اور جب آجائے غش تھیں تو نظیر
پھر چھوڑ کر پڑے گا ہم کو گلاب

یہ غزل اپنے لب و لہجہ اور پیکر کے اعتبار سے اعلیٰ فارسی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور معنوی اعتبار سے نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ جو شاعر طرہ عذاب، عشرت و دچند، یارہ چہرہ، ساقی گل عذرا، جیب الم، تار قانون و دین و چنگ و رباب، جیسے جملے وضع کر سکتا ہے اس کی فارسی دانی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی ضرورتوں کے لئے فارسی جملے خود تراشے اور ترکیبیں خود وضع کی ہیں۔ بعض اور دلکش ترکیبیں ملاحظہ ہوں:-

پروانے سے عاشق کے تئیں شمع جلا کر پھر آپ بھی روتی ہے کھڑی بخت جلی چپ

ہے جو اس محبوب کی انگشتی دردست چپ رکھتی ہے کیا کیا نزاکت پروری دردست چپ
حس کماں کو کھینچتا ہے وہ بت ابرو کماں اس کے قبضے میں ہے سوزنیت دردی دردست چپ

ہو گئی باغ میں عطریت سنبل برباد نگہت اس زلف کی لے کر جو صبا آئی آج
جگر میں جوش تمیش اور بہ لب ہجوم فغاں ہوئی ہے آج یہ کچھ اس کی از دہام سے یاد
اس لطف سے جزو قلم مانی تقدیر کیا تاب جو کھینچے تری تصویر کوئی اور
اسے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو کھیر ایسا ہی پھیرنا ہے تو اہل وفا کو چھیر
کستنائنگ صفا ہے کہ پائے نگاہ کا ہلکا سا اک غبار ہے چہرے کے رنگ پر
نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال میں کس سے پوچھوں یہ ندرت مآب کیا چیز

ان اشعار میں بخت جلی، نزاکت پروری، بت ابرو کماں، زینت پروری، عطریت سنبل، بہ لب ہجوم فغاں، مو قلم مانی تقدیر، ہوس آشنا، کستنائنگ صفا، ندرت مآب، لاجواب ترکیبیں ہیں اور توہمن و غائب کی بہت سی ترکیبیں انہی سانچوں میں دھکی معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فارسی ترکیب بنانے کا اسلوب غالب نے نظیر

سے یکساں ہے۔ نظیر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

گردہ مرزہ ہوا مل جنگ پر طاؤس تو سہم کے بے پروا ہو، خدنگ پر طاؤس
یوں زلف معنبر کے خط سبز ہے نزدیک گویا پر طوطی ہے بہ چنگ پر طاؤس
دیکھے جو ترے عاشق گل خوردہ کی تصویر حیرت زدہ ہو دیدہ تنگ پر طاؤس
نظیر کے اس نوع کے اشعار سے غالب کے وہ مخلق اشعار یاد آتے ہیں جو اس کا ابتدائی کلام بتائے جاتے ہیں :-

شمارِ بزمِ مرغوب بہت مشکل پسند آیا تماشا ہے یہ یک کف بردنِ عدد دل پسند آیا
جراحتِ تحفہ الماسِ ارغماں داغِ جگر ہدیہ مبارکبادِ اسدِ غمِ خوارِ جانِ وردِ مند آیا

شبِ نیم بہ گلِ لالہ نہ خالی زادِ اہ ہے داغِ دلِ بیدارِ دُلفِ گاہِ حیا ہے
قمری کفِ خاکسترِ دبلِ قفسِ رنگ لے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

نقشِ تازِ بہت طراز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پے خامہ مانی مانگے
اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظیر کا یہ کلام، اس وقت کی پیداوار ہے جب غالب، اس کے کتب میں پڑھتا تھا اور اس کے ذہن پر اس نوع کے کلام کا نقشِ اول، مرتسم ہوا۔ بچپن کے اثرات ہمیشہ قومی اور دیر پا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اس نے خود کنا شروع کیا تو پہلے اسی انداز لیں کہا اور پھر بجھتے بجھتے کلام نے وہ رنگ پکڑ لیا جو نظیر کے فارسی آمیز کلام میں پایا جاتا ہے۔ چند اور نادر ترکیبیں ملاحظہ ہوں :-

اٹھا دیں نازِ ان کے ہم نہ کیوں کر نظیرِ دل سے کہ جن کے ہوں
جفا تملطف، عتاب شفقت، غضب توجہ، ستم نوازش

جب تو اس گل بدن شکر لب نے یوں کہا، سن کے اس حقیر کی عرض
 قد کو ہے سرو سہی سے ہم قدمی تن کو ہے نازک تری سے ارتباط
 ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی آن کو غارت گری سے ارتباط
 نظیر کو مصرعوں میں توازن و تقابل کا بڑا شوق ہے۔ قد کو سرو سہی کا ہم قدم بنانا اور ہم قدمی کی ترکیب وضع
 کرنا کمال ہے لیکن ہم قدمی کے مقابل تن کے لئے نازک تری وضع کرنا کمال بالائے کمال اور نظیر کا
 حصہ ہے۔ دوسرا شعر بھی اسی درجے کا ہے یہی وہ مقامات ہیں جو اسے بڑا انسانی مرتبہ بخشتے ہیں اور دنیا
 کے ہومز، کالیداس، شیکسپیر، انیس اور ڈالساے جیسے بڑے فن کاروں کی صحبت میں لا بٹھاتے ہیں۔
 اور مثال ملاحظہ ہو:-

آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے جل کر حسن کی گرمی باز میں مشہور کی شمع
 نظیر کی اس غزل کا لب و لہجہ، غالب کے بہت سے کلام میں پایا جاتا ہے۔ غزل یہ ہے:-
 ابے صف مزگاں تکلف بر طرف دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف
 دیکھ وہ گوراسا کھڑا رشک سے پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
 آبرو رکھ سیو نظیر اپنے کی تم یا امیر المومنین شاہ نجف
 حسین ترکیبوں کی اور چند مثالیں یہ ہیں:-

جونہی آیا ادھر کو وہ چشم سیم، وہیں لے گیا دل کو بے سیر نگہ
 رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوش رہائی قسم
 میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں تو وہ شرم و حیا سے ہونٹ زریں
 لئے نیچی نگاہوں سے جان دل دیں میں کہوں کیا، اب اس کی حیا کی قسم
 کیا لبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام آہ حسرت زدہ شوخی رفتار تو ہم ہیں

بوسہ لیجے جو ہو کے دست و کمر
اتنی ہم میں کہاں ہے تاب و توان

جوش نے ایک جگہ کہا ہے :-

تجھے کیا فصل گل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی
تو خود اپنی جگہ ایک دولتِ بیدار ہے ساقی
مرا خیال تھا کہ یہ ترکیبِ جوش کی خلقت ہے مگر نظیر نے اسی غزل میں پہلے ”پر دلی“ کہا ہے اور پھر ”دولتِ بیدار“ استعمال کیا ہے :-

بہرِ زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ
کیا پر دلی ہے اس دلِ خانہِ خواب میں
لگتے ہی آگ کھ شُب کو نظر آگئی وہ شکل
پائی یہ ہم نے دولتِ بیدارِ خواب میں
یہیں نہیں نظیر نے ایک اور جگہ بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے اس لئے یہ ترکیب اسی کی ملک ہے۔ ملاحظہ ہو
قاصد اس دولتِ بیدار سے کہیو کہ کبھی
دو گھڑی آ کے ہمارے بھی جگا جائے نصیب

بعض اور ترکیبیں یہ ہیں :-

وہ منتظر کہ آویں، ہم پر تپش کہ جاویں
اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں
نہ ضبط ہے نلکہ کا نہ رک کے نظارہ
کیا شوق و رزیاں تھیں کیا بقراریاں تھیں

جب کہ اُلٹی ہم نے تکرارِ نظر پر آستیں
کھینچ لی اس نے رخِ رشکِ قمر پر آستیں
اس پر ہی رو کے دو آنے کی یہ شکلِ لباس
تارِ دامنِ خار پر شاخِ شجر پر آستیں

گر عار ہے کچھ اس میں تھیں تو میاںِ نظیر
لے جاؤ اپنے اس دلِ عزتِ پناہ کو
دل میں چن کے ہے تری حسرت کی گھڑی
باور نہیں تو دیکھ یہ غنچہ نہیں گرہ
بہرِ عمر میرے دل کا یہ غنچہ کھلا نہ آہ
ایسی فلک نے کس کے دی میرے تئیں گرہ

آئینہ کی روایت میں نظیر نے مطلع اور مقطع سمیت سات شعر کی غزل کہی ہے۔ پوری غزل جا بجا فارسی ترکیبوں سے بھرپور ہے، لیکن ہر شعر کا دوسرا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ داد و طلب ہے۔ غالب کے کلیات میں اس روایت کا صرف ایک مطلع میسر آتا ہے۔ نظیر کی غزل یہ ہے :-

بس کہ دل اس کا ہے مانوس خیال آئینہ ہے وہ ملکِ حق محروس خیال آئینہ
تھا وہ پشتِ بامِ برعکس آری میں ہم نے بھی زورِ حکمت سے لیا، بوسِ خیال آئینہ
تا ابد آزا دہیں دامِ وقفہ کے جوڑے بلبَل تصویرِ دِطاؤس خیال آئینہ
دل بجا سے اس کی آزرہ ہو سوتا نہیں بے خطر ہے رنگ سے روس خیال آئینہ
کل اُسے آئینہ خانے میں جو تھی شوقِ خرام تھا دو صد جا ہم کو با بوسِ خیال آئینہ
صافیِ دل کا لغت اس سے پھر نہاں ہے یک نظر دیکھے جو قافیا بوسِ خیال آئینہ
ہے اگر منظورِ سیرِ عالم حیرتِ نظیر
تو دل اپنا کر تو مجھ بوسِ خیال آئینہ

غالب کا مطلع ملاحظہ ہو :-

از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شش جہت کے مقابل ہے آئینہ

اور مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مقابل اس چشم کے ہوں کیونکہ کہ دیتی فرصت نہیں ہے بل بھر
ادھر نگاہوں کی ترک تازی، ادھر کو مڑنا گاہ کی نیلہ بازی

بھولتی دل سے نہیں ہوشِ ربانی تیری دلبری عشوہ گری، جلوہ نساںی تیری
ذیل کی پوری غزل کالب و لہجہ، مزاج اور رنگِ فارسی ہے، مگر اس کے قطعے میں دو محاورے

ہلکا ہونا بہ معنی سبک ہونا اور بھاری ہونا بہ معنی دو بھر ہونا، تقابل کے طور پر بڑے حسن سے نظم ہوئے ہیں۔ ملاحظہ
 اظہار ہم بھی کرتے احوال دلفکاری شرم و فگارک دم دیتی زباں کو یاری
 جن میں فریب و فن کی سوختہ کاریاں ہیں ہم ان کے مبتلا ہیں لے وائے خام کاری
 شکوہ فرامشی کا کیا ان سے کیجئے جن کو صورت ہی بھول جاوے پھر کیسی یاد کاری
 یک بار ملتے جھلتے ترک جاؤ تم تو لے جاں دل بستگاں کی پھر ہو کیونکہ اشک باری
 وعدہ پگزل رخوں کے مت کھا فریب اک دل ان کے قرار میں ہیں صد غار بے قراری
 لیتی ہے ہم سے بدلہ اب صبح حشر اس کا جو شام موین ہم نے کی تھی سیاہ کاری
 گر کر نظیر ہم اس محبوب کی نظر سے
 ایسے ہوئے ہیں ہلکے جو زندگی ہے بھاری

اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی صدختہ نہ خفتہ کی حاجت روا ہوئی
 جو شکل دور باش تھی روز سخت کی اب بھی جو ہم گئے تو دہی بر ملا ہوئی
 یہ غزل بھی سر تا پا فارسی رنگ میں رنگی اور میر و غالب کے تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:-
 جان بھی بہ جان ہے ہجر میں درد دل نگار بھی تر ہے مزہ بھی اشک سے جیب کا تار بھی
 طرفہ فوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار لیتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
 کوچے میں اس کے بٹھنا حسن کو اس کے دیکھنا ہم تو اسی کو سمجھتے ہیں باغ بھی اور بسا رہی
 دیکھنے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں عشوہ پُرفریب بھی، غمزہ سحر کار بھی
 زلف کو بھی ہے دم بہ دم عزم کسند افکنی دام لئے ہے مستعد طرہ تاب دار بھی
 گئے لگی وہ اپنے جب چاہے والوں کو نظیر اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کیا رہی

اس غزل کا مطلع تمیر کے رنگ کا، چوتھا شعر غالب کے رنگ کا اور مقطع ٹھٹھٹ نظیر کے رنگ کا ہے۔ فارسی ترکیبوں کی چند اور مثالیں یہ ہیں :-

خیال شوخی چشم اس کا اپنے دیدہ ترین
پھرے ہے یوں کہ جیسے ہوشا و بحر میں ماہی
اے مردمان چشم بستاں یہ وہ حال ہے
تم سب کے آج خال کو کہاں جائے حال ہے
اب تو ہر لحظہ کو بے درد تا ہے مجھے
بے نہایت ستم و ظلم دکھاتا ہے مجھے
یک سرمونہ پریشان ہو تو لے کا کل بار
ہم ترے دام میں آ کر کہیں جانے والے
نقطہ حسن اس کے رخ کا ایک کتاب حسن ہے
ہو چکی اس کی بھی تحقیقات میرے سامنے
اس کی ابرو کی صفت میں ہر کہاں ابرو نے رات
برقم میں کیا کیا بڑھیں آیات میرے سامنے
زیادہ اس سے اب انھائے درد کیا ہوگا
کہ جان آنکھوں میں آ آ گئی پر آہ نہ کی
غنیم لب، مہر جبین، عارض گل فام پری
گلشن حسن ہے اب وہ گل اندام پری
زمین نظیر نہیں گرم اس میں ہے کیا خاک
مگر بہ زور طبیعت نباہ کی گھڑی
فارسیت اور فارسی ترکیبوں کا التزام، غزلوں کی طرح، مسلسل اور موضوعی غزلوں میں بھی بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

خدا و خال خوبی آگین لب لعل بان سے نگیں
نظر آفت دل و دیں مژدہ صدمضرت افزا
اس شعر میں ”صدمضرت افزا“ خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ خط کی جگہ ”خدا“ کے استعمال نے شعر کی دلکشی کس قدر بڑھادی ہے۔ ذیل میں ان مسلسل غزلوں کے مطالعے درج کئے جاتے ہیں جن میں یا تو فارسیت کی کثرت ہے یا جو اول سے آخر تک فارسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

✓ یہ جو اہر خانہ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہل صورت کا ہے دریا، اہل معنی کا سراپا
درپے ہیں دل اپنے کے ادھر عشوہ گرے چند
خواہندہ یک جان ہیں ادھر مو کرے چند

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا کل اک دلبر سہی قامت، پری بیکر، مقطع وضع، خوش منظر
 دنیا ہے اک نگار فریبندہ جلوہ گر الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و ضرر
 کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن گل رخ و گلگوں قبا و گل عذار و گل بدن
 کیا کا سہنے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشین دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں
 کیا دل لگاویں مہرباں ہم حسن صورت سے کہیں نہ وہاں ثبات اس سے بہم نہ یہاں قیام پلے تینیں
 گل رنگی دگل پیر ہستی، گل بدنی ہے وہ نام خدا، حُسن میں سچ سچ کی بنی ہے
 موضوعی غزلوں میں فارسیت کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ برسات کا مطلع ہے :-
 ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فرا دیکھ تک تازگی صنعت، بچون و چہرا
 پری کا مطلع ملاحظہ ہو :-

رخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری کیوں نہ اب نام خدا ہو تر سے قربان پری
 بسنت کا مطلع ملاحظہ ہو :-
 مل کر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی ہنس کر کہنا یہ ہم نے لے جاں بسنت آئی
 سمھن کا مطلع ملاحظہ ہو :-
 سراپا حُسن سمھن کا گویا گلشن کی کیا رمی ہے پری بھی اب تو بازی حُسن میں سمھن سے ہاری ہے
 دوسرا ملاحظہ ہو :-
 کروں گس منہ سے اب یار و بیان میں شان سمھن کی لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمھن کی
 موتی کا مطلع ملاحظہ ہو :-

پریزادوں میں ہے نام خدا جس شان پر موتی کوئی ایسا نہیں موتی مگر موتی مگر موتی
 ان ساری موضوعی غزلوں میں فارسیت کی ہلکی چاشنی موجود ہے۔

اُردو زبان میں غالب کا کلام اپنی نوع کی یکتائی اور اپنے رنگ کے اچھوتے پن کے لئے مشہور ہے۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام پر غالب کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ نظیر کے کلام میں شعر نظیر کا پر تو غالب پر کے شعر اور غزلیں کی غزلیں، ایسی میسر آتی ہیں جنہیں شاعر کا نام بتائے بغیر پڑھا جائے تو اہل ذوق و نظر کو غالب کے کلام کا دھوکا ہو جائے۔ تاریخی اعتبار سے نظیر مقدم ہے۔ اس لئے کسی دوسری دلیل کے بغیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ غالب پر نظیر کا گہرا پرتو پڑا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اُس نے نظیر کے فلسفیانہ کلام سے بیش از بیش استفادہ کیا ہے۔ ایک معنوی تواریخ ملاحظہ ہو:-

نظیر نے کہا ہے:-

اس مہر پر انوار سے شبِ بنم کی طرح ہم گم ہوتے گئے ہم کو دو جوں جوں نظر آیا
غالب نے کہا ہے:-

پر تو خور سے ہے شبِ بنم کو فنا کی تعلیم ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
غالب کا شعر نظیر کا چربہ ہے لیکن اگر غائر نظر ڈالی جائے تو نظیر کا شعر، غالب سے بہ مراتب بلند ہے۔ غالب عنایت کی نظر کا محتاج ہے اور نظیر اپنی نظر پڑتے ہی، جمالِ مطلق میں جذب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ”جوں جوں“ لکھ کر نظیر نے تسلسل و تواتر کا جو تصور پیش کیا ہے وہ غالب کے شعر سے پیدا نہیں ہوتا۔
نظیر کے غزلیہ کلام کا، غالب کے رنگِ طبیعت پر گہرا اثر ہے۔ بعض مقامات نظیر کے کلام میں ایسے نظر آتے ہیں جنہیں بلا خوفِ تردد، غالب کے تصور کا ماخذ اور تحفیل کا سرچشمہ کہا جاسکتا ہے۔ نظیر نے کہا ہے:-

تھے کل یہ خطِ عارضِ خیراں سبزہ رنگ کہتے ہیں آج خلقِ جنہیں سبزہ زار ہا
تھے کل یہ شاہدان سہی سرو و سیم تن شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزار ہا
سب کو نظیر سونا ہے اک دن بہ زیرِ خاک سنگ مزار اس کے ہیں آئینہ مزار ہا
ان اشعار میں بندش کی جُستی، تصور کی بلندی، فکر کی گہرائی، نقاد کی فکر و نظر کے لئے تحقیق و تفتیش کا

ایک وسیع میدان کھول دیتی ہے۔ ان میں اور فارسی ترکیبوں کے علاوہ، سبزہ رنگ، سہی سرو اور آئینہ دار اس کیفیت و مزاج کی ترکیبیں ہیں جن کی ایجاد و اختراع کا خضر غالب کی ذات سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ ترکیبیں پہلے نظیر اور پھر غالب نے استعمال کی ہیں۔ اب پیکری مماثلت سے قطع نظر کر کے، معنی کی طرف توجہ کی جائے تو بار بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں
کا ماخذ نظیر کے مذکورہ بالا اشعار ہیں جن سے غالب نے اپنے مطلع کے لئے عام مواد حاصل کیا ہے۔ نظیر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :-

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب
غالب کا یہ شعر :-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
بہت مشہور ہے۔ یہ اس کے فلسفیانہ نوادر اور اردو کے اہم شعری سرمائے میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس کا ماخذ دریافت ہونے سے بڑی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ نظیر کا ایک مطلع ملاحظہ ہو :-

ساتی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب پھر بزم ہو گی جب تو سمجھ لیجو جب کی جب
غالب نے بھی اسی معنی کا ایک مطلع کہا ہے جو یہ ہے :-

کل کے لئے اگر آج نہ خست شراب میں یہ سوئے نغمہ ہے ساتی کوثر کے باب میں
دونوں کے تقابل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسرا پہلے سے ماخوذ ہے۔ ”عربہ جو“ کی ترکیب عموماً غالب کی اختراع سمجھی جاتی ہے۔ فارسی سے اردو میں لانے کا شرف کم سے کم اسی کے نامہ اعمال میں لکھا گیا ہے۔ نظیر کہتا ہے :-

ربط اُس عربہ جو سے ہمیں کس طور سے ہو ہم تو ہیں صلح طلب اور وہ ہے پیکار طلب

نظیر کے بعد غالب نے کہا ہے :-

صدِ حیف وہ ناکام جو اک عمر سے غالبِ حسرت میں رہے ایک بتِ عربہ جو کی
دوڑے شاعروں کے کلام میں ہم قافیہ غزلیں میسر آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ محض اس
اشتراک سے کوئی خاص نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن جب بحرِ عامۃ اور ود نہ ہو اور قافیہ شاہراہ سے ہٹے
ہوئے اور غیر مانوس ہوں، یہاں تک کہ خاص خاص استادوں کے کلام میں بھی نظر نہ آتے ہوں تو
لا محالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مقدم کی تقلید کی گئی۔ اولیت کا خرد و شرف مقدم کو حاصل ہے اور
مناظر نے استفادہ کیا ہے۔ نظیر کی غزل ملاحظہ ہو :-

ہوا جو ہم کو وہ کو چمن سرشت نصیب خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب
جدا جو اس سے ہوئے ہم تو اپنی قسمت ہے وہ تو خوب پر اپنے ہی کچھ ہیں رشت نصیب
لکھیں نہ حرف و فاکیا کریں کہ اول سے ہوئی قلم کو ہمارے ہی نوشت نصیب
زمینِ دل میں گرایا ہے تخم تو لیکن کریں گے دیکھے سر سبز کت نصیب
یہ کلم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر
ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک نشت نصیب

اب ان ہی قافیوں میں مگر ردیف کے تغیر کے ساتھ غالب کی غزل ملاحظہ ہو :-

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں بھولا ہوں حقِ صحبت اہل کشت کو
طاعت میں تار ہے نہ نئے واکہیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں مخرف نہ کیوں رہ درسم ثواب سے ٹیڑھا لگا ہے قلم سر نوشت کو
آئی اگر بلا تو جسک سے نہیں ٹہلی ایراہی دے کے ہم نے بچا ہے کشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے خرمن جلے اگر سرخ لکھائے کشت کو

نظیر کی غزل میں مطلع اور مقطع ملا کر پانچ شعر ہیں۔ غالب کو اس زمین میں مطلع میسر نہیں آیا۔ اس کے یہاں بھی مقطع سمیت پانچ شعر ہیں۔ نظیر نے چھ قافیے استعمال کئے ہیں اور غالب کے یہاں ایک قافیے کی تکرار کی وجہ سے صرف چار ہیں۔ ان چار میں تین، بہشت، نوشت اور کشت اس نے غالباً، نظیر سے مستعار لئے ہیں۔ غالب کی غزل میں کنشت ایک نیا قافیہ ہے جس پر نظیر کی نظر نہیں پڑی۔

مضامین کے قرب و یک رنگی کی یہ دو مثالیں بہت دلچسپ ہیں۔ نظیر نے کہا ہے :-
حاضر جوابی دیکھو کہ لب سے مرے ہنوز نکلا نہیں سوال کہ وہاں ہو گیا جواب

غالب نے کہا ہے :-

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
نظیر نے کہا ہے :-

یار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے دوست بھی ہو گئے دشمن مرے لئے نصیب
غالب نے کہا ہے :-

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
اں دونوں مثالوں میں مقابل شعروں کا مطلب بالکل تو ایک نہیں ہے مگر بہت قریب قریب ہے
اور غالب کے اشعار نظیر کے شعروں کا اقتباس سمجھے جاسکتے ہیں۔ تو ارد کی ایک اور عمدہ اور صریح مثال
ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے :-

آئینہ ایک دم نہیں رکھتا ہے ہاتھ سے ایسا وہ اپنے رخ کا تماشا طلب ہے اب
غالب کا شعر ہے :-

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ ہر دم نقاب میں
نظیر کی غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

بحر ہستی میں صحبت احباب یوں ہے جیسے ہر روئے آب جباب
ایک اہم فلسفیانہ کارنامہ ہے۔ جب یہ غزل غالب کی اس مشہور غزل کے ساتھ مطالعہ کی جائے جس کا مطلع
یہ ہے:-

دل نادان تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
تو، دونوں استادوں میں صوری اور معنوی اشتراک کے بہت سے پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ ان دونوں
غزلوں کی بحر ایک ہے۔ اس کے علاوہ زبان و بندش، لب و لہجہ اور مغز و موضوع بھی بہت کچھ یکساں ہے۔
تظہیر، اکثر اپنی غزلوں کے بعض اشعار میں فعل حذف کر دیتا ہے یہ شعر کا ایک حصہ ہے اور اس سے
بیان میں ایک خاص لطف و لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ نظیر نے کہا ہے:-

ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی آن کو غارت گری سے ارتباط
یہ انداز بیان غالب کے کلام کا ایک خاص حصہ سمجھا جاتا ہے مگر یہ اس نے غالباً نظیر سے سیکھا ہے۔ نظیر
کے کلام میں بہت سے وہ جملے بھی موجود ہیں جو غالب کی جدت سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً نظیر نے کہا:-
اے صف مژگاں تکلف بر طرف دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف
تکلف بر طرف کا استعمال نظیر کے بعد غالب نے اس طرح کیا ہے:-

رہے اُس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
ایک اور دلچسپ نوآرہ ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:-
ان شک دل ہوں کا گلہ کیا کروں نظیر میں آپ اپنے شیشہ دل کی شکست ہوں
غالب نے کہا ہے:-

نہ گل نمے ہوں نہ پروہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
ان اشعار کے دوسرے مصرعوں کی صوری و معنوی ہم آہنگی بڑے لطف کی بات ہے۔ نظیر کی بہت سی

زمینوں میں غالب نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دو عدد مثالیں حب ذیل ہیں۔ نظیر نے کہا ہے:-
 نہ ادا میں مزا نہ لذتِ ناز آہ کا ہے کو خط ہوا آغاز
 غالب نے کہا ہے:-

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
 نظیر نے کہا ہے:-

وہ بے نشان دہن رُخِ خورشید تاب میں ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں
 غالب نے کہا ہے:-

ملتی ہے خوں یار سے نارِ التباب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذتِ عذاب میں
 ایک اور معنوی توارد ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:-
 عشق بھلا ہے تجھے زلفِ بتاں کی قسم ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی
 غالب نے کہا ہے:-

کب سے ہوں کیا تاؤں جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گاہِ حساب میں
 نظیر نے کہا ہے:-

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہشِ خوں ہے کچھ دیر نہیں لگنے کی یاں صیدِ زبوں ہے
 غالب نے فرمایا ہے:-

خیالِ مرگ کب تشکیں دل آزدہ کو بخٹے مرے دامنِ تنہا میں ہے ایک صیدِ زبوں بھی
 مسلسل غزلوں میں بھی توارد کی بعض مثالیں میسر آجاتی ہیں۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:-
 ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ سب ارض و سما کی ہے گلستانِ تماشا
 غالب نے کہا ہے:-

ہوتا ہے شب دروز تماشا مرے آگے

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے

اب نظم کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:-

رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
نقش طلسم تھا وہ کوئی یا جاب تھا
کیا کہئے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا
جس میں مے طرب سے تو مست خراب تھا
اے غفلت انتما دہی عہد شباب تھا
دیوان عمر کا بھی دہی انتخاب تھا
مجموعہ حیات کا لب لباب تھا

آگ دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر
یعنی وہ کیا زمانہ عشرت تھا اے نظم
اب زار و ناتوان و نحیف و ضعیف ہوں
اک جنبش مرزہ میں وہ برہم ہوا طلسم
جب ہم نے دل سے بھر کے دم سر دیوں کیا
ہیہات کیا بتائیں ہم اُس عصر خوش کا نام
تھی بارغ زندگی کی اسی سے ہی آب رنگ
اپنی تو فہم میں دہی ہنگام دل سرور

اب غالب کا مشہور قطعہ ملاحظہ ہو:-

زہمارا اگر تمہیں ہویں نائے و نوش ہے
میری سنجو گوش نصیحت نبوش ہے
مطرب بہ نغمہ بہرنِ تمکین دہوش ہے
دامان باغبان و کفن گل فروش ہے
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
نے وہ سرور دشوار نہ جوش و خروش ہے
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
غالب سر پر خامہ نوائے سروش ہے

اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل
دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان آگئی
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
لطف خرام ساقی و ذوق صد آچنگ
یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں
دارغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
آئے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

نظیر اور غالب دونوں کے قطعے پیش نظر ہیں۔ غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے قطعے کا لب و لہجہ، نظیر کے قطعے کے لب و لہجے سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ بار بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ متاخر کا کلام، مقدم کا چہرہ ہے۔ لب و لہجے کے علاوہ، دونوں کا رنگ، خیال کا انداز، زبان کا بردار، بندشیں، ترکیبیں، سب ایک ہی طرح کی ہیں۔ موضوع بھی کم و بیش ایک ہی ہے۔ نظیر کے قطعے میں جوانی کا ماتم ہے اور غالب نے عیش رفت پر نوحہ کیا ہے جو جوانی کے ماتم کا مترادف ہے۔ یہ لگا لگت و ہم رنگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بہ ظاہر یہ ہم طرحی، نہ صرف وطن کے اشتراک سے پیدا ہے بلکہ ہم ذوقی سے بھی ہے اور ہم ذوقی کی بنیاد تلمذ پر قائم ہو سکتی ہے۔ حکیم قطب الدین باطن نے، اپنی تصنیف گلستان بیخراں میں غالب کو نظیر کا شاگرد بتایا ہے۔ اور شہباز سے مراسلت میں، حاکی نے بھی دینی زبان سے، غالب کا نظیر کے کتب میں پڑھنا تسلیم کیا ہے۔ بہر حال کلام کے رنگ کے اشتراک سے یہ بہت قرین قیاس ہے کہ غالب کے ذوق سخن نے نظیر کے ذوق سخن کی آغوش میں تربیت پائی، اس کا اتباع کیا اور وہ شاعری میں اس کا معنوی شاگرد ضرور ہے۔ نظیر کی طرح غالب بھی اکبر آباد کا سپوت، اردو کے گھر کا چشم و چراغ اور اس زبان کی شاعری کا مسلم الثبوت استاد اور امام ہے۔ نظیر کا شاگرد، قرار پا کر نہ اس کی حرمت میں کوئی کمی ہو سکتی ہے، نہ نظیر کی عظمت میں کوئی زیادتی۔ بہر حال یہ مسئلہ خالص اکبر آبادی مسئلہ ہے اور اس پر محض ایک واقعے کی حیثیت سے نگاہ ڈالنی چاہئے۔

ان چند نظموں اور غزلوں کے منتخب اشعار پر تبصرہ کرنے اور کلام کے چند پیش پا افتادہ محاسن نمایاں کرنے کے بعد نظیر پر تبصرے کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ نظیر کا کلام ایک بحرِ زخار ہے جس میں شنادری کے لئے کم سے کم ایک پوری حیات کی ایک طویل مدت درکار ہے۔ یہاں تبصرے کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک سرسری اور سطحی کوشش ہے جس کو زیادہ وسیع کرنے اور غائر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہاں نظیر کی زبان اور محاورے اور ان کے عالمگیر اثر، عروض اور بہت سے دوسرے اہم مسائل پر مفصل توجہ

نہیں کی گئی۔ اس مختصر مضمین میں، فی الحقیقت، اتنی گنجائش نہ تھی کہ اس میں دقیق مسائل پر بحث کی جاسکے یہی وجہ ہے کہ یہاں نظیر کی شاعرانہ فطنت کا بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس موضوع پر ”نظیر نامے“ کے نام سے ایک دوسری کتاب مرتب ہو چکی ہے جو انشاء اللہ جلد پیش کی جائے گی۔

روح نظیر کی پہلی اشاعت میں، بعض نظموں کے بعض حصے حذف کر دئے گئے تھے لیکن وہ حصے اس اشاعت میں شامل کر دئے گئے ہیں۔ بعض حضرات، ان حصوں کو فحش اور غیر مہذب بتائیں گے اور یہ اعتراض غلط نہ ہوگا لیکن شاعر کا کلام صرف اخلاق و عوائد ہی کی بنا پر نہیں جانچا جاتا اور نظیر کا کلام بالخصوص، اس معیار سے نہیں پرکھنا چاہئے۔ ایک واقعہ نگار شاعر کے کلام میں، اخلاق و عوائد کی بنا پر، جن کا معیار خود ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، دخل اندازی کرنا نا انصافی ہے۔ ان مقامات کو جب خود نظیر نے لکھنا جائز سمجھا تو کسی دوسرے کو انھیں حذف کر دینے کا اختیار نہیں۔

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ هَدَانِيْ اِلَى عِيُوْبِيْ



(۱) الٰہی نامہ

دنیا میں نہ خاص اور نہ کوئی عام رہے گا نے صاحبِ تقدور نہ ناکام رہے گا
 زردار نہ بے زر نہ بد انجام رہے گا شادی نہ غم گردشِ ایام رہے گا
 نے عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 یہ چرخ جو کھاتا ہے بڑا گنبدِ اُزرق یہ چاند یہ سورج یہ ستارے ہیں معلق
 لوح و قلم و عرش بریں ثابت و مطلق سب ٹھاٹھ یہ اک آن میں ہو جاؤ گا ہو حق
 آغاز کسی شے کا نہ انجام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 لے عالمِ اوداح سے تا عالمِ بجات انسان و پری حور و ملک جن و جنیبات

کیا ابرو ہوا کوہ جنگل ارض و سموات اک پھونک میں اُڑ جاویں گے چلی نقش طلسمات
 ہمشیار نہ پختہ نہ کوئی خام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 گر علم و ہنر سے ہے کوئی خلق میں مشہور یاکشف و کرامات میں ہے صاحب مقدر
 یا ایک کا ہے نام و نشان خلق میں مشہور اک دم میں ہلک مارے ہو جاویں گے سب دور
 مستور نہ مشہور نہ گمنام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 مختاری کے غرتے سے جو کرتے ہیں سدا کام یاجبر سے مجبوری کے رکھتے ہیں کئی کام
 جب آئے فنا ڈالے گی اک گردش ایام اک آن میں اُڑ جائے گا سب چیز کا الزام
 مختار نہ مجبور نہ خود کام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 اب دل میں بڑے اپنے جو کلمات ہیں عیار سو کرو دغا کرتے ہیں اک آن میں تیار
 جب آئے فنا سر کے اوپر پارے گی اک وار اک وار کے لگتے ہی یہ ہو جاویں گے سب آ
 نے مگر نہ حیلہ نہ کوئی دام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 کرتے ہیں جواب دل سے ریاضات و عبادات یا علم کو کھوتے ہیں برندی و خرابات
 جب آئے فنا چھاڑے گی شمشیر کا اک بات پھر صاف ہیں دونوں کی گنگاری و طاعا
 نے زندہ عابد نہ آسمان رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جھگڑانہ کرے ملت مذہب کا کوئی یاں جس راہ میں جو ان پڑے خوش رہے ہر آں
زنا رگلے یا کہ بغل بیچ ہو تر آں عاشق تو قلند رہیں نہ ہندو نہ مسلمان

کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جوشاہ کہاتے ہیں کوئی ان سے یہ پوچھو دارا و سکندر وہ گئے آہ کدھر کو
- مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیر و اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیر و

نے ملک نہ دولت نہ سرا انجام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

بیوپار جو کرتے ہیں ہر اک چپہ کا زوار آگے بھی دکانیں تھیں کئی اور کئی بازار
جس طور کا اب چاہئے کر لیجئے بیوپار پھر جنس نہ دالال نہ مالک نہ خریدار

- نے نقد نہ کچھ فرض نہ کچھ دام ہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

- اب جتنی کھڑی دیکھو ہو عالم میں عمارات یا بھونپڑے دد کوڑی کے بالاکھ کے محلات
کیا پست مکان کیا یہ ہوا دار مکانات اک اینٹ بھی ڈھونڈے کیسے آئے کی نہیں ہا

والان نہ حیرہ نہ درو بام رہے گا

- آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ باغ و چین اب جو ہر اک جا ہیں ہے بھول یہ شاخ یہ غنیمت یہ ہرے پات یہ پھل بھول
آجاوے گی جب باخزاں ان کے ادھر بھول ہر خار کی ہر پھول کی آؤ جاوے گی سب بھول

نے زرد نہ سرخ اور نہ سید فام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 میخا بھی کہتے ہوئے یاں مے کے ملائی ساقی بھی کئی ہو گئے محبوب و شائق
 لاجام کوئی بھر کے جو ہو اور بھی باقی فرصت ہے غنیمت کوئی دم کو اسے ساقی

نے مے نہ صراحی نہ ترا جام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 یہ عاشق و معشوق جو کرتے ہیں بہم چاہ آگے بھی بہت عاشق و معشوق تھے واللہ
 وہ شخص کہاں جاتے رہے اے مرے اللہ اس بات سے معلوم ہوا اب تو یہی آہ
 نے عشق نہ عاشق نہ دلا آرام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جو جن کے ہیں گلبدن اور چاند سے رخسار آگے بھی اسی طرح بہت گل تھے نمودار
 کیا جانے کدھر جاتے رہے ہائے وہ گزرا یہ جن یہ صورت بھی غنیمت ہے مرے یار
 گل رنگ نہ گل رو نہ گل اندام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ملک غور کر داب کہاں جنوں کہاں فرباد لیلی کہاں شیریں کہاں ہاں وہ بیدار
 جو پھول کھلے آہ وہ جب ہو گئے برباد ہم تم بھی غنیمت ہیں سنو یارو پری زاد

واں حسن نہ یاں عشق کا ہنگام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

محبوب بنا جس نے تمہیں حسن دیا ہے اُس نے ہی ہمیں عاشق جانباڑ کیا ہے
 ملنا ہے تو مل لو یہی جینے کا مزا ہے سب ناز دنیا ز آہ یہ اک دم کی ہوا ہے

پھر جس نے کچھ وصل کا پیغام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 ملنے سے ہمارے جو تھیں آتا ہے الزام آنے دو یہ تم ہم سے ملے جاؤ سحر شام
 پھر حن کہاں اپنے رکھو کام سے تم کام جھک مارتے ہیں وہ جو تھیں کرتے ہیں بدنام
 طوفان نہ بہستان نہ الزام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
 یہ شعر و غزل اب جو بناتے ہیں زبانی اس کے بھی بہت پھوڑ گئے اپنی نشانی
 دیوان بنایا کوئی قصہ کہ کہانی کچھ باقی نظیر اب نہیں سب چیز ہے فانی
 خمسہ نہ غزل نہ رد نہ ایہام رہے گا
 آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

(۲) برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں سبزوں کی لہلہاٹ باغات کی بہاریں
 بوندوں کی جھجھاوٹ قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں بھڑیلوں کی مستیوں سے دھوئیں مچا رہے ہیں
 پڑتے ہیں پانی ہر جا جمل محل بنا رہے ہیں گلزار بھیکتے ہیں سبز سے نما رہے ہیں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

مارے ہیں موج ڈاؤر یا ڈونڈر ہے ہیں موڑ پیسے کوئل کیا کیا رنڈ ہے ہیں
 جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں نالے انڈر ہے ہیں برسے ہے مینہ جھڑا جھڑا بادل گھنڈ ہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں
 جنگل سب اپنے تن پر ہرالی سج رہے ہیں گل کھول جھاڑ بوتے کراہی دھج رہے ہیں
 بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں اندھ کے قارے نوبت کے بج رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں
 بادل لگا ٹکڑیں نوبت کی گت لگا دیں جھینگر جھنگرا اپنی سر زائیاں بجا دیں
 کر شور مور بگے جھڑیوں کا مینہ بلا دیں پی پی کریں پیسے مینڈک مار گادیں
 کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں

ہر جا بچا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے قدرت کے بچہ رہے ہیں ہر جا بکے بچھونے
 جنگلوں میں ہو رہے پیدا ہرے بچھونے بچھو ادئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں
 سبزوں کی لہلہا ہٹ کچھ ابر کی سیاہی اور چارہ ہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
 سب بھیگے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الہی

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں
 کیا کیا رکھے ہے یارب سامان تیری قدرت بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
 سب مست ہو رہا ہیں بچان تیری قدرت تیرے بچا رہتے ہیں بھان تیری قدرت

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں
 کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا اور مور کی نڈل میں تیرا ہی نام ہے گا

یہ رنگ سوزے کا جو صبح و شام ہے گا یہ اور کانہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 بولیں بے ہٹیریں قمری پکارے کو کو پی پی کرے پیہا بگے پکاریں تو تو
 کیا ہمدردوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہو ہو سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیر د
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جو مست ہوں اُدھ کے اکڑ شورنا چتے ہیں پیارے کا نام لیکر کیا زورنا چتے ہیں
 بادل ہوا سے گھر گھر گھٹ گھورنا چتے ہیں میزدک اچھل رہے ہیں اور مورنا چتے ہیں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 پھولوں کی سیج اوپر سوتے ہیں کتنے بن بن سوہیں گلابی جوڑے پھولوں کے ہار بن
 کتنوں کے گھر ہے کھانا سونا لگے ہے انگن کوئے میں پڑ رہی ہے سرمئے لپیٹ سوگن
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاتے ہیں رات ساری جو غم میں ہیں انھوں پر گورے ہے رات بھاری
 سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیار کی پیاری چھاتی پھٹے ہے اُن کی جو ہیں برد کی ماری
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جو وصل میں ہیں اُن کے جوڑے ہمک رہے ہیں جھولوں میں جھونتی ہیں گئے بھمک رہے ہیں
 جو دکھ میں ہیں سوان کے سینے پھر ملک رہے ہیں آہیں مغل رہی ہیں آنسو ٹپک رہے ہیں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 اب برہنوں کے اوپر ہے سخت بیکراری ہر لوندا مارتی ہے سینہ اوپر کٹاری
 بدلی کی دیکھ صورت کتنی ہیں باری باری ہے نہ نہ لی پیانے اب کے بھی سد بہاری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 جب کوئل اپنی ان کو آواز ہے سُناتی
 سُنتے ہی غم کے مارے چھاتی ہے اُٹھتی آتی
 پی پی کی دُصن کو سُن کر بیکل ہیں کہتی جاتی
 مت بول اے پیسے پھلتی ہے میری چھاتی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 ہے جن کی سچ سوئی اور خالی چار پائی
 رو رو انھوں نے ہر دم یہ بات ہے سنائی
 پر دیسی نے ہماری اب کے بھی سُدھ بھلائی
 اکے بھی چھاوئی جا پر دیس ہی میں چھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 کتنوں نے اپنے غم سے ابتر یہ گت بنائی
 میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
 نے گھر میں جھوٹا ڈالنے اور صحنی رنگائی
 پھوٹا پڑا ہے چوٹھا ٹوٹی پڑی کڑھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 گاتی ہے گیت کوئی بھولے پہ کر کے پھیرا
 مارو جی آج کیجیے یاں پین کا سیرا
 ہے خوش کوئی کسی کو ہے درد و غم نے گھیرا
 منہ زرد بال بھرے اور آنکھوں میں انہیرا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 اور جن کو اب میسر حسنوں کی ڈھیریاں ہیں
 سُرخ اور سنہرے کپڑے عشرت کی گھیریاں ہیں
 محبوب دلبروں کی لطفیں بھیریاں ہیں
 جلتوں چمک رہے ہیں راتیں اندھیریاں ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
 کتنے تو بھنگ پی پی کپڑے بھگور رہے ہیں
 باہیں گلوں میں ڈالیں جھولوں میں سو رہے ہیں
 کتنے برہ کے مارے سدھ اپنی کھور رہے ہیں
 جھولے کی دیکھ صورت ہر آن رو رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بیٹھے ہیں کتنے خوش ہوا اپنے چہوا کے منگے پیٹے ہیں مے کے پیالے اور دیکھتے ہیں جنگے
کتنے پھرے ہیں باہر غواں کو اپنے منگے سب شاد ہو رہے ہیں عمدہ غریب کنگے

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارہ یار سائبان ستھرایا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا مفلس بھی کر رہا ہے پو لے تلے گزارا

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

پھت گردنے کا کسی جانغل شور ہو رہا ہے دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے مفلس تو جھنجھڑے میں دلشاد سو رہا ہے

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکان پُرانا اٹھ کے ہے ان کو مینہ میں ہر آن پھت چرانا
کوئی پکارتا ہے ٹھک موری کھول آنا کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لویہ مکان ٹپکا گرتی ہے پھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا باقی تھا اک اُسارا سو وہ بھی آن ٹپکا

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

اونچا مکان جس کا ہے بیج گھنا سوا یا اوپر کا کھن ٹپک کر جب پانی نیچے آیا
اس نے تو اپنے گھر میں سے شور غل مچایا مفلس پکارتے ہیں جانے ہمارا

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بھٹی ٹیلوں اوپر بھتورے پوسے پھروں سے رُوئے کوئی بسورے

بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے
 آنگن میں کنسلالی کوٹوں میں کنکھوڑے
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 پھنسی کسی کے تن میں سر تر کسی کے پھوٹے
 چھاتی پہ گرمی دانے اور پیٹھ میں ددوڑے
 کھا پوریاں کسی کو ہیں لگ رہے مردٹے
 آتے دست جیسے دوڑیں عرقی گھوٹے
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 پتلی جہاں کسی نے دال اور کڑھی پکائی
 نکھی نے دوہیں بولی آونٹ کی بٹائی
 کوئی پکارتا ہے کیوں خیر تو ہے بھائی
 ایسے جو کھاتے ہو کیا کالی مرق کھائی
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جس گلبدرن کے تن میں پوشاک سو سنی ہے
 سودہ پری تو خاصی کالی گھٹا بنی ہے
 اور جس پہ سرخ جوڑا یا اودھی اوڑھنی ہے
 اس پر تو سب گھلاوٹ برسات کی چھنی ہے
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 بدنوں میں کھب رہے ہیں خوب لال جوڑے
 جھمکیں دکھا رہے ہیں پریوں کے لال جوڑے
 لہریں بنا رہے ہیں لالوں کے لال جوڑے
 آنکھوں میں چھ رہے ہیں پیاروں کے لال جوڑے
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی
 گلنار یا گلنابی یا زرد سرخ دھانی
 کچھ جن کی چسٹھائی اور گھونٹی جوانی
 جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کوئی تو جھولتی ہے جھولے کی ڈور جھوڑے
 یا ساتھوں میں اپنی پاؤں سے پاؤں جوڑے
 بادل کھڑے ہیں سر پر سے ہیں تھوڑے تھوڑے
 بوندوں سے بھیگتے ہیں لال اور گلنابی جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں
کتھنوں کو ہو رہی ہے اس عیش کی نشانی
سوتے ہیں ساتھ جس کے کہتی ہے وہ سیانی
اس وقت تم نہ جاؤ اے میرے یارِ جانی
دیکھو تو کس قزے سے برسے ہے آج پانی

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں
کتے شراب پی کر ہوسٹ چھک رہے ہیں
سے کی گلابی آگے پیالے چھک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر گھنگر و جھنگ رہے ہیں
پڑتا ہے مینہ بھڑا بھڑا طبلے گھنگ رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں
ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لونی
وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھر ہیں لونی
اور جن کی غفلی نے سرم و حیا ہے کھوئی
ہے اُن کے سر پہ سہری یا بورے کی کھوئی

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں
کتے پھرے ہیں اوڑھے پانی میں سرخ پٹو
جو دیکھ سرخ بدلی ہوتی ہے ان پر پٹو
کتھنوں کی گاڑی رتھ ہیں کتھنوں کے گھوڑے پٹو
جس پاس کچھ نہیں ہے وہ ہم سا ہے کھٹو

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں
جو اس ہوا میں یارِ دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اور چڑھے ہیں
ہم سے غریب غریب کچھ دین گر بڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پلینچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں
ہے جن کئے مہیا پکا پکا یا کھانا
اُن کو بلنگ پہ بیٹھے بھڑیوں کا حظ اُڑانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں نوں تیل لانا
ہے سر پہ اُن کے پنکھا یا پھاج ہے بُرانا

کیا کیا مچی ہیں یارِ دبرسات کی بہاریں

کہتے خوشی سے بیٹھے کھاتے ہیغش محل میں کہتے چلے ہیں لینے بنے سے قرض بل میں
 کا ندھے پہ وال آنا ہلدی گرہ لے مل میں ہاتھوں میں گھر کی پیالی اور لکڑیاں بفل میں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جو کسبیاں جوانیں حسوں میں پرتیاں ہیں سینوں میں لال انگیا اور لال کرتیاں ہیں
 نظریں بھی بدلیاں ہیں دل میں بھی سرتیاں ہیں اک اک نلکے میں کافر بجلی کی پھرتیاں ہیں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جو نو جوان ہیں ان کی تیاریاں بڑی ہیں ہاتھوں میں لال چھڑیاں کوٹھوں اور کھڑی ہیں
 اور وہ جو آشنائے جھگڑی ہیں یا لڑی ہیں منہ کو چھپا پلنگ پر پھلی ہوئی پڑی ہیں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کوئی اپنے آشنائے کرنا نہ کھینچتا کہتی ہے ہنس کے کافر چٹکی لے یا نہٹتا
 تم سے تودل ہمارا اب ہو گیا ہے کھٹا تم آج بھی نہ لائے رنگو امرا ڈوپٹا
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کہتی ہے کوئی مجھ کو جوڑا سو ہا سنا دو یا ناٹ بانی جو تیا کفش سرخ لا دو
 کوئی کہے ہے میری کرتی ابھی رنگا دو یا گرم سے اندر سے ایک سیر بھر منگا دو
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 جو ان کے بتلا ہیں سب چیز لا رہے ہیں کرتی بنا رہے ہیں انگیا رنگا رہے ہیں
 جو جو ہیں ان کی باتیں سب کچھ اٹھا رہے ہیں باہیں گلے میں ڈائے عشرت منائے ہیں
 کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 زردار کی توان میں ہے بچہ رہی پلٹ گدی دلبر پر سی بیٹھی اچھکائے چوڑی بن گدی

مفلں کوٹوٹی پٹی یاٹ کی جھلن گڑی رنڈی ملی تو کالی، یا گنجی، لولی، لنگڑی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو سیگی ہیں گھر میں آرام کر رہی ہیں پردوں میں دوستوں سے پیغام کر رہی ہیں

چتون لگاؤٹوں سے سودام کر رہی ہیں چپکے ہی چپکے اپنا سب کام کر رہی ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی اپنے محبوب سے اس مینہ میں نہ جاؤ پیارے ہمارے برسے

کوئی کہے ہے اپنے دلدار خوش نظر سے ہاتھوں سے میرے جانی کھاویہ دو اندر سے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی پیاری جو کچھ کوسو لادیں زردوزی ٹاٹ بافی جوتہ کہو پھادیں

پیڑا جلیبی لڈو جو کھاؤ سو مٹکا دیں چیرا ڈوپٹہ جامہ جیسا کہو رنگا دیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جن دلبروں کے تن پر ہیں گرمی دانے آئے کہتے ہیں ان کو عاشق یوں پیارے بلائے

کیا مینہ برس رہا ہے پیارے ذرا نہالے چھاتی تھیں تو پیارے ٹک پیٹھ ہی ملائے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس رت میں ہیں جہاں تک گلزار بھیکتے ہیں شہر و دیار کو کوچہ بازار بھیکتے ہیں

صحرا و بھاڑ بولے کسار بھیکتے ہیں عاشق نہا رہے ہیں دلدار بھیکتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتے تو دلبروں کی دہلی پہ بھیکتے ہیں کہتے پریرخوں کی پولی پہ بھیکتے ہیں

اور کہتے..... کی ڈیورٹھی پہ بھیکتے ہیں کہتے طوائفوں کی موری پہ بھیکتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کہتی ہے جب وہ سن کر یہ بات بھیگ احمق ماروں گی تیرے آکر اک لات بھیگ احمق
 مجھ کو بھی ضد چڑھی ہے دن رات بھیگ احمق یونہی تو اب کے ساری برسات بھیگ احمق

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 زردار کی تو سُن کر آواز وہ پرورد کہتی ہے لونڈیوں سے جلدی کو اڑھو لو
 مفلس کوئی پکارے تو اس سے کہتی ہے ہرگز کوئی نہ بولو احمق کو بھیسگے دو

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 یس کے گروہ مفلس کچھ شور و غل مچاوے بیٹھک میں اینٹ پھینکے یا کنڈی کھڑکھڑاوے
 کھڑکی میں ڈال سر کو جب ناگہ ساوے کیا غل مچا رہا ہے سُن پٹھے مالزادے

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کوئی یار سے کہے ہے اے دلستان آؤ بدلی بڑی اٹھی ہے، کہنے کو مان آؤ
 کیا مینہ برس رہا ہے ہر اک مکان آؤ راتیں اندھیریاں ہیں اے میری جان آؤ

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کوئی رات کو پکارے پیارے میں بھیگتی ہوں کیا تیری الفتوں کے مارے میں بھیگتی ہوں
 آئی ہوں تیری خاطر آکرے میں بھیگتی ہوں کچھ تو ترس تو میرا کھارے میں بھیگتی ہوں

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
 کوئی پکارتی ہے دل سخت تھمبھگتی ہوں کانپے ہے میری چھاتی یک نخت بھیگتی ہوں
 کپڑے بھی تر بہر ہیں اور سخت بھیگتی ہوں جسدی بلا لے مجھ کو کم نخت بھیگتی ہوں

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں

شیشہ کہیں گلابی بوتل جھمک رہی ہے راہیں موتیا کی خوشبو مہک رہی ہے
چھاتی سے چھاتی لگ کر عشرت چھلک رہی ہے پائے ٹھٹک رہے ہیں چٹی چٹک رہی ہے

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
کوئی پکار رہی ہے کیا کیا مجھے بھگویا کوئی پکار رہی ہے کیا کیا مجھے بھگویا
ناحق قرار کر کے جھوٹا مجھے بھگویا یوں دور سے بلا کر اچھا مجھے بھگویا

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
جن دلمروں کی خاطر بھیگے ہیں جن کے جور وہ دیکھ ان کی الفت ہوتے ہیں تھوڑے تھوڑے
لے ان کے بھیگے کپڑے ہاتھوں میں نہ مڑوئے چیرا کوئی سکھا دے جامہ کوئی پٹوڑے

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
کچھڑے ہو رہی ہے جس جاڑیں پھسلنی مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی جوتی گرمی تو واں سے کیا تاب پھر نکلی

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
کتے تو کچھروں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں کپڑے تمام گندی دلدل میں پس رہے ہیں
کتے ٹٹھے ہیں ممر کتنے اُکس رہے ہیں وہ دکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
کہتا ہے کوئی گر کر یہ اے خدائے لیو کوئی ڈنگا کے ہر دم کہتا ہے وائے لیو
کوئی ہاتھ اٹھا پکارے مجھ کو بھی ہائے لیو کوئی شور کر پکارے گرنے نہ پائے لیو

کیا کیا مچی ہیں یار و برسات کی بہاریں
اکثر جو مرد عورت پھسلے ہیں ناگستانی تو ان کی یہ ہوئی ہے گرنے کی واں نشانی

یا اس کا ہاتھ اُن کے پا جامے کی میانی یا ان کا منہ ہوا ہے اور اس کی وہ میانی

کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں
گر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر پھسلا کوئی کسی کا کچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر
کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں

یہ رت وہ ہے کہ جس میں خورد و کبیر خوش ہیں ادنیٰ غریب مفلس شاہ و وزیر خوش ہیں
مشوق شاد و خرم عاشق اسیر خوش ہیں جتنے ہیں اب جہاں میں سب نظر خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یا رو برسات کی بہاریں

(۳) بنجارہ میا

ملک حرص دہوا کو چھوڑیاں مت دیں بدیں پھرے مارا قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا کیا گہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دہواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ بڑا رہ جاوے گا جب لا دچلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیب بھی تیری بھاری ہے لے نافل تجھ سے بھی چتر اک اور بڑا یو پاری ہے
کیا شکر مصری، قند گرمی، کیا سانہر، میٹھا کھاری ہے کیا داکھ، منقا، سوٹھ، مرج، کیا کیسر لونگ، پیاری ہے
سب ٹھاٹھ بڑا رہ جاوے گا جب لا دچلے گا بنجارا

تو بدھیا لا دے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالامار آگر اوے گا دھن، دولت، نہانی، پوتا کیا اک کنبا کام نہ آوے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زردام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نے بھانڈا ہے نے حلوا ہے نے مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھپ جو تلنے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جوانی آیا کیا بنجارا پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی بل ساعت میں یہ کھپ بدن کی ہے کھپنی
کیا تھال کٹورے چاندی کے، کیا پیتل کی ڈیا ڈھکنی
کیا برتن سونے روپے کے کیا مٹی کی ہنڈیا چپنی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لئے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہو اجب ان اور جل
گھر بار اٹاری چو پاری، کیا خاصہ نہ سکھ اور مل
کیا چلن پر دے، فرش سنے، کیا لال پلنگ اور رنگ محل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل زمر و سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جاں اوپر
نوبت نقارے، بان نشان، دولت خشت فوجیں لشکر
کیا مت زکیم ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھستر

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت لیکر آن پڑا پھر دوسنے ہیں ہو پاری کے
کیا ساز جڑاؤ زریور کیا گوٹے ٹھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عاری کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواردں پرست پھول بھروسے ڈھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکان بنو اتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا
کیا رینی خندق زنبڑے کیا بُرج کنگورا انمولا
تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
گر کھ کھ کوٹ رہ کھ توپ قلعہ کیا شیشہ دار واد گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مڑتا پھرتا ہے بن بن
کیا لونڈی باندی دانی دو کیا بند اچیل نیک چلن
ٹھک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا مندر مسجد مال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک کھد کی پھانکے گا
کوئی نال سیٹے گا تیرا کوئی گون سے اور ٹانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ بھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۴) عاشق نامہ

تمنا نہ اُسے اپنے دل تنگ میں پہچان
بیزنگ میں بازنگ میں نیزنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں فرنگ میں پہچان
ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہرنگ میں پہچان
ہر دم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

پھل بات کہیں تلخ کہیں پھول کہیں ہل
نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں راہیل
آزاد کوئی سب سے کسی کا ہے کہیں میل
کرتا ہے کوئی ظلم کو لیتا ہے کوئی جھیل
ادنیٰ کوئی اعلیٰ کوئی سوکھا کوئی ڈنڈ پھیل
باندھے کہیں تلوار اٹھاتا ہے کہیں سیل
جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

گاتا ہے کوئی شوق میں کرتا ہے کوئی حال
پھانکے ہے کوئی خاک اُڑاتا ہے کوئی مال
ہنسنا ہے کوئی شاد کسی کا ہے بُرا حال
روتا ہے کوئی ہو کے غم و درد میں یا مال
ناچے ہے کوئی شہنشاہ بجاتا ہے کوئی نال
پہنے ہے کوئی چھتھرے اڈٹھے ہے کوئی نال
کرتا ہے کوئی ناز دکھاتا ہے کوئی بال
جب غور سے دیکھا تو اُسی کی ہے یہ سب چال

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغسل مار
کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار
بٹھتا ہے کوئی عیش میں بھرتا ہے کوئی خوار
عاجز کوئی بیس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار
مفلس کوئی ناچار تو نکر کوئی زر دار
زخمی کوئی ماندہ کوئی اچھا کوئی بدکار
جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں سب سمار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان
 ہے کوئی دلی دوست کوئی جان کا دشمن
 بیٹھا ہے پہاڑوں میں کوئی پھر تاسہ بن بن
 مالا کوئی چیتا ہے کوئی شوق میں سمرن
 چھوٹے ہے کوئی مال سیٹھے ہے کوئی دھن
 نکلے ہے جواہر کی کوئی پہن کے ابرن
 لوٹے ہے کوئی خاک میں رو رو کے ملا تین
 جلی کوئی بھوگی کوئی سوگی کوئی سوگن
 جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب فن

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

سردی کہیں گرمی کہیں جاڑا کہیں برسات
 دوزخ کہیں بیکینٹھ کہیں ارض و سماوات
 حوریں کہیں غملاں کہیں یریاں کہیں جنات
 اوپر ٹکھیں بستی کہیں جنگل کہیں دیوات
 سختی کہیں راحت کہیں گردش کہیں سکنا ت
 شادی کہیں ماتم کہیں نور اور کہیں ظلمات
 مائے کہیں سورج کہیں رُوح اور کہیں دن رات
 جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں طلسمات

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

بیچے ہے جواہر کوئی نذر سیم طلا رنگ
 مارے کوئی پارے کو بنا دے کوئی مرگانگ
 دیتا ہے کوئی ہاتھ سے لیتا ہے کوئی مانگ
 محتاج کوئی قوت کا رکھتا ہے کوئی دانگ
 ٹھیرا ہے کوئی چور لگاتا ہے کوئی تھانگ
 ملتا ہے کوئی پوست کو چھانے ہے کوئی بھانگ
 گھنٹا ہے کہیں جھانجھ کہیں منگ کہیں بانگ
 جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب مانگ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ناری کوئی بادی کوئی خساکی کوئی آبی
صوفی کوئی زناہ کوئی بدست شرابی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتا بی
پیتا ہے کوئی کیف کوئی مے کی گلابی
مارے ہے زٹل کوئی کہیں جیب ہے دابی
تچا کوئی جھوٹا ہے کوئی رند خرابی
کالا کوئی گورا کوئی پیلا کوئی آبی
ہل س کی ہی قدرت کے یہ سب لعل گلابی

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

کیا احن کہیں پایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا عشق کہیں چھایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا نور یہ جھمکایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا دھوپ ہے کیا سایہ ہے اللہ ہی اللہ
کیا مہر ہے کیا مایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھیرایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا بھید نظیر آیا ہے اللہ ہی اللہ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

۵۔ آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
لکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے

ابدال و قطب و غوث ولی آدمی ہوئے

کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدا کی کا شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا

نمرود بھی خدا ہی کہتا تھا بربلا یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا

یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور

کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مجتب بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

پڑھتے ہیں آدمی ہی قراں اور نازیاں اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں

جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی

پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی

اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی بجاتا لیوں کو یار اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار اُتار

ننگا ٹھکڑا اُچھلتا ہے ہو کر ذلیل و خوار سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اس کو بار بار

اور وہ جو مسخرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کئے مال اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی لگے میں ڈال

یاں آدمی ہی صبد ہے اور آدمی ہی جال پچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ دوڑے ہیں آدمی ہی مشعائیں جلا کے واہ

اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں، دوڑیں بغل میں مار کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کسار

اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
بیٹھے ہیں آدمی ہی دوکانیں لگا لگا اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خواجہ
کہتا ہے کوئی کو کوئی کہتا ہے لارے لا کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بستا بنا

اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی ہی قمر سے لڑتے ہیں گور گور اور آدمی ہی دیکھ انہیں بھاگتے ہیں دور
چاکر غلام آدمی اور آدمی مزدور یاں تک کہ آدمی ہی اٹھاتے ہیں جا ضرور

اور جس نے وہ پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
طلبے جمیرے دائرے سازنگیاں بجا گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بہ جا
رنڈی بھی آدمی ہی بچاتے ہیں گت لگا وہ آدمی ہی ناچیں ہیں اور دیکھو یہ مزا

جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی ہی لسل جواہر ہیں بے بہا اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اٹا ہے جوں تو گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا

بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کی یہ کچھ زرق برق ہیں روپے کے اُن کے پاؤں میں سونے کے فرق ہیں
بھٹکے تمام غرب سے بے تاب یہ شرق ہیں کجواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں

اور جیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے کچھ ہیں نئے پلنگ پھولوں کی سیج ان پہ بھکتی ہے تازہ رنگ
سوئے ہیں پلے پچھاتی سے معشوق شوخ و تنگ سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ

اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیران ہوں یار و دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے آپ آدمی ہی چور ہے اور آپ تھا ہاگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تاگ ہے دیکھا تو آدمی ہی یہاں نل راگ ہے

فولاد سے کڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلاؤ ہلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار سب آدمی ہی کرتے ہیں مرنے کا کاروبار

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشرف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مُرید ہیں اور آدمی ہی پیر اچھا بھی آدمی ہی کہا تا ہے اسے نظیر

اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(۶) ہنسنا

دنیا کی جو الفت کا ہوا مجھ کو سہارا اور اس نے خوشی کو مری خاطر میں اتارا

دیکھی جو یہ غفلت تو مراد دل یہ دکھارا
 آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
 اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اس کا گرا را
 چنڈول اگن ابلے جھپٹاں بنے ڈھیر
 میں او بے کلے بگے بھی سمندر
 طوطے بھی کئی طور کے ٹوٹیاں کوئی لہر
 رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر
 اس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا
 بلبل نے کیا اس کی محبت میں خوش آہنگ
 اور کوکلے کوئل نے بھی الفت کو لیا رنگ
 کھنجن میں گلنگوں میں بھی چاہت کے بے چنگ
 دیکھا جو طیوروں نے اسے حسن میں بخش رنگ
 وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا
 سیر مرغ بھی سودل سے ہوئے ملنے کے شائق
 گڈھ پنکھ بھی پنکھوں کے ہوئے جھلنے کے لائق
 سارے بھی حواصل بھی ہوئے اس کے موافق
 بازو نگڑ و جزہ و شاہیں ہوئے عاشق
 شکروں نے بھی شکر سے کیا اس کا مدارا
 کچھ سبزک و بڑے، کچھ سنٹن و بڑے
 پنڈ خنی سے لگا ٹوڑ و قمری ٹہریو سے
 غوغائی، گیسری و لوارے و پیسے
 کچھ لال چڑے پودنے پٹے ہی نہ بخش تھے
 پدڑی بھی سمجھتی تھی اسے آنکھ کا تارا
 چاہت کے گرفتار، بٹیریں لو سے تیر
 کبکوں کے تدرؤں کے بھی چاہت میں بندھے پر
 ہڈ بھی ہوئے ہٹ کے بڑھایا دیدھر او دھر
 زارغ و زغن و طوطی و طاؤس کبوتر
 سب کرنے لگے اس کی محبت کا اشارا
 شکل اس کی وہیں جی میں کبھی شام چڑی کے
 دی جاہ و تاج کئی جہانوں نے بھی جھپ سے
 ہر لی بھی ہوئے اُس کی ہری چاہنے والے
 جتنے غرض اس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے

اس ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو دارا
 خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دم اُسے دیکھیں اور اس کی محبت سے ذرا منہ کو نہ پھیریں
 دن رات اسے خوش رکھیں نہ سکھائے دیویں صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں
 ایک چند رہا خوب محبت کا گزارا
 سب ہو کے خوش اس کی مے الفت لگے پینے اور پیت سے ہر ایک نے داں بھر لئے سینے
 ہر آن جتانے لگے جاہت کے قرینے اس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے
 اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا
 یاں لطف و کرم تم نے کئے ہم پہ ہیں جو جو تم سب کی یہ خوبی ہے کہاں ہم سے بیان ہو
 تقصیر کوئی ہم سے ہوئی نہ دوسے تو بخشواں لویا رواب ہم جاویں گے کل اپنے وطن کو
 اب تم کو مبارک رہے یہ پیر تمہارا
 اب تک تو بہت ہم بے فرحت سے ہم آغوش اب یاد وطن دل کی ہمارے ہوئی ہمدوش
 جب حرف جدائی کا پرندوں نے کیا گوش اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک اٹھے ہوش
 سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا
 بن دیکھے تمہارے ہیں کب چین پڑیں گے اک آن نہ دیکھیں گے تو دل غم سے بھریں گے
 گر تم نے یہ ٹھیرائی تو کیا سکھ سے رہیں گے ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
 یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا
 بھر ہنس نے یہ بات کہی ان سے کہی بار کچھ بس نہیں اب چلنے کی ساعت ہے ناچار
 آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گھر بار اس میں جو شب کو ج کی ہوئی صبح نمودار
 پُرا پنا ہوا پر وہیں اس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اس پیر سے واں کو چلا ناگاہ منہ پھیر کے ایدھر سے وطن کی جو ہیں لی راہ
 دیکھا جو اسے جاتے ہوئے واں سے تو کراہ سب ساتھ چلے اس کے وہ ہمراز ہو خواہ
 ہر ایک نے اڑنے کے لئے پسند کیا را

اور ہنس کی واں سب کو رفاقت ہوئی غالب جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
 کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب دو کوس اڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
 پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یار را

پران کے ہوئے ترجو ہیں دوری کی بڑی اوس روئے کہ رفاقت کی کریں کیونکہ قدم بوس
 تھک تھک کے لگے گرنے تو کرنے لگے افسوس کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ اڑا کوس
 کوئی آٹھ کوئی نو کوئی دس کوس میں ہا را

کچھ بن نہ سکے اُن سے رفیق کے جو واں کاہ اور اتنے اڑے ساتھ کہ کچھ ہو دسے نہ اظہار
 جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کے تئیں ہاہ کوئی یاں رہا کوئی واں رہا کوئی ہو گیا ناچار
 کوئی اور اڑا آگے جو تھا سب میں کرا را

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مے سمجھے تھے بہت دل میں یہ الفت کو بڑی شے
 جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے چلیں رہیں کوئے گرے اور باز بھی تھک کے
 اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنا را

دنیا کی جو الفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ جب شکل یہ ہو دے تو بھلا کیونکہ ہو زباہ
 ناچار می ہو جس جا میں تو واں کیجئے کیا چاہ سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر راہ
 آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھا را

(۷) رُضِ تاجِ گنج

یارِ دیہ تاجِ گنج جو یاں آسٹھ کار ہے مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
 خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
 نقشہ میں اپنے یہ بھی عجب خوش نگار ہے
 روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں میاں پر اس مکان کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
 سنگِ سفید سے جو بنا ہے قمرِ نشاں ایسا چمک رہا ہے مجلسی سے یہ مکان
 جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے
 گنبد ہے اس کا زور بلند ہی سے بہرہ مند گرد اس کے گزیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
 اور وہ کلس جو ہے سر گنبد سے سر بلند ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
 ہر باد جس کے خم پہ نہ نوشا رہے
 گنبد کے نیچے اور مکاں ہیں جو اس پاس وہ بھی برنگِ سیم چمکتے ہیں خوش اساس
 برسوں تک اس میں رہتے تو قلعے نہ جی اُداس آتی ہے ہر طرف سے گلِ یاسمن کی باس
 ہوتا ہے شاد اس میں جو کرتا گزار ہے
 ہیں بیچ میں مکان کے وہ دو قندیں جو یاں گرد اُن کے جالی اور مچر ہے دلفشاں
 سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں پتے کلی سہاگِ رگ در رنگ ہے عیاں
 جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے
 دیواروں پر ہیں سنگ میں نازک عجب نگار آئینے بھی لگے ہیں مجلسی و تابدار

دروازے پر لکھا خطِ طغرا ہے طرفہ کار ہر گوشے پر کھڑے ہیں جوینا اس کے چار

چاروں سے طرفہ اوج کی خوبی دو چار ہے

پہلو میں ایک برج بسی کہتے ہیں اُسے آگے نظر ہیں اُس سے مکاں دور دور کے

منجد ہے ایسی جس کی صفت کس سے ہو سکے پھر اور بھی مکان ہیں ادھر اور ادھر کھڑے

دروازہ کلاں بھی بلند استوار ہے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دلکش آتی ہے جس میں گلشنِ فردوس کی ہوا

ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھومتا

کیا کیا روشِ رش پہ ہجوم بہار ہے

سروسی کھڑے ہیں قرینے سے نسترن کو کو کریں ہیں قمریاں ہو کر شکر شکن

راہیل سیوتی سے بھرے ہیں چمن چمن گلزار لالہ و گل و نسرين و نسترن

نوارے چھٹا ہے ہیں رواں جو بہار ہے

وہ تاجدارِ شاہجہاں صاحبِ سریر بنوایا ہے انھوں نے لگا سیم و زکثیر

جو دیکھتا ہے اس کے یہ ہوتا ہے دلپذیر تعریف اس مکان کی میں کیا کیا کروں نظیر

اس کی صفت تو مشہر روزگار ہے

(۸) تذکرۂ نامہ

ہیں مرداب وہی کہ جنھوں کا ہے فنِ درست حرمت انہوں کے واسطے جن کا چلنِ درست

رہتا نہیں کسی کا سد مالِ دھن درست دولت رہی کسی کی نہ باغ و چمن درست

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر دے رکھے اور تندرست

دنیا میں اب انہوں کے تئیں کئے بادشاہ جن کے بدن درست ہیں دن رات سال ماہ

جس پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ ایسی بھر اور کون سی دولت ہے واہ واہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر دے رکھے اور تندرست

جو گھر میں اپنے میری دشمنت پناہی ہے بن تندرستی سب وہ خرابی تباہی ہے

یہ تندرستی یا رو بڑی بادشاہی ہے بچ پوچھے تو عین فضل الہی ہے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر دے رکھے اور تندرست

گرد و لتوں سے اس کا بھرا ہے تمام گھر بیمار ہے تو خاک سے بدر ہے سب وہ زر

ہو تندرست اگرچہ یہ مفلس ہے سربس پھر نے کسی کا خوف نہ ہرگز کسی کا ڈر

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر دے رکھے اور تندرست

عاجز ہو یا حقیر ہو پر تندرست ہو بے زر ہو یا امیر ہو پر تندرست ہو

قیدی ہو یا اسیر ہو پر تندرست ہو مفلس ہو یا فقیر ہو پر تندرست ہو

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر دے رکھے اور تندرست

اس میں تمام ختم ہیں عالم کی خوبیاں ہو تندرستی اور طے حرمت سے آبِ نال

قسمت جب یہ دونوں میسر ہوں پھر تو ہاں پھر ایسی اور کونسی نعمت ہے میری جاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر وسے رکھے اور تندرست

پرواہ نہیں اگر چہ لکھا یا پڑھا نہ ہو محتاج حق سوا پہ کسی اور کا نہ ہو
حسن و جمال و علم و ہنر گونا گونا ہو اک تندرستی چاہئے کچھ ہو دے یا نہ ہو

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر وسے رکھے اور تندرست

بیمار گرچہ لاکھ طرح سے ہو بادشاہ تو اس کو جانے پہ گداسے بھی ہے تباہ
ہم تو اُسی کو شاہ کہیں اور جہاں پناہ اب جس کا تن درست ہو حرمت سے ہو نباہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر وسے رکھے اور تندرست

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں بیمار کے کنے اور نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں بنے ٹھنہ
بہتر ہیں مفلسی کے میاں چاہئے چنے جو تندرست ہیں وہی دولہا ہیں اور بنے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر وسے رکھے اور تندرست

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں، نگہ ہوں فاقہ مستیاں سب عیش اور مے ہیں جو ہوں تندرستیاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ اکبر وسے رکھے اور تندرست

چاہا جو دل نشہ کو تو دُوہیں منگا لیا محبوب دلبوں کو گلے سے لگا لیا
 آیا جو عیشِ دل میں خوشی سے اڑا لیا جو مل گیا سو پی لیا چاہا سو کھل لیا
 جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخنِ درست
 اللہ اکبر دوسے رکھے اور تندرست

آیا جو دل میں سیرِ چین کو چلے گئے بازارِ چوک سیرِ تماشے میں خوش ہوئے
 بیٹھے اُٹھے خوشی سے ہر اک جا چلے پھرے جا گے مزے میں رات کو یا خوش ہو سو رہے
 جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخنِ درست
 اللہ اکبر دوسے رکھے اور تندرست

قدرت سے یہ جو تن کی بنی ہے ہر ایک کل جب تک یہ کل بنی ہے چھپی تک پڑے ہے کل
 گر ہو خدا نخواستہ ایک کل بھی چل بہ چل پھر نے خوشی نہ عیش نہ کچھ زندگی کا پھل
 جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخنِ درست
 اللہ اکبر دوسے رکھے اور تندرست

ادنیٰ ہو یا غریب تو نگر ہو یا فقیر یا بادشاہِ شہر کا یا ملک کا وزیر
 ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دلپزیر جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیر
 جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخنِ درست
 اللہ اکبر دوسے رکھے اور تندرست

(۹) چڑیوں کی تسلیہ

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولے لکڑوں کوں اور مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں

سابقہ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں

چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

پسنگھ بڑا گڑبگڑ اسی کے غم کی تپ میں تپتے ہیں
سادس، گدھ، خواصل، بڑے، ابلگے، پنکھ کھلتے ہیں

سابقہ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں

چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

قمری بولے حق سترہ بلبل بولے بسم اللہ
دادر، مور، پیپھے، کوئل، کوک، رہے اللہ اللہ

سابقہ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں

چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

شکر، جھج اور گھڑ، باشے اور ترستی باز کوئی
لعل پڑھے ہے صتم کلم، جب پہنے پوشاک سوئی

سابقہ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں

چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

چیل کھلی السجل کہے ہے جلوں جلوں مت جان میاں
 مرمرو لے مرغابی گل من علیسا ناں میاں
 کتے قاں قاں کرتے ہیں الا آن کما کان میاں
 جتنے پنکھ کھیر وہیں سب پڑھتے ہیں قرآن میاں
 سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں
 چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں
 ہنس ہنس خراب تدوین بولیں یارحمان میاں
 نفس تیر، چکوہ، چکوہ، بولیں یا مستان میاں
 سارو، ہریل اور لٹورے دھیر پیاخان میاں
 ہمد بولیں احد احد کچھ تو بھی تو کر دیسان میاں
 سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں
 چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں
 بوم چند اور سبزک ابابیل اور چکوریں شام چڑی
 تنلی ٹڈی ڈانس بھنبھیری کتری، بھونری اور بڑی
 سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں
 چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں
 تن تن اور لم ڈھیک مولا حق حق تار پر روتے ہیں
 طائر تو سب تخم محبت اس کا دل میں بولتے ہیں
 سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں
 چوچوں چوچوں چوچوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں
 کس کس کا لوں نام غرض ہیں جتنے طائر خورد کبیر
 پنکھی تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں رہیں ایسر
 کوئی کہے یا حی تو انا کوئی کہے یارب تدبیر
 ہم سا غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہوگا آہ نظیر
 سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوچوں چوچوں کرتی ہیں

چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں

(۱۰) فنا نامہ

گر شاہ سر پر رکھ کر افسر ہوا تو پھر کیا اور بحسب سلطنت کا گوہر ہوا تو پھر کیا
ماہی علم مراتب پر زور ہوا تو پھر کیا نوبت نشاں نقارہ در پر ہوا تو پھر کیا
سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا

یار کھ کے فوج و لشکر کی سلطنت پناہی پھیری دُہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن گرفتار کی سر پر ڈی تباہی پھر سر رہا نہ لشکر نے تاج بادشاہی
دارا و جم سکندر اکبر ہوا تو پھر کیا

یا ذات میں کہائے نامی اصیل ذاتی جمشید فر کے پوتے نوشیرواں کے تاتی
تھے آپ مثل دولہا اور فوج تھی براتی جب چل بسے تو کوئی پھر نگ تھا نہ ساتی
ملک و مکاں خزانہ لشکر ہوا تو پھر کیا

یاراج ہنسی ہو کر دنیا میں راج پایا چوڑ گڈھ ستار کا لہجہ آہن پایا
جب توپ نے اجل کی آموڑ چہ لگایا سب اڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گڈھ کوٹ توپ گولہ سنگ ہوا تو پھر کیا

کتے دونوں فعل تھا نواب ہیں یاں ہیں یہ ابن پنجہ زاری یہ عالی خاندان ہیں
جاگیر مال و منصب سب کچھ ان کے ہاں ہیں دیکھا تو اک گھر می میں نے نام نے نشاں ہیں
دودن کا شور چرچا گھر گھر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی دیکھو یہ ہیں امیر خاں جی اور یہ ہیں خانخاناں اور یہ شیر خاں جی
 پنجم اٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی پھر کس کے میر خاں جی کس کے وزیر خاں جی
 عمدہ غنی تو نگر بازار ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نامدار خاں کا یہ پالکی یہ ہاتھی ہے ذوالفقار خاں کا
 آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں کا خر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا
 جھپاں میگ ڈنبر در پر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ ڈیوڑھی ہے خاں تہراں کی یہ باغ یہ عویلی ہے محلدار خاں کی
 جب راج لے قضا کے کرنی بسوی ٹانگی اک اینٹ بھی نہ پائی ہرگز کسی مکاں کی
 رنگیں محسں سنہرا گھر در ہوا تو پھر کیا

کتوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا مہرین بڑی گھدائیں سکے بڑا بنایا
 جب آن کر فنانے نام و نشان مٹایا وہ نام اور وہ سکے ڈھونڈھا کہیں نہ پایا
 دودن کا مہر چھپا پا در پر ہوا تو پھر کیا

جاگیر میں کسی نے زریر ملک پایا کر بند و بست اپنا نظم و نسق بٹھایا
 لیکر سند اجل کا جب فوجدار آیا اک دن میں حکم حاصل کسب ہو گیا پرایا
 ہانسی حصار تھٹھا بھٹکا ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ لشکر ہے طرہ باز خاں کا یہ خیمہ شامیانہ ہے شہنواز خاں کا
 آیا لٹک اجل کے جب یکہ تار خاں کا سر بھی کہیں نہ پایا پھر فرار خاں کا
 سردار میر بخشی بڑھ کر ہوا تو پھر کیا

ہاتھی پہ چڑھ کے نکلے یا خاصے گھوڑے اوپر یا نالکی سنبھالی یا پالکی کی جھال

یا لے صراحی حقہ دوڑے جلیب اندر جب آجل پکاری صاحب رہا نہ نوکر
 آقا ہوا تو پھر کیا نوکر ہوا تو پھر کیا
 یا لے کے اک قلمداں اور رکھ قلم کو سر پر جوڑے حساب لاکھوں چہرے لکھے سراسر
 جب عمر کی کچھری جھانکی قضا نے آکر پھر آپ نے قلمداں کا غدر رہا نہ دفتر
 منشی وکیل دیواں مر مر ہوا تو پھر کیا
 یا لے قضا کی خدمت ہو بیٹھے آپ قاضی محضر قبالہ لکھے قضا کے شرعی
 اعلام لے قضا کا جب آفنا پکاری پھر محکمہ نہ جھگڑا قاضی رہا نہ مفتی
 کوڑا، لبیدہ درہ در پر ہوا تو پھر کیا
 کتوال بن کے بیٹھا یا صبر ہو مقرر فاسق ڈرے ہزاروں اور چور کانپے تھر تھر
 آیا قضا کا مرد با جس دم چھڑی اٹھا کر کتوالی اور صدارت سب ہو گئی برابر
 دو دن کا خوف خطرہ در در ہوا تو پھر کیا
 کہتے تھے کہتے ہم تو ہیں فدا میں کلاں جی ہم شیخ ہم مغل ہیں ہم ہیں پٹھان ہاں جی
 جس دم قضا پکاری اب اٹھ جلو میاں جی پھر شیخ نجی نہ سید مزار ہے نہ خاں جی
 ذات و حسب نسب کا جوہر ہوا تو پھر کیا
 یا لے کے زبرجہاں میں کرنے لگے تجارت یا سیٹھ بن کے بیٹھے خاصی بنا عمارت
 کھولیں قضا نے یہاں جب کر کے اک اشار سب کو ٹھکی اور دکانیں کر ڈالیں دم میں غارت
 مال اور مکاں جواہر اور زرہ ہوا تو پھر کیا
 یا ہو سپاہی یا بھا تر چھا، بڑا کسایا بلند ار باندھ چسپرا طرے کو جگ گایا
 کھیتوں میں جا کے گودا لاکھوں کے تیں بھگایا جب منہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا

یکست شجاع بہادر صفر ہوا تو پھر کیا
 گھوڑا اٹھا کے ڈوبا فوجوں میں ہو دلاور مارے طعنے بھالے کھائے کٹا رجمصر
 مارا قضا نے بھالاجس دم فنا کا آ کر پھر مردمی شجاعت سب ہو گئی برابر
 خود و سلاح جلتے بکتر ہوا تو پھر کیا
 یا خانہ جنگی لڑ کر کھایا بدن میں طمانکا موچھوں کو تا دے کر سو دوت و ات ہا
 جب گھور کر قضا کے بانگے نے آکے جھانکا ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گنت ڈارہا نہ بانکا
 تیغا سپر فراہیں جھڑھ ہوا تو پھر کیا
 یا ہو حکیم حاذق کرنے لگے طبابت مُردوں کے تئیں جلایا عیسیٰ کی کی کر امت
 کھوئے مرض ہزاروں ہوئی ہر اک کی رحمت جب سر پہ آئی اپنے پھر کچھ چلی نہ حکمت
 لقمان یا فسلاطوں آ کر ہوا تو پھر کیا
 یا ہو نجومی کامل تاروں کو چھان ڈالا سورج گمن بجارے چند رگمن نکالا
 بچ دتارے باندھے احکام کو سنبھالا جب وقت اپنا آیا اُس وقت کو نہ ٹالا
 جوشش نجوم پندت پڑھ کر ہوا تو پھر کیا
 یا پڑھ کے دو کتابیں اور کر کے علم حاصل یا بھوت جن آمارے مشہور ہو کے کامل
 جب دیو کا اجل کے سایہ ہوا مقابل ملّا رہا نہ سیانا عالم رہا نہ فاضل
 تعوین فال جادو منتر ہوا تو پھر کیا
 ماتھے پہ کھینچ ٹیکایا ہاتھ لے کے مالا پوتھی بغل میں دہلی زنا ر کو سنبھالا
 پوجا کتھا بھانی کیا کیا سب نہ نکالا کچھ بن سکا نہ آیا جب جان لینے والا
 دید و پُراں پڑھ کر مقصد ہوا تو پھر کیا

یا زہد بندگی میں سوکھا ہو کوئی عابد بیٹھا مصلوں اور ہومسجدوں میں ساجد
حاضر ہوا قضا کا جب آن کر محبا ہد پھر بوریانہ بدھن عابد رہا نہ زاہد
روزہ نہ از چلہ اکثر ہوا تو پھر کیا

یا پی کے مے کسی نے کی عیش کامیابی لوٹا نشے میں ہر جا کردل سے بے جبابی
جس دم قضا نے اپنی جھمکائی اک گلابی پھر مے رہی نہ مینا نے مست نے شرابی
اک دم لبوں پہ مے کا ساغر ہوا تو پھر کیا

حن و جمال پا کر یا خبر و کسایا یا عشق میں کسی نے جی جان کو گھٹایا
اگر پڑا سروں جس دم اجل کا سایا دونوں میں پھر کسی کو ڈھونڈھا کہیں نہ پایا
عاشق ہوا تو پھر کیا دلبر ہوا تو پھر کیا

یا ہو کے پیر زادے کرنے لگے فقیری کر کر مرید کتنے کی اُن کی دستگیری
جب پیر بن کی گئی آکر اجل نے چیری سب اڑ گئی ہوا پردم میں مریدی پیری
مرد فقیر ہادی رہا تو پھر کیا

یا سر منڈا کے بیٹھے آزاد ہو نویلے یا خود منڈے کہا کر سو روپ رنگ کھیلے
میلے کئے ہزاروں منڈے فقیر چیلے جب آفا پکاری جا سو رہے اکیلے
تکبیر ہوا تو پھر کیا بستر ہوا تو پھر کیا

جوگی ایت جگم یا سیوڑا کما یا یا کھول کر جٹا گویا گھونٹ سر منڈا یا
ترسول بے قضا کا جب قت سر پہ آیا نے بالے کو تھا بانے آپ کو بچا یا
ناہک کہیں نہ تھی بھر فقر ہوا تو پھر کیا

یا نیک بن کے بیٹھے اچھے لگے کہانے یا ہو کے بد ہر اک کے دل کو لگے تانے

اگر بچہ اجل کے جب سر پہ شادیا نے تھے نیک و بجاں تک سب لگے ٹھکانے
 بہتر ہوا تو پھر کیا بدتر ہوا تو پھر کیا
 کیا ہندو اور مسلمان کیا رند و گبر و کافر نقاش کی مصوٰر کیا خوشنویس شاعر
 جتنے نظیر ہیں یاں اک دم کے ہیں مسافر رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
 دو چار دن کی خاطر یاں گھر ہوا تو پھر کیا

(۱۱) طفل نامہ

کیا دن تھے یا روہ بھی تھے جب کہ بولے بھالے نکلے تھی دائی لے کر پھرتی کبھی دوالے
 چوٹی کوئی رکھالے بدھی کوئی پہنالے ہنسی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھالے
 موٹے ہوں یا کہ دبے گورے ہوں یا کہ کالے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے اہ کا بھی کھل رہا ہے بچھا بھی کھل رہا ہے
 پسینے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے یاں یوں بھی داہ داہے اور ووں بھی ادا ہے
 کچھ کھالے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھالے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 مرجائے کوئی تو بھی کچھ ان کا غم نہ کرنا نے جانے کچھ بڑا مانے جانے کچھ سنورنا
 ان کی بلا سے گھر میں ہو قید یا کہ گھر نا جس بات پر یہ مجھے پھر وہ ہی کر گزرنا
 ماں اور مٹھی کو بابا پگڑی کو نہ بچ ڈالے

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اونٹتے ہیں گڑبیر مولیٰ گا جو لے منہ میں گھونٹتے ہیں
 بابا کی مونچھ ماں کی چوٹی ٹکھسوتے ہیں گردوں میں اٹ ہے ہٹا کوں میں لوٹتے ہیں
 کچھ مل گیا سوئی لے کچھ بن گیا سوکھا لے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 جو ان کو دوسو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا
 جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہے ان کو سونا پروانہ کچھ لنگ کی لئے چاہئے بچھونا
 بھونپو کوئی بجالے پھر کی کوئی نچالے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے
 یہ بالے پن کا یار و عالم عجب بنا ہے یہ عمروہ ہے اس میں جو ہے سو بادشاہ ہے
 اور سج اگر یہ پوچھو تو بادشہ بھی کیا ہے اب تو نظیر میری سب کو یہی دعا ہے
 جیتے رہیں بھوں کے اس فرادوا کے
 کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

۱۲ جوانی

کیا عیش کے رکھتی ہے سب آہنگ جوانی کرتی ہے بہاروں کے تئیں دنگ جوانی
 ہر آن پلاتی ہے اور بنگ جوانی کرتی ہے کہیں صلح کہیں جنگ جوانی
 اس ڈھب کے لئے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

اللہ نے جوانی کا وہ عالم ہے بسایا جو ہر کہیں عاشق کہیں رسوا کہیں شیدا
پھندے میں کہیں جی کہیں دل ہے تڑپتا مرتے ہیں سسکتے ہیں بلکتے ہیں ابا ہا

اس ٹھہب کے مرنے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

نئے سے کانہ معجون کے منگوانے کا کچھ غم نے دل کے لگانے کا نہ گل کھانے کا کچھ غم
گالی کا نہ آنکھوں کے لڑا آنے کا کچھ غم ہنسنے کا نہ چھاتی سے لپٹ جانے کا کچھ غم

اس ٹھہب کے مرنے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

لڑتی ہے کہیں آنکھ کہیں دست کہیں سین چھوٹا ہے کہیں بیا کسی سے ہیں گلے نین
وعدہ کہیں اقرار کہیں سین کہیں نین نے جی کو فراغت ہے نہ آنکھوں کے تین چین

اس ٹھہب کے مرنے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

افت ہے کہیں تھر و محبت ہے کہیں چاہ کرتا ہے کوئی چاہ کوئی دیکھ رہا راہ
ساتی ہے صراحی ہے پر بزاہ ہیں ہمراہ کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں اللہ

اس ٹھہب کے مرنے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

پہرے پہ جوانی کا جو آکو ہے چڑھا نور رہ جاتی ہیں پر یں بھی غرض اس کے تیں گھور
چھاتی سے لپٹتی ہے کوئی حسن کی مغرور گودھی میں پڑی بسے ہے چنل سی کوئی حور

اس ٹھہکے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

گرات کسی پاس رہے عیش میں غلطاں اور واں سے کسی اور کے ملنے کا ہوا دہیاں

گہر کے اُٹھے جب تو گری پاؤں پہ ہر آں کہتی ہے ہمیں چھوٹے جاتے ہو کدھر جاں

اس ٹھہکے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

رستے میں نکلے ہیں تو ہوتی ہیں یہ جاہیں وہ شوخ کہ ہوں بند جنہیں دیکھ کے راہیں

کھانے ہے کوئی ہنس کے کوئی بھرتی ہیں پڑتی ہیں ہر اک جا سے نگاہوں پہ نگاہیں

اس ٹھہکے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

تنتے ہیں اگر اینٹھ کے چلتے ہیں عجب چاں بے پاؤں کہیں راہ کہیں سیف کہیں اڈھاں

کھینچے ہیں کہیں بال کہیں تو دل لیا گال بھڑ بھڑ بیٹھے کہیں ہاتھ کہیں منہ پہ دیا ڈال

اس ٹھہکے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

جاتے ہیں طوائف میں تو واں ہوتے ہیں چاؤں کہتی ہے کوئی ان کے لئے پان بنا لاؤ

کوئی کہتی ہے یاں بیٹھو کوئی کہتی ہے یاں آؤ ناچے ہے کوئی شوخ بتاتی ہے کوئی بھاؤ

اس ٹھہکے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

ہنس ہنس کے کوئی حسن کی پھل بل ہے دکھاتی منی کوئی سرمہ کوئی کا بل ہے دکھاتی

آگے تھے جہاں گل بدن دیوسف ثانی دیتے تھے ہیں پیار سے چھٹوں کی نشانی
 مرا عینِ ثواب مُنہ میں نہ ڈالے کوئی پانی کس دُکھ میں ہیں چھوڑ گئی ہائے جوانی
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یاد آتے ہیں ہم کو جوانی کے وہ ہنگام اور جامِ دلا رام مرنے عیش اور آرام
 ان سب میں جو دیکھو تو نہیں ایک کا اب نام کیا ہم پرستم کر گئی یہ گردشِ ایام
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مجلس میں جوانوں کی تو ساغر ہیں جھلکتے پھیلیں ہیں بہاریں ہیں پر بردہاں جھلکتے
 ہم ان کے تئیں دور سے ہیں رشک سے تکتے وہ عیش و طرب کرتے ہیں ہم سرہیں پٹکتے
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب باؤں پڑیں ان کے تو ہرگز نہ بلاویں جا بیٹھیں تو اک دم میں خنا ہو کے اٹھاویں
 اتنا تو کہاں اب جو کوئی جسامِ بلا دیں گرجانِ نکلتی ہو تو پانی نہ چواویں
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جب عیش کے ہمان تھے اب غم کے ہمنے ضیف اب خون جگر کھاتے ہیں جب پیتے تھے سوہن
 جب اینٹھ کے چلتے تھے سپر باندھ اٹھا سیف اب ٹیک کے لاٹھی کے تئیں چلتے ہیں صد
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
تھے ہم بھی جوانی میں بہت عشق کے پورے وہ کون سا گل رو تھے جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے نے کئے ایسے ادھورے پر جھڑکے دم اڑ گئی پھرتے ہیں لندورے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
کیا یار اُلٹ ہم سے گیا ہائے زمانا جو شوخ کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانہ
پھیرے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانا ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہونا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
پوچھیں جسے کہتا ہے وہ کیا پوچھے ہے بڑھے آویں تو یہ غل ہو کہ کمان آوے ہے بڑھے
بیٹھیں تو ہو یہ دھوم کہاں بیٹھے ہے بڑھے دیکھیں جسے کہتا ہے وہ کیا دیکھے ہے بڑھے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
کیا یار و کہیں گو کہ بڑھاپا ہے ہمارا پر بوڑھے کہانے کا نہیں تو بھی سہارا
جب بوڑھا ہمیں ہائے جہاں کہہ کے پکارا کافر نے کلجے میں گویا تیسرا مارا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
خواباں میں اگر جاویں تو ہوتی ہے یہ پھکڑی کھنچے ہے کوئی ہاتھ کوئی پکڑے ہے لکڑی
پے کھیں اور نوچیں کہیں جاتی ہیں پکڑی ڈاڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی بھارے ہے لکڑی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
 کتا ہے کوئی پھین لو اس بوڑھے کی لاٹھی کتا ہے کوئی شیخ کہ ہاں کھینچ لو ڈاڑھی
 اتنی کسی کافر کو سمجھ اب نہیں آتی کیا بوڑھے جو ہوتے ہیں تو کیا ان کے نہیں جبا
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
 اک وقت تھا ہم بھی مرنے کرتے تھے گن گن محبوب، پریرا نہ رہتے تھے ملے رہن
 اک وقت یہ رہائے جو سب کرتے ہیں اب گھن یا ایک دہایام تھے یا ایک یہ ہیں دن
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
 بوڑھوں میں اگر جاویں تو لگتا نہیں اں دل واں کو نہ لگے دل تو ہے محبوبوں کا مائل
 محبوبوں میں جاویں تو وہ سب چھڑے ہیں بل بل کیا سخت مصیبت کی پڑی آن کے مشکل
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
 پنکھٹ کو ہماری اگر سواری گئی ہے تو داں بھی لگی ساتھ یہی خواری گئی ہے
 سُننے ہیں کہ کہتی ہوئی بھٹیاری گئی ہے لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے
 سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
 پڑھی ہو اگر لال گلابی تو یہ آفت کتا ہے ہر ایک دیکھ کے کیا خوب ہے ہر نگت

ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے کڑنکل ہے رحمت لاول ولا دیکھے بوڑھے کی حاققت

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گرباہ میں جاویں تو یہ ذلت ہے اٹھانا چھٹتے ہی بنے باپ نکاحی کا نشانہ
زندوں میں اگر جاویں تو مشکل ہے پھر آنا افسوس کسی جا نہیں بوڑھے کا ٹھکانا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہے بھانولی تالی کا زناؤں میں جو چرچا اگر ان میں کبھی جا دیں تو ہے یہ ستم آتا
ڈاڑھی کی جگت بولے کوئی آنکھ کو ٹکا ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے آامرے دادا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

دوریا کے تماشے کو اگر جائیں تو یارو کہتا ہے ہر اک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کو
اور سنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بد خو کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر آج کو ہوتے وہ جوانی کے زمانے قدرت تھی جو یوں پھیرتے بھرٹے دزنانے
مشکل ابھی پڑ جاتی انہیں پیچھے چھڑانے اک دم میں ابھی لگتے ادنیٰ ہائے چانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گرناج میں جاویں تو یہ حسرت ہے ساقی جو ناپے ہے کافروہ نہیں دھیان میں لاتی
اور دس کی طرف جاوے تو آنکھیں ہے لڑاتی پر ہم کو تو کافروہ انگوٹھا ہے دکھائی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گرنیکہ ان میں کوئی بوڑھی ہے کماتی البتہ بڑھاپے یہ دھمک رحم ہے کھاتی
پھسکی سی پُرانی سی لگاؤٹ ہے جتاتی پر تھر ہے وہ ہم کو ذرا خوش نہیں آتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

چکلے کے جواندہ کی وہ کھلاتی ہے کسی گران میں کبھی جاویں تو ہوتی ہے خرابی
منہ دیکھتے ہی کہتی ہیں سب آدھڑے جی کیا آئے ہو یہاں کرنے کو پیری دمیری

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر جاویں طوائف میں تو لگتی ہیں ستانے کیا آئے ہو حضرت ہیں قرآن پڑھانے
ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گو جھک کے کمر پاؤں سے سر آن لگا ہے پر دل میں تو خواہاں کا وہی دھیان لگا ہے
کہتے ہیں جسے 'ہم کو یہ ارمان لگا ہے کہتا ہے وہ کیا بوڑھے کو شیطان لگا ہے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
نقلیں کوئی ان پو پے ہونٹوں کی بناوے چل کر کوئی کبڑے کی طرح قد کو جھکا دے
ڈاڑھی کے کئے انگلی کو لالا کے نچا دے یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھا دے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
تھے جیسے جوانی میں کئے دھوم دھڑکتے ویسے ہی بڑھاپے میں چھٹے آن کے چھٹے
سب اڑ گئے کافروہ نظارے وہ بھٹکے اب عیش جوانوں کو ہیں اور بوڑھوں کو دھٹکے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
گر حرص سے ڈاڑھی کو خضاب اپنی لگاویں بھڑی جو پڑی مُنہ پہ اسے کیونکہ مٹا دیں
گو کمر سے پہننے کے تئیں نہ انت بندھا دیں گردن تو پڑی ملتی ہے کیا خاک چھپا دیں

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
بوڑھے ہوئے پُرس کی چاہت نہیں چھٹی آنکھوں سے یہ دیدار کی لذت نہیں چھٹی
اور دل سے بھی محبوب کی الفت نہیں چھٹی سب چھٹ گیا پر دید کی یہ لت نہیں چھٹی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
سننے ہو جو انو یہ سخن کہتے ہیں تم سے کرنے ہیں جو کرو وہ منے عیش و طرب کے
جادے گی جوانی تو پھر افسوس کرو گے تم جیسے ہو ویسے تو کبھی ہم بھی جواں تھے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب جتنے ہو معشوق یہ سب یاد رکھو بات جو ہو سو کر دچاہئے والوں کی مدارات
محبوب و غنیمت ہے جوانی کی یہ اوقات جب بڑھے ہوئے پھر تو تھوئے ڈھاک کے دوپٹا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب جس سے رہیں صاف تو ہوتا ہے وہ گلا اللہ نہ دکھلائے کسی کو یہ ملدا
اس چرخِ تم گارنے سینے میں حدلا کیا ہم سے جوانی کا لیا آہ یہ بدلا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں پیئے جامِ سبو کے ویسے ہی بڑھاپے میں پیئے گھونٹ لہو کے
جب آکے گلے لگتے تھے محبوب بھوکے اب کھتے تو بڑھاپا بھی کوئی مُسنہ پہ نہ تھو کے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یہ ہونٹ جواب پوچھے یارو ہیں ہمارے ان ہونٹوں نے بوسوں کے بڑے رنگ ہیں مارے
ہوتے تھے جوانی میں تو پریوں کے گزارے اور اب تو چڑیلِ آن کے اکلات نہ تارے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی کے چڑھے زور میں سرخ ویسے ہی بڑھاپے کی پڑی آن کے اب پتخ

تکلا ہوا تن سوکھا، روئی بال، رگیں سخیں
 حلو ہوئے، چرغا ہوئے، لپسی ہوئے چرخ

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مخمل میں وہ مستی سے بگڑنا نہیں بھولے
 ہنس ہنس کے پریرا دوسرے لڑنا نہیں بھولے
 ساتی سے پیالوں پہ جھگڑنا نہیں بھولے
 وہ گالیاں وہ بوسوں پر لڑنا نہیں بھولے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا دُور تھا سر دکھنے کا ہوتا تھا جدا فوس
 اب مر بھی اگر جائیں تو ہوتا ہے کہ افسوس
 ہر غم پہ دہن دیکھ کے کرتا تھا جدا فوس
 افسوس صد افسوس صد افسوس صد افسوس

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جب جان کے بوڑھا ہیں چھپڑیں یہ لکھا
 اس وقت تو ہم یار و دم سر دے بھر آہ
 اور چھپڑ کے مجلس سے اٹھاتے ہیں بہ اکراہ
 رور و کے یہی کہتے ہیں اب کیوں مرے اللہ

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر ہوتی جوانی تو ابھی دھوم یہ مچتی
 چھاتی سے لپٹ دم میں کر دک ڈالتے پسلی
 جب کرتی وانگیا کی اڑا ڈالتے دھتی
 پر کیا کریں یار و کہ بڑھاپے نے بُری کی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
 عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

وہ جوش نہیں جس کے کوئی خوف سے ڈھے وہ زعم نہیں جس سے کوئی بات کو سہ لے
جب پُھوس ہوئے ہاتھ تھکے پاؤں بھی پہلے پھر جس کے جو کچھ شوق میں آئے وہی کہہ لے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کرتے تھے جوانی میں تو سب آپ سے آج اور جن دکھاتے تھے وہ سب آن کے دل غا
یہ تھر بڑھاپے نے کیا آہ نظیر آہ اب کوئی نہیں پوچھتا اللہ ہے اللہ

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

(۱۴) فقیرن کی صدا

بٹ مارا جل کا آپھونچا ٹٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سر دھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے لے بس من مارو بابا جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو ہمان کرو خیرات کرو احسان کرو یا پُن کرو یا دان کرو
یا پوری لڑو بڑاؤ یا خاصہ سلوا نان کرو کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب چلنے کا سامان کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دل کو ٹوہنا جینے سے اب اور گلے کو مت کاٹو
 اب چاٹ فنا کی ٹمک چکھو اور خون کسی کا مت چاٹو
 دھن جھڑو حصے بھرے کی اور بھاجی اپنی تم باٹو
 ناکند بچھڑے کو دچکے اب اور دولتی مت چھاٹو
 تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بلج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
 یہ اس بہت گودا اچھلا اب کوڑا مارو زیر کرو
 جب مال اکٹھا کرتے تھے اب تن کا اپنے ڈھیر کرو
 گر کھڑا ٹاشکر بھاگ چکا اب میان میں تم شمشیر کرو
 تم صاف لڑائی ہار چکا اب بھاگنے میں مت دیر کرو
 تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بلج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
 سر کا نیا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا ملیں آن بھکیں
 فڈیڑھا کان ہوئے بے اور انکھیں بھی چند میا گئیں
 سکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل شستہ ہوا آواز تیں
 جو ہوئی تھی سو ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
 تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بلج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
 یوں پاؤں گھسٹ کر چلنے سے مت رستے کو حیران کرو
 اور پوئے منہ سے روئی کو مت مل مل کر ہلکان کرو
 اب آپ ہوئے تم پانی سے مت پانی کا نقصان کرو
 کچھ لاکھ نہیں ہے جینے میں اب مرنے سے پہچان کرو
 تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بلج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
 گراچی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے
 تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے
 اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤ گے
 کچھ بات نہیں بن آنے کی گھر آؤ گے پچھاؤ گے
 تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
 یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چنتی ہے جس لکڑی کے بل بیٹھے ہوں ات یہ لکڑی گھنتی ہے
 تم گھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنتی ہے اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تا بانا بنتی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گھر بار روپے اور پیسے میں مت دل کو تم خرسد کرو یا گورنہ و جنگل میں یا جمنہ پر آئند کرو
 موت آن لٹاڑے کی آخر کچھ کر کرو کچھ بچسد کرو بس خوب تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یو پار تو یاں کا بہت کیا اب داں کا بھی کچھ سودا لو جو کھپ ادھر کچھ دھنتی ہے اس کھپ کو یاں سے لدو لاو
 اس راہ میں جو کچھ کھاتے ہو اس کھانے کو بھی منگو لاو سب ساتھی بھونچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستہ لو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلتی ہے یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا گھلنی ہے یا چلنی ہے
 ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں یہ بھی گھلنی ہے اٹھ باندھ کر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
 اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ دولت کام نہ آوے گی مت اس کو تم زنجیر کرو یہ خاک بدن کی پارا ہے مت مارا سے اکسیر کرو
 جو پار آتا رہے دیرا سے اُن باتوں کو گو سیر کرو اب نہ کھائے آپہنچی، اب چڑھنے میں مت دیر کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھر دیا

اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کر دیا

کچھ دیر نہیں اب چلے نہیں کیا آج چلو پاگل نکلو
کچھ کپڑا لٹا لینا ہو سوجلدی باندھ سنبھل نکلو
اب شام نہیں اب صبح ہوئی بچوں نوم پھیل کر نکلو
کیوں ناحق دھوپ چڑھاتے ہو بس ٹھنڈے ٹھنڈے نکلو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھر دیا

اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کر دیا

یہ اونٹ کرایہ کا یا رو صندوق جنازہ ارٹھی ہے
جب اس پر ہوا سوار چلے پھر گھوڑا ہے نے ہستی ہے
کس نیند پرے تم سوتے ہو یہ بوجھ تھا را بھاری ہے
کچھ دیر نہیں اب آہ نظیر تیار کھڑی اسواری ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھر دیا

اب موت نقارہ بانج چکا چلنے کی فکر کر دیا

(۱۵) خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی جن دہری بھوت بلا راضی ہے

بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے
شاہ مسرور غنی شاد گدار راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے
اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے

اولیا انبیا اور رب کی خوشامد کیجئے
اپنے مقدر و غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانے نہ نکالا ہے یہ دام خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مفسل ادنیٰ و غنی کی بھی خوشامد کیجئے بد بخیل اور سخی کی بھی خوشامد کیجئے
دیو و شیطان و پری کی بھی خوشامد کیجئے گرولی ہو تو ولی کی بھی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پیار سے جوڑ دئے ہاتھ طرف جس کے آہ وہیں خوش ہو گیا کرتے ہی وہ ہاتھوں پہ نگاہ
خور سے ہم نے جو اس بات کو دیکھا واللہ کچھ خوشامد ہی بڑی چیز ہے اللہ اللہ

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد کا مزاج جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکاں ملک اور راج کیا ہی تاثیر کی اس نغز نے پانی ہے رواج

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر بھلا ہو تو بھلے کی بھی خوشامد کیجئے اور بُرا ہو تو بُرے کی بھی خوشامد کیجئے

پاک ناپاک سڑے کی بھی خوشامد کیجئے کتے بلی و گدھے کی بھی خوشامد کیجئے
 جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
 حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
 خوب دیکھا تو خوشامد کی بڑی کھیتی ہے غیر کیا اپنے ہی گھر بیچ یہ سکہ دیتی ہے
 ماں خوشامد کے سبب پھاتی لگا سیتی ہے نانی دادی بھی خوشامد سے دعا دیتی ہے
 جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
 حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
 بی بی کہتی ہے میاں آترے صدقے جاؤں ساس بولے کہیں مت جاتے صدقے جاؤں
 خالا کہتی ہے کہ کچھ کھا ترے صدقے جاؤں سالی کہتی ہے کہ بھیا ترے صدقے جاؤں
 جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
 حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
 آپڑا ہے جو خوشامد سے سروکار ہے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُلفت کے خریدار اُسے
 آشنا ملتے ہیں اور چاہے ہیں سب یار اُسے اپنے بیگانے غرض کرتے ہیں سب پیار اُسے
 جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
 حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
 روکھی اور روغنی آبی کی خوشامد کیجئے نان بانی و کبابی کی خوشامد کیجئے
 ساتی و جام شرابی کی خوشامد کیجئے پار سارند خرابی کی خوشامد کیجئے
 جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
 حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے ہیں انسان جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ حیران
ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں سامان جس نے یہ بات نکالی ہے میں اس کے قربان
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
کوڑی پیسے و ٹکے زر کی خوشامد کیجئے لعل و نیلم دُر و گوہر کی خوشامد کیجئے
ادب و پتھر ہو تو پتھر کی خوشامد کیجئے نیک و بد اجتہد ہیں یکسر کی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
ہم نے ہر دل میں خوشامد کی محبت دکھی پیار و اخلاص و کرم و ہر محبت دکھی
دلبروں میں بھی خوشامد ہی کی الفت دیکھی عاشقوں میں بھی خوشامد ہی کی چاہت دیکھی
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پار سا پیر ہے زاہد ہے منا جانی ہے جوا یا چور و غا باز خسرابانی ہے
ماہ سے ماہی تلک چو نیٹی ہے یا ہاتھی ہے یہ خوشامد تو میاں سب کے تیئں بھاتی ہے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
گر نہ بیٹھی ہو تو کر ڈی بھی خوشامد کیجئے کچھ نہ ہو پاس تو خالی بھی خوشامد کیجئے
جانی دشمن ہو تو اس کی بھی خوشامد کیجئے بچ اگر بچھو تو جھوٹی بھی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے
 مرد وزن طفل و جوان خرد و کلاں پیر و فقیر
 جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر
 سب کے دل ہوتے ہیں چھند میں خوشامد کے اسیر
 تو بھی دانش بڑی بات یہ کہتا ہے نظیر
 جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
 حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

(۱۶) کلجک

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
 نیکی کا بدلانیک ہے بد سے بدی کی بات لے
 میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول نے پھل بات لے
 آرام دے آرام لے دکھ درد سے آفات لے
 کلجک نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
 کانٹا کسی کے مت لگا کر مثل گل پھولا ہے تو
 وہ تیرے حق میں زہر ہے کس بات پر پھولا ہے
 مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھاس کا بولا ہے تو
 سن یہ کہ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر پھولا ہے
 کلجک نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
 شوخی شرارت مکر و فن سب کا لیکھا ہے یہاں
 جو جو دکھایا اور کو وہ آپ دیکھا ہے یہاں
 کھوٹی کھری جو کچھ کسے تس کا پر لیکھا ہے یہاں
 جو جو بڑا ملتا ہے دل تل تل کا لیکھا ہے یہاں
 کلجک نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو اُور کی بستی مکے اس کا بھی بتا ہے بُرا جو اُور کے مارے پُھری اس کے بھی لگتا ہے پھرا
 جو اُور کی توڑے دھری اس کا بھی ٹوٹے ہے دھڑ جو اُور کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے بُرا

کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو اُور کو پھل دیوے گادہ بھی سدا پھل پاوے گا گیہوں گیہوں جو سے جو چانول سے چانول پاوے گا
 جو کج دیوے گا یہاں ویسا ہی وہ کل پاوے گا کل دیوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا
 کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
 میانہ جان اس کو میاں دریا کی یہ نبرد عار ہے اوروں کا بیڑا پار کرتیرا بھی بیڑا پار ہے
 کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 تو اُور کی تعریف کرتے کوشا خوانی طے کر شکل آساں اُور کی تجھ کو بھی آسانی طے
 تو اُور کو ہمسان کرتے تجھ کو بھی ہمانی طے روٹی کھلا روٹی طے پانی پلا پانی طے
 کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو گل کھلاوے اور کا اس کا ہی گل کھلتا بھی ہے جو اُور کا کیلے ہے مُنہ اس کا ہی مُنہ کھلتا بھی ہے
 جو اُور کا پھیلے جگر اس کا جگر پھلتا بھی ہے جو اُور کو دیوے کپٹ اس کو کپٹ ملتا بھی ہے

کھجک نہیں کر جگے یہ یاں دن کو دے اور رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

کُجک جو کچھ کرنا ہو یاں یہ دم تو کوئی اُن ہے نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
تمت میں یاں تمت لگے طوفان میں طوفان ہے رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے

کھجک نہیں کر جگے یہ یاں دن کو دے اور رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

یاں زہر سے تو زہر لے شکر میں شکر دیکھ لے نیکیوں کو نیکی کا مزہ موزی کو ٹکر دیکھ لے
موتی جو دے موتی ملیں پتھر میں پتھر دیکھ لے گر تجھ کو یہ باور نہیں تو تو بھی کر کر دیکھ لے

کھجک نہیں کر جگے یہ یاں دن کو دے اور رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر تیرا بھی نقصان ہو دے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیئے تو چھان کر یاں پاؤں کو دیکھ بھونک کر اور خوف سے گزران کر

کھجک نہیں کر جگے یہ یاں دن کو دے اور رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں یاں صاحب اور اک رہ دشا در کھ دشا درہ غناک رکھ غناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ یہ وہ مکاں ہے او میاں یاں باک رکھ میاں ہ

کھجک نہیں کر جگے یہ یاں دن کو دے اور رات

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو اُدر کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے بُرا
 جو ادر کے مارے بھری اس کے بھی لگتا ہے پھرا
 جو ادر کی توڑے دھری اس کا بھی ٹوٹے ہے دھڑل
 جو ادر کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے بُرا

کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو ادر کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
 گیہوں گیسوں جیسے جو چانول سے چانول پاوے گا
 جو آج دیوے گا یہاں دیا ہی وہ کل پاوے گا
 کل دیوے گا کل پاوے گا کلپاوے گا کل پاوے گا

کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو چاہے لے چل اس گھر میں سب جنس یاں تیار ہے
 آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
 دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منہ جار ہے
 اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے

کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 تو ادر کی تعریف کر تجھ کو شنا خوانی لے
 کر شکل آساں ادر کی تجھ کو بھی آسانی لے
 تو ادر کو مہسان کر تجھ کو بھی مہمانی لے
 روٹی کھلا روٹی لے پانی پلا پانی لے

کجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 جو گل کھلاوے اور کا اس کا ہی گل کھلتا بھی ہے
 جو ادر کا کیلے ہے منہ اس کا ہی منہ کھتا بھی ہے
 جو ادر کا پھیلے جگر اس کا جگر جھپکتا بھی ہے
 جو ادر کو دیوے کپٹ اس کو کپٹ ملتا بھی ہے

کھجک نہیں کر جگتے یہ یاں دن کو دے اور رات کے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 کر چک جو کچھ کرنا ہو یاں یہ دم تو کوئی اُن ہے نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
 تہمت میں یاں تہمت لگے طوفان میں طوفان ہے رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے
 کھجک نہیں کر جگتے یہ یاں دن کو دے اور رات کے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 یاں زہر دے تو زہر لے شکر میں شکر دیکھ لے نیکیوں کو نیکی کا مزہ موزی کو ٹکڑ دیکھ لے
 موتی جو دے موتی ملیں پتھر میں پتھر دیکھ لے گر کچھ کو یہ باور نہیں تو تو بھی کر کر دیکھ لے
 کھجک نہیں کر جگتے یہ یاں دن کو دے اور رات کے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر تیرا بھی نقصان ہووے گا اس بات پر تو دعویٰ کر
 کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیے تو چھان کر یاں پاؤں کو رکھ بھونک کر اور خوف سے گزران کر
 کھجک نہیں کر جگتے یہ یاں دن کو دے اور رات کے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 غفلت کی یہ جاگہ نہیں یاں صاحب اور اک رہ دلشاد رکھ دلشاد رہ غمناک رکھ غمناک رہ
 ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ یہ وہ مکاں ہے اومیاں یاں باک رکھ میاں ہ
 کھجک نہیں کر جگتے یہ یاں دن کو دے اور رات کے
 کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

(۱۷) مُفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
 پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
 یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی
 کہتے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
 مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہیں یا عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
 حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی
 جواہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں
 پوچھے کوئی آلف تو اسے بتاتے ہیں وہ جو غریب غریب کے لڑکے پڑھاتے ہیں
 ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی
 مفلس کرے جو ان کے مجلس کے بیچ حال سب جانیں دیوں کا یہ الا ہے اس نے حال
 گر گر پڑے تو کوئی نہ لے اُسے سنبھال مفلس میں ہو دیں لاکھ اگر علم اور کمال
 سب خاک کی بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی
 جب روٹیوں کے بٹنے کا اگر بڑے شمار مفلس کو دیویں ایک تو نگر کو چار چار
 گر اور مانگے وہ تو اُسے جھڑکیں بار بار اس مفلسی کا آہ بیاں کیا کروں میں یا ر
 مفلس کو اس جگہ بھی چپاتی ہے مفلسی
 مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے ان پر دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر

ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر
 دیا یہی مفلسوں کو لڑائی ہے مفلسی
 کرتا نہیں جیسا ہے جو کوئی وہ کام آہ مفلس کرے ہے اس کے تئیں انصرام آہ
 سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانے حرام آہ کہتے ہیں جس کو شرم و حیانت نام آہ
 وہ سب جیاد و شرم اٹھاتی ہے مفلسی
 یہ مفلسی وہ شے ہے کہ جس گھر میں بھر گئی بھر جتنی گھر میں ست تھی اسی گھر کے درگئی
 زن بچے روتے ہیں گویا نانی گزر گئی ہمسائے پوچھتے ہیں کہ کیا دادی مر گئی
 بن مردے گھر میں شور مچاتی ہے مفلسی
 لازم ہے گرمی میں کوئی شور غل مچائے مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
 مردادے گر کوئی تو کہاں سے لے اٹھائے اس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ملے
 مردے کو بن کفن کے گڑاتی ہے مفلسی
 کیا کیا میں مفلسی کی کہوں خواری بھکڑیاں جھاڑو بغیر گھر میں بھرتی ہیں جھکڑیاں
 کونوں میں جلے لپٹے ہیں پچھڑیاں پیدانہ ہوویں جن کے جلائے کو لکڑیاں
 دریائیں ان کے مردے بہاتی ہے مفلسی
 بی بی کی نٹھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کٹے ہے کپڑے میاں کے بننے کے گھر میں پڑے ہے
 جب کڑیاں بگ گئیں تو کھنڈر میں اڑے ہے زنجیر نے کو لڑنے پتھر گڑے ہے
 آخ کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی
 نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے سب رنگ دم میں کڑے مصور کے کر کرے
 صورت بھی اس کی دیکھ کے نہ سمجھ لے پے تصویر اد نقش میں کیا رنگ وہ بھرے

اس کے تو منہ کا رنگ اڑاتی ہے مفلسی
 عاشق کے حال پر بھی جب آ مفلسی پڑے مشوق اپنے پاس نہ دے اس کو بیٹھنے
 آوے جو رات کو تو نکالے وہیں اسے اس ڈرے یعنی رات کو ایذا کہیں دے
 نہمت یہ عاشقوں پہ لگاتی ہے مفلسی
 کیسی ہی دھوم دھام کی رہی ہو خوش حال جب مفلسی کا کن ٹپے اس کے سر پہ جال
 دیتے ہیں اس کے نالچ کو ٹھٹھے کے بیچ ڈال ناپے ہے وہ تو فرش کے اوپر قدم سنبھال
 اور اس کو انگلیوں پہ نچاتی ہے مفلسی
 اس کا تودل ٹھکانے نہیں بھاؤ کیا بتائے جب ہو بیٹھا ڈوٹا تو کاسے سے منہ چھپائے
 وہ شام سے لے صبح تک گو کہ ناپے گا سنے اوروں کو اٹھ سالت تو وہ دو ٹکے ہی پاسے
 اس لاج سے اُسے بھی لجاتی ہے مفلسی
 جب مفلسی ہو دے کلا دنت کا دل ادا اس پھر ناپے لے طنز و سہ کو ہر گھر کے اس پاس
 اک پاؤ سیر کرے کی دل میں لگا کے اس گوری کا وقت ہو تو ناک کا سہ ہے وہ بھی اس
 یاں تک حواس اُس کے اڑاتی ہے مفلسی
 مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول سیاکہاں جو جا کے وہ او سے جیمز مول
 جو رو کا وہ گلاسہ کہ پھوٹا ہو جیسے ڈھول گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
 ہیبت تمام اُس کی اٹھاتی ہے مفلسی
 بیٹے کا بیاہ ہو تو نہ بھائی نہ ساتھی ہے نے روشنی نہ باجے کی آواز آتی ہے
 ماں پیچھے ایک میلی چادر اوڑھے جاتی ہے بیٹا بس اسے دو لٹا تو ہاوا اڑتی ہے
 مفلس کی یہ بات پڑھاتی ہے مفلسی

گر بیاہ کر چلا ہے سحر کو تو یہ بلا
شہدا زنا نہ ہیجڑا اور بھاٹ منڈپرا
گھیرے ہوئے اسے چلے جاتے ہیں جا بہ جا
وہ آگے آگے لڑتا ہوا جاتا ہے چسلا
اور نیچے پھڑکیوں کو بجاتی ہے مفلسی

دروازے پر زانے بجاتے ہیں تالیاں
اور گھر میں میٹھی ڈومنی دیتی ہے گالیاں
مالن گئے کا ہار ہو دوڑے لے ڈالیاں
سقا کھڑا سناٹا ہے باتیں رذالیاں
یہ خواہی یہ خرابی دکھاتی ہے مفلسی

کوئی شوم بے حیا، کوئی بولا نکھٹو ہے
بیٹے نے جانا باپ تو میرا نکھٹو ہے
بیٹی بکارتی ہے کہ بابا نکھٹو ہے
بی بی یہ دل میں کہتی ہے بھڑوا نکھٹو ہے
آخر نکھٹو نام دہراتی ہے مفلسی

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھٹھاتا نہیں
مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حُسن کو کوئی جانتا نہیں
صورت بھی اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

جس وقت مفلسی سے یہ آکر ہوا تباہ
پھر کوئی اس کے حال پہ کرتا نہیں نگاہ
دالیدری کئے کوئی ٹھراوے رویاہ
جو باتیں عمر بھر نہ سنی ہو ویں اس نے آہ
وہ باتیں اس کو آگے سناتی ہے مفلسی

چوٹے تو ان پانی کے ٹکے میں آبی ہے
پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نہ رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے
مفلس کی جو روپ ہے کہ ہاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گواہی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پراغلاس کے لفیل
کوئی گدھا کئے اسے ٹھیرا دے کوئی بیل

کپڑے پچھے تمام بڑے بال پھیل پھیل منہ نیشک دانت زرد بدن پر جا ہے میل
 سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی
 ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
 اپنوں کی مہر غیری کی چاہت گھٹاتی ہے خرم و جیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
 ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی
 جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
 کپڑے پچھے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
 مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی
 مفلس کسی کا دل کا جو لے پیار سے اٹھا باپ اس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کرٹا
 کہتا ہے کوئی جوتی نہ لیوے کہیں چڑا نٹ کھٹ اچکا چور دغا باز گٹھ کسٹا
 سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی
 رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو سب خاک میں ملائی ہے حرمت کی شان کو
 سوختوں میں اس کی کھیلتی ہے جان کو چوری پہ اکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
 آخوندان بھیک لگاتی ہے مفلسی
 دنیا میں لیکے شاہ سے لے یار و تا فقیر خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسپر
 اشرف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
 وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

(۱۸) معجزہ حضرت علی علیہ السلام

سنئے ہواے علیؑ کے مجاہدان دوستدار
ہے تازہ واردات یہ از قتل روزگار
اک ہجرہ میں کہتا ہوں اُس شہ کا آشکار
تھا کوئی شخص دولت و جنت میں نامدار
اک روز وہ گیا تھا کہیں کھیلنے شکار

جس دشت میں شکار کو گزرا تھا وہ غنی
واں ایک شیر رہتا تھا اور اس کی شیرنی
تھا ایک چشمہ پانی کا اور سبز تھی بنی
دو بچے اس بنی میں تھے وہ شیرنی جنی
دس برس روز کے تھے ابھی طفل شیر خوار

بچوں کو اپنی چھاتی پہ رکھے وہ بے زباں
دونوں کو میٹھی دودھ پلاتی تھی شا دماں
بندوق کی جو آئی صدا اس میں ناگہاں
نرمادہ دونوں بھاگ گئے بھوکے نیم جاں
بچے اکیلے رہ گئے جنگل میں ہیستار

القصر جب شکار سے فارغ ہوا وہ شاہ
رکھوا کے ان کو اونٹ پہ جلد می سے خواہ خواہ
محلوں میں اپنے آن کے اس نے لیا قرار

جب آئے شیر و شیرنی باحالت تباہ
اور دونوں بچے گھر میں نہ آئے انہیں نگاہ
وہ شیر کھا کے غشس گرا اک بار کر کے آہ
اور شیرنی نے فی نجف اشرف کی ودھیں راہ
سر پٹتی چلی وہ سیاہاں سے سوگوار

القصر کتنے روز میں وہ شیرنی غریب
بھوک پیاسی پھیرتی ہونٹوں پہ خشک جیب

شوہر سے چھوٹی اور بھئی بچوں سے بے نصیب
 اپنی بیک بیک نجف اشرف کے عنقریب
 بچوں سے اپنے سر پہ اڑاتی ہوئی غبار
 بازار میں نجف کے جب آئی وہ نیم جاں
 ہر اک دوکان سے اس کی اٹھا شور اور نجاں
 کوئی پکارا دوڑیو کوئی پکارا ہاں
 ہیبت سے اس کی چھپنے لگے پیر اور جواں
 چاروں طرف سے دھوم مچی آ کے ایک بار
 وہ تو کسی طرف کو نہ گھڑکی بستی تھی
 نے منہ کو موڑتی تھی نہ پنجرہ اٹھاتی تھی
 آنکھوں سے اس ہجوم میں آنسو بہاتی تھی
 شاہ نجف کے رونے پہ فریاد دی جاتی تھی
 لوگ اس پر اپنے خوف سے کرتے تھے مار مار
 جس دم وہ اپنی حیدر صفدر کے در تک
 دربان اس کے خوف سے کیسر گئے سرک
 داخل ہوئی وہ روضہ انور میں یک بیک
 رونے لگی وہ سامنے سر کو پٹک پٹک
 آنسو کی دونوں آنکھوں سے بہنے لگی قطا
 آنکھوں سے اس کے آنسو کی ندی جو بہتی تھی
 بچوں کا داغ اپنے کلبجے پہ بہتی تھی
 کچھ منہ سے شور کرتی تھی کچھ دیکھ رہتی تھی
 گویا وہ شہ سے اپنی زباں میں یہ کہتی تھی
 بچے مرے دلائیے یا شیر کردگار
 روتی تھی یوں وہ شیرنی آنسو بہا بہا
 مظلوم جیسے رونے سے عادل کے پاس آ
 اور کچھ زباں سے اپنی سنانی تھی بغیر
 نکلے تھی آغا آغا کی منہ اس کے سے صدا
 کہ آغا آغا درو سے روتی تھی زار زار
 فریاد می بن کے سانی گویا کے سامنے
 محتاج بن کے صاحبِ قبر کے سامنے
 یوں دیکھتی تھی روضہ انور کے سامنے
 مظلوم جیسے آن کے داور کے سامنے

کرتا ہے اس کے حکم کا رہ رہ کے انتظار
 لوگوں کے دل سے جب تو ہوا خوف اس کا کم
 سب اس کے پاس آن کے دکھیں تھے اس کا غم
 ہر اک اپنے سر کو پٹک کر بہ چشمِ غم
 فریادی داد مانگے ہے جوں ہاتھ کو پیار
 فریاد وہ تو مانگے تھی آئنا سے بھوم بھوم
 یعنی فلک نے مجھ کو دکھایا یہ روزِ شوم
 اس بات سے تمامِ نجف میں پڑی یہ دھوم
 گرد اس کے مرد و زن کا ہوا آن کر بھوم
 حیرت میں تھے تمام چہ نا داں چہ ہوشیار
 کوئی پانی اس کے واسطے کوئی کھانا لاتا تھا
 لیکن اُسے تو رونے سوا کچھ نہ بھاتا تھا
 بچوں کا دل غمِ ہوش سب اس کے اڑاتا تھا
 جو اس کو دیکھتا تھا اُسے رونا آتا تھا
 ایسی طرح سے سر کو پٹکتی تھی بار بار
 جب تین دن وہ شیرنی بھوکی پڑی رہی
 ناچار اُن شریفوں نے دیکھ اس کی بے کلی
 جس طرح وہ قدیم سے گمنے کی راہ تھی
 اس طرح سے جنابِ مقدس میں عرض کی
 بائینہ الم کش و با چشمِ اشکبار
 آئی نہ ایہ شیرنی دیتی دہائی ہے
 اک شخص کے یہ ظلم و ستم کی ستائی ہے
 بچوں نے اس کے قید کی آفت جو پائی ہے
 سو اب ہمارے رونے پہ فریادی آئی ہے
 کل اُس کا بھید ہووے گا تم سب پہ آشکار
 یاں تو شریف کو یہ عنایت ہو اجواب
 واں جا پلنگ اُلٹ دیا اس کا برعین خواب
 فرمایا وہ جو شیر کے بچے ہیں دلِ کباب
 بھجوا دے ان کو شہرِ نجف میں تو کلِ شباب
 ورنہ تو اس گمنے سے بہت ہو گا شرمسار

ماں ان کی اُن کے واسطے آنسو بہاتی ہے اور تین دن ہوئے ہیں نہ پتی نہ کھاتی ہے
 فریادی ہو کے روتی ہے اور غل مچاتی ہے غش ہو ہوائے روضے میں جی کو کھپاتی ہے
 جلدی سے ان کو بھیج دے کراونٹ پر سوار

وہ تھر تھرا کے کانپ اٹھا ہو کے غدر خواہ جانا یہ اس نے یہ ہیں شہنشاہ دیں پناہ
 بولا نجف کو پندرہ دن کی ہے یاں سے راہ بچھا دوں کس طرح سے انھیں کل میں پُرگاہ
 اتنا تو اس غلام میں کب ہے کا اختیار

جب حکم یہ ہوا اسے جس وقت ہو سحر جلدی سے دونوں بچوں کو رکھوا کے اونٹ پر
 بچھاوے اپنے شہر کی آبادی سے اُدھر جب بھونچیں گے یہ شہر کے دروازے کے اوپر
 واں پیدا ہو گا غیب سے اک ناقہ و سوار

ہوئے ہی صبح اس نے منگا کر وہ دو بچے رکھوا کے ایک اونٹ پہ جلدی رواں کئے
 جب لوگ آئے شہر کے دروازے کے کئے کیا دیکھیں ایک شخص کو واں آدھی رات
 ہے منتظر وہ اونٹ کی پکڑے ہوئے ہمار

جاتے ہی دونوں بچے انھوں نے اُسے لے با احتیاط سوئپ کے پھر شہر کو پھرے
 وہ اُن بچوں کو لے کے چلا اس شتاب سے آپھونچا اس مکان میں اک پھر دن چڑھے
 یک بار اس کا شہر نجف میں ہوا گزار

بچوں کے آنے کے جب غل ہوئے کروڑ وہ شیرنی بھی تکنے لگی اپنے منہ کو موڑ
 جب لا کے اس کے سامنے بچے دے وہ چھوڑ یوں خوش ہو چاٹنے لگی الفت کی کر جھنجھوڑ
 انسان جیسے کرتا ہے بچوں کو اپنے پیار

بچے بھی دوڑ ماں کے گلے سے لپٹ گئے یوں جیسے کوئی دور کا بچھڑا ہوا لے

چھاتی پہ لوٹ لوٹ کے جادو دھ سے لگے اُس شیرنی کے جیسے کلیجے میں داغ ستھے
 ویسی ہی اس کے مُنہ پہ خوشی کی ہوئی بہار
 جب اس نے بچے پائے تو ہو کر وہ شاداں بچوں سمیت اُٹھ کے وہ حیوان بے زباں
 روضے کے سات بارِ تصدق ہوئی وہاں پھر آستانہ چوم ہوئی واں سے وہ رواں
 جا پہنچی اپنے دشت میں خوش ہوتی بار بار
 شیر خدا کے عدل کی یہ دیکھ رہی رسم و راہ خلقت تمام واں کی پکاری کر واہ واہ
 انعام ایسا چاہئے اے شاہ دیں پناہ حامی و منصف اور نہیں کوئی تم سا شاہ
 ہے ختم تم یہ عدل و حمایت کا کاروبار
 حیوان تمہارے لطف سے جس وقت کہو میں شاد انساں پھر اس مکاں سے رہیں کیونکہ نامراد
 جیسے تمہارے در سے ملی شیرنی کی واہ احسان ایسے ایسے بہت اے کرم نہاد
 ہیں گے تمہارے صفحہ عالم میں یادگار
 اے شاہ یہ نظیر تمہارا غلام ہے رکھتا سوا تمہارے کسی سے نہ کام ہے
 عاصی ہے پرگناہ ہے اور ناتمام ہے دن رات اُس کا آپس اب یہ کلام ہے
 رکھو بچو میری آبرو دیا شیر کردگار

(۱۹) دوالی

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
 سبھی کے دل میں سماں بھاگیا دوالی کا کسی کے دل کو مزہ خوش لگا دوالی کا

عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے، کھیلوں، بتاسوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے جلوائی
پکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی
بتا سے لے کوئی برنی کسی نے تلوائی
کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی
گویا انھوں کے واس راج آگیا دوالی کا

صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار
انھوں نے کھایا ہے اس دن کے واسطے ہی اُدھار
کے ہیں ہنس کے قرض خواہ سے ہر اک اک بار
دوالی آئی ہے سب دے چلائیں گے لے یار
خدا کے فضل سے ہے آ سرا دوالی کا

مکان لپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی
جلا چراغ کو کوڑی وہ جلد جھنکائی
اَصَل جاری تھے ان میں تے جان سی آئی
خوشی سے کو د اچھل کر پکائے او بھائی
شگوں پہلے کرو تم ذرا دوالی کا

شگن کی بازی لگے پہلے یار گنڈے کی
پھر اس سے بڑھ کے لگی تین چار گنڈے کی
پھری جو ایسی طرح بار بار گنڈے کی
تو آگے لگنے لگی پھر ہزار گنڈے کی
نہ سال زرخ لگا پھر تو آ دوالی کا

کسی نے گھر کی حویلی گرورکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر بنا بسا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چڑا چھپا ہاری
کسی نے گھڑی پڑوسن کی اپنی لاہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی کا

کسی کو داؤ پہ لائی موٹھ نے مارا کسی کے گھر پہ دھڑا سختہ نے انگارا
کسی کو زدنے چوڑے کے کر دیا زارا لنگوٹی باندھ کے بیٹھا ازار تک ہارا
یہ شور آ کے مچا جا بجا دوالی کا

کسی کی جورو کہے ہے پکارے بھڑوے بہو کی نوگرہی بیٹے کے ہاتھ کے کھڑے
جو گھر میں آوے تو سب مل کے ہیں سو گھڑوے نکل تو یاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے
خدا نے تجھ کو تو شہسار کیا دوالی کا

وہ اس کے جھونٹے پکڑ کر کہے ہے ماروں گا ترا جو گناہ ہے سب تار تار اُتاروں گا
حویلی اپنی تو اک داؤ پر میں ہاروں گا یہ سب تو ہارا ہوں خندی تجھے بھی ہاروں گا
چڑھا ہے مجھ کو بھی اب تو نشا دوالی کا

تجھے خبر نہیں خندی یہ لت وہ پیاری ہے کسی زمانے میں آگے ہوا جو جوا ری ہے
تو اس نے جورو کی نتھ اور ازار اُتاری ہے ازار کیا ہے کہ جو روتلک بھی ہاری ہے
سنا یہ تو نے نہیں ماجرا دوالی کا

جہاں میں یہ جو دوالی کی سیر ہوتی ہے تو زر سے ہوتی ہے اور زربغیر ہوتی ہے
جو ہارے ان پہ خرابی کی فیر ہوتی ہے اور ان میں گن کے جن جن کی خیر ہوتی ہے
تو آڑے آتا ہے ان کے دیا دوالی کا

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانو یارو نصیحتیں ہیں انہیں دل میں ٹھانیو یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو جو جوا ری ہو نہ بُرا اس کا مانو یارو
نظیر آپ بھی ہے جوا ریا دوالی کا

(۲۰) حضرت سلیم چشتی

ہیں دو جہاں کے سلطان حضرت سلیم چشتی
سر دفتر مسلمان حضرت سلیم چشتی
عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سر دار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

برج اسد کی رونق عرش بریں کے تارے
یہ بات جان دل سے کہتے ہیں سب پیارے
گلزار دین کے گلبن اللہ کے سنوارے
تم وہ ولی ہو برحق جو فیض سے تمھارے

عالم ہے باغ و بہستاں حضرت سلیم چشتی
شاہوں کے بادشاہ ہو تاج بالا ہو
اور قبلہ صفا ہو اور کعبہ ضیا ہو
خلقت کے رہنما ہو دنیا کے مقتدا ہو
تم صاحب سخا ہو محبوب کبریا ہو

ہے تم سے زیب امکاں حضرت سلیم چشتی
شاہ و گدا ہیں تابع سب تیری مملکت کے
لاؤں تم ہی ہو شاہ اس قدر و منزلت کے
پروردہ ہیں تمھارے سب خوان کرم کے
شاہ شرف تو بخشے خالق کی سلطنت کے

اور تم ہو میسر ماں حضرت سلیم چشتی
ہے نام پاک تیرا مشہور شہر و بن میں
کرتی ہیں یاد قائم کو یہ جانیں ہیں جو تن میں
ہے خلق نئی تمھارے خوشبو گل دامن میں
خدمت میں ہیں تمھاری فردوس کے چمن میں

جنت کے عور و غلاماں حضرت سلیم چشتی
کعبہ سمجھ کے اپنا مشتاق تیرے در کو
کرتے ہیں آ زیارت دل سے بھکا کے سر کو

اوصاف تیرے ہر دم لیتے ہیں سیم و زر کو پڑھتے ہیں مدح تیری گلشن میں ہر سحر کو

ہو بلبل خوش الحان حضرت سلیم چشتی

ہے سلطنت جہاں کی سب تیرے زیرِ قراں چاکر ہیں تیرے در کے فغفور اور خاقان
خوابِ کرم پہ تیرے ہے خلق ساری مہاں ہیں علم میں تمہارے جن و پری و انساں

ہو وقت کے سیلاں حضرت سلیم چشتی

تم سب سے ہو معظم اور سب سے ہو مکرم خلقت ہوئی تمہارے سب نور سے مجسم
اور خوبیاں جہاں کی تم پر ہوئیں مسلم ابرکرم سے تیرے دائم ہے سبز و خرم

عالم کا سب گلستاں حضرت سلیم چشتی

پشت دہنا ہو تم ہر اک گدا و شہ کے محتاج ہیں تمہاری اک لطف کی نگہ کے
منزل پہ کے پھونچے سالک تمہاری رہ کے خاکِ قدم تمہاری اور چشمِ ہر دمہ کے

ہو روشنی کے ساماں حضرت سلیم چشتی

چشم و چراغ ہو تم اب جملہ مومنین کے روشن ہیں تم سے پردے سب آسمان زمین کے
بیشک ضیائے دل ہو ہر صاحبِ یقین کے ذرہ نہیں تفاوتِ تم آسمان ہو دیں کے

ہو آفتابِ رخشاں حضرت سلیم چشتی

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے حرمت، دوستوں کی حضرت تمہارے رو سے
یہ چاہتا ہوں اب میں سودل کی آرزو سے رکھو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے

اے موجود ہر احساں حضرت سلیم چشتی

(۲۱) ھولی کی بھسا

جب پھاگن رنگ جھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 پریوں کے رنگ دکھتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 اور دھڑ کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی

محبوب نشے میں چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 ہونانچ رنگیلی پریوں کا بیٹھتے ہوں گلو رنگ بھرے
 دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
 کچھ گھنگر دتال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
 ہر آن شرابی دھلتی ہوں اور ٹھٹھہ ہونگے ڈوبوں کا
 وہ سب سامان مہیا ہوا اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
 اس عیشِ معرے کے عالم میں اک غول کھڑا جموں کا

کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی طیاری ہو
 کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
 اس رنگ بھری پچکاری کو انیا پر تک کر ماری ہو

سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ زندگی ناپھنے والی ہو
 منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی نے کی سیالی ہو
 نے نوشی ہو، بیہوشی ہو، بھڑوے کے منہ میں گالی ہو

بھڑوے بھی بھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ھولی کی
 ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کچھ بڑھ بڑھ کے
 اور ایک طرف دل لینے کو محبوب ہوئیوں کے لڑکے

کچھ ناز جادویں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گاویں اڑاڑ کے
 کچھ لچکے شوخ کمر بنی، کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھر کے
 کچھ کافزین منگتے ہوں تب دیکھ ہماریں ہولی کی
 یہ دھوم مچی ہو ہولی کی اور عیش مزے کا جھک رہو
 معجون شرابیں، نانچ مزا اور ٹکلیاں سلفا، لکڑ ہو
 لڑ بھڑ کے نظیر بھی نکلا ہو کچھ طیں لٹھر پتھر ہو
 جب ایسے عیش منگتے ہوں تب دیکھ ہماریں ہولی کی

(۲۲) نانک شاہ گرو

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
 مقصود، مراد، امید، سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
 سب سیں نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو
 ہر آن دلوں فوج یاں اپنے جو دھیان گرو کالاتے ہیں
 گرا پنی لطف و عنایت سے سکھ چین انھیں دکھلاتے ہیں
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
 سب سیں نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو
 جو آپ گرو نے بخشش سے اُس خوبی کا ارشاد کیا
 یاں جس جس نے اُن باتوں کو ہے دھیان لگا کر یاد کیا
 ہر بات وہ ہے اُس خوبی کی تاثیر نے جس پر صا د کیا
 ہر آن گرو نے دل اس کا خوش وقت کیا اور شاد کیا
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرد
 دن رات جنھوں نے یاں مل بیج ہے یاد گرو سے کام لیا سب من کے مقصد بھر پائے خوش وقتی کا سنگام لیا
 دکھ درد میں اپنے دہیان لگا جس وقت گرو کا نام لیا بل بیج گرو نے اُن انھیں خوش حال کیا اور تھام لیا
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرد
 سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرد
 یاں جو جودل کی خواہش کی کچھ بات گرو سے کہتے ہیں وہ اپنی لطف و شفقت سے نت ہاتھ انہوں کے گتے ہیں
 الطاف سے اُن کے خوش ہو کر سب خوبی سے یہ کہتے ہیں دکھ درد انھوں کے ہوتے ہیں سوکھ سے جگ میں بہتے ہیں
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرد
 سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرد
 جو ہر دم اُن سے دہیان لگا امید کرم کی دہرتے ہیں وہ اُن پر لطف و عنایت سے ہر اُن توجہ کرتے ہیں
 اسباب خوشی اور خوبی کے گھر بیج انہوں کے بھرتے ہیں آئند عنایت کرتے ہیں سب من کی چنتا ہرتے ہیں
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرد
 سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرد
 جو لطف عنایت ان میں ہیں اب نصف کسی سے اُن کا ہو وہ لطف و کرم چوکرتے ہیں ہر جا و طرف میں ظاہر و د
 الطاف جنھوں پر ہیں اُن کے سو خوبی حاصل ہے اُن کو ہر اُن نظیر اب یاں تم بھی تو بابا نانک شاہ کو
 اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرد
 سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرد

۲۳ جَنم کھیا جی

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے اُس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دو بالا ہوتا ہے
سب بات بھٹا کی بھولے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے آئند منڈیلے بابت ہیں نت بھوں اُجالا ہوتا ہے

یوں نیک پختہ لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لپن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم
بھو ساعت سے یوں نیامیں اوتار گرجیں آتے ہیں جو اردن ہے دھیان بھلی سبان کا بھید بتاتے ہیں
وہ نیک مہور گرج جن دم اس شمسٹ میں جنم جاتے ہیں جو سلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ جا دکھلاتے ہیں
یوں دیکھنے میں اور کتنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں

پر بالے ہی پن ہیں اُن کے اُکار نرالے ہوتے ہیں
یہ بات کہی جو میں نے اب یوں اس کو تو اب دھیان لگا ہے بندت پشک نیچ لکھا تھا کنس جو راجا متھرا کا
دھن ڈھیر بہت بل تیج نیٹ سامان اینک اور ٹیل ٹا گج اور ترنگ اچھے نیکے انباری ہو دے زین سجا

جن بن ٹھن اوپنے ہستی پردہ پانی آن نکلتا تھا
سب ساز بھلا بھل کرتا تھا اور سنگ ٹٹاک دل چلتا تھا

اک روز جو اپنے بچ بل پردہ کنس بہت مغرور ہوا اور منس کر بولا دنیا میں ہے دو جا کون بلی مجھ سا
اک بان لگا کر بہت کوچا ہوں تو دوں اک بل میں گرا اس نیس کے بڑھ بل جتنے ہیں کون جو مجھ سے ہو سوا
جو دُشٹ کوئی آج تھ کرے کب موں پردا کا جو رچلے
وہ سامنے میرے آیا ہو جوں جیلٹی ہانٹھی پاؤں تلے

وہ ایسے ایسے کہتے ہی جو بول کر بھگدے کے کہتا تھا سب لوگ بھاگے سنتے تھے کیا تاج بولے کوئی ذرا
 تھا ایک پرکھ دیوں بولا "تو بھولا اپنے بل پر گیا جو تیرا مارن ہارا ہے سو وہ بھی جہم اب لیوے گا
 تو اپنے بل پر ہائے مور کھراس کن عبث بنکار لیا
 وہ تجھ کو مار گراوے گا یوں جیسے جھنگا مار لیا"

یہ بات سنی جب کنس نے واں تب سن کر اس کے ہوش اُٹے بھومن کے بھیتر کن بھرا اور بول کر بھگدے بسرے
 یوں بوجھا وہ کس دیس میں ہے اور کون ہوں اگر بننے کون اُس کے مات پتا ہو دیں جو پالیں اُس کو چاہت سے
 وہ بولا، "متھرا نگری میں اک روز جہم وہ پاوے گا
 جب سیاتا ہوگا تب تجھ کو اک پل میں مار گراوے گا"

یہ بات سنی کنس کو پھر اور اٹھ لکیریں واں ٹھنچیں بس دیوتا کا ناؤں کما اور دیوکی، ماتا ٹھنچیں
 اُن اٹھ لکیروں کی باتیں پھر کنس کو اُس نے سمجھائیں سب چھوڑ چھوڑ دیوکی کے ہیں جگ میں ہوا اٹھ یو ہیں
 بل نیچ کر ب میں تو نے تو سب کا رنج گیان بسا رہا ہے
 جو اپنے پچھے رکھا بچھی ہے وہ شیر مارن ہارا ہے

اس بات کو سن کر کنس بہت تب من میں اپنے گھبرا یا جب نارو من اُس پاس گئے تب ان سے اس نے بھید کہا
 تب نارو من نے اس کو بھی کچھ اور طرح سے سمجھایا پھر کنس کو واں اس بات سو اچھ اور نہ مارگ بن آیا
 جو اپنی جان بچانے کا کر سہج یہ اُس نے پھند کیا
 بلوا بسید اور دیوکی کو اک مندر بھیتہر بند کیا

جب قید کیا ان دونوں کو تب چوکیدار دئے پٹھلا اک کن نہ کنس پاویں یہ، پھر ان سب کو یہ حکم دیا
 رامان رسوئی کا جو تھا سب اُن کے پاس دیا رکھا اور دودار دئے اُس مندر کے تب بھاری تالے بھی لٹڑوا
 ہشیار لگیوں رہنے واں نت چوکی کے دینے ہارے

کیا تاب جو کوٹھے چھتے پر اک آن پرندہ پر مارے
 بھو بیٹھا تھا جو کنس کے من وہ بھر کر نیند نہ سوتا تھا
 اس مندریں ان دونوں کے جب کوئی بالک ہوتا تھا
 کنس آن اُسے چھپ مارے تھا من مات پتا کاروتا تھا

اک مدت تک ان دونوں کا اس مندر میں یہ حال رہا
 جو بالک ان کے گھر جاسو مارتا وہ چنڈال رہا
 پھر آیا وہاں اک وقت ایسا جو آئے گرب میں منموہن
 گوپال، منوہر، مرید، سیکشن، کشورن، کنول، نین
 گھنٹا، م، مزاری، بنواری، گردھاری، مندر، شام، برن
 پر بھو تاتھ بہاری کان لاسکھ لانی جگ کے دکھ بھجن
 جب ساعت پڑھٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھرتیا کی

اب آگے بات جنم کی ہے بے بلو کشن کنھیا کی
 تھا نیک مہینہ بھاؤں کا اور دن بدھ گنتی اکھن کی
 سبھ ساعت نیک مہورت سے واں جنمے آکرشن جھی
 اس مندر کی اندھیاری میں جو اور اجالی آن بھری
 بسیدو سے بولیں دیو کی جی مت ڈر بھو من میں گھیر کر د
 اس بالک کو تم گوکل میں لے پہنچا اور مت دیر کرو

جو تم اس کے لے جانے میں یاں تک بھی دیر لگاؤ گے
 وہ ڈشٹ اسے بھی مارے گا پھناتے ہی رہ جاؤ گے
 اس آن سنھل کر تم اس کو جو گوکل میں پہنچاؤ گے
 اس بات میں یہ پھل پاؤ گے جو اس کی جان پھاؤ گے

واں گوکل باشی جو اس کو لے اپنی گود سنھالے گا
 کچھ نام وہ اس کا رکھ لے گا اور مہر دیا سے پالے گا

جو حال یہ واں جا پہنچے گا تو اس کا جی بیج جاوے گا
 جو کرم لکھی ہے تو پھر بھی کھہم کو آن دکھاوے گا
 جس گھر کے بیج پلے گا یہ وہ گھر ہم کو تملادے گا
 ہم اس سے ملنے جاویں گے یہ ہم سے ملنے آوے گا

نے کام ہیں کچھ دعوے سے نے جھگڑا اور پر کیلے سے
 جب دیکھیں تو من بھٹکے گا، سکھ پاویں گے اس کے دیکھے سے
 ہے آدمی رات ابھی تو یاں لے جاؤ اسے تم حال دھر
 من بیچ انھوں کے تھا ڈیرہ دن ہو دے گا تو کنس کر
 یہ بات نہ تھی معلوم انھیں یہ بالک جگ نثار سے گا
 کب مار سکے گا کنس اسے یہ کنس کو آپ ہی مارے گا
 جب دیو کی نے بید یو جی سے واں رو رو کر رہتا کہی
 اور دوار لگے ہیں تالے کل کچھ بات نہیں میرے بس کی
 وہ بالک کو جبے تکے سب ساکر پٹ پٹ چھوٹ گئے
 تھے تالے جتنے دوار لگے اُس آن جھڑا بھر ٹوٹ گئے
 جب آئے چوکیداروں میں تب واں ابھی یہ صورت دیکھی
 جب سوتا دیکھا اُن سب کو ہونے بھونکے واں سے بھی
 یہ سہج ہوا من بیچ انھیں پیر اس جل میں کیسے دھرے
 ہے رین اندھیری بالک سنگ اس بیتا میں اب کیا کرے
 رن من میں ٹھرا پھر چلے پھر آپ ہی من مضبوط ہوا
 جوں جوں پاؤں بڑھاتے تھے وہ پانی چڑھتا آتا تھا
 تب پاؤں بڑھائے بالک نے جو آپ سے اور بھیگے جل میں
 جب جنائے پگ جوم لے جا پھونچے پار وہ اک پل میں
 سب آن بلجے گوئل میں سب پھاٹک اُن بھی پائے کھلے
 تب واں سے چلتے چلتے وہ پھر زندہ دوارے آ پھونچے

واں مندر محل کے دواں بھی سب دیکھے پٹ پٹ دور کھڑے جو چوکی والے ہوتے تھے اب کون انہیں روکے ٹوکے
 جب بیچ محل کے جا پہنچے سب سوتے واں گھر والے تھے
 ہر جا طرف اچالی تھی جوں سانچہ میں دیوے بالے تھے
 اک اور اچنچیاہ دیکھو جرات جنم سی کشن کی تھی اس رات جسودا کے گھر میں تھی جننی یار دواں لڑکی
 واں سوتے دیکھ جسودا کو اور ہڈی کر اس بالک کی اس لڑکی کو وہ آپ اٹھالے نکلے آئے متھر اچھی
 جب لڑکی لائے مندر میں سب تالے مندر لاگ اٹھے
 جو چوکی دینے والے تھے پھر وہ بھی اس دم جاگ اٹھے
 جب بھور ہوئی تب گھر اکڑند کنس نے لی اس مندر کی جب تالے کھلوا بیچ گیا تب لڑکی جننی اک دیکھی
 لے ہاتھ پھر باچکر دے 'تو پٹکے' وہ بن پٹکے ہی یوں جیسے بجلی کو بند ہے جب چھوٹ ہوا پر جا بھوچی
 یہ کہنی نکلی "لے مور کھ کیا تو نے سوچ بچا را ہے
 وہ جیتا اب تو سیس مکٹ ہو تیرا مارن ہارا ہے"
 جب کنس نے واں یہ بات سنی من بیچ بہت سالچیا یا جو کارن ہونے والا ہے وہ ٹالے سے کب ہے ٹلتا
 سو فکر کرو سو بیچ کرو سو بات سننا حاصل کیا ہر آن وہی یاں ہونا ہے جو ماتھے کے ہے بیچ لکھا
 ہیں کہتے ہمد جسے اب یاں وہ سوچ بڑے ٹھیراتی ہے
 تقدیر کے آگے پر یارو تدبیر نہیں کام آتی ہے
 اب مندر کے گھر کی بات سنو واں ایک اچنچیاہ ٹھیرا جرات کو جننی تھی لڑکی اور بھور کو دیکھا تو لڑکا
 گھر نالیں چھوٹیں، ناچ ہوا اور نوبت کا غل شور مچا پھر کشن گرب نے نام رکھا سب کہنے کے بل بیٹھے آ
 مندر اور جسودا اور کوات کرنے واں ہیرا پھیر لگے
 پکوان مٹھانی نیوے کے ہر نامی آگے ڈھیر لگے

سب ناری آئیں گول کی اور پاس پڑوسن بہ بیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت چاکے گاتی تھیں
کچھ ہر دم نگاہ اس بالک کا بلہا رہی ہو کر دیکھ رہیں
کچھ کھتی تھیں ”ہم بیٹھے ہیں نیک آج کے دن کا لینے کو“
کچھ کہتیں ”ہم تو آئے ہیں آئندہ بدھاوا دینے کو“

کوئی گھٹی بیٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھڑکی
کوئی لانی ہنسلی اور کھڑے کوئی کرتہ ٹوپی سیوہ گھی
کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ماتھا جوئے مہر بھری
کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اسے ہر تہارے بالے کی
کوئی کہتی سیاہ بھولاؤ اس اس مرادوں والے کی

کوئی کہتی ”بالک خوب ہوا اسے بھینا تیری نیک رتی
اس کہنے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی
یہ بالے اُن کو ملے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھساگی
یہ باتیں سب کی سُن کر یہ بات جو دا کہتی تھی
”اے میرے بالک جو ایسا اب میرے گھر میں جتا ہے

کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی مو پر گر پاستے“
تھی کونے کونے خوش وقتی اور طبلے تال تھپکتے تھے
ہر جا طرف آنندیں تھیں واں گھر میں نند جو دا کے
کچھ آنگن بیچ براب تھیں کوئی بیٹھی کوٹھے اور پچھتے
سو خوبی اور خوش حالی سے دکھلائی تھی ستان کھڑی
بیچ بات ہے بالک ہونے کی ہے دنیا میں آئندہ بڑی

پھر اور خوشی کی بات ہوئی جب بیت ہوئی دود کا ندی کی
یہ اس پر پھینکے بھر بھر کر وہ اس پر ڈالے گھڑی گھڑی
رکھوائی دودھ کی مٹکی بھر اور ڈالی ہلدی بہتیری
کوئی پونچھے نگہ اور باہن کو کوئی سساری بھیگی اور تھری
اس دودھ کی بھی رنگ ریکوں میں ردپ اور ہوا ہرناری کا

اور تن کے ابرن پوں بھیکے ہوں رنگ ہو کیسہ کیاری کا
 ٹکھ منڈل میں یہ دھوم مچی اور باہر نیگی جوگی بھی
 آنند بدھا دے باج رہے نرسے سُرنا اور ترئی
 رنگین سنہرے پالنے بھی لے ہاتھ کھڑے کتے برنی
 ہر آن اٹھاتے تھے انک کیا گنتی سونے روپے کی
 نندا اور جودا نے ایسی کی شادی بالک ہونے کی
 جو نیگی جوگی تھے ان کو اس آن نہٹ خوش حال کیا
 پھر آئے باگے ریشم کے اور زر بھی بخشا بہت سیرا
 اور جتنے ناچنے والے تھے اسباب انھیں بھی خوب دیا
 نہان جو گھر میں آئے تھے سب ان کا بھی ارمان رکھا
 دن رات چھٹی کے ہونے تک من خوش کیا لوگ لگائی کا
 بھر تھا مال روپے اور مہر دیں جب نیگ چکا یادانی کا
 نندا اور جودا بالک کو داں ہاتھوں چھاؤں میں رکھتے تھے
 نت پیار کریں تن من واریں ستھری ابرن گئے بنکے
 جی ہلا تے من پر جاتے اور خوب کھلوانے منگواتے
 ہر آن بھلاتے پلنے میں وہ ایدھر اور اودھر بیٹھے
 کر یا و نظیر اب ہر ساعت اُس پالنے اور اُس جھولے کی
 آنند سے بیٹھو چین کرو جے بولو کا نھ بھنڈولے کی

(۲۴) بانسی

جب مرلی دھرنے مرلی کو اپنی ادھر دھری
 کیا کیا پریم میت بھری اُس میں دُمن بھری
 لے اس میں ملا دھے را دھے کی ہریم بھی کھری
 لہرائی دُمن جو اُس کی ادھر اور اُدھر ذری
 سب سنے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری
 کتنے تو اس کے سننے سے دُھن ہو گئے دُھنی کتنوں کی سدھ بھر گئی جس دم وہ دُھنی سنی
 کتنوں کے من سے کل گئی اور بیا کھی چُنی کیا نر سے لے گئے ناریاں کیا گُوڑھ کیا گئی

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری
 جس آن کا نہر جی کو وہ بنی بجاوُنی جس کان میں وہ آوُنی واں سدھ بھلاوُنی
 ہر من کی ہو کے موہنی اور چت بھلاوُنی نکلی جہاں دُھن اس کی وہ میٹھی سُہاوُنی

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری
 جس دن سے اپنی بنی وہ سیکشن نے سچی اس سانور سے بدن پہ نیٹ آن کر سچی
 مر لی بھلایا آپ کو ناری نے سدھ چکی ان کی اُدھر سے آکے وہ بنی جدھر بجی

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری
 گوالوں میں نند لال بجاتے وہ جس گھڑی گوئیں دُھن اس کی سننے کو رہ جاتیں سب کھڑی
 گلیوں میں جب بجاتے تو وہ اس کی دُھن مری لے لے کے اپنی لہر جہاں کان میں پڑی

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری
 بنسی کو مر لی دھر جی بجاتے گئے جدھر پھیلی دُھن اُس کی زور ہر اک دل میں کر اثر
 سننے ہی اس کی دُھن کی حلاوت دھر دھر منہ چنگ اور نے کی دھنیں دل سے بھول

سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
 ایسی بھائی کُشن کنہیا نے بانسری
 بن میں اگر بجاتے تو واں بھی یہ اُس کی چاہ کرتی دھن اُس کی بچی بڑھی کے دل میں راہ
 بستی میں جو بجاتے تو کیا شام کیا بگاہ پڑتے ہی دھن وہ کان میں بھاری ہو گئے راہ
 سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
 ایسی بھائی کُشن کنہیا نے بانسری
 کتنے تو اس کی دھن کے لئے رہتے بیقرار کتنے لگائے کان اُدھر رکھتے بار بار
 کتنے کھڑے ہو راہ میں کر رہتے انتظار آئے جدھر بجاتے ہوئے شام ہی مُرار
 سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
 ایسی بھائی کُشن کنہیا نے بانسری
 موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن لے اس کی من کی موہنی دھن اس کی چت ہرن
 اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بچن کیا چل پون نظیر اکیمیر و کیا ہرن
 سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
 ایسی بھائی کُشن کنہیا نے بانسری

(۲۵) آگے کی تیراکی

جب پیرنے کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
 بھولے یار نے نادان ہتیار پیرتے ہیں پیرو جان و لڑکے عیار پیرتے ہیں

ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
 بھرے سے لیکے یار و بھٹا کا تاپیالہ چھتری سے برج خونی دار اکاچو نتر کیا
 متاب باغ اسید تیلی، قلعہ دروضہ غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا
 ہر اک مکاں میں ہو کر ہمشیا پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
 باغ حکیم اور جو شیو داس کا چین ہے اُن میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
 میوہ مٹھائی کھانے اور لالچ دل لگن ہے کچھ پیرنے کی دعویں کچھ عیش کا چلن ہے
 ہر اک مکاں میں ہو کر ہمشیا پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
 برسات میں جو اگر چڑھتا ہے خوب دریا ہر جا گھری و چادر، بند اور ناند چکوا
 مینڈا، بھنڈا، اچھالن، چکر، سمیٹ، مالا مینڈا، گھمیر تخت، کتے، کچھاڑ، کرا
 وال بھی ہنر سے اپنے ہمشیا پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
 تربیتی میں ابا ہوتی ہیں کیا بھاریں خلقت کے ٹھٹھ ہزاروں پیراک کی قطاریں
 بیریں نماویں، پھلیں، کودیں لڑیں پھاریں لیتے وہ چھینٹ غوطے کھا کھا کے ہاتھ ماریں
 کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
 جھنا کا پاٹ گویا صحن جن ہے بارے پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے

منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گوہے پیار پیارے پروں سے بھرے ہیں منہ صارا اور کنارے
 کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں
 کتنے کھڑے ہی پیریں اپنا دکھا کے سینہ سینہ چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینہ
 آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے سینہ سرووں کا بہ چلا ہے گویا کہ اک قرینہ
 دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں
 جاتے ہیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے کتنوں کے ہاتھ پھرے کتنوں کے سر پہ طوطے
 کتنے پتنگ اڑاتے کتنے سوئی پروتے حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے
 سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں
 کچھ ناچ کی بہاریں پانی کے کچھ لتاڑے دریا میں تج رہے اندر کے سوا کھاڑے
 لب ریز لگروں سے دونوں طرف کرا رہے بحرے دناؤ، چٹو، ڈونگے بنے اڑاڑے
 ان جھگڑوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں
 ناؤں میں وہ جو لگروں میں چمک رہے ہیں جوڑے بدن میں زکین گئے جھنک رہے ہیں
 تانیں ہوائیں اڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں عیش و طرب کی دھویں پانی چھپک رہے ہیں
 سو ساٹھ کے بسا کر اطار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں

ہر آن بولتے ہیں سید کبیر کی بے پھر اس کے بعد اپنے استاد پیر کی بے
 مور و مکٹ کنہیا، جمنہ کے تیر کی بے پھر غول کے سب اپنے خور و د کبیر کی بے
 ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں
 کیا کیا نظیریاں کے ہیں پیرنے کے بانی ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن مانی
 استاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی سب خوش رہیں ہے جب تک جمنہ کے بیچ پانی
 کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
 اس آگرے میں کیا کیا اسے یار پیرتے ہیں

(۲۶) مونسِ مستان

جب ماہِ اگھن کا ڈھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی اور ہنس ہنس پوس نہ بھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 دن جلدی جلدی چلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی پالا بھی برف پھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 چلا ختم ٹونک اچھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہوا اور دل سے ہوتی ہوشی سی تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو، بجتی ہو سب کی بیتیسی
 ہوشور ہو ہو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی سی کی گلے پر گلے لگ لگ کر چلتی ہو مونس میں چکی سی
 ہر دانت ہے سے دلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 ہر ایک مکاں میں سردی نے آباد دیا ہو یہ چکر جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑا کڑا اور تھر تھر
 بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پھلتا ہو پتھر جھڑ باندھتا دوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لے لے کر

سناٹا باؤ کا چلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن گھلا ہو کوٹھے کا
 اور تن میں نیمہ شب بنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
 چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیکا
 ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فراش گھڑا
 فراس بھی پٹکا جھلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 جب ایسی سردی ہو لے دل تب زور مزے کی گھاتیں ہو
 کچھ نرم کچھ تے غل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
 محبوب گلے سے پٹا ہو اور کٹنی چٹکی لائیں ہوں
 کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
 دل عیش و طرب میں پلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 ہو فرش بچھا غالیجوں کا اور پردے چھوٹے ہوں آکر
 اک گرم آنکھیں جلتی ہو اور شمع ہو روشن اور نس پر
 وہ دلبر شوخ پر پی چنچل ہے دھوم مچی جس کی گھر گھر
 ریشم کی نرم نہالی پر سونا زوداد اسے ہنس ہنس کر
 پہلو کے بیچ چلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 ترکیب بنی ہو مجلس کی اور کا فر ناچنے والے ہوں
 منہ ان کے چاند کے ٹکڑے ہوتے ان کے رونی کے گاہوں
 پوشاکیں نازک نگوں کی اور اوڑھے شال ڈھالے ہوں
 کچھ ناچ اور رنگ کی دھویں ہو کچھ عیش میں ہم متوالے ہوں
 پیالے پر پیالہ چلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی
 ہر ایک مکان ہو خلوت کا اور عیش کی سب تیاری ہو
 وہ جان کہ جس سے غش ہو سونا زسے آجھکا رہی ہو
 دل دیکھ نظیر اس کی چھب کو ہر آن ادا پروا رہی ہو
 سب عیش مہیا ہو اگر جس جس ارمان کی باری ہو
 جب سب ارمان نکلتا ہوتا دیکھ بہاریں جاڑے کی

اُوس (۲۷)

سکڑی جھڑی ۱۴

کیا ابر کی گرمی میں گھڑی پہر ہے اُوس گرمی کے بڑھانے کی عجب لہر ہے اُوس
پانی سے پسینوں کی بڑی نہر ہے اُوس ہر باغ میں ہر دشت میں ہر شہر ہے اُوس

برسات کے موسم میں نہٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

کتنے تو اس اُوس کے تئیں کہتے ہیں گرماؤ یعنی کہ گھرا ابر ہو اور آ کے ر کے باؤ
اس وقت تو پڑتا ہے غضب جان میں گھراؤ دل سینہ میں بیکل ہو یہی کہتا ہے کھاتاؤ

برسات کے موسم میں نہٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

بدلی کے گھر آنے سے ہوتی ہے ہوا بند پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند
پھینکے کوئی پڑی کوئی کھولے ہے کھڑا بند دم رگ کے کھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

برسات کے موسم میں نہٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

ایک دھڑ تو پسینوں سے پڑی بھیکے ہیں کھائیں گرمی سے اُدھر میل کی کچھ چوٹیاں کاٹیں
کپڑا جو پہنے تو پسینے اُسے آٹیں ننگا جو بدن رکھے تو پھر کھیاں چاٹیں

برسات کے موسم میں نہٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

رُکنے سے ہوا کے جوڑا ہوتا ہے احوال پنکھا کوئی، آنچل کوئی، دامن کوئی، رومال
دم دھونکنے لگتا ہے لہاروں کی گویا کھال کچھ دھڑکتے ہیں کچھ بیاں کچھ جان کو جنجال

برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

گھبرا کے کبھی آتا ہے دم جاتا ہے بھولا آرام جو دل کا ہے سبھی جاتا ہے بھولا

آتا ہے کبھی ہوش کبھی جاتا ہے بھولا کپڑے بھی رُسے لگتے ہیں جی جاتا ہے بھولا

برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

ہوتی ہے اُوس جو کبھی اک رات کو اگر کر ڈالتی ہے پھر تو قیامت ہی مفسر

ایدر تو ہوا بند اُودھر پتو و پٹھر پانی کوئی پیوے تو ادھن سے بھی ودبتر

برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

جس وقت ہوا بند ہو اور آکے کھٹکھٹائے پھر کسے دل اُس گرمی میں کس طرح نہ گھبرائے

اُدھر تو پسینہ جو نہ اُدھر تو غضب آئے پتو کبھی ٹھیک کبھی ٹھٹھل ہی لپٹ جائے

برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

گراس میں ہوا کھل گئی اور بانی بھی لائی توجی میں جی اور جان میں کچھ جان سی آئی

اور اس میں جو پھر ہو گئی اُوس کی چڑھائی تو پھر وہی رونا وہی غل شور نہائی

برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس
 اُوس میں تو لازم ہے کہ پسٹکھا نہ ہوا ہو اک کوٹھڑی ہو جس میں دھواں آکے بھڑکے
 اور کھیلوں کے واسطے گڑ تن سے ملا ہو اس وقت مزادیکھے اُوس کا کہ کیا ہو
 برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس
 سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس
 اس رت میں تو واسطہ عجب عیش ہے دلچاہ مینہ برستے ہیں اور سرد ہوا آتی ہے ہر گاہ
 جنگل بھی اھرے گل بھی کھلے سبز چراگاہ اُوس ہی گردل کو ستاتی ہے نظیر آہ
 برسات کے موسم میں نیٹ زہر ہے اُوس
 سب چیز تو اچھی ہے پر اک تھر ہے اُوس

(۲۸) کور برتن

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
 بوند پانی کی اُن میں جب گھنکی کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
 تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کورے برتن کی
 پانی کی آپ اب بڑی ہے ذات قطرہ قطرہ ہے جس کا آبِ حیات
 کورے برتن میں جبکہ آیا بات پھر تو آبِ حیات بھی ہے مات
 تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی
 وہ چو پانی کی کوری گولی ہے دہی آنے کے مول کو لی ہے
 کیا ہی ٹھنڈی دوا کی گولی ہے کیا کہوں گولی گولی گولی ہے
 تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی
 یہ جو گولی کی بولیاں باندہیں ہم نے پانی کی گولیاں باندہیں
 سوندھی سوندھی ٹھٹھکیاں باندہیں دل نے پھولوں کی جھولیاں باندہیں
 تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی
 کورا پنہاری کا جو ہے مٹکا اس کا جو بن کچھ اور ہی مٹکا
 لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا دل گھڑے کی طرح سے دے پٹکا
 تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی
 کوری ٹھلیا یہ دیکھ کر لوٹا دل لگا ہونے کچھ کھرا کھوٹا
 گرچہ لوٹا وہ قد کا ہے چھوٹا جس نے دیکھا اسی کا دل لوٹا
 تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی
 کورے کوزدوں کو دیکھ عالم میں کوزے مصری کے بھر گئے غم میں
 یوں وہ رستے ہیں آب کے نم میں جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں

تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کو رے برتن کی
 وہ جو کورا سفید جھڑ ہے جس کی جاگیر ملک جھڑ ہے
 بیل بوٹے سے اس جھک پر ہے تاش کو آب یا مشجر ہے
 تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کو رے برتن کی

جس صراحی میں سر د پانی ہے موتی کی آب پانی پانی ہے
 زندگی کی یہی نشانی ہے دوستو یہ بھی بات پانی ہے
 تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کو رے برتن کی

جتنے نذر و نیاز کرتے ہیں اور جو پیروں سے اپنے ڈرتے ہیں
 جب کہ لا پھول بان دھرتے ہیں وہ بھی کوری ہی ٹھلیاں بھرتے ہیں
 تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کو رے برتن کی

خاک سے جب کہ اُن کو گرہتے ہیں بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں
 کوروں پر پھول ہار چڑھتے ہیں جو رو غلہاں درد د پڑھتے ہیں
 تازگی جی کی اور تری تن کی
 واہ کیا بات کو رے برتن کی

کوروں پر جو نظیر جو بن ہے جو جہے میں کہاں وہ کھن کھن ہے

جس گھڑو پچی پہ کورا باسن ہے وہ گھڑو پچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

(۲۹) کو اور ہرن کا بیچہ

اک دشت میں سنا ہے کہ اک خوب تھا ہرن بچہ ہی تھا ابھی نہ ہوا تھا بڑا ہرن
پھر تا تھا چو کڑی کا دکھاتا مزا ہرن دیکھا جو ایک کوٹے نے وہ خوشنا ہرن
دل کو نہایت اس کے وہ اچھا لگا ہرن
دوبائیں کر کے کوٹے نے اس کو لگایا دم میں ہرن بھی کوٹے کی الفت میں آ گیا
کوٹے ہرن میں ٹھہری جو گہری محبت آ کوٹا جدھر جہر کد خوشی ہو کے جاتا تھا
پھر تا تھا اس کے ساتھ لگا جا بجا ہرن
اک گیدڑ اس ہرن کے کئے آ کے نابکار بولا ہزار جان سے میں تم پہ ہوں نشانہ
مجھ کو بھی اپنا جان غلام اور دوستدار اور دل میں یہ کہ کیجئے کس لہر سے شکار
اس کے دغا و مکر سے واقف نہ تھا ہرن
گیدڑ یہ کہہ کے مکر سے جس دم گیا ادھر کوٹا ہرن سے کہنے لگا کر کے شور و شر
یہ سخت مکر باز ہے کہ اس سے تو حذر اک دن دغا سے تجھ کو یہ پڑے گا فتنہ گر
سن کر یہ بات کوٹے کی چپا ہو رہا ہرن
دن دوسرے ہرن کے گیدڑ پھر آ گیا کوٹے کی سوتا دیکھ یہ بولا وہ پُر دغا

میں آج دیکھ آیا ہوں اک کھیت کیا ہر
تم کھاؤ اُس کو چل کے تو ہوشاد دل مرا

سُنتے ہی اس کے ساتھ اچھلتا چلا ہرن

جس کھیت پر یہ لے کے گیا اس کو بدنگال
واں پہلے دیکھ آیا تھا وہ اک ہرن کال

لے پہنچا جب ہرن کے تئیں کھیت پر خال
جاتے ہی واں ہرن نے دیا منہ کو اس کی دال

منہ ڈالتے ہی جال میں واں پھنس گیا ہرن

واں پھر پھڑپھڑاتا گیا کو ابھی ناگساں
گیدڑ کو دسے کے گالی ہرن سے کہا کہ ہاں

ترپے مت اس میں ورنہ تو جوڑے گا ناواں
کو سے کی بات سنتے ہی ہمت کو بانٹھواں

جیسے گر گر پڑا تھا وہیں پھر اٹھا ہرن

گیدڑ لگا جب آنے ہرن کی طرف جھپٹ
تو اپکارا مار تو سینک اک جو جاوے ہٹ

یا اک کھری تو ایسی لگا پاؤں کی لپٹ
جاوے جو اُس کے لگتے ہی گیدڑ کا پیٹ پھٹ

سُنتے ہی یہ تو سینک ہلانے لگا ہرن

گیدڑ نے خوب کو سے کو دیں جل کے گالیاں
صیادواں ہوا تھا کسی کام کو رواں

اس میں شکاری آکے ہوا دور سے عیاں
کو اپکارا لیٹ جا دم بند کر کے ہاں

دم بند کر کے اپنا وہیں گر پڑا ہرن

گیدڑ نے اس کو دیکھ کے اک جگہ بھاڑی لی
صیاد اس ہرن کو پڑا دیکھ اُس سس گھڑی

انہوں کر کے دام کی دسی دہ کھول دی
کو اپکارا بھاگ اسے وقت ہے یہی

سُنتے ہی واں سے چوکر دی بھر کر اڑا ہرن

صیاد نے جو دیکھا ہرن اُٹھ چلا جھیاک
جلدی سے دوڑا پیچھے ہرن کے وہ سینہ چاک

سوئے کو پھینک مارا جو پھرتی سے اس نے تاک
بھاگا ہرن، لگا وہیں گیدڑ کے آکھٹاک

سر اس کا پھوٹا اور وہ سلامت گیا ہرن
 گیدڑ نے اس ہرن کا جو چیتا تھا وہاں بُرا
 پانی اسی نے اپنی ہدی کی وہیں سزا
 تھا یہ تو نثر میں نے اسے نظم میں کیا
 پھونچا نظیر جب وہ خوشی ہو کے اپنی جا
 کوٹے کے ساتھ پھر وہ بہت خوش رہا ہرن

(۳۰) خواب کا طلسم

یار و ذرا سنویہ عجب سیر ہے بڑی
 پنی کر شراب عیش کی ہر دم کڑی کڑی
 صحنِ چین میں ابر کی آکر لگی جھڑی
 کل بنے خبر ہورات کو سوا میں جس گھڑی
 اُس خواب میں مجھے اک عمارت نظر پڑی
 آئی نظر جو مجھ کو وہ نادہر محسوس
 دل میں پری کے بلغ کا مجھ کو یقیں ہوا
 جب اس مکان کے پاس میں ڈرتا ہوا گیا
 دیکھوں تو اس کا ہے درد دولت سرا کھلا
 آیا یہ دل میں دیکھنے چل کر کوئی گھڑی
 جھکے مکان جو اس کے مری آن آن میں
 پھونچا یونہی میں اُس چین زرفشان میں
 کیا دیکھتا ہوں جا کے میں ہر اک مکان میں
 عالم سنہرے پردوں میں اور سائبان میں
 سونے کی کھان ہے کہ بھی پھرتی ہے بڑی
 گلشن کہیں چین کہیں شیشہ صراحی جام
 فرش طلا بچھا کہیں یکسر جڑت کا کام
 تھی نقری زمین تو سنہرے تمام مام
 طاق دروازا اُس کے جھکے تھے یونہی مام
 گویا کہ اینٹ اینٹ جو اہر کی ہے جڑی

دیکھی پھر اس میں ایک ستم ایجا دمہ لقا اوپر نظر گئی جو مری سر سے تابا
 صورت وہ تہر جاندا کا ٹکڑا سا بے بہا اور جن کا بیان تو جانا نہیں کہا
 نقشہ وہ جس کے پاؤں پہ لڑے پری پڑی
 فخریزا برو جان کی قاتل ہر اک نگاہ مرگیاں وہ بر جھپیوں کو لئے تل رہی سپاہ
 منہدی آنکھوں نے کئے خوں بے گناہ آنکھوں میں بھینچ رہا تھا وہ کا جل غضب سیاہ
 پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہر پڑی
 زلفیں وہ مشک ناپ سی چہرہ وہ چاند سا جھگڑ رہا گئے میں ستارہ سا جگمگا
 گئے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھک دکھا
 گویا شفقت میں آن کے بجلی جھک پڑی
 رکھے تھی اس گھڑی تو یہ عالم وہ مہ جہیں شاید کہ اس طرح کی نہ ہوگی پری کہیں
 حسرت سے آن کر مری آنکھوں نے مان جہیں دیکھی جو اُس بہار کی کافروہ ناز نہیں
 دل لوٹ پوٹ ہو گیا جاں غش میں جا پڑی
 کیا کیا کہوں میں شوخ کے عالم بناؤ کا تصویر بن رہی تھی لگا سر سے تابہ پا
 اس دم بندھی تھی اس کی غضب آن کر ہوا کافر گھڑی ہوئی تھی عجب ڈھب سے بن بنا
 اک ہاتھ میں لے آئینہ اک ہاتھ میں چھری
 دیکھی جو میں نے واں یہ طلسمات کئی ہوا عالم جوانہرات کا ہر جا چمک رہا
 اس کی چمک جھمک کی بہاریں کہوں میں کیا چمکا جو وہ مکاں مری آنکھوں میں نور سا
 حیرت سے عقل آن کے چکر میں جا پڑی
 ایسا مکاں تو میں نے نہ دیکھا تھا نے سُنا دیوانہ ہو میں چاروں طرف دیکھنے لگا

چاہا کہ دیکھوں کوٹھے کے اوپر نظر اٹھا
اتنے میں اک طرف سے جو پردہ سا اٹھ گیا
بجلی سی کچھ چمک گئی آنکھوں میں اُس گھڑی

اگر گھڑی ہوئی تھی جو داں ناگماں وہ شوخ
لیتی تھی ہر نگاہ میں عاشق کی جاں وہ شوخ
کچھ جلیلی نگاہ تھی کچھ آنکھڑیاں وہ شوخ
کرتی تھی سیر چاروں طرف کی جو داں وہ شوخ

اتنے میں پھرتی اُس کی نظر مجھ پہ آ پڑی
اُس کی نگہ کے آنے کا میں کیا کر دوں بیان
بجلی تھی یا کہ تیر تھی گولی تھی یا سناں
میری طرف کو دوڑ کے آتی تھی ناگماں
ایسی لڑی کہ خوب لڑی، خوب ہی لڑی

بارے نظر کے لڑتے ہی کچھ کم ہوا حساب
الفت کی آکے دونوں طرف سے کھینچی طناب
اتنے میں دیکھ دیکھ کے وہ رشک باہتاب
اکبار کھلکھلا کے ہنسی اور اتر شتاب

کافروہ میرے پاس ہی آکر ہوئی گھڑی
کہنے لگی کہ تو نے بلایا ہے کیوں مجھے
دے خواب کو دعا کہ نہ پاتا تو وہوں مجھے
چاہت میں اپنی ڈوبا ہوا دیکھا ہوں مجھے
ہنس کر لپٹ گئے لگی کہنے یوں مجھے

اُس محل میں چل کے کریں عیش و گھڑی
اُس گلاب دن سے جب کہ ملی آکے مجھ کو داد
نارے خوشی کے کچھ نہ رہی تن بدن کی یاد
کیونکہ بھلا نہ عیش و طرب دل کو ہو زیاد
میری تو اس پر سی سے یہی عین تھی مراد
سننے ہی دل کی کھل گئی ہر ایک پھل پڑی

پالا پڑا جو مجھ کو اس آب حیات سے
جاں آگئی بدن میں مرے اس کی بائیسے
آخر کو لے چڑھی مجھے کوٹھے پہ نگاہ سے
دو چار جام مجھ کو پلا اپنے ہات سے

سونا ز سے پناک پہ مرے پاس آپڑی
 آنے سے اُس کے دل کا مرے کھل گیا جن
 عیش و طرب کے ابر کی پڑنے لگی بھرن
 نازک کمر وہ صاف شکم اور وہ نرم تن
 گل سا ملا جو مجھ کو نیا گد گدا بدن
 رگ رگ میں میری جھٹ گئی عشرت کی ٹھلادی
 لے کر بغل میں اس کو لگایا جو ہیں گلے
 سو عشرتوں کے دل پہ مر کھل گئے ورے
 حاضر ہوئے جب ان کے سب عیش اور مزے
 سینے سے سینہ مل گیا اور لب لب طے
 لٹے لگی بہار مڑوں کی دھڑکی دھڑکی
 ایدھر تو خوش عشق ایدھر حسن اور جنوں
 ناز و ادا کی ہوئے لگی آ کے دھب دھبوں
 ان عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں
 جا با میں اس پری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
 اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل پڑی
 یہ حادثہ جو مجھ پہ پڑا آ کے یک بیک
 آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو بڑے ٹپک
 نیندا ڈل گئی قرار گیا، جل گئی پلک
 جاگا کیا نظریں میں پھر آہ صبح تک
 مل مل کے ہاتھ رات کی کاٹی گھڑی گھڑی

(۳۱) سچے سچے کا پتہ

کل راہ میں جاتے جو ملا یہ کچھ کا پتہ
 لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا یہ کچھ کا پتہ
 سو نعمتیں کھا کھا کے پلا یہ کچھ کا پتہ
 جس وقت بڑھایا کچھ ہوا یہ کچھ کا پتہ
 جب ہم بھی چلے ساتھ چلا یہ کچھ کا پتہ

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سوٹا لوہے کی کڑی جس پہ کھڑکتی تھی سراپا
کاندھے پہ چڑھا جھونکا اور ہاتھ میں پیالا بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا
آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا یہ کچھ کا بچہ

تھا یہ کچھ کے بچے پہ وہ گستاخو سر اسر ہاتھوں میں کڑے سونے کے بچتے تھے جھک کے
کانوں میں درا اور ٹھنڈے پاؤں کے اندر وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُر زور
جس ڈور سے یار و تھا بندھا یہ کچھ کا بچہ

جھکے وہ جھکے تھے بڑے جن پہ کرن پھول نقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر پھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گل پھول یوں لوگ گرے پڑتے تھے سپاؤں کی سرد پھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا یہ کچھ کا بچہ

اک طرف کو تھیں سیکڑوں لٹکوں کی پیاریں اک طرف کو تھیں بیرو جانوں کی قطاریں
پکھ ہاتھیوں کی قین اور اونٹوں کی ڈکاریں غل شور مرنے بھیر ٹھٹھ انبوہ ہساریں
جب ہم نے کیا لاکے کھڑا یہ کچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر وہ کیا ہوئے اگلے جو تھکے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ ہمیشہ ہے قلندر ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جھنگلے کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا یہ کچھ کا بچہ

دلت میں اب اس بچے کو ہم نے ہے سدھایا لڑنے کے سوانح بھی اس کو ہے سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھیلی کے تئیں گت پہ بجایا اس ڈھب سے اُسے چوک کے جھگڑ میں نہ جایا
جو سب کی نگاہوں میں کھپا یہ کچھ کا بچہ

پھر ناچ کے وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ پھر کمر ہانا چا تو ہراک بولی زباں واہ

ہر چار طرف سے کہیں پیر و جواں واہ سب ہنس کے یہ کہتے تھے میاں واہ میاں واہ

کیا تم نے دیا خوب نچاریچھ کا بچہ

اس ریچھ کے بچے میں تھا اس نالج کا ایجاد کرتا تھا کوئی قدرت خالق کے تئیں یاد

ہر کوئی یہ کہتا تھا خدا تم کو رکھے شاد اور کوئی یہ کہتا تھا ارے واہ ارے استاد

تو بھی جئے اور تیرا سدا ریچھ کا بچہ

جب ہم نے اٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا خم ٹھونک پہلوں کی طرح سامنے آیا

لپٹا تو یہ کشتی کا ہنر آن دکھایا جو چھوٹے بڑے جتنے تھے ان سب کو رنجایا

ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچہ

جب کشتی کی ٹھیری تو دہیں سر کو جو جھاڑا لٹکارتے ہی اس نے ہمیں آن لٹاڑا

گہ ہم نے پچھا ڈاؤسے گہ اس نے پچھا ڈاؤ اک ڈیڑھ پر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا

گو ہم بھی ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچہ

یہ دادیں بچوں میں ہوتی ہیں دیر یوں برسے روپے پیسے کہ آدمی میں گویا ہیر

سب نقد ہوئے آکے ہوا لاکھ روپے ڈھیر جو کہتا تھا ہر ایک اس طرح سے منہ پھیر

یارو تو لڑا دیکھو ذرا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کھڑا کوئی جو کر آہ ابا ابا اس کے تم ہی استاد ہو واد لٹاڑا

یہ حسر کیا تم نے تو ناگاہ ابا ابا کیا کہئے عرض آخر شس لے واہ ابا

ایسا تو نہ دیکھا نہ سنا ریچھ کا بچہ

جس دن سے نظیر اپنے تو دلشاد یہی ہیں جاتے ہیں جدم کو ادھر ارشاد یہی ہیں

سب کہتے ہیں وہ صاحب ایجاد یہی ہیں کیا دیکھتے ہو تم کھڑے استاد یہی ہیں

کل چوک میں تھا جن کا لڑا ریچھ کا پتہ

(۳۲) راکھی

بجلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی سنہری ہیز ریشم زرد اور گلستا کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر خوب ہر سردار کی راکھی سلوٹوں میں عجب نگین ہے اس دلدار کی راکھی

نہ پہنچے ایک گل لویا جس گلزار کی راکھی عیاں ہے اب راکھی بھی جن بھی گل بھی شبنم بھی
تماشہ ہے اہا ہا غنیمت ہے یہ عالم بھی اٹھانا ہاتھ پیالے واہ واٹک دیکھ لیں ہم بھی

تمھاری موتیوں کی اور زری کے تار کی راکھی ہر اک گرو پھر ہے راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوں جو دل میں گزے ہے کہوں کیا آہ میں کم کو یہی آتا ہے جی میں بن کے با مھن آج تو یارو

میں اپنے ہاتھ سے پیالے کے باندھوں پیار کی راکھی ہوئی ہے زیب زینت اور خباں کو تو راکھی سے
دوانی بلبلیں ہوں دیکھ گل چنے لگے تنکے ولیکن تم سے لے جان اور کچھ راکھی کے گل پھولے
تمھارے ہاتھ نے منہدی آئینہ ستوں ناخن نے

گلستاں کی چمن کی بلوغ کی گلزار کی راکھی ادا سے ہاتھ اٹھنے میں گل راکھی جو ملتے ہیں
کہاں نازک یہ پہونچے اور کہاں یہ رگستے ہیں کیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں
چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گل رخسار کی راکھی

پہرے ہیں راگھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تھے
تو ان کی راگھیوں کو دیکھ لے جان چاؤ کے مائے
پہن زتار اور نقشہ لگا مائے اُپر بارے
نظیر آیا ہے با مہن بن کے راگھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راگھی

(۳۳) سخاوت و عشت

زردار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو
تن زیب بین سکھوں سے ترسانہ اپنے تن کو
جو زچلن چلیں ہیں چل تو بھی اُس چلن کو
مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
جا بیٹھ میکروں میں سب درد غم سے ہٹ کر
جھمکا گلابی نے کی پیالے اُلٹ پلٹ کر
محبوب دلبروں سے خوش ہو اپٹ پلٹ کر
بی دو دھڑا اور تبا شے میوہ مٹھائی چٹ کر
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
کنو اب کیا دوشالہ کیا ریشمی دوسوتی
کرشال کا لنگوٹا، مت رکھ قبا اچھوتی
بولے جو شوم بھڑوا مار اس کے سر پہ چوتی
دودن تو دوستوں میں بولالے اپنی طوطی
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
نیعتیں ہیں جتنی جو کچھ ملے سو کھا جا
تاشس اور بادے میں اک بار کھا جا

پاپی بخیل مت بن داتا سخی کسا جا اک دم تو اپنا ڈھکامن مانتا بجا جا
 دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
 گرم رہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
 یاں کا یہی مزا ہے، کھانا دیا کھانا بھوکے کو دال روٹی، ننگے کو کچھ اڑھانا
 سب اس گھر ہی اڑا لے جو تجھ کو ہواڑانا غافل پھر اس گلی میں تجھ کو نہیں ہے آنا
 دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
 گرم رہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
 جو گل بدن ہیں روٹھے زرفے انھیں منالے بوسہ انھوں کالے کر سینے سے پھر لگالے
 ہنس لے، ہنسا لے ہر دم، دے لے دال لے کھا جو بن سکے سوا اپنے جی کے مزے اڑا لے
 دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
 گرم رہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
 جو پاس ہے ذخیرہ مت رکھ وہ کوئے اندر مسجد، کنویں بنادے تالاب، باغ، مندر
 دریا کہیں بہا دے بن جا کہیں سمندر سب کچھ اڑا، لٹا کر، ہو رہ سدا قلندر
 دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
 گرم رہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
 باغوں کی دیکھ سیریں بھر جام کے چھلکے اور جھان میلے پھیلے کر دھوم اور دھڑکے
 آدے جو شوم بھڑوا کا ٹھہا اس کو دیکھ دھکے تو شوق سے اڑا لے عیش و مزے جھکے
 دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
 گرم رہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

صندوق میں جو رہے اُس کو بھی لے گیا دے
مے کے بہا کے نالے تہلوں کو کھڑکھڑائے
کوٹھے مکاں جو ملیں سب کھو کر کھلا دے
کر دیاں تلک جلا دے اینٹیں تلک اڑا دے

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال دل دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
جو جو خیل کٹن زر چھوڑ کر مرے گا
یا کھائے گا جنوائی یا خالصہ لگے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہ خدا میں دے گا
تکھاتا کھلاتا بہنتا تو بھی سدا رہے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
گر آپڑے گا تجھ پر کچھ حادثہ خسل کا
مالک پھر اور کوئی ٹھیرے گا تیرے ڈال کا
آگے سے دے دلائے ہو رہ تو اس سے ہل کا
کر سوچ اپنے دل میں کچھ آج کا نہ کل کا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال دل دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
نر جوڑ جوڑ اپنے تو پاس گر رکھے گا
یا چھین لے گا حاکم یا چور لے مرے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ اب عیش کر چکے گا
جب وقت آپکا رات تب کچھ نہ بن سکے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال دل دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو
جس نے یہ زردیا ہے پھر وہ ہی دھن بھی دے گا
مال و مکاں جو ملی باغ و چین بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھائے کو ان بھی دے گا
مر جائے گا تو وہ ہی تجھ کو کفن بھی دے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال دل دھن کو

گرم دہے تو عاشق کو ٹری نہ رکھ رکھن کو
 جتنے گڑے دبے ہیں سب کھالے اور کھلاے
 رکھ دھن اسی کی دل میں اب کھالے اور کھلاے
 اپنا سمجھ اسی کو جب کھالے اور کھلاے
 اب تو نظیر تو بھی سب کھالے اور کھلاے
 دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال دھن کو
 گرم دہے تو عاشق کو ٹری نہ رکھ رکھن کو

(۳۴) چاندنی رات

صبح جن میں واہ وا زور بھیجی تھی چاندنی
 صحن چمن میں واہ وا زور بھیجی تھی چاندنی
 آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری
 چکھ تھی تار تار میں مہ کی جھلک ذری ذری
 بوس نکار جام دے عیش طرب ہنسی خوشی
 اس میں کہیں سیک بیک مرغ سحر لے باگ ہی
 صبح ہوئی گرج بجا پھول کھلے ہوا چلی
 یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی
 کیا ہی مڑوں سے عیش کی رات تھیں کامیاں
 آگے جی تھیں صف صف نے کی کئی گلابیاں
 چھوٹے طعنےں ہاتھ کی نمرؤں میں ہاتھیاں
 ہم کو نشتے کی مستیاں یار کو نیم خوابیاں
 سینوں میں اضطراباں آنکھوں میں بے حجابیاں
 اس میں فلک نے رشکے ڈالیں یہ کچھ خرابیاں
 صبح ہوئی گرج بجا پھول کھلے ہوا چلی
 یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی
 شب کو دلوں میں واہ وا زور مڑوں کے تار تھے
 ہم سے دو چار یار تھا یار سے ہم دو چار تھے

دونوں دلوں میں پیار تھا دونوں گے میں ہاتھے وصل کے بقرار تھے عیش کے کار و بار تھے
 سینے میں آسمان کے تیر حسد کے پار تھے ایک پلک میں ناگماں سب مہرے شرار تھے
 صبح ہوئی تجسہ بجا پھول کھلے ہوا چلی

یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک
 چمک رہیں تھیں بلبلیں باغ رہا تھا سب ہمک جام کے لب سے ہر گھر مٹی کھٹے تھی سے جھلک جھلک
 یار بغل میں غنچ بابوں کی سولیک جھیک عیش طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بیک
 ایسے مہرے میں عیش میں کہ کہیں سے نہ دھک صبح ہوئی تجسہ بجا پھول کھلے ہوا چلی

یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی ایک طرف تو زور میں ماہ رہا عتسا جگمگا
 ایک طرف ہر شک نہ میری بغل میں تھا بڑا دونوں دلوں میں لذتیں و فوں جیوں میں عیش تھا
 کی نگاہی ہاتھ میں آنکھوں میں چھارہ انشا ہونٹوں سے ہونٹ لگ سے سینہ مل رہا
 اتنے میں آہ یک بیک کیا ہی غضب یہ ہو گیا

صبح ہوئی تجسہ بجا پھول کھلے ہوا چلی
 یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی واہ ہوئیں تھیں رات کیا چاندنی کی اجالیاں
 جھوم رہی تھیں باغ میں سنبل دگل کی ڈالیاں شمع بغل میں ناز سے کھلے تھا زلفیں کا لیاں
 خوش ہو گئے لپٹ لپٹ دیتا تھا میٹھی گالیاں ہم بھی نشے میں مست تھے ساقی کی پی کے پالیاں
 جل کے فلک اس میں ہائے آنیت لائی لیاں

صبح ہوئی تجسہ بجا پھول کھلے ہوا چلی
 یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

کیا ہی چمن میں شب کو داہرے تھی نور کی جھڑی تار نشوں کے تھے ہندھے لڑے تھی چاندنی پڑی
 غنچہ دہن تھا بے خبر پی تھی جوئے کر دی کر دی دیتا تھا بوسے پیار کے سینہ سے مل گھڑی گھڑی
 چشم سے چشم لب سے لب چھاتی سے چھاتی جب لے لے گیا ہی گھڑی تھی عیش کی اس میں بلایہ آپڑی

صبح ہوئی کجس بجا پھول کھلے ہوا چلی
 یار فضل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

باغ تھا یا کہ خلد وہ یا کہ بہشت یا ارم یار تھا یا کہ حور تھا یا کہ بری وہ یا صنم
 چاندنی تھی وہ چاندنی چاندنی کا رنگ جس سے کم پیے تھے مے گھڑی گھڑی لیتے تھے بوسے مہم
 دونوں نشوں میں مست ہوئے پلنگت جب کہ کم عین مزہ تھا وصل کا اس میں نظیر ہے ستم

صبح ہوئی کجس بجا پھول کھلے ہوا چلی
 یار فضل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

(۳۵) ہولی

آجھکے عیش و طرب کیا کیا جب سُن دکھایا ہولی نے ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف بتایا ہولی نے
 ہر خاطر کو خوشند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے دف رنگین نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
 بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حسن بناؤں ہولی کا سب ابرن تن پر بھک رہا اور کیسر کا ہاتھ ٹیکا
 ہنس دینا ہر دم ناز بھرا دکھلا ناچ دھج شوخی کا ہر گالی مصری قند بھری ہر ایک قدم اکھیلی کا
 دل شاد کیا اور موہ لیا یہ جو بن پایا ہولی نے

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ تارطنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھول بھی اور منہ چنگ بجی
کچھ بھڑ میں بین بابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ گنگر دکھنے جھجھجھ کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

ہر جاگہ تھا لگلاؤں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پیکاری ہے
اور ڈھیر عیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
منہ سرخی سے گلزار ہوئے تن کیسری کی تیاری ہے
یہ روپ جھکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

پوشا کیں چھڑیں رنگوں کی اور ہر دم رنگ نشانی ہے
کھیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھیری کھینچا تانی ہے
ہر وقت خوشی کی جھکیں ہیں پیکاری کی رختانی ہے
کہیں لٹیاں جھکیں رنگ بھری کہیں جوتا کچر پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا یہ خوش بڑھایا ہولی نے

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
کچھ آگ اور رنگ جھکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
رخسار گلاروں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں میں کچھ ہنستے ہیں کچھ ہنکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

محبوب پری روپیہ رو کی ہر جانب نوک جھونکی ہے
کچھ سینیں ترچھی سحر بھری کچھ گھات لگاؤٹ خوں کی ہے
کچھ آن رنگیلی چلتی ہے کچھ بان ادھر سے روکی ہے
کچھ شور اماہا با کا کچھ دھوم اہو ہو ہو کی ہے
یہ عیش یہ حظ یہ کام یہ دھب ہر آن بتایا ہولی نے

مجنوں سے رنگ لال ہو کہیں چلتی مے کی پیالی ہے
سو کثرت عیش مسرت کی خوش دقتی اور خوش حالی ہے
کہیں ساز و طب بجاتے ہیں دل شاداں منہ پر لالی ہے
کچھ بولی ٹھولی پیار بھری کچھ گالی ہے کچھ تالی ہے
ان چروں کا ان جھلوں کا یہ تار لگایا ہولی نے

ہیں کیا کیا سر میں رنگ بھر اور سوانگ بھی کیا کیا تے ہیں
کہ تیں ہر دم جھل بھری خوش ہنستے اور ہنساتے ہیں

کچھ جوگی چیلے بیٹھے ہیں کچھ کانپوں کی گاتے ہیں کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں کچھ ناپتے ہیں کچھ گاتے ہیں
ہرگز نظر اس فرحت کا سامان دکھایا ہوئی نے

(۳۶) جو گنا مہا

صفہ رُخ بہ ترے خوبیِ خطا کی ہے پھین
ہے سو دیا ترے عاشق کا تر اخالِ ذوق
رُشکِ گلِ دستِ خانی کو کسے دیکھ چمن
ہو رُقم کس قلمِ شوق سے اے غنچہِ دہن
اشتیاق تھے کہ بہ دیدار تو دارد دلِ من
اب جو مل جائے کہیں تو یہ ہم اُس سے کہیں
کب تلک دردِ جدائی کو بھلا تیرے سہیں
اتنا بھی بس نہیں اے یار کہ ہم مر ہی رہیں
دو درجنِ ن سے ہوا تجھ چمنِ حسن سے میں
نہ مجھے بلغِ خوش آتا ہے نہ گلشنِ نہ چمن
بید مجنوں ہیں کہ ہیں تاکِ پریشاں خاطر
یا ہیں خاکِ ترِ خاشاکِ پریشاں خاطر
ہم غرض ایسے ہیں غمِ ناکِ پریشاں خاطر
چشمِ نمِ ناکِ جگرِ چاکِ پریشاں خاطر
چاکِ پرچاکِ گریباں سے لگتا دامن
جور اور ظلم سے اس کے نہ کبھی ٹھکبانا
نہ کبھی شکوہ بیدادِ زباں پر لانا
کام ہرگز نہ کسی سے نہیں آنا جانا
کوئی کچھ پوچھے تو منہ نہ دیکھ کے چپ رہ جانا
نہ لکھ نہ اشارت نہ حکایت نہ سخن
یاد اُس شوخ کی کیا کیا ہی ستم لاتی ہے
جان بے چینی سے تن میں مے گھبراتی ہے
آہ کرتا ہوں تو بجلی سی نکل آتی ہے
جب میں روتا ہوں تو آنکھوں سے برسنی ہے

کبھی سادون کی بھڑی اور کبھی بھادوں کی بھرن
 دشت اور کوہ میں وحشی سا بڑا پھرتا ہوں برق کی طرح سے بے تاب سد بھرتا ہوں
 میں غرض تجھ سے صنم جب سے جدا پھرتا ہوں رات دن ہجر میں جوگی سا بسنا پھرتا ہوں
 بے قراری سے ترے نام کی جیتا سمن
 جو راور ظلم مرے دل نے ہزاروں ہی سے شکوہ جو رہلا تیرا کہاں تک نہ کرے
 اب تو یہ حال ہوا ہجر میں اے یار مرے دوش پر بارالم کانوں میں غم کے مندے
 اشکوں کے تارنگے میں پڑے سیلی کے نمون
 عشق میں جوگی ہوئے جب سے ہیں بھائی بھوت بیٹھے در پر ترے اور گرد ہے پھیلائی بھوت
 دیکھو تک آن کے کس روپ میں رنگ لائی بھوت پیر جن کیسے رواورتن کے اُپر چھائی بھوت
 سر سے لے پاؤں تلک خاک ملی سو سون
 گم و گمبہ پہ پیشانی کو اپنی گھسنا گاہ مسجد میں میاں مانگنا جا جا کے دعا
 انکساری سے کبھی دیر میں ہر دم جانا دم بہ دم آہ کی پوئگی سے بجانا یہ صدا
 دیکھے کون سے دن ہر ہیں دیں گے درشن
 دیکھا میرے تئیں جو تن کے اُپر گل کھائے اور کیرے بھی رنگے گیر وے تن پر پائے
 دیکھ یہ حال تعجب سے بشر گھبرائے کوئی کہتا ہے کہ جوگی جی کدھر کو آئے
 بیچ کو کون سی نگری میں تمھارا ہے وطن
 یاد کرتے ہو اُسے، نام اُسی کا لے لے اور زباہیں بہت آپ کے تن پر سیلے
 واہ جوگی بھی بنے خوب ہو تم البیلے کون سے پنہ میں ہو کون گرد کے چیلے
 کون سے روپ میں ہو کون سار کھتے ہو برن

ہم کو جوگی جی بتا دیجئے یہ حال اپنا تم جو ہیراگی بنے اس میں نفع کیا ہے بھلا
اور مرشد سے تمھارے ہے تمھیں کیا پہنچا نام کیا جوگ میں ہے تم کو گردنے بخشا
دھیان کیا رکھتے ہو کس گیان کا رکھتے ہو چلن

دُشمنوار جلا کر جو بنائی ہے بھبھوت اور کیوں تم کو تاؤ یہ خوش آئی ہے بھبھوت
عشق میں کس کے یہ اب تن پہ رملی ہے بھبھوت کس لئے منہ کے اپر تم نے لگائی ہے بھبھوت
کس کی الفت میں یہ ہیراگ کا پہننا ابرن

کس لئے جوگ لیا اور رنگا کپڑوں کو کس پہ عاشق ہو دیا رنج یہ کس نے تم کو
کیونکر اوقات بسر ہوتی ہے یہ ہم سے کہو کیا الم کھاتے ہو اور کس کی طلب رکھتے ہو
دھونی جل پان بھی یا یونہی کرو گے لسنکھن

نام پیغمبروں کے کفنی پہ لکھے سارے اور گریبان میں ہیں نام خدا کے لکھے
تم تو کامل سے نظر آتے ہو اپنے لکھے ہم نے جوگی تو بہت یوں ہیں ہزاروں لکھے
پر تمھارا نور زمانہ سے نرالا ہے چلن

ہم نے دنیا میں اجی سکڑوں دیکھے جوگی دیکھے ہر رنگ کے ہر ایک برن کے جوگی
پر غرض تم سے نہیں دیکھے ہیں ہم نے جوگی تم تو آتے ہو نظر ہم کو نئے سے جوگی
بیج کہو جوگ لیا تم نے یہ کس کے کارن

کیا ہوا جوگی جی تم کو بھلا ہم سے تو کہو کیوں نخل خوار پڑے پھرتے ہو منہ سے بولو
کس لئے وحشی سے پھرتے ہو بتاؤ ہم کو کس کی ہے یاد تمھیں کس کے لئے پھرتے ہو
اب کہیں بیٹھو گے یا یوں ہی پھرو گے بن بن

کس لئے گھر سے تم آئے ہو بھلا اپنے نکل پھرتے مانند صبا کیوں ہو بدشت و جنگل

تم سے اک بات کہوں اس پہ اگر کبے عمل گر کر جو حکم تو بنادیں تمہارا استھل
 شہر میں باغ میں یا برب دریا سے جمن
 یا کہیں اور بتاؤ کہ جہاں آپ رہیں یا تو جنگل میں اگر دل لگے یہ آپ کہیں
 یا کہ استھل کے بنادینے کی تجویز کریں یا کہ متھرا جو پسند آوے تو وہاں جا لیں
 یا کہ دربن میں ہو یا مات جہاں بند رہا بن
 اور اگر یوں ہی پھر روگے تو یہ ہے شکل سخت استھل اک ہم جو بنادیں تو رہے اپنے سخت
 اس میں اچھا سا بچھا دیویں تمہارے لئے تخت خاصے پھولوں کے لگا دیویں اس استھل میں درخت
 جس سے آنکھوں کو طراوت رہے اور دل ہو مگن
 اب تو جوگی جی کہا مان لو یہ تم میرا ایک جا بیٹھ رہو اور کرو ہم پہ دیا
 مت پھر دیویں نخل دیوار بدشت و صحرا جب تو سن سن کے یہ ہم نے کہا اس سے بابا
 تجھ کو کیا کام فقیروں سے یہ کرنا ان بن
 کیا غرض تجھ کو جو پوچھے ہے تو احوال مرا جوگ کی پوچھے تو بس عشق میں یہ جوگ لیا
 اور اس کی ہی جدائی میں پھرے ہیں ہر جا اور وطن پوچھے ہمارا تو یہ سن رکھ بابا
 یا گلی دوست کی، یا یار کے گھر کا آنگن
 مثل صرصر اسی کو چے میں پھرا کرتے ہیں دیکھ دروازے کو بس شاد ہوا کرتے ہیں
 خونِ دل جائے نے ناب پایا کرتے ہیں اس کے کوچے میں سلامت رہا کئے تے ہیں
 وہی بستی، وہی نگری، وہی جنگل، وہی بن
 گاتے پھرتے ہیں سدا بنے کا ندھے پہ گیت جو ایتنوں کی ہے مدت سے وہی اپنی ریت
 نحویم کے ہیں جب سے کہ لگی اُس کی پیت پنہ کی پوچھے تو جوگی، نہ جنم کے، نہ ایت

عشق کے میل میں ہم پریم کار رکھتے ہیں برن
 آبلے دل میں جوا لفت کے تھے سو چھوٹ گئے
 جتنا تھا مال مراتب اُسے لے لوٹ گئے
 اقربا دوست تھے جتنے وہ سبھی چھوٹ گئے
 جسے تھے مذہب ملت کے جہاں میں بندھن

عشق میں چھوڑ کے ہم دنیا دیں بیٹھے ہیں
 چھوڑ سب عیش جہاں گوشہ گزین بیٹھے ہیں
 خاطر آشفتمہ و دلگسب و حزن بیٹھے ہیں
 اس کے ہم در پہ منڈا سر کے تئیں بیٹھے ہیں
 رات دن پیتے ہیں دھو دھو کے اسی گر کے چرن
 خنجر عشق سے بس اپنا کلیجا ہے شوق
 خون میں آلودہ ہیں نحی ہیں کہ جوں رنگ شوق
 نام کو پوچھے تو ہے نام ہمارا عاشق
 سب سے آزاد ہوئے یار کالے کر دامن

حال بے باکی کا کیا اپنی بھلا تھ سے کہیں
 اور کھانے کو ملے تو بھی نہ کچھ شاد رہیں
 گر رہیں بھو گے تو ہر گز بھی کبھی غم نہ کریں
 گر رہیں جیتے تو جینے کی نہیں منکر ہیں
 اور مر جائیں تو ہر گز نہیں پروائے کفن

دیکھ نیرنگی زمانے کی ہوئے گل در گل
 کپڑے رنگے کو تو آسان نہ جان او غافل
 اور مل تن کو بھرت اپنے گئے خاک میں مل
 رنگ وہ رنگے ہیں جس رنگ کا رنگا مشکل
 روپ ہ بھرتے ہیں جس روپ کا بھرتا ہے کٹھن

چھوڑا جنت کو جو آدم نے اسی کی خاطر
 جی میں کی اپنے خوشی غم نے اسی کی خاطر
 اور ہر ایک کے کی آدم نے اسی کی خاطر
 جوگ بیراگ لیا ہم نے اسی کی خاطر
 سب کے تئیں چھوڑا اسی کی ہے محبت کی لگن

رنگے کپڑوں سے نہ کر ہم یہ توجہ کی کا گمان
 ہم نے کیا جانے کیا کس لئے ایسا سامان
 گرتو عاقل ہے تو پھر دل ہی میں اپنے پہچان
 ہم میں اور جوگی کی صورت میں بڑا فرق ہے جان
 کہاں جوگی کی ادا اور کہاں عاشق کی پھین
 آتش غم سے جلا یا دل و جان
 تب یہ اکسیر ملی ہم کو تو شک اس میں نہ جان
 تو تو عاقل ہے بس اب عقل سے اپنی پہچان
 خاک ہے یار کے کوچے کی بھٹو اب ہر کن
 ہم نے بھی راکھ بنائی ہے جسلا کر تن من
 سرخ آنکھوں کا جو پوچھے ہے کہ باعث ہے کیا
 شوق مے کا نہیں کچھ ذوق نہیں ایوں کا
 قبیح رنگ سے نے عشق کبھی ہم کو ہوا
 ہے محبت کے دھتورے کا جو آنکھوں میں نشا
 اس کی گرمی ہی سے رہتے ہیں سدا سرخ نین
 کوئی ٹونس ہے نہ غم خوار نہ ہے سنگ نہ سات
 رہتا ہوں برج میں مشغول سدا دن اور رات
 اب خدا جانے کہ کس طرح کئے گی اوقات
 اور استھل کے بنانے کی کہی تو نے جو بات
 یہ گھیرا وہ کرے جس کے کئے ہو کچھ دھن
 عشق جب سے کہ ہوا، ہمیں اس اچل سے
 جس بے تاب پھر کرتے ہیں اور بے گل سے
 ہم سے بے گل بھی کہیں بیٹھے ہیں اک جا گل سے
 ہم فقیروں کو بھلا کا مہ ہے کیا استھل سے
 وہی استھل ہے جہاں مار سگے بیٹھے اسن
 خواہش زر نہ کریں اور نہ کسی سے مانگیں
 تخت اور چتر کی بھی کچھ نہیں پر دلچسپ ہیں
 گو گل اور متھرا کے رہنے کی نہیں حرص کریں
 جا پڑیں یا دین اُس شوخ کی جس بستی میں
 وہی گو گل ہے ہیں اور وہی ہے بند راہن
 جب جوگی ہوئے دی اُس کو تلخ دل فحان
 چھوڑ بیٹھے سبھی آرام کا جو تھا سامان

حاجتِ تکیہ ہے نے خواہش بسترِ مکان جا پڑے خاک پر رکھ سر کے تلے ہاتھ جہاں

ہے وہی فرش وہی تخت وہی سنگھاسن

ہے خیال اس گلِ رخسار کا ہر شام و گاہ باغِ باغیچہ کی ہر گز ہے نہیں ہم کو چاہ
چاہ ہے چاہِ ذوق کی نہیں درکار ہے چاہ پھول پھل واری کی بھی جب سے نہیں کچھ پرواہ

جب سے گل کھا کے محبت میں جلا یا ہے بدن

رہتا ہوں مضطرب و مغموم میں ہر دم ہر آن ہوش کلمِ کردہ پھر کرتا ہوں اور بے سامان
باز آظلم سے اور جور سے توحق کو مان اب تو اس حال کو پہنچا ہوں ترے ہجر میں جان

اسے گلِ باغ و فادل کے چمن کے گلشن

کہیں کہتا ہے جو احوال مرا کوئی ذرا سر کو دھستا ہے ہر اک پیر و جوان اور لڑکا
گھر میں رہتا ہوں تو روتا ہے ہر اک خوش اپنا گھر سے باہر جو نکلتا ہوں تو منہ دیکھ مرا

مرے احوال پہ بھی روتے ہیں جنگل میں ہر ن

خاطرِ آشفتمے میں پھرتا ہوں حزنِ دلگیر عشق میں اُس کے سبھی کھو چکا عز و توقیر
پھرتا ہوں گلیوں میں دیوانہ سا ہر روز ضریر کیا کہوں اب تو گزرتی ہے جو کچھ مجھ پہ نظر

دل من داند و من داند و داند دل من

(۳۷) جو گنِ نامہ

ہائے اُس الفتِ ظالم کا برا ہے یہ چلن چھوٹی ہی نہیں لگ جاتی ہے جن وقت لگن
چار و ناچار اٹھانے ہی پڑے رنج و محن در فراقیِ مُخ پر نور تو اسے عینِ دہن

دیدہ باید کہ چپ گونہ شود احوال من
 ہجر نے اب تو نہایت کیا بے دم مجھ کو
 پھرتی ہوں شکل بگولے کے میں دیراں ہر سو
 لے مرے ماہ جبین لے مرے ہدم گل رو
 کون سے شہر میں ہے کون سی جا پر ہے تو

لے مرے ہدم جاں لے مرے جان و تن من
 دل صد چاک مرا چاک گریباں میرا
 مثل دریا کے رواں دیدہ گریاں میرا
 برق کی طرح تپاں یہ دل سوزاں میرا
 دیکھ ٹک آن کے یہ حال پریشاں میرا

کہ ترے ہجر میں کیا نہ سہا سنج و سخن
 میری جیسی ہے کرے حق نہ کسی کی اوقات
 جو سنی بھی نہ تھی کا ہے وہ وہ دیکھی آفات
 ہائے افسوس صد افسوس ہے حسرت بہات
 ناز زار اب تو پڑا ہجر میں رو نادن رات

زندگی ہو گئی دو بھر مجھے اور جان کٹھن
 خاناں و طرب و عیش و زرو مال خوشی
 اک تجھے یاد رکھا سب کے تئیں بھول گئی
 ہائے جس وقت لگی آنکھ وہ کیسی تھی گھڑی
 شہر بھی چھوڑ دیا دیس سے پردیس ہوئی

ہجر نے کر دیا آخر ترے مجھ کو جو کمن
 سرخ آنکھیں ہوئیں الفت کے نشے سے رنگین
 بہن کر حلقہ بگوشی کے بھی مندر سے دو تین
 تو نہ کر دست دعا کا پڑی پھرتی ہوں حزین
 پیر بہن گیر وار کھے ہوئے کا ندھے پرین

من کے منکوں کی بنا، بات میں پہنی سُمن
 کھوئے پھرتی ہوں سب آرام کو ہرجائی میں
 ڈھونڈھتی ہوں تجھے گل فام کو ہرجائی میں
 گاتی پھرتی ہوں اسی کام کو ہرجائی میں
 چلتی پھرتی ہوں ترے نام کو ہرجائی میں

اٹھ اٹھ آنسوؤں سے روئی ہوں اور تر میں نین

ناتواں ہو گئی اور جسم میں باقی نہیں دم
 ہو گئیں خشک رگیں سیلیوں سے میں نہیں کم
 رکھو ٹپک آکے کبھی اس دل مضطر پہ قدم
 گیر و ساری ہے اور جائے بھوت لے ہدم
 خاک اڑا لے کے بڑی تن کے اوپر سو سو من

یہی دل ہے کہ ہوا تھا نہ کبھی بھی غمناک
 آگ لگ جائیو اس بیت میں جلیو یہ تپاک
 وہی دل ہے کہ ہوا تیغ جفا سے صد جاک
 سیس کے بال تھے سنبل سے جمی جس میں خاک
 خاک میں مل گیا تھا یہ جو چند راں سا بدن

پھوڑ کر پتھروں سے کر دئے سر کے ٹکڑے
 آدھر دیکھ مری ٹوٹی کمر کے ٹکڑے
 ہاے تو ہے کہاں لے میرے قمر کے ٹکڑے
 جیب کے بدلے میں کرتی ہوں جگر کے ٹکڑے
 نہ تو بستی ہی خوش آتی ہے نہ کسرا نہ بن

میں نے کیا کیا نہ سہا آہ تری الفت میں
 ناگماں آگئی اک مفت کی میں آفت میں
 ایک دیوانی پڑی پھرتی ہوں میں وقت میں
 سیس کے بال ٹھسوٹوں ہوں کھڑی فرقت میں
 خاک اڑا لے پڑی پھرتی ہوں بہ جد رنج و محن

ساری پت میری گئی اے مرے ساجن تجھ پر
 ایک حیران پڑی پھرتی ہوں بردگن تجھ پر
 مال و زر وار دیا اور تن و من تجھ پر
 چھوڑ کر ماتا پست کو، ہوئی جو گن تجھ پر
 لیک تو ہی نہ ملا اے مرے جوگی ساجن

اپنے بیگانوں نے کر ڈالا ہے مجھ کو پامال
 خاک کا بھی نہیں وہ حال جو ہے میرا حال
 اور ادھر تیری جدائی میں ہوئی جانِ پامال
 اقربا کی بھی نظر سے گری اشکوں کی مثال
 باپ اور ماں کا ترے واسطے چھوڑا دامن

نہ تو کچھ دیں کی خبر اور نہ دنیا سے ہے کام
 سارے کاموں کے نہیں بھول گئی اے گل فام

دل گیا جان گئی اور گیا عیش و آرام گھر گیا، دیس گیا، ہو گئی جگ میں بدنام

اک سہیلی ہے مری آہ بس اور سب دشمن
یاد میں بیٹھ گئی جس جگہ میں آسن مار
دل کی کھونٹی کو مڑوڑا تری جانب کو مڑا
نالہ موزوں کے بس کر کے سروں کو طیار
جگر و تن کی بنا تو نبی بس اور آہ کے تار
مین کو خشم میں بجائی پھری بن بن بن

کون سی بات تھی جو واسطے تیرے نہ کری
دیس پڑیس پھری چروں میں لوگوں کے پڑی
چلے بھی باندھے بہت پلو جا بھی درگاہ میں کی
پوچھا ایک ایک سے تجھ کو میں بہ صد حیرانی
لیک تیرے ہی کسی طرح نہ پائے درشن

جا کے متھر میں رہی اور بڑا پوجا تجھ کو
لنگا اور جہنم کے تیرے پہ بھی مانگا تجھ کو
کاشی میں بیٹھ رہی لیک نہ پایا تجھ کو
کون سی جا تھی کہ جس جا پہ نہ ڈھونڈا تجھ کو
پوربا اور چھپم دُڑ سے لگاتا بہ دکن

اب تو ناچار ہوئی اور بڑی بے چین ہوئی
تاکہ اب ڈھونڈنے سے کوئی بھی جا گہ نہ رہی
بہر کے درد و الم میں جلا جاتا ہے جی
اب فقط ملک عدم تجھ کو رہا ہے باقی
سو بھی کچھ دودھ نہیں اور نہیں راہ کٹھن

ہو گئی جان کی یوا تری الفت بیری
کوئی دن میں تو بہ سن لیو نکل جاوے گا جی
مرگ کے کرتی ہے سامان محبت یہ سبھی
رحم کر مجھ پہ کہاں تک سہوں فرقت تیری
دیکھا اس جان پہ کیا کیا سہا، تیرے کارن

روح ہونٹوں تلک آجاتی ہے گھبراتی ہے
غم پہ پھٹتی مرے ہر ایک کی اب چھلاتی ہے
لیک اسید ملاقات میں پھر آتی ہے
آہ کے ساتھ مری جان جلی جاتی ہے

اب اٹھا سکتا نہیں بارِ مصیبت یہ بدن
 یاد کر کے تجھے دیدہ تو رو دیتا ہے جو مجھے دیکھتا ہے روتا رو دیتا ہے
 دیکھ ہر ایک مری سمت کو رو دیتا ہے جو مرے حال کو دیکھے ہے سو رو دیتا ہے
 ہوش لوگوں کے اڑے جاتے ہیں سن میرا سخن
 سر کو کسار سے ٹکراتی ہے بادِ صحرے جانور دیکھیں ہیں حیرانی سے بادیدہ تر
 درو دیوار مرے حال تبر پر ششدر سر کو دھتا ہے مرے حال پہ ہر ایک شجر
 میری بے چینی سے بے چین ہیں شیر اور ہرن
 جب کہ تجھ میں یہ ہوا میرے پر سرخ و تعب ہر کوئی کہنے لگا ہائے غضب ہائے غضب
 اڑتے اڑتے مری خبروں کا فسانہ ہوا جب اک دل آباد ہے بستی وہیں جاتے ہیں سب
 اس میں اک راجا ہمارا جہ کا ہے سنگھاسن
 نامی و نامور اور خلیق میں عزت والا جس کے تابع ہیں ہر اک شاہ سے لے تا بگدا
 ہے حقیقت میں جہاں مرضی یہ اس کی سارا عقل کل نام کما کرتے ہیں اس کا راجا
 دیکھ کر مجھ کو وہ کرنے لگا اس طرح سخن
 واہ وا بھاگ مرے میں نے جو دیکھا تم کو تم سے الفت ہے ہمیشہ سے ہمارے دل کو
 میں تو یہ چاہتا ہی تھا کہ کہیں مجھ سے ملو آؤ جی بیٹھو مرے گھر میں قدم رنجس کرو
 کرو روشن مرے کاشانے کو ٹلک رکھ کے چرن
 ہم تمہیں جانتے ہیں اور بزرگوں کو سب سب بزرگ آپ کے رکھتے ہیں ہماری ہی طلب
 ہم کو بھی لوگوں سے ہے ربط محبت کے سبب ہم کو معلوم ہوا آپ کا سب حسب و نسب
 عشق نے تم کو بنایا ہے بہ شکل جو گن

ہے عزیز آپ کی خاطر بڑی ہم کو دل میں اس سمجھاتے ہیں اب مت رکھو غم کو دل میں
کیوں اٹھا رکھا ہے اس جو دستم کو دل میں جانے دورا نہ دور رخ و الم کو دل میں
باغ کی سیر کرو اور ہو مچو گلشن

مخل عیش بنا کر رہو آنکھوں کے حضور باغ دنیا کی کرو سیر جو ہر دل کو سرور
کیسے کیسے ہیں گل انداموں کا دیکھو تو ظہور یاد کو اس رخ تاباں کی کرو دل سے دور
کون سی بات کی کہتی ہے تجھیں صاحبِ من

تم بھی سرور ہو ذی ہوش ہو آنک غور کرو ایک ہی شخص پہ مہر جالتے نہیں جان کو کھو
سیکڑوں ماہ جبیناں ہیں ہزاروں خوش نو تن سے بس گیر وی کفنی کے تئیں دور کرو
پہنو پشاک شہانہ رکھو خوش دل اور من

شانہ لوہا تھیں اور اپنے یہ سلجھاؤ بال سرمہ دو آنکھوں میں اور دیکھو یہ قدرت کا خیال
دل کو ہلا کے بھلا دو یہ بھی رنج و ملال تم پہ اس طرح کا ہے نام خدا حسن و جمال
کہ میں خلق کے دلبر بھی دھو دھو کے چرن

دل کو سہرور رکھو اور رہو شاد اور خوش شیریں باتیں کرو اور شکل بناؤ دل کش
کہ ہر ایک شخص کو کجائے تجھیں دیکھ کے غش نہ کہ تم اور دل پہ اس طرح پھر و وحشی و ش
جانے دو دور کرو دل سے یہ الفت کی لگن

آدمی رنج سہا کرتا ہے ان باتوں میں جان کو کھو تا پھر کرتا ہے ان باتوں میں
سب کی نظروں سے گرا کرتا ہے ان باتوں میں نام بدنام ہوا کرتا ہے ان باتوں میں
خوب ہم دیکھو جگے ہیں کہ برا ہے یہ فن

خوب سن کے میں حیراں رہی منہ کو تانک اور مایوسی و غم سے دیکھا بہ فلک

گفت گو حد سے زیادہ ہوئی بس اور یک بیک تب تو وہ حال ہوا جیسے جراحت پہ نہک

و غلط کے تیروں سے پہلو ہوا چلنی چھن چھن
سب کو روشن ہے بُری ہوتی ہے یہ پیت لگی میں بھی کہنے ہی سے آخر کے تئیں رہ نہ سکی
دل میں غصہ تو بہت آیا ولے روک گئی زار زار آنکھوں سے رونے لگی اور کہنے لگی

ہے بعید ایسے خرد مندوں سے یعنی یہ سخن
آپ تو جانے ہیں پیت بلا ہوتی ہے خوب معلوم ہے تم کو کہ یہ کیا ہوتی ہے
رہے خاموش طبیعت یہ خفا ہوتی ہے واہ جی یوں بھی لگی دل سے جدا ہوتی ہے
عشق میں کس کے تئیں بھاتی ہے سیر گلشن

عیش کبھی تپے جب تک کہ نہ ہو یا رخصت
اس سوا کون ہے بہتر کہ وہ میں دیکھوں نمود
اپنے قابو میں ہے جو دور کروں رنج و سخن
پلے کیا بس میں ہے جو دل سے کر دل رنج کو دور

بال خاص اس لئے ہیں مجھ کو یہ منظور نظر
یہ تمنا ہے یہ آنکھیں گریں اُن قدموں پر
کہ ہماریں کبھی راہ اس کی جو وہ آئے ادھر
بات کے کرنے سے ہے آہ کا کرنا بہتر
جلیو یہ تین جو خوش آئے اسے خوش پیرا ہن

میرا وہ رشک قمر کون ملا دے مجھ سے
میرا متوالا مگر کون ملا دے مجھ سے
میرا وہ تیر نظر کون ملا دے مجھ سے
یا خدا، میرا جگر کون ملا دے مجھ سے

کون جا کر کہے میں پھرتی ہوں بے شہر و وطن

خوش ہوں اس غم سے کہ یہ یار کے باعث ہوا
سر تیلی پہ دھرا عشق میں جب پاؤں رکھا
تنگ و ناموس بھی سب اُس پہ ہے وار دیا
جان کا بھی نہیں جب پاس تو پھر پاس ہے کیا

جو کہ سمجھائے مجھے اس کا ہے دیوانہ پن
 نام پر تیرے میں اس جاں کے تئیں کھوتی ہوں تیری صورت پر میں قربان کھڑی ہوتی ہوں
 خون دل روئی ہوں غرض کے تئیں دھوتی ہوں تھام تھام اپنے کیجے کے تئیں روتی ہوں
 دیکھ رہتی ہوں ہر اک شخص کو حیراں بن بن

جو نہ سہنا تھا سہا، رنج بہت کھایا ہائے
 یعنی تو نے ہی نہ دیکھا یہ مرا جلنا ہائے
 ایک ارمان رہا دل کو بہت سارا ہائے
 اب تو بے تابی سے گھبرا گیا دل میرا ہائے

ڈوب کر مری رہوں بربک گنگ اور جمن
 کس کو دکھلاؤں جو گڑھے ہے تری الفت میں
 نام بدنام ہوا فسق پڑا عزت میں
 ایک دیوانی سی بھرتی ہوں تری فرقت میں
 عرش سے فرش تلک حال ہے میرا روشن

کس سچیں جا کے کہوں کون سی جا ہے تیری
 کبھی بے تابی سے بیٹھوں کبھی ہوتی ہوں کھڑی
 کبھی ہو نوحہ تصور یہی کہتی ہوں، آجی
 سیس کے بالوں سے میں اہ ہماروں تیری
 جو قدم رنجہ کرو اور مجھے دو درشن

کبھی رو دیتی ہوں آنکھوں سے ہر شکل دریا
 کبھی منہ پیٹ لیا جب کبھی چاک کیسا
 کبھی گاتی ہوں ترے نام کو لے لے کے پیا
 آرزو ہے کہ میں سو جاں سے ہوں تجھ پہ نذا
 دیکھے ملک آن کے تو بھی تو مرا جو کن پن

تو کہیں اور میں کہیں اس سے تو مری جاؤں
 لے کر سے ماہ جیں اس سے تو مری جاؤں
 تجھ کو بھی ہو سکیں اس سے تو مری جاؤں
 تاب جینے کی نہیں اس سے تو مری جاؤں
 ہے جدائی کی نہیٹ مجھ پہ مصیبت یہ کٹھن

یا آہی کوئی مجھ سا بھی نہ ہو دے لگیں
نخل و خوار پریشان و ذلیل اور حقیر
طور بے طور نظر آتے ہیں ہوں بس کہ نظیر
حسرت آہ چہ بے غم بہ غم یا ریشہ ریر
من حزنیں در غم او خلق حزنیں در غم من

موتی (۳۸)

رہے ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و صبح موتی
جہیں پر موتی اور میسر میں موتی مانگ پر موتی
ادھر جگنو ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی
بھرے ہیں اس پری میں اب تو یار و سر بہر موتی
گلے میں کان میں نتھ میں جس دھڑکیو ادھر موتی
کوئی اس چاند سے اتھے کے ٹیکے میں اچھلتا ہے
کوئی بندوں سے بل کر کان کی نرموں میں ملتا ہے
پٹ کر دھکدگی میں کوئی سینے پر چلتا ہے
کوئی جھکوں میں جھولے ہے کوئی بالی میں ہلتا ہے
یہ کچھ لذت ہے جب اپنا چھدا تے ہیں جس گر موتی
کبھی وہ ناز میں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے
تو اک اک بات میں موتی کپانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چمپل عجب عالم دکھاتی ہے
وہ سرن توتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر بلور پر موتی
غلط ہے اس لب زگیں کو برگ گل سے کیا نسبت
کہ جن کی ہے عشق اور پنے اور یا قوت کو حسرت
اُداسٹ کچھ مسی کی اور کچھ اس پر بان کی رنگت
وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جو اہر خسانہ قدرت
ادھر نعل اور ادھر نعل ادھر مر جاں ادھر موتی
کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پر موتی ہے
نزاکت سے عرق کی بوند بھی کھڑے کو دھوتی ہے

بدن بھی موتی، سرتاپاؤں سے پہنے بھی موتی ہے سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا، وہ ہوتی ہے
 کہ کچھ وہ خشک موتی کچھ پھینکے کے وہ ترموتی
 گلے میں اس کے جس دم موتیوں کے ہار ہوتے ہیں چمن کے گل سب اس کے وصف میں موتی پروتے ہیں
 نہ تنہا رشک سے قطرات شبنم دل میں روتے ہیں فلک پر دیکھ کر تارے بھی اپنا ہوش کھوتے ہیں
 پہن کر جس گڑھی بیٹھے ہے وہ رشک ترموتی
 وہ زیور موتیوں کا داہ اور کچھ تن وہ موتی سا
 سراپا زیب و زینت میں وہ عالم دیکھ کر اس کا جو اکتا ہوں ارے ظالم تک اپنا نام تو بستا
 تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہے وہ جا دو نظر موتی
 کڑے پازیب توڑے جس گڑھی آپس میں لڑتے ہیں تو ہر جھکا میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں
 کسی دل سے بگڑتے ہیں کسی کے جی پر اڑتے ہیں کڑے سونے کے کیا موتی بھی اس کے پاؤں پڑتے ہیں
 اگر باد نہیں دیکھو ہیں اس کی کفش پر موتی
 خفا ہواں دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے دو تو اس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو
 چلے آتے ہیں آنسو دل پڑا ہے جسم میں غش ہو وہ دریا موتیوں کا ہم سے روٹھا ہو تو پھر یارو
 بھلا کیونکر نہ برساوے ہماری چشم ترموتی
 شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے دیا ابر گلانی میں کہیں بجلی چمک جاوے
 بیاں ہو کس طرح سے آہ، اُس عالم کو کیا کہنے تبسم کی جھلک میں یوں جھک جاتے ہیں انتاس کے
 کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی
 ہیں کیونکر پر زادوں سے بوسوں کے نہ ہوں لینے جڑاؤ موتیوں کے اس غزل پر دارے گھنے
 سخن کی کچھ جو اس کے دل میں ہے الفت لگی رہنے نظیر اس ریختے کو سن وہ ہنس کر یوں لگی کہنے

اگر ہوئے تو میں دیتی، تجھے، اک تھاں بھر موتی

(۳۹) موت

دنیا کے بیچ یار و سب زلیست کا مزا ہے جیتوں کے واسطے ہی یہ ٹھاٹھ سب ٹھٹھا ہے
جب مر گئے تو آخر پھر عمر خاک پا ہے نے باپ ہے نہ بیٹا، نہ یار اس شناسا ہے
ڈرتی ہے روح یار و اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

جیتوں کے دل کو ہر دم کیا عیش لے رہے ہے گلزارِ ناز، سیریں، ساقی، صراحی، مے ہے
جب مر گئے تو ہر گز مے ہے نہ کوئی شے ہے اس مرگ کے ستم کو کیا کہوں میں ہے ہے
ڈرتی ہے روح یار و اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

ہے دم کی بات جو تھے الگ یہ اپنے گھر کے جب مر گئے تو ہر گز گھر کے رہے نہ در کے
یوں مٹ گئے کہ گویا تھے نقشِ رہ گزر کے پوچھنا نہ پھر کسی نے یہ تھے میاں کدھر کے
ڈرتی ہے روح یار و اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

مرنے کے بعد کوئی الفت نہ پھر جتاوے نے بیٹا پاس آدے نے بھائی مُنہ لگا دے
جو دیکھے ان کی صوبت ہشت بھاگ جاوے اس مرگ کی جفائیں کیا کیا کوئی سناوے
ڈرتی ہے روح یار و اور جی بھی کانپتا ہے

مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے
 پیتے تھے دودھ شربت اور چاہتے تھے میوا
 مرنے ہی پھر کچھ ان کا سکھ رہا نہ تھیوا
 بچے یتیم ہو گئے، بی بی کسائی میوا
 اس مرگ نے اٹھاڑا کس کس بدن کا لیوا
 ڈرتی ہے روح یار وادرجی بھی کانپتا ہے

مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے
 جب روح تن سے نکلے آنا نہیں یہاں پھر
 کا ہے تو دیکھنے ہیں یہ بلغ و بوستاں پھر
 ہاتھی پر چڑھ کے یاں پھر گھوڑے پر چڑھ گئے اں پھر
 جب مر گئے تو لوگو یہ عشرتیں کہاں پھر
 ڈرتی ہے روح یار وادرجی بھی کانپتا ہے
 مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

گھر ہو بہشت جن کا اور پھر رہی ہو دولت
 اسباب عشرتوں کے محبوب خوب صورت
 پھر مرتے وقت ان کو کیونکر نہ ہووے حسرت
 کیا سخت بے بسی ہے کیا سخت ہے مصیبت
 ڈرتی ہے روح یار وادرجی بھی کانپتا ہے
 مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

کھائے کو نعمت اُن کے سو طرح کی آتی
 اور وہ نہ پاویں ٹکڑا دیکھو ٹک ان کی چھاتی
 کوڑی کی چوڑی بھی چھوڑی نہیں ہے جاتی
 لیکن نظیر سب کچھ یہ موت ہے چھڑاتی
 ڈرتی ہے روح یار وادرجی بھی کانپتا ہے
 مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

(۴۰) اکبر آباد

شہر سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں
کیونکہ نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں
ہر وقت اس میں شاد ہے ہیں جہاں تہاں

رکھو الہی اس کو تو آباد جاو داں
ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نذر گستری
ہر شام بھی وہ رشکِ ملاحظت ہے بھری
نثر مندہ جس کو دیکھ کے ہو عارضِ پری
لیلیٰ کی جحد کرنے سکے جس کی ہسری
دن روئے نہر طلفت و شب زلفِ ہوشاں

باغات پر بہار عمارت پر نگار
محبوب دل فریب گل اندام و گلزار
کوچے کہیں ہیں اپنے تئیں صحنِ گلستاں
بازار وہ کہ جس پہ چین دل سے ہونشار
گلیاں کہیں ہیں آپ کو گلزار پر بہار
دیکھو جدھر اُدھر گلِ عشرت ہیں کھل رہے

آبِ دہوا کے لطف کوئی کیا اب سکے
ایدھر کو فتنے ہیں تو اودھر کو چہچہے
سبزوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں
دیکھو جدھر اُدھر گلِ عشرت ہیں کھل رہے
اشجارِ باغ و شہر وہ سرسبز لعلیے
سبزیوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں

ہر فصل میں وہ ہوتے ہیں پاکیزہ بیوہ جا
شہدِ ان پر اٹھ پر لگائے ہے بے گھات
دیکھو تو پھر نبات سے بن آوے کچھ نہ بات
قند و شکر بھی دل سے فدا ہیں دن اور رات
رہتے ہیں اُن کے وصف میں ہر دم شکرِ قات
نہر جن کو دیکھو تو جیسے جن کی تہر

لاکھوں بہاریں رکھتی ہے ایک ایک جس کی لہر

کوئی نہاؤے اور کوئی مُنہ دھوے شادہر اس پرجوم رکھتے ہیں یوں ساکنانِ شہر
 شمشادوسر روہتے ہیں جوں نہرِ رعیا
 گریاں کے پیرنے کا کروں وصف میں رقم تو بحرِ صفحہ بیچ لگے پیرنے قلم
 پیریں ہیں اس روش کی بہاروں سے ہوہم سو سوچن بھرے ہوئے شبنم کے دمدم
 آجاتے ہیں نظر وہیں دریا کے دریاں
 اہلِ شننا جو کرتے ہیں سو سو طرحِ شننا لہریں نشاط و عیش کی اٹھتی ہیں دل میں آ
 ملتا نہیں کتا کچھ عشرت کے بحر کا ساحل پر جوشِ خلق سے ملتی نہیں ہے جا
 ہوتا ہے وہ ہجوم بھی اک بحرِ بیکراں
 یا ر و عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہا
 ہر طور خوش ہے ہے دل اور طبعِ شاد کام میری نظیرِ دل سے یہی ہے دعا مدام
 ہنستا رہے یہ شہر بھسدا من اور اماں

(۲)

(۲۱) پری کا سراپا

خوں پر زکرتِ شمع، نازِ ستمِ غمروں کی جھکاوٹ ویسی ہے
 عیارِ نظر، مکارِ داتا، تیورِ می کی چڑھاوٹ ویسی ہے
 مڑگاں کی سناں، نظروں کی انی، ابرو کی کھنچاوٹ ویسی ہے
 قتالِ نگہ اور دشتِ غضب، آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے
 پلوں کی جھپک پتلی کی پھرت سرے کی کھلاوٹ ویسی ہے

جو کافراس کا عالم ہے وہ عالم جو رکساں پاوے
 جب ایسا حسن بھیسو کا ہو، دل تاب بھلا پھر کیا لاوے
 گلاب بردہ منہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجاوے
 وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے
 گالوں کی دھب، خوبی کی جھک، رنگوں کی گھلاوٹ ویسی ہے
 تھی زور داد اسے سرا پر سخاوت ڈوپٹے کی اٹھی
 دل بیچ نہ کھاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ اُلجھے کیونکر جی
 زلفوں کی کھلت، پٹٹی کی جھٹ، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے
 بیدرد، ستگر، بے پردا، چنچل، بے کل، چٹکیلی سی
 ڈوروں کی بان ریلی سی، کاجل کی آن کٹیلی سی
 چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے
 اس کا فریبی اور نتھ کے انداز قیامت شان بھرے
 وہ نئے صاف تارا سے اور موتی سے دامان بھرے
 اور گھر سے چاہ زرخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے
 وہ کان نرے طوفان بھرے کن پھولوں بالے جان بھرے
 بندوں کی ہلت، بھکوں کی جھکت، بالے کی ہلاوٹ ویسی ہے
 جہرے پر حسن کی گرمی سے ہر آن جھکتے موتی سے
 ہنسنے کی ادائیں پھول جھڑپ، باتوں میں ٹپکتے موتی سے
 پاؤں کی رنگاوٹ تہرستم، دھڑپوں کی جاوٹ ویسی ہے
 تقریر بیاں سے باہر ہے وہ کافراس حسن اہا ہا ہا
 پکیں جھپکیں ان باہوں کی یارو میں واہ کہوں کیا کیا
 پہنچی کی پہنچ، پھونچے بغضب، بانگوں کی بندھاوٹ ویسی ہے
 وہ گورے گورے ہاتھ غضب، وہ نرم کافی ناز بھری
 کچھ شہ رخ کڑوں کی جھنکاریں، کچھ جھنکے چوڑی باہوں کی۔

یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینہ میں نہ تڑپے کیونکر جی وہ پیاری پیاری انگشتیں، وہ پوریں نازک نازک سی
 مہندی کی رنگت، نقد کی نبت، پھٹلوں کی چھلاوٹ ویسی ہے
 کچھ ناز واد کی مغروری، کچھ جور و جہاں کچھ بانک پنا کچھ آدھن کے موسم کی کچھ کافر جسم رہا گدرا
 یہ شور جوانی اٹھتی کا، آہ آہ ہے اسنڈ کرجوں دریا وہ سینہ بھرا جوش بھرا، وہ حسن کا عالم بھوم رہا
 شاووں کی اکڑ، گردن کی حرمت سمونڈھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے
 یہ کافر گدسی کا عالم، گھبرائے پری بھی دیکھ جسے اور گور اوصاف نکلا ایسا ہر جاوے موتی دیکھ جسے
 دل لوستے تڑپے ہاتھ لے اور غش کھاوے جی دیکھ جسے وہ گردن اونچی ٹخن بھری اکٹ جائے صراحی دیکھ جسے
 دائیں کی حرمت، بائیں کی بھرت، کوٹوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے
 اس سینے کا وہ چاک ستم اس کرتی کا تن زیب غضب اس قد کی زینت تھرا ملا اس کا فرح جب کا زیب غضب
 ان ڈبیوں کا آزار بڑا ان گیندوں کا آسیب غضب وہ چھوٹی چھوٹی سخت کچیں، وہ کچے کچے سیب غضب
 انگلی کی بھڑک، گوڑوں کی جھک بندوں کی کاوٹ ویسی ہے
 اس گورے گورے سینے پر وہ گنے کی گلزار کھلی چھپے کی کھلی، ہیرے کی جڑی، توڑے، جگنو، ہیکل بدھی
 دل لوستے تڑپے ہاتھ لے اور جائے نظر ہر دم پھسلی وہ پیٹ ملائی سا کافر، وہ ناف چسکتی تارا سی
 شوخی کی ٹھلاوٹ اور ستم، شرموں کی چھپاوٹ ویسی ہے
 ہر آن زانی ہر ایک سے اس شوخ پری کی محبوبی کچھ ناز واد کی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محبوبی
 اب گنے کی تعریف کروں یا کافر جوڑے کی خوبی پوشاک سنہری عطر بھری، سراپاؤں جو اہر میں ڈوبی
 جگنو کی دھک، سینے کی صفا کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہے
 وہ کافر و جی، جی دیکھ جسے سوار قیامت کا لرزے پازیب کڑے، پائل گھنگر، کڑیاں، پھر پیاں، بگڑے ٹوٹے
 ہر جنبش میں سو جھنکاریں ہر ایک قدم پر سو جھکے وہ چنچل چال جوانی کی، اونچی ایڑی، نیچے پنچے

کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے

قاتل ہر آن، نیا عالم کا نسر ہر آن نہی جھبکیں
ہر آن نظر میں، ترجیحی بلکیں، بھولی صورت، میٹھی باتیں
دل بس کرنے کے لاکھوں ٹھب جی لینے کی سو سو گھائیں
ہر آن پھین، ہر آن بن ہر دم میں بدلے لاکھ دہجیں

آنکھوں کی لگاوٹ، قہر ستم، باتوں کی رکھاوٹ ویسی ہے

تصویر کا عالم نکل سکھ سے چھب تختی صاف پری کی سی
کچھ چین چین کے اینٹھڑے اور ہونٹوں میں کچھ کالی سی
بیدردی سختی بہتیری اور مہر محبت تھوڑی سی
جھوٹی عیاری ناک چڑھی، بھولی سیانی، پکی پیسی

ٹھٹھوں کی اوڑاوٹ اور غضب قہر کی ہنساوٹ ویسی ہے

نظروں میں صاف اڑا لے دل، اس طر کی کافر عیاری
اور ہٹ جاوے سو کوں پرے گربات کہو کچھ مطلب کی
کہنی مارے چٹکی لے لے پھیرے بھڑکے دیوے گالی
ہر آن جھ خوش، ہر دم اچھا، ہر بات ہنسی کی چھل بھری
دمنوں کے ضلع، غمزدوں کے جھگت، پھبتی کی بھداوٹ ویسی ہے

یہ ہوش قیامت کافر کا جو بات کہو وہ سب سمجھے
یہ شوخی اور یہ بتابی، ایک آن کبھی نچلی نہ رہے
روٹھے، مچلے، سو سو انگ کرے باتوں میں لڑے نظروں میں
چنچل، اچیل، مٹکے چلے سر کھولے ڈھانپے، ہنس ہنس دے
باہوں کی جھٹک، گھونگھٹ کی ادا، جو بن کی دکھاوٹ ویسی ہے

ایک شور قیامت ساتھ چلے نکلے کافر جس دم بن ٹھن
مذکور کروں میں اب یار اس شوخ کے کیا کیا چنچل بن
بلدار کم، رفتار غضب، دل کی قاتل جی کی دشمن
کچھ ہاتھ لیں، کچھ پاؤں لیں، اچھلیں بازو بھڑکے سب تن
گاتی وہ بلا، تالی وہ ستم، انگلی کی بجاوٹ ویسی ہے

جو ایسا حسن کا دریا ہو، کس طور نہ لہروں میں بہے
دل لوٹ گیا ہے غش ہو کر بس اور تو آگے کیا کہے
گر مہر و محبت ہو بہتر، اور جو رخصتا ہو تو سہے
مل جائے نظیر ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سو رہے
بوسوں کی چپک، بنگلوں کی لپٹ، سینوں کی ملاوٹ ویسی ہے

۴۲ ائینہ

لے آئے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
 خال سیاہ اور خط مشکبار دیکھ زلف دراز و طرہ عنبرنشار دیکھ

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
 لے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ
 آئینہ کیا ہے اجمان وہ ترا پاک صاف دل اور خال و خط ہیں تیرے سو یاد کے رخ کے قتل
 زلف دراز فہم رسا سے رہی ہے بل لاکھوں طرح کے پھول سے ہیں تجھی میں گل
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
 اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک تار و مشک ختن بھی تجھی میں ہے یا قوت و حل کیا ہیں یہ تیرے لب و لہجہ میں ہے
 نسرين و نوبیا و سمن بھی تجھی میں ہے القصر کیا کہوں میں چمن بھی تجھی میں ہے
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
 اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک ختن ہے کیا یہ تری زلف پر شکن یا قوت و حل کیا ہیں یہ تیرے لب و لہجہ میں
 اور نوبیا ہے کیا ترے دندان گہر منم باغ و چمن ہے کیا یہ سراپا ترا بدن
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
 اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سوس مکھی کے گل کی گردل میں تاب ہے تو اپنے منہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے
 گل اور گلاب کا بھی تجھی میں حساب ہے رخسار تیرا گل ہے پسینہ گلاب ہے
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش نگار دیکھ
 اسے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

زر گس کے پھول پر تو نہ اپنا گمان کر اور سر دسے بھی دل نہ لگا اپنا جان کر
 یہ سب سمار ہے ہیں تجھی میں تو آن کر اپنے سوا کسی پر تو ہرگز نہ دھیان کر
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش نگار دیکھ
 اسے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

زر گس وہ کیا ہے جان تری جہنم خوش نگاہ اور سر دیا ہے یہ تراستہ دراز آہ
 گر سیر باغ چاہے تو اپنی ہی کر تو چاہ حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے واہ واہ
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش نگار دیکھ
 اسے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

گردل میں تیرے قمری بلبل کا دھیان ہے تو ہونٹھ تیرے قمری ہیں بلبل زبان ہے
 ہے تو ہی باغ اور تو ہی باغبان ہے باغ و چین ہیں جتنے تو ان سب کی جان ہے
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش نگار دیکھ
 اسے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا، گلاب، سیوقی، نسرب، نسترن داؤدی، جوہی، لالہ، درابیل، یاسمن
 جتنی جہاں میں پھولوں کی پھولی ہے جن یہ سب تجھی میں پھول ہے ہیں جن جن
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بسا دیدیکھ
 عالم میں تیرے باغ کا لے جاؤ وہ گھیر ہے
 طوطی تندر تو طوطی و کبک و بٹیر ہے
 باغ و کچن کی تجھ کو بحث گھیرا گھیر ہے
 سر پاؤں سے تو آپ ہی پھولوں کا ڈھیر ہے
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیدیکھ
 اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بسا دیدیکھ
 باغ جہاں کے غنچہ و گل میں نہ ہوا سیر
 قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سُنِ صغیر
 اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے بے نظیر
 ہیں حُسنِ مَن عَرَفَ کَی مَعْنٰی لے نظیر
 ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیدیکھ
 اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بسا دیدیکھ

۴۳ مَوْحِیٰ طَامَہ

ب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
 پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
 نکھیں بری رنوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
 سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
 جتنے فزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
 وٹی سے جہاں تک پیٹ ہے بھرا
 کڑا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
 بو اچھا نہ کوئی کوٹھا اچھل گیا
 ٹھٹھا، مہنٹی، شراب، صنم، ساقی اس سوا
 سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں
 ن جا بے ہانڈی چوٹھا تو اور نور ہے
 خالق کی قدرتوں کا اسی جانطور ہے

چوٹے کے آگے آنج جو جلتی حضور ہے جتنے ہیں نور، سب میں یہی خاص نور ہے

اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے تو سے نور کا جس جازباں پر نام یا چکی چوٹے کا جہاں گلزار ہو تمام

یہاں مہر جھکا کے کیجئے رُخِ طُوت اور سلام اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام

پہلے انھیں مکاؤں میں آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب نل ہیں پور پور آٹا نہیں ہے پھلنی سے پھن پھن گرے ہے نور

پیڑا ہر ایک اس کا ہے برنی و موئی چور ہرگز کسی طرح نہ کچھ پیٹ کا تنور

اس آگ کو مگر یہ جُھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل نقیر سے یہ مہر و ماہِ حق نے بنائے ہیں کا ہے کے

وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خبر دے ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہ یہ ہے دلائل نور کیا اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا

وہ بولا سن کے، ”تیرا گیا ہے شعور کیا کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا

جتنے ہیں کشف اسب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیشِ ثل گئے

دو تر نوالے پیٹ میں جب آئے ڈھل گئے چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے

یہ کشف، یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو میلے گی سیر، خواہش باغ و چین نہ ہو

بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے، بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں
 اب جن کے آگے ہال پوسے بھر کے تھال ہیں پوری بھگت انھیں کی وہ صاحب کے لال ہیں
 اور جن کے آگے روغنی اور شیر مال ہیں عارف وہی ہیں اور وہی صاحب کمال ہیں
 پکلی بکائی اب جنھیں آتی ہیں روٹیاں
 کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے سینے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
 باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
 جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
 روٹی سے ناپے پیادہ قواعد دکھا دکھا اسوار ناپے گھوڑے کو کاوا لگا لگا
 گھنکر کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے جا بجا اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو جا بجا
 سو سطرچ کے نالچ دکھاتی ہیں روٹیاں
 روٹی کے نالچ تو ہیں بھی خلق میں بڑے کچھ بھانڈ بھگتے یہ نہیں پھرتے ناپتے
 یہ رنڈیاں جو ناپے ہیں گھونٹ گھٹ کو منہ پر لے گھونٹ گھٹ نہ جانو، دوستو تم زینہارا سے
 اس پردے میں یہ اپنی کماتی ہیں روٹیاں
 اور وہ جو ناپنے میں باتی ہیں بھاؤ تاؤ چتون اشارتوں سے کہیں ہیں کہ روٹی لاؤ
 روٹی کے سب سنگار ہیں روٹی کے راؤ جاؤ رنڈی کی تاب کیا جو کرے اس قدر بناؤ
 یہ آن یہ جھک تو دکھاتی ہیں روٹیاں
 اشرفوں نے جو اپنی یہ ذاتیں چھپائی ہیں سچ پوچھے تو اپنی یہ شانیں بڑھائی ہیں
 کہنے انھوں کی روٹیاں کس کس نے کھائی ہیں اشرف سب میں کہنے تو اب ان ہائی ہیں
 جن کی وکان سے ہر کہیں جاتی ہیں روٹیاں

بھٹیا ریاں کہا دیں نہ اب کیونکر رانیاں ہنتر خضم ہیں اُن کے وہ ہیں ہنترانیاں
 ذاتوں میں جتنے اور ہیں قصے کہانیاں سب میں انھیں کی ذات کی اونچی ہیں بانیاں
 کس واسطے کہ سب یہ پکاتی ہیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور کوئی ہے نادستی و دوستی ناتندر خوی ہے
 کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے
 نوکر، نذر، غلام، بساتنی ہیں روٹیاں

روٹی کا ابزل سے ہمارا تو ہے خمیر روٹی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد خمیر
 یا پتلی ہو دے موٹی، خمیری ہو یا فطیر گیہوں کی جوار باجرے کی جیسی ہو نظیر
 ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

(۴۴) 'اندھی'

نہ ہو کیونکر جہاں یا روزبر اور زیر آندھی میں کہ ہو کر بادلے پھرتے ہیں بن کے شیر آندھی میں
 لگا لینے جو گل دامن ہوا کا گھیر آندھی میں بگولے اٹھ چلے تھے اور نہ تھی کچھ دیر آندھی میں
 کہ ہم سے یار سے آہو گئی ٹہ بھیر آندھی میں

کہا میں نے ابھی کچھ خمیر ہے جانے ہو تم کیدھر ہوا پر بھی تمہیں کچھ ہے نظر اے نازنین دلبر
 چلو بھاگو شش تابی ورنہ آندھی آگئی سر پر جتا کر خاک کا اڑنا دکھا کر گرد کا چسکر
 دہیں ہم لے چلے اس گبدن کو گھیر آندھی میں

یہ سنتے ہی پھری ڈر کر وہ چھپل نازنین گلو چلی اس چال سے اس دم کو میرا جی گیا غش ہو

کہ اس میں آکے اک جھونکا اندھیرا کر گیا یارو رقیبوں نے جو دیکھا یہ اڑا کر لے چلا اس کو
 پکارے ہائے یہ کیسا ہوا اندھیرا آندھی میں
 یہ کہہ کر کھڑکھڑاتیخ و سپر اور مل کے سب ڈوٹے پکارے لے چلو جانے نہ پاوے اس کو جلد ہی سے
 کہاں کا وہ بھلا اور کس کا لینا ہم جو دھڑ بھاگے وہ دوڑے تو بہت لیکن انھیں آندھی میں کیا سمجھ
 زبس ہم اس بری کو لائے گھر میں گھیر آندھی میں
 چلے اس میں ہوا کے پھرتو آکر اور سناٹے اندھیرا ہو گیا کیسے منوں خاکیں لگیں اڑنے
 انھیں جھوکوں میں ہم نے اس بری چھل کو آندھی میں چڑھا کوٹھے پہ دروازے کو روند اور کھول کر پردہ
 لگا چھاتی لئے بو سے کیا ہست پھیر آندھی میں
 او دھرتو آکے آندھی سے اندھیرا ہو گیا ہر سو خبر کس کو کسی کی میں کہاں ہوں اور کہاں تو
 ابا بابا عجب عشرت کی اس دم بہ گئی اک جو وہ کوٹھے کا مکاں وہ کالی آندھی نہ صغم گل و
 عجب رنگوں کی ٹھری آکے ہیرا پھیر آندھی میں
 اسی آندھی نے گلشن کر دیا بار و مرے گھر کو بچھا یا شاد ہو میں نے پنگ پر بھاڑ بستر کو
 صراحی کی خبر لی اور سنبھالا جا کے سانگ کو اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا چھاتی سے دلبر کو
 نشوں میں عیش کے کیا کیا کیا دل سیر آندھی میں
 چمن سا کھل گیا بار و مرے کوٹھے کے زینے پر ہوئی پنکھوں کی مارا مار گرمی کے پسینے پر
 لگے پھر عیش و عشرت جب تو ہونے اس قریں پر کبھی بوسہ کبھی انگیا پہ ہاتھ اور گاہ سینے پر
 لگے لئے مزے کے منگترے اور ہیرا آندھی میں
 یہ ٹھہر جب تو بھر داں عیش کے بادل لگے گھرنے جو ڈوبی حشر میں تھیں دل میں سب دم لگیں تر نے
 لپٹ کی ٹھری اور بھی ہاتھ سینے پر لگے پھرنے مزے عیش و طرب لذت لئے یوں لوٹ کر گرنے

کہ جیسے ٹوٹ کر میووں کے ہو دیں ڈھیر آندھی میں
 اس آندھی میں اہا ہا عجیب ہم نے غزنے مائے
 نلک پریش و عشرت کے دکھائی دے گئے تائے
 رقیبوں کی میں اب خواری خرابی کیا لکھوں بائے
 تلے کو ٹھٹھے کے بیٹھے اٹ گئے سب گرد کے مائے
 بھری نیتھوں میں ان کے خاک بس دس سیر آندھی میں
 کسی نے بھاگ کر جلدی سے جا گھر کا لیا آنگن
 گرا کوئی گڑھے میں اور کوئی بھاگا کہیں دشمن
 کسی کے چھن گئے کپڑے چکوں کی گئی داں بن
 کسی کی ارگٹنی پگڑھی کسی کا پھٹ گیا دامن
 گئی ڈھال اور کسی کی گر پڑی شمشیر آندھی میں
 یہ دن آندھی کے یار دیوں تو سب کے ہوش کھوئے ہیں
 جھنڈیں عیش و آندھی میں ہوتی سے پڑتے ہیں
 مزا ہے جن کو ہستے ہیں جھنڈیں غم ہے ٹوٹتے ہیں
 نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
 میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پر یاں گھیر آندھی میں

(۴۵) اتر دھے کا بچہ

بیچے ہے اب تو کوئی بلبل بے کا بچا اور بچتا ہے کوئی طوطے ہرے کا بچا
 مینا، بیسا، لٹورا اور ابلتے کا بچا تیر بٹیر سارس، شکرے، لوے کا بچا
 سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لواڑو ہے کا بچا
 کھاتے تھے ہم تو اس سے آگے بلاؤ قلیا یار وکھی سوکھی روٹی یا باجرے کا دلیا
 پھرتے ہیں سر پہ رکھ کر جالیں من کی ڈلیا اب کوئی آگرے میں ایسا نہیں ہے بلیا

سب بیچتے ہیں اگر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لوازد ہے کا بچا
 جب بیچتے تھے یارو ہم اُزد ہارانا سو طرح کا جب تو آتا تھا ہم کو کھانا
 اب گاکی جو کم ہے تو ہے یہ دل میں ٹھانا ایک بچہ روز لانا اور روز بیچ کھانا
 سب بیچتے ہیں اگر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لوازد ہے کا بچا
 گاہک نہ کوئی بولا ہے یہ بُرا زمانا آج اس کو سر پہ رکھ کر سہرے چھانا
 اب بھی بکا تو بہتر نہیں پھر پڑے گا لانا ہے اس سے ہی ہماری نثری کا ٹھکانا
 سب بیچتے ہیں اگر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لوازد ہے کا بچا
 ہے ڈر ہم اس کو رکھیں یا پھیر کر لے جاویں تو کیا ہم آپ کھا دیں اور کیا اسے کھا دیں
 کچھ بن نہیں ہے آتا یہ دکھ کسے سنا دیں جی چاہتا ہے اب تو یہ شہر چھوڑ جا دیں
 سب بیچتے ہیں اگر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لوازد ہے کا بچا
 سو من گیہوں کا ہر دن کھائے کو کہاں آئے اور بو کھال پانی کب تک کوئی پلاوے
 جب رات ہو تو ہر دم یہ خوف جی میں آئے شاید لے چڑا کر کوئی چور لے نہ جاوے
 سب بیچتے ہیں اگر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لوازد ہے کا بچا
 روزی کے اب تو ایسے کھر گھر میں کسے ہاتھی دھوئے اپنے دیتے ہیں لوگ ڈھالے

جب تنگ ہو کر روزی کون اڑدے کو پلے اس کی بھی اور ہماری یاد و خبر خدا لے
 سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لو اڑدے کا بچا
 نو دس ہزار تک تو چھوٹے اسے نہ دیں گے اتنے روپے تو اس کے اک پر کے ہم نہ لیں گے
 ستر ہزار تک بھی سودا نہیں کریں گے اسی ہزار دے گا تو ہم بھی بے چکیں گے
 سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لو اڑدے کا بچا
 سب اٹھ گئے جہاں وہ تھے جو لوگ جیا وہ رہ گئے ہیں جن کے گھر میں نہیں ہے ہنسنا
 اس بات کو تو عمدہ ہو بھوگ کا بلسا جو اڑدے کو پالے ایسا ہے کون ریا
 سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لو اڑدے کا بچا
 آگے تو گھر بہ گھر تھے اکشر تمام داتا سیرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
 اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا بیچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا
 سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
 ہم بیچتے ہیں یارو، لو اڑدے کا بچا

(۴۶) ککڑی

بھونچے نہ اس کو ہرگز کابل دے کی لکڑی نے پورب اور نہ پھم خوبی بھرے کی لکڑی

نے چین کے پرے کی اور نہ درے کی لکڑی دکھن کی اور نہ ہرگز اس پرے کی لکڑی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں گنے کی بُدیاں ہیں ریشم کی نکلیاں ہیں

فراد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسیاں ہیں مجنوں کی سرداہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

کوئی ہے زردی مائل کوئی ہری بھری ہے بکھر ج منغل ہے، پتے کو تھر تھری ہے

ٹیراھی ہے سو تو چوڑی وہ بہیر کی ہری ہے بیدھی ہے سودہ یا درانجھ کی بالسرہی ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

میٹھی ہے جس کو برنی کہئے، گلابی کہئے یا حلقے دیکھ اس کے تازی جلیبی کہئے

تلی شکریوں کی پھانکیں اب یا امرتی کہئے بیج پوچھئے تو اس کو دندان مصری کہئے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

چھونے میں بگ بگ ہے کھانے میں لکڑی ہے گرمی کے مارنے کو اک تیر کی سری ہے

آنکھوں میں سکھ کچے ٹھنڈک ہری بھری ہے لکڑی نہ کہئے اس کو لکڑی نہیں پری ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

بیل اس کی ایسی نازک جوں زلف بچ کھائی
دیکھ اس کی ایسی نرمی باریکی اور نگائی
بیچ ایسے چھوٹے چھوٹے خشتاش یا کہ رائی
آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

لیتے ہیں مل اس کو گل کی طرح سے گل کے
عاشق تو ہیں بجاتے شعلوں کو اپنے دل کے
معتوق اور عاشق کھاتے ہیں ونوں مل کے
معتوق ہیں نگاتے ماتھے پر اپنے چھلکے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

مشہور جیسے ہر جایاں کی جالیاں ہیں
میٹھی ہیں سو تو گویا شکر کی تھالیاں ہیں
ویسی ہی لکڑی نے بھی دھو میں بیٹھ لیاں ہیں
کڑوی ہیں سو بھی گویا خواہاں کی گالیاں ہیں

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

جو ایک باریار واس جا کی کھائے لکڑی
دل تو نظیر عشق ہے یعنی منگائے لکڑی
پھر جا کہیں کی اس کو ہرگز نہ بھائے لکڑی
لکڑی ہے یا قیامت کیا کہے ہائے لکڑی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی لکڑی

اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی لکڑی

(۴۷) بھونچال

بھونچال کا ہوق نے یہ نقشہ دکھا دیا قدرت کا اپنی زور جہاں کو دکھا دیا
روشن دلوں کے نور نظر کو بڑھا دیا غفلت زدوں کو مار کے ٹھوکر جگا دیا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جن منکروں کو نوح کے طوفان کا شبہ تھا اور دوزخ و بہشت کو سمجھیں تھے تو تیا
فائن نہ قبر کے تھے نہ خطراتھا حشر کا ایک زلزلے نے سب کے دے دوسے مٹا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

سنبہ بارہ سواٹھارہ میں یہ واردات تھی اول جمادی بارہویں تاریخ، سات تھی
دن بدھ کا جمعرات کی وہ آدمی رات تھی بھونچال کیا تھا قدرتِ خالق کی بات تھی

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھی آدمی رات جب ہوا بھونچال کا گزر پتاسا تھر تھرا گیا پتال کا جگر
سانوں طبق کے ہل گئے مکان ہر سہر دربو لے اکھنڈ تو دیواریں انحدر

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اجڑائے ارض قاف سے قاف ہل پڑے اجڑا چل ٹل کے کلیجے نکل پڑے
انسان گھر سے دشت سے وحشی نکل پڑے طاہر بھی آشیانوں میں اپنے اوچھل پڑے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور کھپڑا تھا دیا

گر طمہ کوٹ، قلعہ روئے زمین پر دہل گئے کانپیں انگلیں، برج کے کنگورے ہل گئے
سنگیں محل مکان تھے سو وہ بھی اوہل گئے اینٹوں کے زہرے پھٹ گئے پتھر کھیل گئے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور کھپڑا تھا دیا

باہم کو اڑاڑ گئے زنجیریں ہل پڑیں کرتیاں مہرک مہرک کے چھتوں سے نکل پڑیں
چھبے، ستون کانپے، منڈیریں دہل پڑیں دیواریں مجھوم مجھوم کے پنکھے سے جھل پڑیں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور کھپڑا تھا دیا

گھر گھر میں شور ہو گیا اور غل گلی گلی روئے زمین پہ پڑ گئی ایک دم میں کھل ملی
کوئی اللہ اللہ کہہ اٹھا کوئی علی علی کوئی یا حسین کہہ اٹھا کوئی رام رام جی

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور کھپڑا تھا دیا

تھیں جتنی جتنی اصل زمین کی رسائیاں ایک زلزلے نے سب وہ پکڑ لیں ہلائیاں
بھونچال نے یہ جیسی ہوا میں دکھائیاں ایسی ہزاروں اس کی ہیں قدرت نمایاں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھادیا
دست تضا کی انگلی کی چھوٹی سی پور ہے ہلنے سے جس کے کانیا ہر اک مار مور ہے
بھونچال کا تو یارو، یہ ادنیٰ سا شور ہے سودر جہ اس سے، اس کی تو قدر تین سو رہے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھادیا

جیسا کہ حکم اس کے سے آیا تھا زلزلہ کانپی تمام روئے زمین جس سے تھر تھرا
ویسا ہی اپنے حکم سے گردہ نہ روکتا پھر کھینچا تھا جہان میں فقط پانی پانی تھا
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھادیا

بھونچال کے تو ہم کو خیالات خام تھے یہ چھوڑنے یہ روکنے قدرت کے کام تھے
تھا ڈول تو وہی کہ نہ خاص اور نہ عام تھے رحم آگیا ورنہ وہیں سب تمام تھے
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھادیا

سجد کر د خدا کے تئیں یا رو د بدم آخر کریم تھا تو کیا اس نے پھر کرم
بانی تو کچھ رہی نہ تھی پر تھم گیا قدم ورنہ گھڑی میں یا رونہ پھر تم تھے اور نہ ہم
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھادیا

بھونچال کیا جو چاہے تو اک پل کے مارتے کر ڈالے آسمان وزمین کو اُپر تلے
اڑتے پھر یہ پہاڑ روئی کی طرح پڑے قادر، کریم، دم میں جو کچھ چاہے سو کرے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا
 کہتے ہیں یوں حکیم کہ پھرتی ہے سب ہوا آتا ہے اس سے روئے زمیں پر یہ زلزلہ
 خالق کا بھید ہے، یہ کسی پر نہیں کھلا ہم تو اسی کے حکم کا جانے ہیں دبدبہ
 دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا
 محکوم سب اسی کے ہیں حاکم وہی آلہ تابع ہیں اُس کے حکم کے ماہی سے تابہ
 جب اس کا حکم آوے تو جو کون سداہ کیا حکم ہے عزیزو، آؤرا دیکھو واہ واہ
 دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا
 لرزے ہیں آکے ڈالیاں نخلوں کی لگائیں دہشت سے چل بھل ہو جڑیں بھی کھل گئیں
 تھرا کے گاؤں ماہی کی چولیں اوٹل گئیں جل تھل کے ہوش اڑ گئے، ریخیں نکل گئیں
 دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا
 جو ارض سب جہان کے بوجھوں کے تئیں سے جب وہ ہی تھر تھرا دے تو پھر ہم کہاں رہے
 جنات دیو فیل و شتر، شیر اڑ رہے ایک دم میں سب کے تن کے غرض کھل گئے چھپے
 دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا
 بھونچال کی دھمک کا وہ سنتے ہی کھڑکھڑا جی مہنتوں میں آگیا اور دم نکل چلا

اوروں کے دل کی کیا کہوں جانے دی خدا پر میں تو جانا صور سرافیل پھونک گیا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھکا دیا

قدرت کی تیغ کی ہے یہ کچھ آب در درمی کھینچے ہی، جس کے پر لگی سینوں میں تھر تھری
دارائی کام آئی نہ یہاں کچھ سکندری ایک دم میں تھر تھرا لگی سب خشکی و تری

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھکا دیا

آنکھوں سے میری اس گڑھی آنسو چلے گزرا یہ جی میں ہائے ہوا کیا غضب چلے
تحت الشری کی سیر کو ہم سب کے سر چلے دل میں ہی یقین ہوا یعنی بس اب چلے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھکا دیا

ہسیت کے بارے پہلے تو دل ہو گیا دو نیم جب تھم گیا تو ہو گیا جی دو ہیں مستقیم
یہ قدرتوں کی دیکھ کے شان امید و بیم سر کو جھکا گئے میں نے کہا وہ ہیں یا کریم

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھکا دیا

بھونچال میں کہاں تھا یہ عالم مجال کا سب حکم تھا یہ حضرت ایزد تعال کا
اک دم میں یوں بڑھا دیا شعلہ جلال کا اک دم میں یوں دکھایا جھکا جلال کا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھکا دیا

بھونچال کا تو کہنے کی خاطر یہ نام تھا یہ شور زور دیکھا تو قدرت کا کام تھا
 احکام ذوالمنن کا جس کا اہتمام تھا یہ زلزلہ تو دہاں کا اک ادنیٰ غلام تھا
 دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور کھپسرتھا دیا
 حاکم دہی، حکیم دہی، حق دہی کسبیر خالق دہی، خدا دہی، دانا دہی خبیر
 مالک دہی، ملک دہی، قادر دہی قدیر قدرت کا اُس کی ایک یہ شتمہ تھا اے نظیر
 دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
 ایک آن میں ہلا دیا اور کھپسرتھا دیا

(۴۸) کوڑی نامہ

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہل یقین ہیں کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
 کپڑے بھی ان کے تن میں نہایت نہیں ہیں سمجھیں ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 کوڑی بغیر سوتے تھے خالی زمین پر کوڑی ہوئی تو رہنے لگے شہ نشین پر
 پچھلے سنہری بندھ گئے جاموں کی چین پر موتی کے پچھلے نمک گئے گھوڑوں کی زین پر
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی ہی چاہتی ہے سدا بادشاہ کو کوڑی ہی تھام لیتی ہے فوج دہپاہ کو
 لے کر چھڑی رومال گدا بھی نباہ کو پھر تباہ ہے ہر دوکان پہ کوڑی کی چاہ کو
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھیل کماں سے ہو رتھ خانہ، فیل خانہ، طویلا کماں سے ہو
 منڈوا کے سرفقیر کا چیل کماں سے ہو کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میل کماں سے ہو
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں کوڑی کے واسطے آپس میں خون کرتے ہیں کوڑی کے واسطے
 یاں تک تو لوگ مرتے ہیں کوڑی کے واسطے جو جان دے گزرتے ہیں کوڑی کے واسطے
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 کوڑی سے ہر امیر کی چلتی ہے باؤنی کوڑی کے ساتھ ہوتی ہے لشکر کی چھاؤنی
 کوڑی سے ہے گی لاکھ طرح کی اٹھاؤنی کوڑی عجب ہے چیز یہ
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 گالی دمار کھاتے ہیں کوڑی کے واسطے شرم دجیا اٹھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
 سو ملک چھان آتے ہیں کوڑی کے واسطے مسجد کو دم میں ڈھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں

کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 کتنے تو ہم میں ایسے ہیں کوڑی کے بتلا کوڑی ہو گندگی میں لعلیں دانت سے اٹھا
 خست نہیں ہے ایسا ہے کوڑی کا مرتبہ کوئی دانت سے اٹھا وہ ہم آنکھوں سے لیں اٹھا
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 کوڑی ہی ڈالتی ہے طوائف کے تئیں لٹاڑ کوڑی ہی اُس کی لبتی ہے کرتی اور انگیا بھاڑ
 کوڑی ہی ہو کرتی ہے چھیر بھاڑ لڑکا بھی دم میں آتا ہے سن کوڑیوں کا بھاڑ
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 بن کوڑی خوردے کے برابر بھی پت نہ تھی کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
 آگے گماشتوں کے کھلی ہر طرف ہی پھر وہ جو کچھ کہیں تو وہی بات ہے سہی
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 بن کوڑی تھیں نہ تیل کی باسی منگوڑیاں کوڑی ہوئی تو چھٹنے لگیں لنبی چوڑیاں
 یوں خلعت دوڑے نکھیاں ہوں گرد پیہ دوڑیاں خالق نے کیا ہی چیز بنائی ہیں کوڑیاں
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 اب جن کے گھر میں روز بستی ہیں کوڑیاں کیا کیا انہوں کی جان میں بستی ہیں کوڑیاں
 دانت ان کے نکلے پڑتے ہیں سحتی ہیں کوڑیاں وہ کیا ہنسیس کے یار وہ نہستی ہیں کوڑیاں

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 تنکے سے جن کے دانت تھیلوں رک کوڑیاں کھوتی ہیں ان کے آن میں دکھ درد کوڑیاں
 خوبی میں اپنی ایسی ہیں اب فرد کوڑیاں نام رک کوڑی ہیں غرض مرد کوڑیاں
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 خاص محل اٹھاتے ہیں کوڑی کے زور سے بکے کو میں کھداتے ہیں کوڑی کے زور سے
 پل اور سرا بناتے ہیں کوڑی کے زور سے باغ و چین لگاتے ہیں کوڑی کے زور سے
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
 لے مفلس اور فقیر سے تاشاہ اور وزیر کوڑی وہ دل رہا ہے کہ ہے سب کی دل پیر
 دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر کوڑی عجب ہے چیز میں اب کیا کہوں نظیر
 کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
 کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

(۴۹) وَجَدُ حَال

کیا علم انھوں نے یہ کیا جو بن لکھے کو با بچے ہیں
 دل ان کے تار تاروں کے تن ان کے قبل طابچے ہیں
 اور بات نہیں منہ سے نکلے بن ہونٹھ ہائے جا بچے ہیں
 منہ چنگ زباں دل سانگی پا لکھنگرو ہاتھ کما بچے ہیں

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے بن تال کھاوج نانچے ہیں
 کل بابجے بچ کر ٹوٹ گئے آواز لگی جب لہرائے اور چھ چھ ٹکڑوں میں بند ہوئے تہب گت کانت لگے پانے
 سنگیت نہیں یہ سنگت ہے ٹوٹے بھی جس سے ٹٹ مانے یہ نالچ کوئی کیا بچائے اس نالچ کو ناچے سو جانے
 ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے بن تال کھاوج نانچے ہیں
 جب ہاتھ کو دھویا ہاتھوں سے جب ہاتھ لگے تھرکانے کو اور پاؤں کو کھینچا پاؤں سے جب پاؤں لگے گت پانے کو
 جب اکٹھا اٹھائی ہستی سے جب نہیں لگے ٹٹکانے کو سب کا چھ کچے سب نالچ بچے اس ریا چھیل بھانے کو
 ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے بن تال کھاوج نانچے ہیں
 جو اگ جگر میں بھڑکی ہے اس شعل کی اجیالی ہے جو منہ پر جن کی زردی ہے اس زردی کی سب لالی ہے
 جس گت پران کا پاؤں پڑا اس گت کی چال نرالی ہے جس مجلس میں وہ نانچے ہیں وہ مجلس سب کا خالی ہے
 ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے بن تال کھاوج نانچے ہیں
 سب گھٹنا بڑھنا پھینک دھرو دھیان ادھر دھر رہتے ہیں بن تاروں تار ملائے ہیں جب زرت نرالا کرتے ہیں
 بن گئے جھوک کھلاتے ہیں بن جوڑے من کو ہر تے ہیں بن ہاتھوں بھاؤ تاتے ہیں بن پاؤں کھڑے گت بھرے ہیں
 ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انھیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے بن تال کھاوج نانچے ہیں
 تھا جن کی خاطر نالچ کیا جب مورت ان کی آکے گی کہیں آپ کہا کہیں نالچ کہا اور تان کہیں لہرائے گی

جب چھیل چھیلی سندر کی چھب زینوں اندر چھائے گی
 اک مور چھا گئے آئے گی اور جوت میں عمت سمائے گی
 ہیں راگ انھیں کے رنگ بھر اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے، بن تال کھا وج مانچے ہیں
 سب ہوش بدن کا دور ہو جب گت پر آمد رنگ . بجی
 تن بھنگ ہوا، دل دنگ ہوا، سب آن گئی بے آن سچی
 یہ ناچا کون نظیر بیاں اور کس نے دیکھا مانج اجی
 جب بوند ملی جا دیا میں، اس تان کا آخر نکلا جی
 ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
 جو بے گت بے سرتال ہوئے، بن تال کھا وج مانچے ہیں

(۵۰) جوانی بڑھائی لڑائی

جہان میں یار و خدا کی عجب خدائی ہے
 کہ ہر کسی کو کب سے ہے خود نسائی ہے
 ادھر جوانی بڑھاپے پر چڑھ کے آئی ہے
 ادھر بڑھاپے کی اس پر ہونی چڑھائی ہے
 عجب جوانی بڑھاپے کی اب لڑائی ہے
 جوانی اپنی جوانی میں ہو رہی سسڑا
 بڑھاپا اپنے بڑھاپے کا ہو رہا دم مار
 ہوئے ہیں دونوں جو لڑنے کے واسطے تیار
 ادھر جوانی نے کھینچی ہے آسپر تلوار
 بڑھاپے نے بھی ادھر لاٹھی اک اٹھائی ہے
 ادھر ہے تیر ساقامت، ادھر ہے پشت کمان
 ادھر ہے کبڑی کمر اور ادھر اکڑ کے نشان
 جوانی کہتی ہے بڑھ کر کس بڑھاپے میاں
 تیری ہے خیر اسی میں کہ جاسرک اب ہاں
 وگرنہ تیری اجل میرے ہاتھ آئی ہے

میں آج وہ ہوں کہ رستم کو کھڑکھڑاؤں پہاڑ ہو دے تو اک دم میں ہل ہلاؤں
 درخت جڑ سے اکھاڑوں، زمین ہلاؤں ابھی کئے تو تری دھجیاں اڑاؤں
 کہ مجھ کو زور کی قوت کی ہادشائی ہے

کہا بڑھاپے نے، اگر تجھ میں زور یہ ہے بچا تو ہاں جی دیکھیں ہمارے تو سامنے آجا
 اگرچہ دانت ہمارے نہیں ہے منہ میں رہا مسوڑوں سے ہی تری ہڈیوں کو ڈالیں چجا
 نہ ہم سے لڑ کہ اسی میں تری بھلائی ہے

ہزار گو کہ تر زور پر چڑھا ہے سن یہ ہم نہ چھوڑیں ترے کان اب مروٹا بن
 اگرچہ تو ہے نیا ہم پرانے ہیں لیکن نیا ہے نو ہی دن آخر پُرانا ہے سودن
 قدیم ہے یہ مثل ہم نے کیا بنائی ہے

کہا جوانی نے ”تیرا تو ہے گا کیا احوال تو میرے سامنے آدے کہاں تیرا مجال
 نہ تیرے پاس طنخہ، نہ تیرا سیف نہ ڈھال ابھی گھڑی میں کچھ تا پھرے گا ایک ایک بال
 یہ ڈاڑھی تو نے جواب سوپ سی بڑھائی ہے

کہا بڑھاپے نے سن کر ”اگرچہ تو ہے پہاڑ تو ہم بھی سوکھ کے جھڑبھری کے ہوئے ہیں جھاڑ
 ابھی کئے تو ترے کپڑے لئے لیوں پھاڑ ذرا سی بات میں اک دم کے بیچ ڈالیں جو اکھاڑ
 ہر ایک مونچھ تیری یہ جو تاؤ کھائی ہے

کہا جوانی نے سن کر کہ ”چل نہ کہہ یہ بات ابھی میں آن کے ماروں تری کمر میں لات
 کہیں ہواؤں کہیں سڑ کہیں پڑا ہوا ہات جسے تو جینا سمجھتا ہے اور خوشی کے سات
 یہ تیرا جینا نہیں یہ تو بے حیائی ہے

کہا بڑھاپے نے سن کر کہ تو نے خوب کہا جو پوچھو بیچ تو مزا ہے ہمیں کو جینا کا

شراب ہو جو پُرانی تو اڑ چلے ہے نشا پرانے جب ہو چا دل تو ہے انھیں می مزا
یہ بات تو نے نہیں کیا سنی سنانی ہے
تری جو پوچھو تو ہے چار دن کی سب کو چاہ جہان تو ہو چکی بس ہے گاتیر حال تباہ
ہیں ہیں وہ جو کریں ہیں تمام عمر نباہ تو ملک تو دیکھ گریبان میں ڈال کر منہ آہ
کہ اب ہے کس میں فنا کس میں بے وفائی ہے

جوانی جب تو یہ بولی بڑھاپے سے سن کر تری وفا سے مری بے وفائی ہے بہتر
میں جب تلک ہوں بہا میں مزے ہیں تترسہر جو سلطنت ہو گڑھی بھر تو وہ بھی ہے خوش تر
مزے تو لوٹ لئے گو کہ پھر گدائی ہے

کہا بڑھاپے نے سن کر وہ سلطنت ہے کیا کہ جس کے سات لگا ہو زوال کا دھڑکا
ہیں ملی ہے بزرگی کی وہ سند اس جا کہ جب تلک ہیں رہے گی ہمارے سات سدا
خدا نے ایسی ہی دولت ہمیں دلائی ہے

کہا جوانی نے چل بھوٹی اب نہ کر تکرار تجھے تو عیش ہے لیکن تری ہے مٹی خوا
شراب، نانچ، مزے، گل بدن، گلے میں ہا تری خرابی یہ دیکھی ہے میں نے کتنی بار
جہاں گیا ہے تیری ڈاڑھی وہاں ہلائی ہے

مجھے خدا نے دیا ہے یہ مرتبہ اور شان جدھر کو جاؤں اُدھر عیش رنگ پھول دیا
اچھل ہے کو دہے لذت، مزہ، خوشی کے دہیا گلے لپٹتے ہیں محبوب گل بدن ہر آن
جہاں گئے تو وہاں سیر ہی اڑاتی ہے

کہا بڑھاپے نے چل بھوٹ مجھ سے مت بڑے فدا تو جن پہ ہے وہ سیر پاؤں ہیں پڑتے
ہیں کہیں ہیں وہ حضرت تجھے کہیں آئے ہزار بار پڑے تجھ پہ لات اور گھونٹے

بھلا بتا تو کہیں ہم نے مار کھائی ہے
 کچل گیا ہے توجہ گل رخوں کی لاتوں میں ہم ان کو مارا تار میں ہیں دم کی باتوں میں
 ہم عیش دن کو اڑاتے ہیں اور راتوں میں کریں ہیں عشق کو ہم بھی ہنر کھاتوں میں
 تجھے کہاں ابھی اس ڈھب کی آشنائی ہے
 توجہ کے واسطے گلیوں میں اب پھر ہے خوار ہم ان کی کوٹے ہیں چھو منہ کے بیج بہار
 تجھے تلاش و طلب میں کٹے ہے لیل دنہا ہم اپنی دھوکے کی ٹٹی میں کھیلے ہیں شکار
 تو کیا وہ جانے جو کچھ گھات ہم نے پائی ہے
 کہا جوانی نے تو کس سند سے ہے کہتا مرا تو وصف کتابوں میں ہے لکھا ہر جا
 کہ وہ وقف جوانی ہے زندگی کا مزا تری جو بات کا مذکور ہے کہیں آیا
 تو ہر طریق سے خواری ہی تجھ پر آئی ہے
 جوانی نے خواری کا نام منہ سے سنا بڑھا پا دوڑ جوانی سے جا وہیں پلٹا
 مڑوڑیں سوچیں ادھر اس لئے ڈاڑھی کو کھینچا لڑے جو دونوں تو آہر طرف یہ شور مچسا
 کہ ”یارو دوڑ تو، فریاد ہے، دہائی ہے“
 کھڑے تھے لوگ ہزاروں یہ دونوں لڑتے تھے کبھی بچھاڑتے تھے اور کبھی کچھڑتے تھے
 جو بازو چھوڑتے تھے تو کمر بکڑتے تھے کچھ اس طرح کے نئے گھونے لات جڑتے تھے
 کہ سب یہ کہتے تھے ”کیا ان کے دل میں آئی ہے“
 یہ مار کوٹ کا آپس میں جیب ہوا چرچا نظیر اس میں وہیں ایک ادھیڑ پن آیا
 کچھ اس کو روکا ادھر اور کچھ اس کو سمجھایا تم اپنے خوش رہو، وہ اپنے خوش رہے ہر جا
 ملاپ خوب ہے، لڑنے میں کیا بھلائی ہے

(۱۵) بلد یوحی کا میلہ

کیا وہ دبیر کوئی نڈیلا ہے تاکہ ہے اور کہیں وہ چیلہ ہے
 موتیا ہے چنبیلی، بیلا ہے بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
 شہر قصبائی اور گنویلا ہے زرا شرفی ہے پیسہ دھیلا ہے
 ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے بھیڑ ہے خلقوں کا ریلہ ہے
 رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلد یوحی کا جی میلہ ہے

ہے کہیں یار اور کہیں اغیار کہیں عاشق ہے اور کہیں دلدار
 کہیں بستی ہے اور کہیں گلزار کہیں جنگل ہے اور کہیں بازار
 وہی بھگتی ہے اور وہی اوتار اس کی لیدائیں کس سے ہوں اظہار
 آپ آتا ہے دیکھنے کو ہزار آپ کہتا ہے یوں پکار پکار

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلد یوحی کا میلہ ہے

ہے کہیں رام اور کہیں کچھن کہیں کچھ مجھ ہے اور کہیں راون
 کہیں بارہا کہیں مدن موہن کہیں بلد یوحی اور کہیں سیکشن
 سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن کہیں رنگ ہے وہ نارائن
 کہیں نکلا ہے سیر کو بن ٹھن کہیں کہتا پھرے ہے یوں بن بن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلدیو جی کامیلا ہے

آج میلے کایاں جو ہے سامان آئے ہیں دور دور سے انسان
کوئی درشن کوئی دعائیں مان سب کی ہوتی ہیں شکلیں آسان
ہر طرف کھل رہے گل وریحان ہار، بدھی، مٹھائی اور پکوان
بھیڑ انبوہ غل دکان دکان اور یہی شور ہر گھر می ہر آن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلدیو جی کامیلا ہے

ہر طرف حسن کی پکاریں ہیں دربار، سویرن، سنواریں ہیں
اک طرف توبتیں جھنکاریں ہیں جھانچھ مزدنگ لاس دھاریں ہیں
سیر ہے دید ہے بہاریں ہیں کر کے جے جے یہی پکاریں ہیں
کہیں عاشق نظارے مارے ہیں سونگا ہوں کی جیت ہاریں ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلدیو جی کامیلا ہے

اتنے لوگوں کے ٹھٹھے لگے ہیں آ جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دودو کوس لگا بلغ و بن بھر رہے ہیں سب ہرجا
ہیں ہزاروں باسلی اور سودا لاکھوں بکتے ہیں گنتے اور مالا
بھیڑ انبوہ اور دھرم دھکا جس طرف دیکھئے اہا ہا ہا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلد یو جی کا میلا ہے

بس کہ اٹھے ہے خلیقوں کا دل جا بجا بھر رہے ہیں جو جنگل
چوک بازار فوج اور جنگل جنگلوں میں ہیں بیٹھے رہے جنگل
کوئی انہوہ میں رہا ہے کچل کوئی دھنکوں میں کر رہا ملدل
کتے کرتے ہیں جست کو دھچل کتے کتے ہیں مورچیل جھل جھل
رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلد یو جی کا میلا ہے

ہیں ہزاروں ہی جنس کے بٹے موتی مونگا اور آرسی بٹے
پیرے لٹو جلیبی اور گٹے کولے، نارنگی، سنگترے، کھٹے
کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹے کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے چٹے
پڑہیں مندر کے کوٹھے اور اٹے بوڑھے لڑکے جوان اور سڑے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلد یو جی کا میلا ہے

لوگ چاروں طرف کے آتے ہیں آکے عیش و طرب مناتے ہیں
دل سے سب درشنوں کو جاتے ہیں اپنے دل کی مراد پاتے ہیں
جھانجھ مردنگ دنت بجاتے ہیں راس منڈل بچھن سناٹے ہیں
دل میں پھولے نہیں سماتے ہیں سب یہ نہیں ہنس کے کتے جاتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلہ ہے

زور بلد یو جی کا میلا ہے

ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں ہک پلک غنچہ لب سبیلے ہیں
 بات کے ترچھے اور کھیلے ہیں دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
 خشک تر از ماسو کھلے گیلے ہیں ٹیڑھے بل دار اور نکیلے ہیں
 جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں پیارا الفت بہانے حیلے ہیں

رنگ ہے روپ ہے بھمیلہ ہے

زور بلدیو جی کا میلہ ہے

خلق آتی ہے سب جڑی جڑی چیز رکھتے ہیں باندھ کر چکڑی
 کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی دوڑیو چور لے چلا گھڑی
 حبیب کتری کہیں گئی پکڑی کہیں لونی اور دوکان اور ہٹری
 چور نے تاک لی کہیں پکڑی سوتا شے ہنسی خوشی پھکڑی

رنگ ہے روپ ہے بھمیلہ ہے

زور بلدیو جی کا میلہ ہے

نازنیں ہیں وہ ساوڑی گوری جن کی نازک ہر اک پری پوری
 کر کے چتون نگاہ کی ڈوری دل کو پھینے ہیں سب برا زوری
 دھوم ناز و ادا جھکا بھوری سبج میں جیسے تیج لہی ہوری
 گھونگھٹوں میں ہیں کرہی چوری چوری کیسی کہ صاف سر زوری

رنگ ہے روپ ہے بھمیلہ ہے

زور بلدیو جی کا میلہ ہے

کنڈ پر بھی نہان ہوتے ہیں جس میں گنگا برن کے سوتے ہیں

پانی لے ہاتھ منہ کو دھوتے ہیں کتنے کتنی کھڑے پروتے ہیں
 کتنے جاکر بنوں میں سوتے ہیں بندر دلیں جنوں کو بوتے ہیں
 ان بہار دلیں میں ہوش کھوتے ہیں سوزے سوتا شے ہوتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے
 زور بلدیو جی کا میلا ہے

کوئی آکر بہانے اور مس سے مل رہا ہے ملا ہے دل جس سے
 ہوتے ہیں آ ملا ہے جس تس سے لڑ رہا ہے کوئی کہیں اس سے
 کوئی کھویا گیا ہے مجلس سے کون چلائے پوچھے کس سے
 کہنی بازو میں لگ رہے کھس سے اور دھکا پیل اور گھان کھسے

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے
 زور بلدیو جی کا میلا ہے

ناچ اور راگ کے کھڑا کے ہیں گھنگر و اور تال کے جھٹا کے ہیں
 نقلیں قصے کہانی، سا کے ہیں کھنڈ و دھرے، کبت، کتھا کے ہیں
 کہیں آغوش کے پا کے ہیں کہیں بوسوں کے سوچا کے ہیں
 تھر تھری دانت پر کڑا کے ہیں تس پہ جاڑے کے سو جھڑا کے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے
 زور بلدیو جی کا میلا ہے

صحن مندر کا سب سے اعلیٰ اس کا گنبد ہے عالم بالا
 ہو رہا جھانکیوں کا اجیالا پردے جیسے ہیں چاند پر ہالا

ہے کوئی درشنوں کا متوالا کوئی جہتا ہے دھیان میں مالا
 کوئی دندوتیں کر رہا لالا کوئی جے جے کرے ہے دھن مالا
 رنگ ہے روپ ہے بھیلا ہے
 زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہے جو مندر میں آپ وہ لالہ ہر گھڑی میں بدل رہی ہے برن
 نئی پوشاک اور نئے بھوجن نئی جھانکی ہے اور نئے درشن
 آرتی کی کہیں مچی ٹھن ٹھن کہیں گھنٹوں کی ہو رہی چھن چھن
 تال مردنگ جھانجھ کی جھن جھن خاص پرشاد مصری اور ماکھن
 رنگ ہے روپ ہے بھیلا ہے
 زور بلدیو جی کا میلا ہے

کوئی چنچل چلے ہے ٹھکی چال کچھ وہ پستی کر وہ لبے بال
 آنکھوں میں جن کے نئے رنگ لال مصری ماکھن کے ہاتھوں اوپر تھال
 کچھ وہ پوشاک کچھ وہ جن و جال مالوں کا زیادہ اُن سے کمال
 ڈال دیں ہار کا گلے میں جال بدھی ہو کر لیں صاف دل کو نکال
 رنگ ہے روپ ہے بھیلا ہے
 زور بلدیو جی کا میلا ہے

بس کہ آتے ہیں راجا اور رانی اور لاکھوں میں رانی اور نانی
 بھیڑا نبوہ کی سرادانی اور بچوں کی لاکھ طفیلیانی
 پالکی، ہاتھی، گھوڑے، رتھ بانی جوگی بیراگی گیانی اور دھیانی

کچھ نہیں مول تول کیا پانی پانی کا دودھ، دودھ کا پانی

رنگ ہے روپ ہے بھیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

کتے کچے ہیں کتے پتے ہیں ان کے منہ اور اچھال جھکے ہیں

چورٹ کھٹ ہیں اور اچھے ہیں دودھ، کھویا، ملائی، پچکے ہیں

بھیڑ انبوہ اور بھڑکتے ہیں دھوم دھونسوں کے اور دھڑکتے ہیں

پالکی ہاتھی گھوڑے ڈنکے ہیں سوتھانے ہیں، سو جھکے ہیں

رنگ ہے روپ ہے بھیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

لاکھوں بیٹھے باطلی اور منہار اینا سب گرم کر رہے بازار

چوڑی بنگڑی کی اک طرف جھنکار نوگرہی، پوتھا، انگوٹھی چھلے ہار

ٹوٹے پڑتے گنوا ری اور گنوار جس گنوا ری کو چلے دھکا مار

گر کے دے گالی یوں کہ ہے پکار کیسواٹھلا چلو ہے ڈاڑھی جاہر

رنگ ہے روپ ہے بھیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

منی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر کوئی کیوے ہے کوئی دیوے پھیر

کوئی کھاری کے کر رہا ہت پھیر کوئی کاچھن کے چن رہا ہے بیر

کوئی کنجر مان سے لڑ رہا منہ پھیر کوئی بنے کو مارتا ہے سیر

گالی ڈک مار کوٹ سا بچہ سویر لالھی پانھی ہے شور غل اندھیر

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے

زور بلد یو جی کا میل ہے

سکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں	پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار پھل چھڑیاں	کہیں کھلتی ہیں دل کی گچھڑیاں
کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں	کہیں باہیں گئے ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لٹ ہی دھڑیاں	دال موٹھیں، منگوچی اور بڑیاں

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے

زور بلد یو جی کا میل ہے

لگ رہی بھڑ اس قدر ٹھٹھ ہو	راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھر دو	جس کو کھینچے ہیں گر پڑے ہے سو
بیٹھے کہتے ہیں کھا کے دھکوں کو	جے ہمارا ج رام رام بھجو
اور گنور دل پکار کر ہو ہو	اب تو لٹھ وار ہے لگانے کو

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے

زور بلد یو جی کا میل ہے

کیا چچی ہے ہمارے جے بلدیو	عیش کے کار و بار جے بلدیو
دھوم لیل و نہار جے بلدیو	ہر کہیں آشکار جے بلدیو
ہرزباں پر ہزار جے بلدیو	دبدم یادگار جے بلدیو
کہہ نظیر اب پکار جے بلدیو	سب کو ایک بار جے بلدیو

رنگ ہے روپ ہے جھمیل ہے

زور بلدیو جی کامیلا ہے

غزلیات

غزلیں

(۱)

بتوں کی مجلس میں شب کو ملہ دو جاوڑک بھی قیام کرتا
 خراب خستہ سمجھ کے تو نے پیارے مجھ کو عبث نکالا
 بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے اے پری
 قیامت آتی جو مسکرا کر چہن میں جانا وہ سیر کرنے
 کنشت دیراں صنم کو بندہ، برہمنوں کو غلام کرتا
 جو رہنے دیتا تو گل رنوں میں، قسم ہے تیری میں نام کرتا
 وگرنہ سینے سے دل ٹپ کر انگ میں آکر مقام کرتا
 تڑپتی بلبل بسکتی فوری، گلوں پہ پہنسا حرام کرتا
 نظر تیری اشارتوں سے یہ باتیں غیروں کی سن رہا ہے
 وگرنہ کس میں بھی تاب و طاقت جو مجھ سے آکر کلام کرتا
 کمال گو دہل اگر جہاں میں جو خاک میری کو جام کرتا
 تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجیب عیش مداہم کرتا

جو پاتا لذت برسان مستان اے محبت سے تیری اہ
 وہ بزم اپنی تھی میکشی کی فرشتے ہو جاتے مست و بخود
 سا جو زلفیں ٹھڑے پہ کھول دیتا، صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں
 تو صومے سے محل کے اپنے، وہ میکہ سے میں قیام کرتا
 جو شہجی داں سے بچ کے کتے تو پھر میں کو سلام کرتا
 نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا
 نظیر آخر کو ہار کر میں، گلی میں اس کی گیا تھا کہنے
 تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا
 خور افکن جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا
 رکھتا ہے کام بہدم داں ضبط آہ کرنا

• لائے کو گو کہ لال کا پیا لہ بیا دیا
 گردوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا
 سائے گل سے تابہ خار مرے دل کے باغ کو
 اے ابرو نہ ہر جا بھی ابر مزہ نے آج
 پر ساتھ اس کے دلغ بھی کیا لگا دیا
 سب کچھ دیا اگر دل بے دعا دیا
 اس شعلہ رو نے ایک نظر میں جلا دیا
 پل مارنے میں اشک کا صیبا بہا دیا
 خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر
 سوتے تھے، لیکن عشق نے آکر جگا دیا
 الفت نے اس کی اوج یہ ہم کو دلا دیا
 شرمندہ رفونہیں عاشق کا چاک جیب
 جیسے رہے فنا نہ ہو پھر بھی اب ملک
 ساساتی نے سب کو بھر کے دئے جا بزم
 جو رفتہ رفتہ خاک میں آکر ملا دیا
 کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا
 قاتل نے ہم کو مار کے ایسا جلا دیا
 ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا
 چاہا کہ مجھ سے پھر وہ نہ بولے کبھی نظیر
 لوگوں نے بارے منتیں کر کے ملا دیا

وہ رشتک جن کل جو زیب جن تھا
 چمن جنبش شاخ سے سینہ زن تھا
 گیا میں جو اس بن چمن میں تو ہر گل
 مجھے ہر گھڑی افسر گہیر ہن تھا
 یہ غنچہ جو بس درو گھیں نے توڑا
 خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا
 تن مردہ کو کیا تحف سے رکھنا
 گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
 کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
 مشق بدن تھا، معطر کنن تھا
 جو تب رکن ان کی اکھڑی تو دیکھا
 نہ عضو بدن تھا، نہ تار کنن تھا
 نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کنن کی
 جو سوچا، تو ناحق کا دیوانہ بن تھا

وہ مجھ کو دیکھ کچھ اس ڈھب سے خرم رہا
 کہ میں حیا ہی پر اس کی فقط نشا رہا
 بسوں کو بوسے دئے ہنس کے اور بھی گالی
 ہزار شکر، بھلا، اس قدر تو پیار ہوا
 قرار کر کے نہ آیا وہ سنگ دل کا نسر
 بڑیں قرار پر پتھر، یہ کچھ مسترا ہوا
 گلے کا ارجو اس گلبدن کے ٹوٹ پڑا
 تو ڈر نظر کا وہیں اس کو ایک بار ہوا
 کسی سے اور تو کچھ بس چلانا اس کا نظیر
 ندان میرے ہی آکر گلے کا ہار ہوا

ادھر اس کی نگہ کا ناز سے آکر لپٹ جانا
 اور عزتا تو پنا غش میں آنا، دم الٹ جانا
 کہوں گیا کیا میں نفتے اس کی ناگن زلف یارو
 لپٹنا، اڑ کے آنا، کاٹ کھانا پھر لپٹ جانا
 اگر ملنے کی دھن رکھنا تو اس ترکیب سے ملنا
 سر کنا، دور بھٹنا، بھاگنا اور پھر لپٹ جانا
 نہ ملنے کا ارادہ ہو تو یہ عساریاں دیکھو
 ہلکنا، آگے بڑھنا، پاس آنا اور ہٹ جانا
 یہ کچھ ہر وہ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی
 بکھرنا، سبڑ ہونا، لہلہانا پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی، یہ یک رنگی، بس اور یہ قیامت ہے نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا
 نظیر ایسا جو چیل، دلربا بہر و پیا ہووے
 تماشا ہے پھر اپنے شوخ سے سووے کا پٹ جانا
 لا کر ہر ایک ادا میں وہ عیار چٹکا چٹکا
 چٹکی بجاکے چھوڑے ہے ہر بار چٹکا
 ظاہر میں اگر چہ وصل کی کتنا ہے منہ سے با
 پردل میں اور کرتا ہے تیار چٹکا
 سب جانتے ہیں چٹکے بازی نظیر کی
 اس کے تو ہر سخن میں ہے اے بار چٹکا
 نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا
 بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشتیاں اپنا

بہار آئی گیا ہر شلن پر گل نے مکاں اپنا
 بڑے حظ لیتے ہم بھی لب جو میکشی کر کر
 مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے
 عدم سے جو ہیں اے ہنیشیں ہستی میں لایا ہے
 بنا اب تو بھی اسے بلبل جن میں آشتیاں اپنا
 اگر آتا جن میں آج وہ سرور واں اپنا
 کہاں گل اور کہاں منہ تو دیکھ لے باغباں اپنا
 وہی غمخوار اپنا، یار اپنا، مہرباں اپنا
 اسی کی مہربانی سے سبھوں کی مہربانی ہے

ہو واجب وہ نظیر اپنا تو پھر ہے سب جہاں اپنا
 دیا قاتل نے پہلی ہی نظر میں جان کو دہلا
 بہت حق ذوالفقار حیدر می ہم منہ نہ موڑیں گے
 چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے
 آگہی شرم رکھ لیو ابھی یہ وار ہے پسلا
 اگر زخموں سے بن جاوے گا، تن نشیر کا دہلا
 کہ مثل آتش فسر وہ پھر کچھ دل چسلا گھلا
 جو شاعر ہے تو خالی ڈال مت اس یار کا کہنا

نظیر اب دیکھتا کیا ہے تو ہی یہ ریختہ کہہ لا
 جھمک دکھاتے ہی اس دلربا نے لوٹ لیا
 ہمیں تو پہلے ہی اُس کی آواز نے لوٹ لیا
 ہنسی نے ڈال دی پھانسی، دعا نے لوٹ لیا
 وفا نے باتوں لگایا، جفا نے لوٹ لیا
 کٹے ہم اس کی گلی میں تو یوں پکارے لوگ
 کہ ایک فقیہ کو ایک بادشاہ نے لوٹ لیا
 ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعست بار آوے
 کہ ہم کو راہ میں ایک آشنائے لوٹ لیا

ہزاروں قافلے جس شوخ نے کئے غارت
 نظیر کو بھی اُسی بے وفا نے لوٹ لیا
 ایک دن آپ نے اس کا نہ کبھی دھیان کیا
 جس نے یہ جن دیا اور تمہیں انسان کیا
 طور کو پھونک دیا اس نے تمہاری خاطر
 چشم کے واسطے جب سرے کا سامان کیا
 ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
 کام مشکل تھا، پر اللہ نے آسان کیا
 دل پار کی گلی میں کر ارام رہ گیا
 پایا جہاں فقیر نے بسرام رہ گیا
 کس کس نے اس کے عشق میں مار نہ دم دے
 سب چل بسے مگر وہ دلِ ملام رہ گیا
 جس کام کو جہان میں تو آیا تھا اسے نظیر
 خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

جو پوچھا میں نے یہاں آنا مر منظور رکھئے گا
 تو سن کر یوں کہا یہ بات دل سے دور رکھئے گا
 بہت روئیں یہ آنکھیں اور پڑی دن رات روتی ہیں
 اب ان کو چشم بھی کیجئے گا یا ناسور رکھئے گا
 جو پردہ بزم میں منہ سے اٹھائے ہو تو یہ کہہ دو
 کہ پھر یہاں شمع کے جلنے کا کیا مذکور رکھئے گا

بادل ہم نے تم کو اور تواب کیا کہیں لیکن یہ ویرانہ تمہارا ہے اسے معمور رکھئے گا
نظیر اب تو دل و جاں سے تمہارا ہو چکا بندہ
میاں اپنے غلاموں میں اسے مشورہ رکھئے گا

چاند اپنا تو کسی اور کا ہالا نکلا
ہم نے سمجھا تھا جسے گل سو وہ لا لا نکلا
بھیک لینے تیرے اس گل سے کھڑے کی را
بدر چاندی کا لئے ہاتھ میں پیا لا نکلا
اس کے چہرے پہ نہیں کا کل مشکیں کی نمود
یہ پیاری کے تیں توڑ کے کا لا نکلا
طو پر جیسی کسی وقت میں جکی تھی چمک
کچھ ہر بام سے ویسا ہی اُجا لا نکلا
مٹ گئی شور و فغاں جی کے نکلے ہی نظیر
پھر نہ سینے سے اُٹھی آہ نہ نا لا نکلا

کہ مر ہے کج آگاہی وہ شہنشاہِ چلبلیا
کہ جس کے غم سے مراد دل ہوا ہے بادلیا
تمام گوروں کے حیرت سے رنگ اڑ جاتے
جو آج گھر سے نکلتا وہ مسیحا سا نولیا
تجھے خبر نہیں بلبل کہ باغ سے گل ہیں
بڑی سی بھولوں کی ایک بھر کے لے گیا ڈلیا
خدا کے واسطے سمجھو نہ اس کو کوٹھے وال
فریب دیتا ہے تم کو یہ بواہوس ٹلیا
نظیر یار کی کل ہم نے جو ضیافت کی
پکایا ترس منگا کر بولاؤ اور قلیا
سو آپ یار نہ آیا رقیب کو بھجا
ہزار حیف ہم ایسے نصیبوں کے بلیا
اُدھر تو ترس ہوا اور اُدھر نہ آیا یار

پکائی گھیر تھی قسمت سے ہو گیا دلیا

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اسے مسکا
لبائے نزاکت سے ایک شور تھا بس لب کا
سوارِ حریر اس کا مسکا نگہ گل سے
شبنم سے کب لے بلبل پیرا ہن گل مس کا

اس تن کو نہیں طاقت شبہم کے تلبس کی
 لٹی ہے پری آنکھیں اور حجبیں سا ہے
 لے دست ہو اس پر تو قصد نہ کر مس کا
 ہے نقش جہاں یار و اس پائے مقدس کا
 ہم عطر لگاتے ہیں گرمی میں اسی خس کا

اس گریہ خوئی کی دولت سے نظیر اپنی

اب کلبہ احزاں میں کل فرش ہے اطلس کا

ادھر مدت ہوئی وہ حسرت گلشن نہیں آتا
 نزاکت اور خوش اندامی زیادہ اس سے کیا ہوگی
 شکار دل تڑپتا ہے شکار انگن نہیں آتا
 مہ کنعاں کا جس کے بریں پیرا ہن نہیں آتا
 اسے سب کچھ بن آتا ہے مجھے کچھ بن نہیں آتا
 یہ ڈھب ہیں یاد تیں پر کچھ فریب و فن نہیں آتا
 کہ ہر دم روٹھنا آتا ہے لیکن من نہیں آتا

نظیر اس شوخ نے سیکھی زبان فارسی جب سے

دلوں کے حق میں بڑ بٹکن اُسے مشکن نہیں آتا

اس کے شرار حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا
 پھر کے نگاہ چار سو ٹھہری اسی کے روبرو
 طور کو سر سے پاؤں تک بھونک دیا جلا دیا
 اس نے تو میری چشم کو قبلہ نہا بنا دیا
 اس نے مجھے رُلا دیا کیں نے اُسے ہنسا دیا
 چاہا اُدھر گھٹالیا چاہا اُدھر بڑھا دیا
 تھادہ تھام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا
 ہم نے تو اپنا دل دیا ہم کو کسی نے کیا دیا

سن کے ہمارا عرض حال یا رے یک بہ یک نظیر

ہنس کے کہا کہ بس جی بس تم نے تو سر پھر ادا یا
 زیر فلک وہ خلق ہوئے ماہ پارہ ہا
 ہر شب ترے فراق میں اسے اختر مراد
 دیکھے ہے جن کو رشک سے چشم ستارہ ہا
 اپنی ہر ایک آہ ہے گنج ستار ہا
 گل اختر سپر ہیں گرم نظارہ ہا
 یوں نگ بھرتوڑے ہے آئینہ ہائے دل
 مینا کے ٹکڑے کرتے ہیں جوں سنگ خارہ ہا
 رکھتی ہے ایک جنبش ابرو اشارہ ہا
 کرتا ہے عرش جن پہ قد اگو شورہ ہا
 ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزار ہا
 کچھ صید زخم خوردہ جاناکاں ہمیں نہیں
 دیکھا اسی طرح سے، اُسے ہم نے بار ہا
 اس گل کے چاک جبب کی حسرت سے باغ نہیں
 ہر صبح چاک ہوتی ہیں جبب و کستار ہا
 اس سوزن مرنہ کے تصور میں مشائساں
 ٹوٹے ہیں ایک خلق کے پہلو میں خار ہا
 کس کس کی دیکھتے ہیں صنع میں ہمار
 اپنی فقط دو چشم ہیں اور یساں ہمار ہا
 تھے کل یہ خط عارضِ غواں سبزہ رنگ
 کہتے ہیں آج اخلق جنہیں سبزہ دار ہا
 تھے کل یہ شاہدان سسی مہر و وسیتن
 شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزار ہا
 سب کو نظیر سونا ہے ایک دن بہ زیر خاک
 سنگ مزار، اس کے ہیں آئینہ دار ہا
 یار نے ہم کو اگر رسوا کیا اچھا کہا
 ہم تو رسوا ہیں ہی کیا بے جا کہا اچھا کہا
 وصف اس کے حسن کا کلی ہوا کس سے مگر
 جس کے جتنا فہم میں آیا کہا اچھا کہا

آپ سے جب آپ کو ہم نے ملایا خاک میں پھر تو جس جس نے جو کچھ چاہا کہا اچھا کہا
یار کے آگے پڑھایہ ریختہ جا کر نظمیں

سن کے بولا واہ واہ اچھا کہا اچھا کہا

نہ آیات بھی کتنی ہی انتظار کیا قرار کر مجھے کانسر نے بمبار کیا
چمن میں اس گل رنگین کی جامہ بی نے ہر ایک گل کے گریبان کو تار تار کیا
کیا ہے کیا نہ کنواں پہ چمن نے احسان کہ اس کے دور میں تجھ کو نہ آشکار کیا
ہمارا دیکھ اسے رشک سے یہ کہتی ہے کہ تھایہ چمن تو پھر مجھ کو کیوں ہمارا کیا

نظیر آج تصدق کو کچھ نہ تھا ہم پاس

وہی جو باقی تھا اک جی وہی نثار کیا

تجھے کچھ بھی خدا کا ترس ہے اے نگ دل ترسا ہمارا دل بہت ترسا ارے ترسا نہ اب ترسا
نہ جاؤں میں تو اس کے پاس لیکن کیا کروں یارو یکا یک کچھ جگر میں آ کے لگ جاتا ہے نشتر سا

نظیر اک دو گلے کرنے بہت ہوتے ہیں خوبان کے

چلو اب چپ رہو بس کھول بیٹھے تم تو دفتر سا

جال میں زمر کے اگر موتی کا دانا ہوگا وہ نہ اس دامن میں آوے گا جو دانا ہوگا
آج دیکھ اس نے مری چاہ کی چتون یارو منہ سے گو کچھ نہ کہا دل میں تو جانا ہوگا
بھر نظر دیکھیں گے اس عہد شکن کی صورت دیکھئے کون سا یارب وہ زمانا ہوگا
خوں بہانے کا مرے حشر میں جب ہوگا ہما دیکھیں کیا اس گھڑی قاتل کو بہانا ہوگا
وہاں بھی کچھ ایسی ہے کہ دے گا کہ جس اس کی بات کی بات بہانے کا بہانا ہوگا
دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر پھر تیرا کا ہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

دل فلج تھ پہلے سرو گل اندام ہوا حلقہ زلف بتاں پھر اُسے کب دام ہوا
ہو گیا دیکھتے ہی مشرق خورشید خجل اس کفِ پاسے مشرف جو سرِ بام ہوا

آگیا اس میں وہ محبوب دل آرام نظیر
جب اُسے دیکھ لیا تب ہیں آرام ہوا

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا اسلام چھوڑ کر لیا، پھر کسی کو کیا
اس بے وفائے کو اگر اپنے عشق میں رسوا کیا، خراب کیا، پھر کسی کو کیا
آپ ہی کیا ہے اپنے گریباں کو ہم نے چاہا آپ ہی سیاسیانہ یا پھر کسی کو کیا

دنیا میں آکے ہم سے بُرا یا بھلا نظیر
جو کچھ کہہ ہو سکا سو کیا پھر کسی کو کیا

سبھوں کو مے میں خوناب دل پلانا تھا فلک مجھی پہ بجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے اگر یہ اشک نہ ہوتے تو کیا ٹھکانا تھا
نگہ سے اس کی بچاتا ہے کس طرح دل کو ازل سے یہ تو اسی تیر کا نشا نا تھا
نہ کرتا خون میں ہیں کس طرح وہ رنگین آہ اسے تو ساتھ ہمارے یہ رنگ لانا تھا
شبِ فراق کی ادنیٰ اسی اک یہ حالت ہے کہ تھا جو گھر سو ہمارا وہ قید خانہ تھا
جو کروٹیں بھینس مو وہ بے کلی کی شدت تھی جو خواب تھا سو وہ دل غش میں ڈوبا تھا

✓ غرض نہ سہی خبر تھی نہ پا کا ہوش نظیر

سہرا نا پانٹی اور پانٹی سہرا نا تھا

کیا جو مارنے ہم سے پیامِ رخصت کا تو دم نکل گیا سنتے ہی نامِ رخصت کا
مثالِ شمع کے ٹپ ٹپ ٹپک پڑے آنسو سنا جو شوخ کے منہ سے کلامِ رخصت کا

تم اپنے ظلم سے ہرگز نہ باز آؤ گے
چلا، نظیر کے لیے، سلام رخصت کا
جب میں سنا کہ یار کا دل مجھ سے ہٹ گیا
میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج
اتنا کوئی کہے کہ دوانے بڑا ہے کیا
آنکھوں میں میری صبح قیامت گئی جھمک
یہ کشمکش ہوئی کہ گریباں مرا ادھر
سنتے ہی اس کے میرا کلیجا الٹ گیا
وہ پیر کیا ہرا ہو جو جڑ سے اُٹکٹ گیا
جادیکھ ابھی اُدھر کوئی پریوں کا غٹ گیا
سینے سے اس پر ہی کے جو پردہ الٹ گیا
ٹکڑے ہو اور اس کا ڈوپٹہ بھی پھٹ گیا

✓ آخر اسی ہسانے ملا یار نے نظیر
کپڑے بلا سے پھٹ گئے سودا تو پٹ گیا

پھر آن کے منت سے ملا ہم سے وہ لالا
گر قتل مجھے تو نے ہمیشہ کو جلایا
دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہے یہی آہ
میرے مجھے کہتا تھا، سو مرتا ہوں میں یارو
شاید وہی بن بٹن کے چلا ہے کہیں گھر سے
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں
ہم تجھ سے اسی روز کو روتے تھے نظیر آہ
✓ کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالا

پھر ہو کے خنارو ٹھٹھ گیا ہم سے وہ لالا
یہ سیل کے اشکوں کی بیاباں میں نہیں نہر
اے داغ مبارک ہو تجھے منصب و اٹا
پھوٹا کوئی مجنوں کے گر پاؤں کا چھالا

شیریں کے در اوپر یہ چوئے شیر نہ جانو فریاد کے لوہو کا چھلکتا ہے پیالا
کیا جانے کس حال میں ہووے گا عزیز دل آج مرا سلمہ اللہ تعالیٰ
وہ اب سے روٹھا نہیں متے کا نظیر آہ

کیا دیکھے ہے چل پاؤں پڑا اور کس منالا
مانی نے جو دیکھا تری تقدیر کا نقشا سب بھول گیا اپنی وہ تحریر کا نقشا
اس ابرو خم دار کی صورت عیاں ہے خنجر کی شاہت دم شمشیر کا نقشا
یہ زلف سیہ عارض قاتل یہ نہ جانو تقدیر نے کھینچی ہے یہ زنجیر کا نقشا
کیا گردش ایام ہے لے آہ جگر سوز اُلٹ نظر آبا تیری تاشیر کا نقشا
تدبیر تو کچھ بن نہیں آتی ہے نظیر آہ

اب دیکھئے کیا ہوتا ہے تقدیر کا نقشا
ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا
تو وہ ست نور سہرا کہ تیری صورت کو بشر تو کیا ہے عری جاں ملک نہ دیکھ سکا
گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا
یہ نہا توں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو تو صورت اس کی اتھا کر ملک نہ دیکھ سکا

نظیر تم سے نہ ہوتا کبھی جدا پیارے
پہ کیا کرے کہ یہ کافر فلک نہ دیکھ سکا

ملا مجھ سے وہ آج چن چن جھبیلدا ہوا رنگ سن کر رقیبوں کا شیلدا
کیا مجھ سے جس نے عداوت کا نیچہ سنلقتی علیہم عذاباً ثقیلدا
نکل اس کی زلفوں کے کوپے سے اول تو پڑھتا تم اللیل الالیلدا

کہتاں میں ماروں اگر آہ کا دم نکانت جبالاً کثیباً مہیلا

نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ

فضل جسی اللہ نعم الوکیدا

کل جو رخ عرق فشاں یار نے ٹک نہ کھا دیا
اس کے شرار حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا
پانی چھڑک کے خواب سے فتنے کو بھر جگا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
گزرے جو سوئے خانقاہ واں بھی شیکل جانناز
اہل صلاح و زہد کو فرش کیا بچھا دیا
لکھے جو راہ دیر سے اک ہی نگاہ مست میں
گبر کا صبر کھو دیا، بُت کو بھی بُت بنا دیا

سُن کے یہ میرا عرض حال یار نے یوں کہا نظیر

چل بے زیادہ اب نہ بک تو نے تو سر بھر دیا

خرام ناز سے اس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا
ہماری خاک نے کیا کیا ہوا کے ساتھ سر جھٹکا
نہیں گستاخات کا ترے ہاتھ پہ لے زاہد
نشاں ہے یہ کسی محبوب بے پروا کی چوکھٹ کا

نظیر آرام سے گرتھ کو اس دنیا میں رہنا ہے

سوا اللہ کے ہرگز کسی دل کو مست اٹکا

سا سنے اس صفا مژگاں کے میں کل جاؤں گا
چھد تو جاؤں گا براگے سے نہ ٹل جاؤں گا
ہے کف پاؤہ مصفا کہ جے دہیان میں لا
پائے نظارہ یہ کہتا ہے پھسل جاؤں گا
مجھ کو دیے ہو عبث خانہ زنجیریں جا
جوں صدا میں ابھی اس گھر سے نکل جاؤں گا
گر چہ ہوں بے حرکت ضعف جوں آتش ننگ
پر جو چھپڑا تو شر رساں میں او چھل جاؤں گا

بے کلی آج بھی واں لے گئی مجھ کو تو نظیر

میں نے ہر چند یہ چاہا تھا کہ کل جاؤں گا

شہر دل آباد تھا جب تک وہ شہر آرا رہا جب وہ شہر آگیا پھر شہر دل میں کیا رہا
کیا رہا پھر شہر دل میں جز ہجوم درد و غم تھی جہاں بزم طرب و اشکِ غم آ رہا

آ رہا آنکھوں میں دم تو بھی نہ آیا وہ صنم
حیف کس سے پوچھے جا کر کہ وہ کس جا رہا

عشق کا جو گل زخم دم شمشیر کھلا رہ گیا جسم پہ مثل گل تصویر کھلا
طفل اشک لے کر نہ چاہے کہ ہے گل لے آئے پیار سے مہر سے الفت بہ تدبیر کھلا

خود تب میں ہم لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پس پردہ وقتِ دیر کھلا

کان میں نام خدا اس مہ کے جب بالا پڑا آگئی چکر میں برق اور ماہ پر بالا پڑا
دیکھنا ہدم یہ اتر اس بنیتاں میں نمر یا نہ کا کل کسی کے چکے ہے بالا پڑا
لائق اس بالے کے گوہر یہاں ہاتھ آیا نہ لیک دیکھنا ہم کو مگر اب عالم بالا پڑا
گوہر مقصود سمجھے ہم وہی اس راہ میں پاشے سے تا سر انشت جو چھالا پڑا
دیکھ نقشِ تن مرا اپنی گلی کی خاک پر ق یوں کہیاں تو نہ دیوانہ نہ متوالا پڑا
نیزد بھر کر سکھ سے سونے کے لئے اس جا مگر رات تھا کوئی ہمارا چاہنے والا پڑا
کل گل لالہ سے پوچھا میں نے دلِ مہر ق کس سبب سے میں تیرے غم کا لا پڑا
سُن کے بولا جس سے تو بھینکتا ہوا آیا ہے ہما یا رنجہ پوچھی اسی آتش کا پر کا لا پڑا

ننگ دل محبوب کو کہنا غلط تھا پر نظیر

ہم نے جب جانا جب اس بے درد سے بالا پڑا

دیکھ لے عالم جو اس کے حُسنِ بالا دست کا حوصلہ اتنا کہاں اپنی نگاہِ پست کا

نہیں رہتے ہم تو یہ سیریں کہاں سے دیکھتے یہ فقط احسان ہے اُس ات پاک ہست کا
 بے صدا آکر لگا، اور ہو گیا سینہ سے پار یہ خندنگ ناز تھا کس بے نشان کی ششش کا
 پنہ خورشید رنگین خونِ حسرت کے سوا برق ساں چمکا چو رنگ اس کے خانی دست کا

بات کچھ کہتا ہے اور نکلے ہے کچھ منہ سے نظیر
 یہ نشا ایسا ہوا کس کی نگاہ مست کا

مائے خاطر میں ہمارے دل کو وہ مغرور کیا جس کے آگے مہر کیا، مہ کیا، پری کیا چور کیا
 دل نیا ہم نے لگایا ہے بتا دو، مہرباں اس کی ہے رہ کیا روش کیا رسم کیا دستور کیا
 یاد ہوں عیا ریاں جس کو بہت پھر ہرسم کریں اُس کے آگے مگر کیا جہل کیا فسوں کیا زور کیا
 یوں کہا ہم بوسہ لیں گے، بتو چھو کر زلف کا بولا منہ کیا دست گر کیا تاب کیا مقدور کیا

ہم کو چاہت ایک ہی ہے اس پری رو کی نظیر
 رو برو کیا در تھا کیا متصل کیا دور کیا

دل ہوا جس روز بسمل ابروئے خدار کا تھا وہی پہلا دن اُس بسمل کی بسم اللہ کا
 جس نے دیکھا وہ رخ انور تو اُس کو عمر بھر پھر نہ روئے مہر خوش آیا نہ چہرہ ماہ کا
 ایک دن آگے خلیل اللہ کے ایک شخص نے یک بیک آکر لیا منہ سے جو نام اللہ کا
 اُس خلیل اللہ نے سنتے ہی آکر شوق میں سب دیا اُس کو جو تھا اسباب عز و جاہ کا
 اور کہا اے شخص پھر مہر خدا یہ نام لے میں بجاں مشتاق ہوں اس اسم خاطر خواہ کا
 گروہ لیتا نام پھر اللہ کا تو بالیقین جی نکل جاتا وہیں حضرت خلیل اللہ کا
 حاصل اس کہنے سے اُس کی جاہ کچھ آتا تھا جب کوئی ایسا ہو تب لے نام اُس کی جاہ کا

اس میں کیا طاقت جو مالک ہو کوئی بت لے نظیر کا

جان بھی اللہ کی اور مال بھی اللہ کا

دیرا و کوہ و دشت و ہوا ارض اور سما
ہے کونسی وہ چشم نہیں جس میں اس کا نور
تمری اُسی کی یادیں کو کو کرے ہے یار
مغس کہیں غریب تو نگر کہیں غنی
بہروپ سا بنا کے ہر اک جاوہ آن آن
ملکِ رضا میں لیکے تو نکل کی جنس کو
سب کا اُسی دکان سے جاری ہے کاڑھا
دیکھا تو ہر مکاں میں وہی ہے رہا سما
ہے کونسا وہ دل کہ نہیں جس میں اُس کی جا
بلبل اسی کی شوق میں کرتی ہے چھپا
عاجز کہیں نبل کہیں سلطان کہیں گدا
کس کس طرح کے روپ بدلتا ہے واہ وا
بیٹھیں ہیں سب اسی کی دکانیں لگا لگا
لیتا ہے کوئی حُسن کوئی دل ہے بھیتا

دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو یاں نظیر
بازارِ معطفے ہے خسروِ یار ہے خدا

ترے رخسار نگین نے کیا دل زیر پھولوں کا
بدن گل چہرہ گل لب گل اور دہن ہے گل
یہ پر بلبل نے اکھڑے مت سمجھ اسے باغباں ہرگز
گھٹے میں ہارا درہاتھوں میں گھرے ہو کے یوں لپٹ
خدا کے واسطے دیکھو ذرا اظہیر پھولوں کا

اک پردہ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا
اس مہرِ بانوار سے شبِ غم کی طرح ہم
سر سبز دل جلوں کو نہ ہرگز کرے فلک
جبے ہوئے ہیں وہ لب جاں بخش جلوہ
وہ پردہ برآمد از ہمیں کیوں نظر آیا
گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا
دانہ کہیں اُگا ہے جو ہم نش میں بھن گیا
تب سے تمام نسخہ عیسیٰ کا کُن گیا

پہنچنے ذیل وصف میں دست اس کے عام کا موصوف ہو جو خاص خدا کے کلام کا

چمن طراز حقیقی نے اپنی صنعت سے کسی کو پھول بنایا، کسی کو گھاس کیا

وصل اس کا ہوتا کیونکر میسر وہ نور جاں تھا، میں آب و گل تھا

جو وصف زلف کو پوچھا تو حلقے حلقے کو آب و مرجع و طجائے صدا سیر کیا

دیکھ اُسے رنگ بہار و سر و گل اور جو بُنا اک اُڑا، اک رگ گیا، اک جل گیا، اک تگ گیا

تو ہے وہ گل اے جان کہ تیرے باغ میں ہے شوقِ جب ریل کو بلبل کی طرح نفس زنی کا

نہ آئی بوجہ ذرا تیرے معصوم رخ کی نسیم پھاڑ گئی آکے ہر ورق گل کا

ہم وہ درخت ہیں کہ جسے دم بہ دم قضا ارہ ادا ہر دکھاتی ہے، اُدھر تبر قضا

بتوں کی ناز برداری میں بھی تیری عبادت ہے مری اس بندگی کا اب تو یہی شاہد ہے مہودا

عزیزو کیا پڑے سوتے ہو غفلت میں ذرا جاگو چرس فریاد می دارد کہ برسندید محل ہا

نظیر اب اس ندامت سے کہوں کیا
فاما، فاما، فاما، فاما، فاما
بان سے سرخ ہوئے پھر بُت عیار کے لب
دیکھ اس وقت تو اسے دل مرے غوغا کے لب
منفعل ہو کے کبھی دعویٰ سخی نہ کرے
دیکھے گر لعل بدخشاں مرے دلدار کے لب
خوف نرمی و نزاکت کا مجھے ہے ور نہ
چوم لوں میں ابھی اس شمع پری وار کے لب

لذت زندگی اس دم مجھے ہو دے گی نظیر
جب ملے ہوں گے ہم میرے لب لعلدار کے لب

اس کی بجلی سے کب ہو دے دو چار آفتاب
ایک تو کیا ہے اگر ہویں ہزار آفتاب
پاس ادب ہے اُسے ور نہ ترے حسن پر
حکم جو ہو تو ابھی ہو دے نثار آفتاب
خانہ زیں میں تجھے دیکھے تو پھر رشک سے
تو سن افلاک پر ہو نہ سوار آفتاب
ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر
مہ کو لگیں جا رہا ہوں مہر کو چار آفتاب
جیسے یہ ہیں مہر و مہ ایسے تو اس کے نظیر

چمکیں میں سو ماہتاب اور ہزار آفتاب

ہو تیرے مہر حسن سے کب ہم سر آفتاب
ذرا تری نگاہ سے ہو کیسر آفتاب
تو حسن میں وہ مہر سپہر حال ہے
ہر روز جہہ سا ہے ترے در پہ آفتاب
ہر لحظہ تیرے چہرہ انور کے وصف میں
یہ بیت پڑھ رہا ہے خدا ہو کر آفتاب
از ہر دفع چشم باز روئے خوب تو
سیارہ ہا پسند شود، بھگر آفتاب

اس مہر کبریا کی اشارت سے اسے نظیر

مغرب تلک پھونچ کے پھر اکثر آفتاب

ہوا جو ہم کو وہ کو چہ چمن سرشت نصیب
خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب

جدا جو اس سے ہوئے ہم تو اپنی قسمت سے
لکھیں نہ حرف وفا کیا کریں کہ اول سے
ہے وہ تو خوب پر اپنے ہی کچھ ہیں نہ شت نصیب
ہوئی قلم کو ہمارے یہی تو شت نصیب
کریں گے دیکھئے سر سبز کب پر شت نصیب

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر
ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک شت نصیب

ساقی شراب ہے تو غنیمت، اب کی اب
ساغر کے لب سے پوچھئے اس لب کی لذتیں
پھر بزم ہو گی جب تو سمجھ لے جو جب کی جب
کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب
کلم فرستی سے عمر کی اپنی ہزار حیف
جتنی تھیں خواہشیں وہ ہیں لب کی لب
سُن کر وہ کل کی آج نہ ہو، کس طرح خفا
لے ناشائس طبع اکہی تو نے کب کی کب

پھولا ہوا بدن میں سہا تا نہیں نظیر
وہ گل بدن جو پاس رہا اس کے شب کی شب

کچھ اور تو نہیں ہیں اس کا عجب ہے اب
آہ و فغان و گریہ و اندوہ و درد و درغ
یعنی وہ شوخ ہم سے خفا ہے سب سے اب
جو جس عشق ہے وہ مر پاس سب سے اب
دیکھے سے جس کے غنچہ صفت گل ہو رشک سے
ایسا تو اس جہنم میں دی غنچہ لب ہے اب
صبح فلک بھی جس کی تجلی سے ہو مجل
اس رشک ماہتاب سے اپنی وہ شب ہے اب
آئینہ ایک دم نہیں رکھتا ہے ہاتھ سے
ایسا وہ اپنے رخ کا تماشا طلب ہے اب

اس گل بدن کے وصل سے ہر دم نظیر کو
سب سے زیادہ خلق میں عیش و طرب ہے اب

خوبیاں میں اس طرح ہے وہ دلخواہ سب سے خوب
جوں وقت شب تاروں میں ہے ماہ سب سے خوب

محبوب کا جو وصل تصور میں ہو تو پھر
 شتاق وصل کو ہے یہی راہ سب سے خوب
 دل جس کو چاہتا ہو اُسے بھی خبر نہ ہو
 اپنے تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب
 کیسا ہی دہ برا ہو تو لگ جائے جس سے دل
 لگتا ہے دل کو پھر وہی راہ سب سے خوب
 رطبی و صریح شمس
 خوبی میں خوب رو تو بھی خوب ہیں نظیر
 پر خوب غور کی تو ہے اللہ سب سے خوب

• بوسہ اس دل سے نہ کر اے دل انگار طلب
 یہ زیادہ طلبی ہے نہ ہو دشوار طلب
 جلد آیا کہ اب ہم کو تاتے ہیں بہت
 گوش گنار طلب، دیدہ دیدار طلب
 ربط اس عہدہ جو سے ہیں کس طور سے ہو
 ہم تو ہیں صلح طلب ابد وہ ہیں بیکار طلب
 آرزو خوب ہے موقع سے اگر ہو ورنہ
 اپنے مقصود کو کم پہنچے ہیں بیکار طلب
 عذر عامی کو نہیں چاہئے کچھ اس سے نظیر
 جس خطا پوش کی رحمت ہے گنہگار طلب

جب کھلے اس معجزہ آرائے لب
 بند ہوئے حضرت عیسیٰ کے لب
 عشق میں اس گوہر نایاب کے
 آج تلک خشک ہیں دریا کے لب
 لعل بھی ہو رخشک سے یا قوت زرد
 دیکھے اگر اس درگیتا کے لب
 نام سے اُس لب کے ہیں لبِ پراشندہ
 خلد میں حورانِ شکر خا کے لب
 ایک تبسم میں کریں لاکھ کام
 ایسے ہیں اس شاہدِ رعنا کے لب
 تھی وہ اسی لب کی شکر جس کو دیکھ
 مصر میں جھپکے تھے زلیخا کے لب
 اس لب جاں بخش کے آگے نظیر
 کس کو خوش آتے ہیں مسحا کے لب

کس کے لئے کیجئے جامہ دیبا طلب
دل تو کرے ہے مدام دامن صحر طلب
کا مردا ہوں بھلا اس سے ہم اب کس طرح
اس کو تمنا نہیں، ہم ہیں تمنا طلب
کس سے کہیں کیا کریں ہے یہ تماشے کی بات
وہ تو ہے پردہ نشین ہم ہیں تماش طلب
کہئے تو کس کس کے اب غور کرے وہ طیب
جس کے طلبگار ہوں لاکھ مداو طلب
ایک تمنا ہو تو یار سے کہئے نظیر
دل ہے پر از آرزو کیجئے کیا کیا طلب

ہے اب تو وہ ہیں اس سر و سیم پر کی طلب
جو کہئے حسن کو خواہش نہیں یہ کیا امکان
کمال عشق بھی خالی نہیں تمنا سے
اُسے بھی اہل نظر سے ہے اک نظر کی طلب
کمال عشق بھی خالی نہیں تمنا سے
جو ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب
پری رنوں کو غرض کیا تھی زیب و زینت سے
نہ ہونی گرا نہیں اپنے نظارہ گر کی طلب
طلب سے کس کو رہائی ہے بحر ہستی میں
اگر صدف ہے تو اس کو بھی ہو گہر کی طلب
چمن میں بلبل و گل بھی ہیں اپنے مطلب کے
اسے ہے گل کی طلب اس کو مشت کی طلب

جہاں وہ باغ تمنا ہے جس کے بیج نظیر

جو اک شجر ہے تو اس کو بھی ہے ثمر کی طلب

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب
دیکھا جو خوب ہم نے دنیا ہے جائے مطلب
جو گلبان کہ آیا آغوش میں ہمارے
کچھ اور بونہ نکلے اس میں ہوائے مطلب
عُشاق کی بھی الفت خالی نہیں غرض سے
مرتے ہیں یہ بھی اس پر جس سے برائے مطلب
کوئی کسی کے اوپر ہم نے فدا نہ دیکھا
منہ پر فدا ہیں لیکن دل میں فدائے مطلب
مطلب کے آشنا کو ہو کس سے آشنائی
کب ہم آشنا کسی کا ہو آشنائے مطلب

گر نرم رقص دیکھی تو وہاں بھی گوش دل میں
کوئی صدا نہ آئی غیر از صدائے مطلب
زیر فلک تو ہم سے جانی نہیں تنہا
ہاں پھر فلک پہ جاویں جب ہم جائے مطلب
وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں نسیں
اس کو بھی دے چکے ہیں اکثر برائے مطلب

جب حرف آبرو تک پہنچا مطلب پھر تو
کیا کہنے ایسی جاگہ جزیہ کہ ہائے مطلب

یوں جھکنا ہے رخ اس محبوب کا زیر نقاب
ہو نمایاں جس طرح ابرو تک میں آفتاب
دیکھ اس مہر و کے رخ کاراں چشم تر میں عکس
کیا ہی لوٹا رنک دریا میں عکس ماہتاب
کیا نزاکت ہے کہ اس نازک کمر کے روبرو
رشتہ ماں حسرت کھاتی ہے رگ گل بیچ تاب
رنگ رخسار اس گل باغ حیا کا دیکھ کر
قطرہ شبنم نہیں ہے شرم سے گل آب تاب
وہ عرق آلود رخ جس دن سے آیا ہے نظر
جب ہم واقف نہیں کیا گل اور کیا لکاب
جس کی ایک دم لرزائی اس چشم میگوں سے نگاہ
پھر اُسے یاد دہاں کا جام اور کیسی شرباب

خواب کر جانا ہے ہم ایک تخت انگلوں سے نظیر
یاد آ جاتی ہے جب ساتی کی چشم نیم خواب

بحر ہستی میں صحت احباب
یوں ہے جیسے بروئے آب حباب
بادہ تاب کیا ہے خون جگر
زردی رنگ ہے شب مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں
وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب
حسن اور عشق جن کو کہتے ہیں
حفظہ برق و قطرہ سیاب
گردش آسماں میں ہم کیا ہیں
پر کا ہے مہیا نہ گرداب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے
مثل تحریر موج، نقش بر آب

جسم کیا روح کی ہے جولا نگاہ
روح کیا ایک سوار پا بہ رکاب
زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں
ایک مثل خیال و دیگر خواب
فرست عمر تپڑہ شبہم
وصل محبوب گوہر نایاب
قفس غم ہے مسکن دادی
اشک حسرت بجائے دانہ آب

سب کتابوں کے کھل گئے معنی

جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

جو کچھ ہے حق میں ہر مہ نقا کو عیش و طرب
وہی ہے عشق میں ہر مبتلا کو عیش و طرب
اگر چہ اہل نوا خوش ہیں ہر طرح لیکن
زیادہ اُن سے ہے ہر بینو کو عیش و طرب
وہ میکدے میں صلاوت ہے زند میکش کو
جو خانقاہ میں ہے پارسا کو عیش و طرب
رکھے ہے ہر تن عریاں برہنہ پائے وہی
جو کچھ ہے صاحب اسب مقبا کو عیش و طرب
کمال قدرت حق ہے نظیر کیا کہئے

جو شاہ کو ہے وہی ہے گدا کو عیش و طرب

جو اس کی چشم گلابی کی دیکھ پائے شراب
تو اس کو حشر ملک ہو نہ پھر ہوا سئے شراب
ہماری بزم میں ہے سے فردش کا کیا کام
وہ اپنے وہاں کے ہی لاگوں میں بیچ کھا شراب
ہم اس شراب کے خواہاں نہیں ہیں آساقی
پیتیں جو تو ہمیں اس چشم کی پلا سئے شراب
نشہ جو اس کی نگہ میں ہے وہ نہ ہو ہرگز
اگر ہزار طرح کی کوئی آہنا سئے شراب
جہاں میں موسم گل ہے میں کیا کروں ہیما
مجھے تو آب میسر نہیں چر جائے شراب

بہ قول حضرت صائب ہزار حیف نظیر
کہ در بہارند ارم بہ کف بہائے شراب

ہو جن اترکیوں نہ مری آہ میں یارب
پہنچے ہے وہی منزل مقصود کو جو شخص
ہر چاہ میں ملتا ہے اسے یوسف اقبال
جو خانہ بدوشی میں ہے طالب کوئے عیش
گم کچھ ہے ہیا تری درگاہ میں یارب
چلتا ہے خدا ہو کے تری راہ میں یارب
جو تشنہ والا ہے تری چاہ میں یارب
وہ عیش نہیں خمیہ و خمر گاہ میں یارب
اپنا ہی طلب گار نظیر اپنے کو رکھو
ہر طور میں، ہر رسم میں، ہر راہ میں یارب

ترے مریض کو اسے جان شفا سے کیا مطلب
فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہتے والے
نہال تازہ رہیں نامیہ کے منت کش
مراد و مقصد و مطلب ہیں سب ہوس کے ساتھ
وہ خوش ہے درد میں اس کو دوا سے کیا مطلب
انہیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب
درخت خشک کو نشو و نما سے کیا مطلب
ہوس ہی مرگئی پھر مدعا سے کیا مطلب
وہ بادشاہ ہے اسے مجھ گدا سے کیا مطلب
انہیں بھر اور کے مہر و ناس سے کیا مطلب

رضائے دوست جنہیں چاہتے بہر صورت

نظیر بھر انہیں اپنی رضا سے کیا مطلب

نہ دل میں صبر نہ اب دیدہ بُر آب میں خواب
جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں کے دل
ہماری چشم کا اسے شہسوار تو سن ناز
ہر ایک مکاں میں گزر گاہ خواب ہے لیکن
عجب بہار کا دیکھا یہ ہم نے خواب میں خواب
جو غور کی تو کیا ہے تری رکاب میں خواب
اگر نہیں تو نہیں عشق کے جناب میں خواب
کہ جیسے ماہی کو آتا ہے اپنے آب میں خواب

روا روی میں لگے آنکھ کس طرح سے نظیر

مسافروں کو کہاں ایسے اضطراب میں خواب

ہنسنا ہوا ازل سے کب لے یار کے نصیب
دل سادہ رستم بکا اک نگہ کے مول
بھیجے ہے جام خور میں ہوا ہر سحر مسج
بازاریوسفی میں نہ دیکھی تھیں خواب میں
دیکھ اس کو آج باغ میں بولی یہ لبسلیں
غش تھے معائنے کی تمنائیں ہم ولے
کل ہم سے روٹھ کر وہ رقیبوں سے جاملا
چلے ہیں کیا ہی دیکھے اغیار کے نصیب
وہ بھی سنا کہ اب کے ہوا ہمارے نصیب
چلے ہیں کیا ہی دیکھے اغیار کے نصیب

جس گل کو اپنے سر پہ چڑھاتے تھے ہم نظیر

وہ گل ہوا رقیب کے دستار کے نصیب

نامہ کو میرے نہ ہو کے نہ اس کھا جواب

اتنا تو نامہ برسے نہ ہوتا میں شہر مدار

پہروں تلک میں کتا ہوں حال اپنا پر مجھے

حاضر جوابی دیکھ کہ لب سے مرے ہنوز

کوچے سے اس کے آتا ہوں یوں چونکا امید

کتا ہے تو جیتا ہے اپنی خوشی سے اب

اے کاش بھیجتا وہ بُرا یا بھلا جواب

وہ اپنی ایک بات میں کرتا ہے لاجواب

نکل انہیں سوال کہ وہاں ہو گیا جواب

نور کشستہ حال کو جیسے ملا جواب

ورنہ میاں خدا تو تجھے دے چکا جواب

کھوئی تمام عمر بتوں کی جناب میں

دے گا نظیر کیا تو خدا کو بھلا جواب

ہیں گو کہ یوں تو اور بھی محبوب خوب خوب
لیکن اُسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب
نام خدایں کیا کہوں اس گل کے حُسن میں
کیا کیا پڑے ہیں ناز کے اسلوب خوب خوب
فضل خدا سے اب تو نظیر اپنی بزم میں
اسباب سب ہیں عیش کے مرغوب خوب خوب

ہیں اس طرف تو ساتی دمطرب کر شنبہ سنج
اور اس طرف کو بیٹھے ہیں محبوب خوب خوب

تمھاری آن عزیز اور ہر ایک ادا محبوب
تمھیں وہ ہو کہ تمھیں دیکھنے ہم آتے ہیں
کہیں جو ہم تمھیں محبوب مت بُرا مانو
جو چاہے آپ سے محبوب بن سکے کیا ذکر
تمھاری آج وہ محبوبیاں ہیں نام خدا
کوئی کہے ہے بصد اشتیاق دل یا دست
نظیر بھی تمھیں اب دیکھ کر یہ کہتا ہے

الہی خلق ہو اور میں ہوں اور مرا محبوب

گزرے خوشی سے نہ دودم کبھی اے وائے نصیب
تھے عجب کلک وہ جس سے مرے لکھو اے نصیب
قاصد اس دولت بیدار سے کہو کہ کبھی
دو گڑھی آکے ہمارے بھی جگا جائے نصیب
آدیں ہم بھی جو تری بزم میں جوں شمع اے جاں
ایسے ہم سوختہ بختوں نے کہاں پائے نصیب
بار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے
دوست بھی ہو گئے دشمن مرا اے وائے نصیب
ایک دم نزع میں لائے نہ اُسے بالیں پر
اپنے اُتھمت سے تو اتنے بھی نہ کام آئے نصیب

یاد آتا ہے ہیں جب وطن اپنا تو نظیر

سر کو حسرت سے ٹک کہتے ہیں ہم ہائے نصیب
یہ گلہ دل سے تو ہرگز نہیں جانا صاحب
سب نے جانا ہمیں پر تم نے نہ جانا صاحب
ان بیانون سے غرض ہم نے یہ جانا صاحب
آپ کو خون ہمارا ہے بہانا صاحب
سو تو مجنوں سانس نہیں ہوں میں دوانا صاحب
ایک کرشمہ تھا، تمہیں نام میں لانا صاحب
یاد تھے ہم کو جوانی میں تو سو کر و فریب
اب جو بوڑھے ہیں تو اب بھی ہیں شیطانِ نظیر

ہنس کے کہتا ہے اجی آئیے انا صاحب
تمہارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب
جگر کے داغ جو دھونے تھے دھولے صاحب
غلام عاشق و چاکر مصاحب و ہمزاد
غرض جو تھا ہمیں ہونا سو ہو لئے صاحب
قرار صبر جو کرنے تھے کر چکے برباد
حواس و ہوش جو کھونے تھے کھولے صاحب
ہمارے وزنِ محبت میں کچھ ہو فرق تو اب
پھر امتحان کی ترازو میں تو لئے صاحب
کچھ انتہائے بکا ہو تو اور بھی یک چند
سرشک چشم سے موتی کو رو لئے صاحب
کل اس صنم نے کہا دیکھ کر ہمیں خاموش
کہ اب تو آپ بھی ٹک لب کو کھولے صاحب
یہ سن کے میں نے نظیر اس سے یوں کہا ہنس کر
جو کوئی بولے تو البتہ بولے صاحب

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب
کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے
یارِ مہرہ اور شبِ بہت تاب
زورِ کیفیتیں دکھاتے ہیں
ساتی گلے غدار و بادہ تاب
کرتے ہیں تار تار جیبِ الم
تار قانونِ دین و جنگ و رباب

وقت خلوت یہ ہم نے اس سے کہا قطعہ اب تو ٹک منہ سے دور کیجئے نقاب
 بولے ہم تو ابھی اٹھا دیں مگر لائیں کب آپ دیکھنے کی تاب
 اور جو آجاوے غش تمہیں تو نظیر

پھر چہرہ کس پرٹے گا ہم کو گلاب
 رکھتا ہے صدا ہونٹ کو جوں گل کی گلی چپ
 سوتا ہے تو لیتا ہوں میں یوں چوری سے بوسہ
 منت سے کہا ہم نے تو تم آہ نہ بولے
 پروانے سے عاشق کے تنہا شمع جلا کر
 سبزی بھی اگی باغ میں غنچے بھی کھلے آہ
 غصے میں قریب آتا ہے جب بجوت ماہن کر
 مرجائیں پہ شکوے کی کبھی بات نہ نکلے
 جس دم یہ خبر جا کے رقیبوں کو ہوئی پھر
 الٹی ہی سمجھ یا رکی سنتا ہے نظیر آہ

زہنا نہ کچھ بولیو، یہاں سب سے بھلی چپ

دل کو لے کر ہم سے اب جاں بھی طلب کرتے ہیں آپ
 مورق تقصیر گر کرتے ہو لازم بھی سسزا
 لےجے حاضر ہے پر یہ تو غضب کرتے ہیں آپ
 یہ جانا پھر کہتے ہم پر کس سبب کرتے ہیں آپ
 حن میں اعجاز کیا کیا روز و شب کرتے ہیں آپ
 سو دہی لے مہراں ہم سے بھی اب کرتے ہیں آپ
 اپنی زلف عنبر میں شانہ جب کرتے ہیں آپ
 کرتے ہو اور وہ کشتہ رخ سے دینے ہو جلا
 قیس سے جو تھا کب در پردہ لیلیٰ نے سلوک
 بے گلی ہوتی ہے حسرت سے دل مسد چاک کو

ہم نے پوچھا پھر بھی اس کی جاں پھری سب جسم میں نزع میں دُری سے جس کو جاں بلب کرتے ہیں آپ

ہنس کے فرمایا نظیر اپنی نگاہ لطف سے
یہ بھی ہو سکتا ہے کیا اس کا عجب کرتے ہیں آپ

ہے جو اس محبوب کی انگشتی دردست جب رکھتی ہے کیا کیا نراکت بروری دردست چپ
کج صہبا کی گلابی اس کے ہے دردست رشت اور چھلکتی ہے کی ایک پیالی بھری دردست چپ
جس کماں کو کھینچتا ہے وہ بت ابرو کماں اس کے قبضے میں ہے بوزینت دردی دردست چپ
کچھ جو لکھتا ہے قلم لے کر تو پھر کیا کیا رسم کرتے ہیں قسط اس پر زب آوریں دردست چپ
کل تو بایں ہاتھ میں تسبیح رکھتا تھا نظیر
اور مصلے کی عنایت گسٹری دردست چپ

نہ چین گھر میں نہ کل ہے باہر نہیں جو تم نے دکھائی صورت تمہارے ناز و عتاب نے تو عجب ہماری بنائی صورت
وہ تسک دیکھی تو ہو کے بے حس رہے تیر میں اس طرح ہم
نظر میں آنکھوں میں اور جاں میں بھری اسی کی وجاہتیں ہیں
پری کی بیوہ ہمسری نے کیا جو اس کا مزاج برا ہم
بیان ہو کیا حسن صورت اس کا جو دیکھ آئینہ ہے یہ کستا
الم میں جاہت کے اب ہماری بدل گئی ہے جو شکل ہدم

نظیر محفل میں گلِ رخوں کی جو ہم نے دیکھا تو اُن سبھوں میں
فدا ہوا ہے دل اپنا جس پر اسی کی ہم کو خوش آئی صورت

اے چشم جو یہ اشک تو بھرائی ہے کم بخت اس میں تو سر اسرمی رسوائی ہے کم بخت
الفت میں تو لے دل نرمی رسوائی ہے کم بخت کم بخت تجھے کیا یہی اب بھائی ہے کم بخت

اس قد میں جو رعنائی و زیبائی ہے اے سرو
 ایک بات بھی مل کر نہ کریں اس سے ہم اے چرخ
 یا روہیں تکلیف نہ دو سیر چمن کی
 رہنے دو ہمیں کنج قفس میں کہ ہمارے
 اس جامِ نگوں سے مئےِ راحت نہ طلب کر
 تو بے ہیں بہت شیشہ دل جس نے نظیر آہ
 یہ چرخ وہی گنبدِ مینائی ہے کمِ بخت
 آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کمِ بخت
 اور اس پر سایہ کہ ہمارا آئی ہے کمِ بخت

کھل گیا رخسار اس کا جس گہڑی کا کل سمیت
 ہم کو دیکھا بلغم میں اس ناز میں کے ساتھ جب
 بزم میں اس کی بہارِ چشم مے گوں دیکھ کر
 اس کے بازو کی لچک سے لگے یوں ہلتا دل
 خوش ہوا دل میں اے نانویش وہ ظاہر میں نظیر
 آگیا اس کی نظر جب ہاتھ میرا گل سمیت

صورت کبھی دکھلائی تو اس میں بھی گلاوٹ
 آتے نہیں اول تو کہیں اور کہیں شاید
 جس بات میں کچھ رمز تھی اور ہم جو نہ سمجھے
 بوسے کا جو اقرار کیا وہ بھی فقط جُسل
 باتوں کی جو ٹھیرائی تو اس میں بھی لگاوٹ
 تشریف جو فرمائی تو اس میں بھی لگاوٹ
 وہ ہم کو جو بھجائی تو اس میں بھی لگاوٹ
 اور سہنس کے قسم کھائی تو اس میں بھی لگاوٹ

ہنسنے میں نظیر اس کے لگاؤ تو ہے لیکن

ابرو میں جو چین آئی تو اس میں بھی لگاؤ

دوسے کے دل بے ہر کو کرنا نگہ یہ بھی عبث
وام میں پھنس کر غلط فہمی ہے کسٹا چھوڑ دو
پھر جو یہ کہنے نہ کیجئے اب رہا، یہ بھی عبث
کچھ اگر رکھئے تو پھر ہوتا ہے کیا یہ بھی عبث
ہوں جو بے درد اُن سے کیا رکھئے توقع لطف کی
یہ تمنا بھی ہے بے جا، مدعا یہ بھی عبث
سُن کے خواہش لرزہ و شام کی بولادہ شورش
جب نہ ہو دشنام کے دینے کے لائق تو نظیر

پھر جو بوسے کے لئے تو نے کہا یہ بھی عبث

کرنے لگا دل طلب جب بہت خوش مزاج
زلف نے اس کی دیا کاکل سنبل کو رشک
ہم نے کہا جان کل اس نے کہا ہنس کے
چشم یہ نے لیا، چشم سے آہو کے با
رہ تو کسی میں ترا کرتا ہوں کیا عمل
چھٹ گئے اس روز سے اور جو تھے کام
دل تو نہ دیتے ہم آہ لے گئی لیکن نظیر

اس کی جیس کی جیا اور وہ آنکھوں کی لاج

اس کے تشریف جولانے کی خبر پائی آج
کیوں نہ جوں جام ہنسیں ہم کہ بہت بد میں
دل نے کی پھر ہوس انجمن آرائی آ
اپنے دل خواہ پھر گنبد مینائی آ
نگہت اس زلف کی لے کر جو صبا آئی
امتحان کو، جو ذرا دیر کی ٹھرائی آ
اس کے کوچے کی طرف جا میں ہم نے ہدم
شام نزدیک جب آئی تو کہا اس نے نظیر

کیا سبب ہے نہیں آیا جو وہ سودا فی آج

طریق عشق بے مرشد نہ ہو سٹے کہ یہ رہ ہے نہایت بیچ در بیچ
بتوں کی کاکلوں کے دیکھ کر بیچ پڑے ہیں دل پہ کیا کیا بیچ بر بیچ
نہ ہو دسے دل کی نکل کٹ کے برباد اگر ڈالے نہ وہ تار نظر بیچ
نظیر ایک روز اپنے زخم سر کو جو باندھا ہم نے دے کر بیشتر بیچ
نظر کرتے ہی اس سرکش نے ایک بار کہا، کر کر سخن کا مختصر بیچ

دعا دیجے ہماری تیغ کو آج

کہ جس نے آپ کو بچنا ہے یہ بیچ

کی تم نے جفا ہم نے وفا جھوٹ ہے یا بیچ سوچو تو اسے دل میں ذرا جھوٹ ہے یا بیچ
غصہ بھی کیا، دکھ بھی دے تم نے لیکن چپ ہو رہے ہم سر کو جھکا جھوٹ ہے یا بیچ
تم ہم سے کئی بار خفا ہو گئے اسے جان پر ہم نہ ہوئے تم سے خفا جھوٹ ہے یا بیچ
جو تم نے کہا اس کے بجالانے میں ہم نے اک لحظہ توقف نہ کیا جھوٹ ہے یا بیچ

سن کر یہ نظیر اس نے کہا ہنس کے بر صدا ز

جانے اسے اب میری بلا جھوٹ ہے یا بیچ

تھی چھوٹی اس کے کھڑے پر کل زلف مسلسل اور طرح پھر دیکھا آج تو اس گل کے تھے کامل کے بل اور طرح
وہ دیکھ بھڑکتا ہے ہم کو، گر غصہ ہر دم اور ہیں ہے چین اسی کے طے سے زہنا نہیں کل اور طرح
معلوم نہیں کیا بات کئی غماز نے اس سے جو ہم سے تھیں پہلی باتیں اور غماز اب بولے ہے بخیل اور طرح
دل مجھ سے اس کے طے کو کہتا ہے تو اس کے پاس انجے جب پہنچا تھا بھیس بدل پھر اب کے نے بخل اور طرح

ہے کتنے دنوں سے عشق نظیر اس یا رکا ہم کو جس کے ہیں

صبح اور برن، شام اور پین آج اور روش کل اور طرح
 ہم تو ہو جائیں اس سے اب گستاخ ہونے دے گا مگر وہ کب گستاخ
 ایک شب ہم نے بقیہ راری سے جھولی زلف اُس کی ہو کے گستاخ
 لاکے برو پچیں کہا اس نے نکلے تم تو کوئی عجب گستاخ
 ہم تو اس کی بہت سزا دیں گے کس لئے تم ہو بے ادب گستاخ

آج تو زلف چھولی تم نے نظیر
 کل یونہی چوم لو گے لب گستاخ

برسرِ بام دل زلف نے ڈالی کند پھرنے کی ہرگز نہیں اب کے یہ خالی کند
 ہاتھ لگا زلف کو اس کا تری لگات میں بھاگ رے دل ورنہ دیکھ اس نے سنبھالی کند
 مر کے بھی چھٹتا نہیں اس میں بندھا جو غرض کا کل پر بیج ہے سب سے زالی کند
 جب وہ چلا صید کو برو نے لے لی کمان گیسوئے بل دار نے جھپ سے اٹھالی کند
 شال کے جھرمٹ میں لے لے ہے چھپا اس لئے یعنی ملا جب کہ صید تو تو نکالی کند

اور نہ جڑھا جو کوئی لگات کے اور پر نظیر

تو اسی جھرمٹ میں پھر اپنی چھپالی کند

کیا نہ جس نے ہیں نامہ و پیام سے یاد تار ہی ہے ہمیں اس کی کج شام سے یاد
 جگر میں جوش پیش اور بہ لب، ہجوم فناں ہوئی ہے آج یہ کچھ اس کی اڑدہام سے یاد
 ہمارے آگے نہ لو نام گل کوئی ورنہ وہ گل بدن ہیں آوے گا گل کے نام سے یاد
 دلایا نالہ ہمیں یاد بڑھ کے بلسل نے یہ بات سچ ہے کہ آتا ہے کام کام سے یاد

علیحدہ خطا وہ لکھ گا نظیر کیا جس نے

کیا نہ غیر کے خط میں کبھی سلام سے یاد
عشق کا دور کرے دل سے جو دھڑکا تو یزید
اس دھڑاکے کا کوئی اہم نے نہ دیکھا تو یزید

ہو کچھ آسیب تو واں چاہئے گنڈا تو یزید
دل کو جس وقت یہ جن آن کے پٹا پھر تو
ہم توجہ ہوش میں آویں جو کہیں پاویں
نور تو یزید کا چلتا تو عرب میں یارو
کو بہن کو مہ کو کس واسطے کاٹا کرتا
آہ اس کے بھی گیا دل کا دھڑکا اس روز
ہم کو بھی کہتے ہی لوگوں نے دئے آہ نظیر

پر کسی کا کوئی کچھ کام نہ آیا تو یزید
ہرگز نہ پلانے مجھے تو آنکھ بدل کر
میں شستہ ابرو ہوں ترا سے مرے قاتل
آتے ہوئے ہاتھ میں کیوں تیغ مچل کر
کتا ہے نظیر اس کو ذرا پیارے تو سو جا
تب اٹھ کے کھڑا ہوتا ہے وہ شوخ مچل کر

رکھی ہرگز نہ ترے رخ نے رخ بدر کی قدر
عزت و قدر کی اُس گل سے توقع ہے عبث
راستی خوار ہے اس چشم فوں پرور سے
سے پرستوں میں ہے یوں ساغر وینا کا وقتا
کھوئی کا کل نے بھی آخر کو شب قدر کی قدر
واں نہ عزت کی کچھ عزت ہے نہ کچھ قدر کی قدر
ہاں مگر منزلت مگر ہے اور غدر کی قدر
جیسے اسلام میں ہو محتسب و صدر کی قدر

کفش برداری سے اس مہر کی چھکاپے نظیر
دور نہ کیا خاک تھی، اس ذرہ بے قدر کی قدر

اس کے بن نیچے جو مہر جاؤں میں آنکھیں پھر کر
ڈر خدا سے اے فلک اتنا تو مت اندھیر کر
میں تو بے غیرت نہیں کیا جاؤں اس بد خوئے پش
کون سا کم بخت پھر لاتا ہے مجھ کو گھیر کر
داغ مرنے کا وہی غروم جانے جس کو آہ

موت آنکھوں کی شتاب اور یار آیا دیر کر

بس کے گلے کی نہیں تدبیر کوئی اور
جز یہ کہ لگا جائے شمشیر کوئی اور
یوں پھوٹ کے زخمی جو ہیں جالتے ہو تم آہ
کیا ترکش مزگاں میں نہیں تیر کوئی اور
اس لطف سے جز موقوف مائی تقدیر
کیا تاب جو کھینچے تری تصویر کوئی اور
بندے کے قلم ہاتھ میں ہو گا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

غنج بھی تری تنگ دلی دیکھ نظر آہ
کتاب ہے کہ ایسا نہیں دگر کوئی اور

کہ جوں ساغ میں دے ساقی شرابِ ارغوانی بھر
گیا پانی، سحر کا آفتابِ ارغوانی بھر
گل عارض شگفتہ صبح دم دیکھ اس کا خجالت سے
بھری ہے کاسہ سر میں ہی اپنے ہوا ساقی
گلوں کے اُٹک سے اس دیدہ خوبا نے یارو
دیا اک دم میں دا ان سحابِ ارغوانی بھر

نظیر اس گل نے بنوائی جو تھی اوراقِ گلگوں کی

گئی شعروں سے تیرے وہ کتابِ ارغوانی بھر
اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گلگوں پر
پڑی ہے خاک گستاہ میں، کیا کیا قدموزوں پر

دہر کے اینٹ پھاتی پر بہ زیر خاک سوتے ہیں چمکتے تھے سنہرے قصر جن کے بام گردوں پر

لن ترانی نے کیا اپنا تلور آخر کار موسیٰ بے خود ہوئے اور جل گیا طور آخر کار
ترب بگھا تھا جے تو وہ ہے دوری اے شیخ اسی نزدیک نے پھینکا تجھے دور آخر کار

کتنا تنک صفا ہے کہ پائے نگاہ کا ہلکا سا اک غبار ہے چہرے کے رنگ پر

اے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ
چھیڑے گا جب تو پیش نہ جاؤ گا کچھ کنوں اے دل نہ اس کے افعیٰ زلف ڈوتا کو چھیڑ
چھیڑیں تو یاد چھوڑ بھی ہیں گی بہت ولے دل کی خوشی یہ ہے کہ نہ اس دل بربا کو چھیڑ
رک رک کے اشک چشم کے لایا ہے غریب اے غمخوار لب اس اب نہ دل مبتلا کو چھیڑ
اک حرف چھیڑ کا تو صبر بچا نہ کہہ نظیر

جو آوے منہ پر ترے ماہتاب ہے کیا چیز غرض یہ ماہ تو کیا، آفتاب ہے کیا چیز
یہ پیر بن میں ہے اس گوئے گوئے تن کی جھلک کہ جس کے سامنے موتی کی اکب سے کیا چیز
بھلا دیں ہم نے کتابیں کہ اس پری رو کے کتابی چہرے کے آگے کتاب ہے کیا چیز
تمھارے ہجر میں آنکھیں ہماری مدت سے نہیں یہ جانتیں دنیا میں خواب ہے کیا چیز
نظیر حضرت دل کا نہ کچھ ٹھکڑا احوال میں کس سے پوچھوں یہ ندرت آبت ہے کیا چیز
جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا جو نرم ہووے تو برگ گلاب ہے کیا چیز

گھڑی میں سنگ گھڑی موم اور گھڑی فولاد
خدا ہی جانے یہ عالی جناب ہے کیا چیز
نہ ادا میں مزانہ لذت ناز
آہ کا ہے کو خط ہوا آغاز
نام سنتے ہی اس پری روکا
ہوش اپنے تو کر گئے پرواز
دیکھ تنہا نظیر کو خاموش
بولا آپہی سے وہ بت طناز
مارڈالا تری خموشی نے
کچھ تو پتھر بیان کر اپنا راز
جب تو لاچار ہو کے بھر کر آہ
یہی اس نے کہا کہ بندہ نواز

عاشقاں گشتگان معشوق اند

بر نہ آید ز رفتگان آواز

زلفیں یہ دو نہیں رخ دلبر کے آس پاس
اب سیم ہے ماہ منور کے آس پاس
تجھ میں تو یہ شمیم نہ تھی بیج کہہ اسے نسیم
کس کے پھری تو زلف معنبر کے آس پاس
گلشن میں جاتے پھرتا ہوں اُس قد کو یاد کر
دود و پتھر میں سر و صنوبر کے آس پاس
روویں گے ہم تو دیکھو کو چے میں اپنے بار
پانی ہی پانی ہوگا، ہر اک گھر کے آس پاس

کیا کیا ہجوم ہوں گے مجھوں کے اسے نظیر

محشر کے روز ساقی کوثر کے آس پاس

گردہ مرزہ ہو مائل جنگ پر طاؤس
تو سم سے بے پروا خدنگ پر طاؤس
یوں زلف معنبر کے خطا بسز ہے نزدیک
گو یا پر طوطی ہے بہ جنگ پر طاؤس
دکھلا دیں جو ہم داغ دل اپنے کی سیاہی
پرواز کرے خوف سے رنگ پر طاؤس
دیکھے جو ترے عاشق گل خوردہ کی تصویر
حیرت زدہ ہو دیدہ، سنگ پر طاؤس

لکھ لکھ کے نظیر اس غزل تازہ کو خواں

دیکھ لیں گے کتابوں میں بہ رنگ پر طاؤس

انکار ہم سے غیر سے اقرار بس جی بس
دیکھے تمہارے ہم نے یہ اطا رہا بس جی بس
اتنا ہوں جائے رحم جو کرتا ہے وہ جفا
تو اس سے روکے کتے ہیں غیا بس جی بس
ساقی ہمیں پلائیے یوں جام پے بہ پے
جو ہم نشیں کہہ اٹھیں یک بار بس جی بس
ہوں نا امید وصل سے یوں جیسے قنبر
رو کر کے طیب سے بیمار بس جی بس
غش ہوں میں وقت بوسہ جو کتا ہے ہنس کے
مُنہ کو ہٹا ہٹا کے بہ تکرار بس جی بس
اس کا جو بس جی بس مجھے یاد آوے ہے تو آہ
پہروں تلک میں کہتا ہوں ہر بار بس جی بس
کل وہ جو بولا تلک تو کہا ہم نے مُنہ پہرا
خیر اب نہ ہم سے بولے نہ مارا بس جی بس
ہم دل لگا کے تم سے ہوئے یہاں تلک بہ رنگ
جو اپنے جی سے کہتے ہیں لاچار بس جی بس
سن کر کہا کہ کیا میرے لگتی ہے دل میں آگ
شکوہ سے جب کرے ہے تو اظہار بس جی بس

ایسے طابخے ماروں گا مُنہ میں تیرے نظیر

گر تو نے مجھ سے پھر کہا ایک بار بس جی بس

ابھی تازہ حلقہ زلف میں جو پھنسا ہے طائر دل بھلا
اسے رنج پہنچے ہے لے صبا تو گھڑی گھڑی نہ قفس

ہم ایسے کب تھے کہ خود بدلت یہاں بھی کرتے قدم نوازش
مگر یہ اک اک قدم پر اے جاں فقط عنایت کرم نوازش
کہاں یہ گھراؤ کہاں نیدلت جو آپ گاتے ادھر کو لے جاں
جو آں نکلے ہو بندہ پرورد تو کیجئے اب کوئی دم نوازش
لگا کے ٹھوکر ہمارے سر پر بلا تمہاری کرے تاسف
کہ ہم تو سمجھے ہیں اس کو دل سے تمہارے سر کی قسم نوازش
جواب مانگا جو نامہ برسے تو اس نے کھا کر قسم کیا یوں
زباں قلم ہو جو جھوٹ بولے کہواں نہیں یک قلم نوازش

اٹھاویں ناز ان کے ہم نہ کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہوویں

بجائے لطف، عتاب، شفقت، غضب، توجہ، ستم، نوازش
 و مانند گان راہ تو منزل پہ جا پڑے اب تو بھی اے نظیر یہاں سے قدم تراش

ہے تو کہنے کو ہر کہیں اخلاص اس کی باریکیاں وہی جانے
 لیک مشکل ہے ہم نشیں اخلاص ہووے جس شخص کے تئیں اخلاص
 اس کو ہر کسی کو غیر نے اس کو یوں کہا تم نظیر سے اے جان
 اپنے دل کا جتا وہیں اخلاص دل سے رکھتے ہو یا پوہیں اخلاص
 منہ سے اس کے سنا جوہیں اخلاص کوئی رکھتے ہیں نازیں اخلاص
 یوں کہا ایسے پوچ لوگوں سے

اس کو ہو کچھ تو، خیر وہ جانے

ہم کو تو اس سے کچھ نہیں اخلاص

سنئے اے جاں کبھی اسیر کی عرض اپنے کو بچے کے جا پزیر کی عرض
 چھد گیا دل زباں تلک آتے ہم نے جب کی نگہ کے تیر کی عرض
 اس گھڑی کھلکھلا کے ہنس دیجئے ہے یہی اب تو کہنے پیر کی عرض
 جب تو اس گل بدن شکر لب نے یوں کہا سن کے اس حقیر کی عرض

اب تلک دُھن ہے حسنِ نداں کی

دیکھ اس پوئے نظیر کی عرض

حسن کو ہے دلبری سے ارتباط رخ کو ہے جاں پروری سے ارتباط
 ہر مژہ کو تیر سے ہے ہم سہری چشم کو افسوں گرمی سے ارتباط

قد کو ہے سروسی سے ہم تہدی تن کو ہے نازک تری سے ارتباط
ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی آن کو غارت گری سے ارتباط

مل کے ایسے ناز میں سے پھر نظیر

کب کیا ہم نے پری سے ارتباط

دل ہے اس کج کلاہ سے محفوظ جی بھی ہے اس کی چاہ سے محفوظ

تم سے جو ناز ہو کر واسے جاں ہم ہیں اس رسم و راہ سے محفوظ

خوش پری بھی جو ہو سو ہو ہم تو ہیں اسی رشک ماہ سے محفوظ

کیا تماشا ہے یاد و کل تو نظیر تھا بہت خانقاہ سے محفوظ

آج بیٹھا ہے میکدے کے بیچ

بے نیچے کی نگاہ سے محفوظ

ہے تراخ بھی تجلی میں کچھ اس نور کی شمع دیکھ جس نور کو کافور ہو کافور کی شمع

چشم بد دور اسی رخ سے ہوئی تھی روشن مشعل وادی امن، شجر طور کی شمع

ہے شمع میں وہ رخشاں ترغاض کی جھلک جس کے برتو سے نخل ہو شب و بچور کی شمع

آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے جل کر حسن کی گرمی بازار میں مشہور کی شمع

آیا نزدیک جو محفل کے وہ مہ رات نظیر

اہل محفل نے نخل ہو کے وہیں دور کی شمع

ساقیا ہے ہمار زینت باغ دے پھلکے ہمیں بھی مے کے ایلاخ

دیکھی جس دن سے اس پری کی چشم پھر ہیں ہوش کا مٹانہ سراغ

اس نے بھیجا نہ رقعہ ایک اور ہم کئی مکتوب کر چکے ابلاغ

جائے حیرت ہے کل نظیر اپنا تھا پراگندہ ہوئے مے سے دماغ
 آج لینے کو جسم پے در پے
 نہیں ساقی کی منتوں سے فراغ

اے صف مرثکاں تکلف برطرف دیکھتی کیا ہے الٹ و کھٹ کے صف
 دیکھ وہ گوراسا کھڑا رشک سے پڑ گئے ہیں، ماہ کے منہ پر کلف
 آگیا جب بزم میں وہ شعلہ رو شمع تو بس ہو گئی جل کر تلف
 ساقی بھی یوں جام لے کر رہ گیا جس طرح تصویر ہو ساغر بکلف
 جب تو ہم نے بھی وہیں یہ عرض کی دیکھ کر اس شاہ خوباں کی طرف
 جان و دل لائے ہیں ہم بھی نذر کو گر قبول افتد زہے عز و شرف
 آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم
 یا اسیر المومنین شاہ نجف

ساقی یہ پلا اس کو جو ہو جام سے واقف ہم آج تلک مے کے نہیں نام سے واقف
 مستی کے سواد و در میں اس چشم سیہ کے کافر ہو، جو ہو، گردش ایام سے واقف
 مر کر بھی تر خاک نہ آسودہ ہوئے آہ اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف
 صیاد کی الفت پھنسنے آن کے در نہ تھے کا ہے کو ہم اس قفس و دام سے واقف
 ملنے کا پیام اس سے کہو جا کے عزیز و جو اس کے نہ ہو واصل کے پیغام سے واقف
 اوروں سے قسم کھائیے اور ہم تو مری جا ہیں خوب تمہارے قسم اقسام سے واقف

کوئی نہیں کرتا جو کیا تو نے نظیر آہ
 دل اس کو دیا جس کے نہیں نام سے واقف ✓

محفل میں ہم تھے اس طرف وہ شوخ چیل اس طرف
 بیٹھے ہم اپنے دھیان میں بیٹھا وہ اپنی آن میں
 کیا کیا دکھاتی ہے الم کیا کیا رکھے ہے تیج و خم
 ہم دے کے دل میں بے گشت پہلے کے دل ہے جی نہیں خوش
 تھی سادہ لوحی اس طرف مکر و فصول پھل اس طرف
 فکر نظارہ اس طرف ٹھٹھے پہ آجبل اس طرف
 آہوں کی شورش اس طرف زلف مسلسل اس طرف
 بے تابی جاں اس طرف راحت خوشی اکل اس طرف
 آج اس سے ملنے کو نظیر احوال ہے دل کا عجب
 ہم کھینچتے ہیں اس طرف گستا ہے وہ چل اُس طرف
 مضمون سرد لہری جاتاں رقم کروں گرا تھ آئے کاغذ کشمیر کا ورق

دیکھا جو ہیں اس نے لگا پاؤں سے تافرق
 وہ دست وہ پا اس کے خاں بستہ جو دیکھے
 کل ہنس کے نظیر اس نے کہا نازیں ہم سے
 جو چاہو سو ہم دیویں تمہیں ہم نے کہا خوب
 ہنس کر یہ کہا تئیں میں اور اس میں ہے کیا فرق
 پھر دست میں اور پائیں ہیں کچھ نہ رہا فرق
 کچھ بوسہ و دشنام میں بھی تم نے کیا فرق
 دونوں کی حلاوت میں نہیں ہم کو ذرا فرق
 گو لطف سے دینے کو کہا آپ نے ہنس کو
 برکتہ میں اور کرنے میں لے جاں ہے بڑا فرق

چتون درست سین بجا باتیں ٹھیک ٹھیک
 کیا دل کو اچھی لگتی ہیں ان خوش قدوں کی آہ
 منہ میں طابے چھاتی میں گھونسا کمر میں لات
 موقع سے بوسہ موقع سے گالی بھی ہم کو دی
 ناز واداکسی اس میں ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک
 یہ پیاری پیاری بولیاں یہ گانیں ٹھیک ٹھیک
 کیا گیا ہوئیں یہ مجھ پہ غیا میں ٹھیک ٹھیک
 کی شوخ نے یہ دونوں مدار میں ٹھیک ٹھیک
 ہوتی ہیں پھر تو کیا ہی ملاقاتیں ٹھیک ٹھیک
 جب دوستی میں قول کے پورے ہوں تو شخص

جب بن پڑی تو شیخ سچی شیخی نہ ماریں کیا ہم سے بھی پھر تو ہو دیں کراہتیں ٹھیک ٹھیک
 بیچ ہے بہ قول حضرت سید نظیر آہ
 بن آتی ہیں تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

تیرے بھی منہ کی روشنی رات گئی تھی مد سے مل تاب سے تاب 'رخ سے رخ' نور سے نور ظل سے ظل
 یوسف مصر سے مگر ملے ہیں سب ترے نشان زلف سے زلف، لب سے لب، چشم سے چشم، تل سے تل
 جتنے ہیں کشتگان عشق، اُن کے ازل سے ہیں ملے اشک سے اشک، غم سے غم، غم سے غم، گل سے گل
 جبے مٹا ہے کو کھن، کرتے ہیں اس کا غم سدا کوہ سے کوہ، جو سے جو، رنگ سے رنگ، گل سے گل
 یا ملا، جب اے نظیر میرے گلے تو مل گئے

جسم سے جسم، جاں سے جاں، روح سے روح، دل سے دل

کب مثل شیشہ ان کا کسی سے برائے دل پتھر جنھیں دیا ہے خدا نے بجائے دل
 جبے چلا وہ دل مرے پہلو سے کھینچ کر دل سے مرے صدا یہی نکلی کہ ہائے دل
 آوے اگر بتاں کے تمہیں رسم دلبری تو جہاں میں پھر کہیں ڈھونڈھانے پائے دل
 اب تو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دعا ق ظالم خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل
 اور جس پہ تو فدا ہو وہ ظالم ہو اس قدر جو مطلقاً ترا وہ نہ خاطر میں لائے دل
 تجھ پر بھی چند روز تو یہ کشمکش رہے دُر دُر اُدھر کرے اور ادھر کو تائے دل
 ناچار جیسے تجھ سے چھڑا ہوں دل کو میں ایسا ہی تو بھی اس سے لگا کر پھڑلے دل
 شیدا ہوں میں تو لیلیٰ و مجنوں کی چاہ پر خالق نے کیا ہی خوب ہے ان بنائے دل
 تھے اس کے پاس کے آبلے پھاتی پہ اس کے آہ کیا اتحاد جسم تھا اور کیا صفائے دل
 ہیں یاں بڑے جواہل دل اکشر یہ کہتے ہیں

چھوٹا سا ایک نظم یہ بھی ہے خاک پائے دل
دور سے آئے تھے ساتی سن کے بچانے کو ہم
بے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساتی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ سے خانے کو ہم
طاق ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی
اب تو بوجھ کے اسی کافر کے بت خانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں سحر اسے گھر آتا ہے دل
اب کہاں لے جائے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم
کیا ہوئی نقص ہم سے تو بتا دے اے نظیر

تا کہ شادی مرگ بھیجیں ایسے مر جانے کو ہم
کبھی دیکھوں نہ منسل باغ کو میں مجھے اس خم زلف دو تار کی تم
یوں پھر کے چمن کی فضا میں صبا دہزار طرح ہونا نہ کٹا
مٹے نہ کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا مجھے کوئے صنم کی ہوا کی تم
رہی عقل نہ رو کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بات ہوش ربا کی قسم
کھلے غم بھول مرا گل کے تن مجھے اُس کھلے بند بیا کی قسم
نہ کروں نہ کروں کروں میں ۱۰، میں لے کھائی ہے اب تو دوا کی قسم
وہ شوق جو کس صبح کو ہو کوعیاں تو وہ کھاتی ہے اس کی خفا کی قسم
لگی ہندی جو ہاتھوں میں لے گیاں تو وہ ہر نئی کچھ ایسی لالہ فشاں

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں تو وہ شرم دیا سے ہو سر و قریں
لئے نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں میں کہوں کیا، اب اس کی حیا کی تم

ہوں تیرے تصور میں مری جاں ہم تن چشم
تا ایک نظر دیکھے تجھے اے مہ تاباں
دل ہے مرا جوں اُٹینہ حیراں ہم تن چشم
رہتا ہے سدا مہر و رخشاں ہم تن چشم
ہر نقش قدم سے ہے بیا باں ہم تن چشم
ہے حلقہ زنجیر سے زنداں ہم تن چشم
دیا انکی میری کے تھیر میں شب و روز

اس آئینہ رو کے ہے تصور میں نظیر اب

حیرت زدہ نظارہ پریشاں ہمہ تن چشم

نہ میں دل کو اب ہر مکاں بیچتا ہوں کوئی خوب رو کے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ نے جس کو سب بیچتے ہیں چھپا کر میں اس مے کو یار و عیاں بیچتا ہوں
یہ دل جس کو کہتے ہیں غرض الہی سو اس دل کو یار و میں یہاں بیچتا ہوں
ذرا میری ہمت تو دیکھو عزیزو کہاں کی ہے جس اور کہاں بیچتا ہوں
لے ہاتھ پر دل کو پھرتا ہوں یارو کوئی مول لیوے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ کہتا ہے جی کوئی بیچے تو ہم لیں تو کہتا ہوں لو ہاں میاں بیچتا ہوں
میں ایک اپنے یوسف کی خاطر عزیزو یہ ہستی کا سب کارواں بیچتا ہوں
جو پورا خسریاں پاؤں تو یارو میں یہ سب زمین و زماں بیچتا ہوں
زمین آسماں عرش کسی بھی کیا ہے کوئی لے تو میں لامکاں بیچتا ہوں
جسے مول لینا ہو لے لے خوشی سے میں اس وقت دونوں جہاں بیچتا ہوں
کی جلس خالی دوکاں رہ گئی ہے سوا ب اس دوکاں کو بھی ہاں بیچتا ہوں

محبت کے بازار میں اسے نظیر اب

میں عاجز غریب اپنی جاں بیچتا ہوں

جان کر ہم سے نہ پوچھو کہ تم عاشق ہو بہ جاں ہم تو عاشق ہی تمہارے ہیں عیاں راہبیاں
دو بد فاس بت سرکش سے نہ ہونا لے دل مژدہ اور بار کی طیار ہے وہاں تیر و کماں

جب یہ کہتے ہیں کہ ہم دل سے تمہیں چاہتے ہیں

دیکھ کر ہم کو تعجب سے یہ کہتا ہے کہ ہاں

نہ دیویں ہم تو دل اپنا کبھی بتوں کے تئیں
جھپیں جو دل کے ستارے کی خود دل لے کر
کہاں تلک نہ بھنے آن کر وہ طائر دل
نظیر ایک دن اُس مُندخوسے میں نے کہا
چہ کردہ ام کہ نگاہے بہ حال من نہ کنی
بہ جز جفا و تعدی نخی کنی بر من
بران کے جن کے آگے کچھ اختیار نہیں
اگر جانا کریں تو کبان کو ہو تسکین
بچھا دے جس کے لئے دُام کا کل مشکیں
یہ فارسی میں کہ لے مہ عذار مہر حبس
چھفتہ ام کہ نہ گوئی دے بیابہ نشیں
نظر عتاب قریں داری وُجہیں پُر چیں
دلہ برائے ہمیں بردہ کہ ظلم کنی
شنید گفت بلے بردہ ام برائے ہمیں

چاہت کے اب افشا کن اسرار تو ہم ہیں
رو آئینے کو دیتے ہو عکس ہمارے
گلشن میں عبث جاتے ہو کر حسن کی تزیین
کیا کلبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام آہ
کی چشم سوئے زگس ہمیں بار تو پھر کیا
دل دے کے دل آزار کو کیا ست کو بید
جس دن سے بھنے دیکھی نہ پھر شکل رہائی
کیا کہے نظر آئے گرفتار تو ہم ہیں

کیس بیٹھنے دے دل اب مجھے جو اس کیس میں بجا کر
تو ہزار مجھ کو ستا ہے برتری چاہ مجھ سے نہ چھوٹے گی
کبھی اس کے کوچے میں جالی جو بہ کام دل گھڑی دو گھڑی
نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو پھر تو میں بھی بھرا کرو
مرنے کی بھی ہے یہی خوشی تو جھاکرے میں وفا کروں
تو میں یاد مجھ کو وہ مرفون کہیں اس کے دل میں بھی جا کر دوں

جو نگہ سے چاہ کی دیکھوں ٹک توڑ پھانکے تیوری یہ کہتا ہے
 تری اس نگہ کی سزا ہے یہ کہ لبس اب میں تجھ سے چھپا کروں
 جو میں بوسہ میں نے طلب کیا تو کہا تجھے تو نہیں ہے ڈر
 مجھے خوف ہے کہ مبادا اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں
 مجھے مدتوں سے ہے درد دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر
 تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں مٹا کروں

کوئی بولا تم نے نظیر کو نہ جھڑک دیا تو کہا میاں
 دل وجاں سے مجھ پہ وہ فدا لے کس طرح سے حفاظت کروں

عجبت چمن میں نہیں گل غدار آتے ہیں
 گلوں کو اپنی دکھانے ہمار آتے ہیں
 گھڑی گھڑی ہمیں دیکھ اپنے در پہ کہتا ہے
 یہ کون ہیں جو ادھر بار بار آتے ہیں
 قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اس کے پاس
 زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں
 جو سادی وضع میں کل لے گئے تھے ہوش دل
 نا ہے آج وہ کر کر سنگار آتے ہیں

گئے تھے ملنے کو شاید جھڑک دیا اس نے

میاں نظیر تو کچھ شرمسار آتے ہیں

مجھ پہ ابرو کی تو نہ کھینچ کساں
 او میں تیری کمان کے قرباں
 داد تیرے بھی حق کی دیتا
 آج ہوتا اگر مسکناں
 ٹھنڈی آہیں جاگ سے نکلیں ہیں
 اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں
 دم غنیمت ہے پھر کہاں لے دل
 یہ ہوا سر داوریہ آب رواں
 بوسہ لیجے جو ہو کے دست و کمر
 قطعہ اتنی ہم میں کہاں آتاب و تواں

وہ دہن اور کہاں لب اپنے نظیر

وہ کمر اور کہاں یہ ہاتھ میاں

تو کہتا ہے میں آؤں گا دو چار گھڑی میں
 مرجائے گا ظالم ترا بیمار گھڑی میں

جس کام کو برسات میں لگتے ہیں مینے وہ کرتے ہیں یہ دیدہ خوبار گھڑی میں
 میں تجھ کو نہ کہتا تھا نظیر اس سے نہ ملنا
 اب دیکھو حال اپنا تو ایک چار گھڑی میں

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں بھرا ہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
 جدھر وہ دیکھے ادھر صدف کی صف لٹ دکھے بھری ہے شوخ کی ایسی شراب آنکھوں میں
 تمھارے ہم تو قدیمی غلام بندے ہیں تمھیں نہ جاہئے ہم سے حجاب آنکھوں میں
 تمھارا شک نہ نیند آئی نہ پلک جھپکی بسا ہے حب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
 قسم ہے چشم گلابی کی تیری اسے گل رو کہ یہاں ٹپنے ہے پُرانت گلاب آنکھوں میں
 خدا کی بات اجنھیں بات بھی نہ آتی تھی وہ اب کس نہیں سوال جواب آنکھوں میں

شتابی آن کے محبوب چند ریاں رنگ لو

نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

مرتے ہیں ہم تو جان تو اب جان یا نہ جان باقی ہے کوئی آن تو اب جان یا نہ جان
 تیری تغافل کی جفا سے ترس ترس جی دیں گے ہم ندان تو اب جان یا نہ جان

مجنوں کے جوشان تھے سوا ب تجھ میں لے نظیر

ہیں سب وہی نشان تو اب جان یا نہ جان

وہ بے نشان دہن رخ خورشید تاب میں ذرہ سا گیا ہے دل آفتاب میں
 مرنے کو ٹھوکر دوں میں جلا دیتے ہوں جہاں وہاں حضرت مسیح میں پھر کس حساب میں
 ہر زخم رہے آہ کے بدلے صدائے واہ کیا پر دلی ہے اس دل خانہ خراب میں
 لگتے ہی آنکھ شبنم کو نظر آگئی وہ شکل پائی یہ ہم نے دولت بیدار خواب میں

آہی تو دل کو لے گئے آہی ہیں پوچھتے کئے میاں نظیر ہیں کس اضطراب میں
قدرت کہاں جو اس سے کہوں میں یہ بات آہ
صاحب تمہیں تو ڈال گئے ہو عذاب میں

ہم میں بھی اور انہوں میں پہلے جو اریاں تھیں دونوں دلوں میں کیا کیا امید و اریاں تھیں
وہ منتظر کہ آویں ہم پر پیش کہ جاویں اس ڈھب کی ہر دو جانب اختیاریاں تھیں
نہ ضبط ہے نہ کہ نہ رکھ کے نظارہ کیا شوق و رزیاں تھیں کیا بقاریاں تھیں
اٹھنے میں بیٹھنے میں ہنسنے میں بولنے میں کچھ بے شعوریاں تھیں کچھ ہوشیاریاں تھیں
جس جانظیر آکر ہوتی ہیں الفتیں تو

وہاں ایسی ایسی کتنی عشرت شعاریاں تھیں

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں چاہ چھپی کیجئے تاکوئی جانے نہیں
گنج محبت عبت کیجئے برباد کیوں یہ تو بڑا نقد ہے آنے دو آنے نہیں
نکلیں ہیں جو اشک آہ دل میں وہیں روئے دیدہ و لب کوڑے اُن کے چکھانے نہیں
خواب میں آکر کوئی پوچھے کہ عاشق ہو تم وہاں بھی عشق کے راز اس کو بتانے نہیں
تھا جو نظیر اس کو ایک شخص نے آکر کہا پڑھے کچھ اپنا سخن کیجئے ہمانے نہیں
جب نہ پڑھا کچھ تو پھر اس نے خفا ہو کسا کیا تمہیں شرع اپنے آہ ہم کو سنانے نہیں
سنئے ہی اس بات کے بھر کے دم سر د آہ

کہنے لگا کیا پڑھیں، دل تو ٹھکانے نہیں

قتل پر باندھ چکا وہ بت گمراہ میاں دیکھیں اب کس کی طرف ہوتے ہیں اندھ میاں
نزع میں چشم کو دیدار سے محروم نہ رکھ در نہ تاشتر یہ دیکھیں گی تری راہ میاں

تو جدھر چاہے اُدھر جا کہ سحر سے تا شام
ہم تری چاہ سے چاہیں گے اُسے بھی دل سے
لیکن اتنا ہے کہ اس چاہ میں دریا ہیں کئی
اگے مختار ہو تم ہم جو تجھیں چاہے ہیں
میں بھی سائے کی طرح ہو ترے ہمراہ میاں
جس کو بھی چاہئے اُسے شوق سے توجاہ میاں
ایسے ایسے کئی ہیں جن کی نہیں نگاہ میاں
اس سب سے تجھیں ہم کرتے ہیں آگاہ میاں
جب دم نزع نہ آیا وہ ستمگر تو نظیر
مر گیا کہہ کے یہ حسرت زدہ اے واہ میاں

دل ٹھرا ایک تبسم پر کچھ اور بہا اے جان نہیں
یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طر ز قفاں ہے یا رو
جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے
کچھ بن نہیں آتا کیا کہے جس طرح سے ملے اے ہدم
تر دیکھ کے میری آنکھوں کو یہ بات سناتا ہے ہنس کر
دل پھینک کر اس کی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر
گر سنس دیکھے اور لے لیجے تو فائدہ ہے نقصان نہیں
جولا کھ کوئی تڑپے سکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں
سہ کوں نہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں
وہ دیکھ ہیں رک جاتا ہے اور ہم کو چین اک آن نہیں
ہیں کہتے جس کو چاہ میاں وہ مشکل ہے آسان نہیں
کب چھوٹے اس کے دام سے تو وہ دانا ہے نادان نہیں
زندان نہ رکھو دل میں نظیر اس لب سے توقع بوسے کی
گر بھولے سے بھی یار تجھے دشنام دے امکان نہیں

گر گئی ہے اس کی مڑگاں کی جھپکے کل ہیں
کچھ تو جاتی دل سے خار بغیر اسی کی خلش
وہ کھن پناہم نے سہلائی ہے نازک نرم نرم
اسی پری رو کی لگی میں پانہاں یا آشکار
ہم تو ہوں کیفی ترے پر کیا کریں اے چشم یاد
کل اگر جا ہے تو ہدم اس گھڑی کچھ جھل ہیں
کاش وہ نازک مزہ دیتی قرار اک بل ہیں
کیا جاتی ہے تو اپنی نرمی لے لے محفل ہیں
جس طرح سے ہو سکے اے ہنسیں چل ہیں
ہوش میں آنے نہیں دیتا ترا کاجل ہیں

دلِ خمِ ابرو کو دیتے ہیں تو کس کس بیچ سے دام میں لیتا ہے اس کا کُل کا اکِ اک بن ہیں

ہم تو اس کے چاہنے والے ہیں مُدت سے نظیر
اور نیا کتا ہے اب تک وہ سنم چل ہیں

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی بہر جیں نہیں پیارے جو ہم سے پوچھو تو یاں کیا کہیں نہیں
ساتی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کو آہ ہر دم اشارتیں ہیں کہ اس کے تئیں نہیں

پوچھے ہے اس سے جب کوئی قتلِ نظیر کو
کتا ہے ہم نے مارا ہے ہاں ہاں نہیں نہیں

وہ جاندنی میں جو ملک سیر کو نکلتے ہیں تو دم کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں
چراغِ صبح یہ کتا ہے آفتاب کو دیکھ یہ بزمِ تم کو مبارک ہو ہم تو چلے ہمیں
فدا جو دل سے ہیں یاں شوخِ بسز رنگوں پر یہ کافران کی بھی چھانی پہ مونگ دلتے ہیں
ہوا ہولِ خشک میں یہاں تک کہ حضرت مجنوں یہ مجھ سے کہتے ہیں اور اپنے ہاتھ ملتے ہیں

کوئی تو بگڑا ہی بدلتا ہے یار سے، لیکن

میاں نظیر ہم اب تم سے تن بدلتے ہیں

یش کر خواہاں میں لے دل شادمانی پھر کہاں شادمانی گر ہوتی تو زندگانی پھر کہاں
جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے آبِ جنت تو بہت ہو گا، یہ پانی پھر کہاں
لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گے وہاں پر یہ میٹھی گالیاں خواہاں کی کھانی پھر کہاں
واں تو ہاں عورتوں کے گئے کے بہت ہوں گے نشانی ان پر زادوں کے پھلوں کی نشانی پھر کہاں
الفتِ مہر و محبت سب ہیں جیسے جی کے ساتھ مہرباں ہی اٹھ گئے جب مہربانی پھر کہاں
واعظ و واضح نگیں تو ان کے کہنے کو نہ مان دمِ غنیمت ہے میاں یہ نو جوانی پھر کہاں

(جاڑے چب ہو کے جب شہر خموشاں میں نظر
 یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

صفائی اس کی جھلکتی ہے گورے سینے میں
 نہ توئی ہے نہ کناری نہ گوگردش پر
 جو چھاپیں کہ کہاں تھی تو ہنس کیوں بولی
 بڑا جو ہاتھ مرا سینے پر تو ہاتھ جھٹک
 جو ایسا ہی ہے تو اب ہم نہ روزاؤں گے
 بھوٹک بھوٹک بس کبھو پیالہ پٹک
 چڑھی جو دوڑ کے کوٹھے پر وہ پری اک بار
 وہ اٹھتی چھاتیان کچھ اپنی کہتی ہے ہے ہے
 وہ پہنا کرتی تھی انگلیاں سرخ لاہی کی

یہ سرخ انگلیاں جو دیکھی ہے اس پری کی نظیر
 مجھے تو آگ سی کچھ لگ رہی ہے سینے میں

لیتے ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں
 اک دم کی زندگی کے لئے مت اٹھا مجھے
 اے یار میں تو گشتہ روزاں ہوں
 اے بے خبر میں نقش زریں کی گشت ہوں
 ظالم میں تیری جٹیم گلابی سے مست ہوں
 دوزخ طریق مجھ کو سمجھو نہ زابدا
 گر تو خدا پرست ہے میں بت پرست ہوں

ان سنگ دل ہوں کا گلہ کیا کروں نظیر
 میں آپ اپنے نشیشہ دل کی شکست ہوں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں
دل کی بتائی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھ
ایک دل دیجئے کس کس کو بھی مانگتے ہیں
نامہ برنامہ لکھوں یا میں زبانی کہہ دوں
مے کہیں شیشہ کہیں ساقی کہیں جام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں
بُندے بالے کہیں اور زلفِ سیاہ کہیں
خط کے پُرزے یہ لکھوں قاصدا کام کہیں

دل بھی اور جان بھی دسی سب اسی پر ہو نظیر

گل کہیں غنچہ کہیں بلسل بدنام کہیں
چمن میں جب سے لباس غنچہ لبے کھولے ہیں
یہ ہر دم جو شیب و سرازیر ہیں گرواں
ہمارے قطرہ افک اس کی سر دھری سے
تھمارے خندہ دندان نما کی دولت سے
غلط ہے یہ جو مرے گھر وہ بھول کر آویں
تُمانہ حن تھارا اگر نہ میزبان نے
گل کے پہلو میں غنچے نہیں پھولے ہیں
تمہارے باغ میں ایسے کئی ہنڈولے ہیں
کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں
صدف تو کیا ہے کہ نیساں نے موتی روکے ہیں
ادھر جو بھول پڑیں کیا وہ ایسے بھولے ہیں
فلک کی شمس و قمر لاکھ بار تو لے ہیں

وہ سنگ دل جو نہ بولا تو کیا تعجب ہے

میاں نظیر کہیں بت بھی منہ سے بولے ہیں

طلعت یوسف صباحت میں سے لاثانی لے
کس طرح سنبل ہو ان زلفوں سے اگر سرسبز
یہ نمک یہ خال و خط یہ زلف یہ ابرو کہاں
یہ لٹک یہ بل یہ بیچ و تاب یہ خوشبو کہاں

جب کہ الٹی ہم نے تکرار نظر پر آستیں
اسی پری روکے دو آنکھی یہ ہے شکل لباس
کھینچی، اس نے سرخ و شک قمر پر آستیں
تار دامن خار پر شاخ شجر پر آستیں

یہ جن مہی بہاراں جن دہلی آئندہیاں ہیں کہ کہ طرح جگر وچ دھواں مچانداں ہیں
کوئی نہ دیکھدا ہے، دیکھو ادھر تو پیارے تم بن بہاری آنکھیاں آنکھو بہانداں ہیں

طوفاں اٹھا رہا ہے مرے دل میں یل اشک وہ دن خدا نہ لائے جو میں آب دیدہ ہوں

صبح جب بول اٹھا مرغ سحر لکڑوں لکڑوں اٹھ گئے پاس سے وہ رہ گئے ہم ٹنڈوں ٹنڈوں

بتلا ایسے ہی خوش مضموں کے ہوتے ہیں نظیر بے قرار و دل نگار خستہ حال و بے وطن

آپڑے ہیں اب تو کوئے یار میں ہم شاد ہو سچے چمن میں اپنی رعنائی سے پابند غور
گر وہ قد دیکھے تو سر اس قید سے آزاد ہو یوں کہا کچھ ہم کہیں خدمت میں گرا شاد ہو
سن کے فرمایا کہو، جب ہم نے یوں اس سے کہا اور جو وقت جو وہ چہاں نہ ہم کو یاد ہو
سچ کر اس نے کہا ہم عہد تو کر لیں دے پھر یہ کہنے کیا کرو گے جب تعدی و جفا ہو معین ہے وہ سب ہو بلکہ کچھ ایسا دہو

عافیت کی گرہوا خواہی تمہیں ہے تو نظیر

تم ہوا میں ہم سے بے دردوں کی مست برآمد ہو

ہم چھپا دے واں کوئی کیا دل کی چاہ کو شاہد جہاں سمجھتے ہیں پسلی نگاہ کو
دکھلا حنائی دست لیا جھپ سے چھین دل کیا دست رس ہے، دیکھئے اس تنگدہ کو

بیٹھا جو چاندنی میں تو رُخ کی جھلک دکھا
 ناصح تو راست کہتا ہے لیکن وہ کیا کرے
 جھڑکی سے اُس نے ہم کو خفا دیکھ کر کسا
 جانے ہیں جھڑکیوں میں ہماری وہ لذتیں
 جو چاہ میں سمجھتے ہیں بہت نگاہ کو
 گر عار ہے کچھ اس میں تھیں تو نیاں نظر
 لے جاؤ اپنے اس دل عزت پناہ کو

بھڑکے بھی نہ الفت سے جو ایراد کوئی ہو
 مشاطہ ذرا بہر خدا حسن کی اُس کے
 اے دل تو عبث اس سے نہ کر خواہش دشنام
 تخفیف جفا کا یہ سبب ہے کہ مبادا
 منظور ہوا دام میں جب دل کو پھنسانا
 ڈر ہم کو بناوٹ کی اداؤں کا نہیں ہے
 بیدار بھی کرتا ہے بہت وہ تو نظیر آہ

المبتہ جو شائستہ بیدار کوئی ہو
 سرچشمہ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ
 حضرت خضر کہیں سے جا کر شراب لاؤ

رکھتی ہے جیسے ناز میں اس کی جبین گرہ
 منہ دیکھتے ہی دوسرے تیوری جڑھاتی ہو
 غیر دل کی تاب کیا جو رکھیں ہم سے کچھ مروڑ
 اس لطف کی تو آہ نہ ہو گی کہیں گرہ
 پھر کسے دل میں آپ کے کیونکر نہیں گرہ
 بس جانا ہم نے رکھتے ہو اہم سے تھیں گرہ

دل میں جن کے ہے تری حسرت کی گلچڑھی
ہم سے تو نزع میں بھی نہ بولا وہ غنچہ لب
چین جیں عرق میں ہوئی اس صنم کی تر
کو نہ نہ ہووے رشتہ عمر آہ کس طرح
مر کر بھی اپنا عقدہ مشکل ہو نہ وا
الفٹ کا تار توڑ کے جوڑا تو کیا ہوا
کانوں کے موتیوں کو ترے دیکھ رشک سے
وہ کیا بکلی کلی کے جگر میں ہے بے کلی

اس بحر میں نظرب تو لکھ اور بھی غزل
زلف سخن میں چاہے ہو ہر کس میں گرہ

یوں ہم سے اس کی کھتی ہے زلف و جیں گرہ
ظاہر میں گو وہ پوری چڑھاتا ہے ہم کو دیکھ
ڈوری کی یہ گرہ نہیں جو لے تو اس کو کھول
بہر عمر میرے دل کا یہ غنچہ کھلا نہ آہ
ٹلنے کے یاد رکھنے کو مدت کے بیچ آہ
بندھتا ہے جیسا دل کی محبت کا عقدہ
تم اپنے دل میں چاہتے جیسی رکھو موڑ
ناف میں مشک غم سے گرہ ہو کے مر گیا
اے شوخ تیرے نیلے کے تلمے کے رشک سے

بدر نہیں تو دیکھ یہ غنچہ نہیں گرہ
اپنی کھلی نہ تا بہ دم واپس گرہ
اے دل بس اب تو حل کی یہ کھلنی نہیں گرہ
جب غم میں اس کے آگے پڑے ہر کہیں گرہ
بیچ پوچھتے تو کہتے ہیں اس کے تمیں گرہ
خوبی بھی تک ہے کہ جب تک نہیں گرہ
تنہا جن میں دانہ شبسم نہیں گرہ
کلیاں بھی کیا کہ پھونچی ہے تاروں میں گرہ

بڑتی ہے جیسے پاس گرہ کے کس میں گرہ
لیکن ہزار اشک گرہ دل میں نہیں گرہ
ناصر ہے میرے اس کے تواب پر نہیں گرہ
ایسی فلک کس کے دی میرے نہیں گرہ
دے کر گیا ہے بند میں وہ ناز نہیں گرہ
ایسی جہاں میں کوئی نہیں دل نشیں گرہ
درد نہ ہمارے دل میں تو ہرگز نہیں گرہ
دیکھ اس پری کی زلف کی وہ عنبریں گرہ
دریا میں سو کھ کر ہوا درخشیں گرہ

مدت میں کل تو زلف کے دل کی جبین کی آہ
کھولی ہے ہم نے بیٹھ کے اسے ہم نشیں گرہ
باقی رہی گرہ جو محبت کی غم کی
وہ بھی نظیر کھولیں گے آخر تہیں گرہ

بس کہ دل اس کا ہے مانوس خیال آئینہ
تھا وہ پشت بام پر عکس آرسی میں ہم بھی
تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جو رہے
دل جفا سے اس کی آزرده ہو سو ہوتا نہیں
کل اُسے آئینہ خانے میں جو تھی مشق خرام
صافی دل کا لغت اس سے پھر پنہاں رہے
ہے وہ ملک حسن محروس خیال آئینہ
زور حکمت سے لیا بوس خیال آئینہ
بلبل تصویر و طائوس خیال آئینہ
بے خطر ہے زنگ سے روس خیال آئینہ
تھا دو صدر جاہم کو پاؤس خیال آئینہ
یک نظر دیکھے جو قافلوں میں خیال آئینہ

ہے اگر منظور سیر عالم حیرت نظیر
تو دل اپنا کر تو مجوس خیال آئینہ

رفقا سے دلوں کو کچلتے ہیں وہ جو آہ
بیچ بوجھتے تو اس میں خطا دل کی کچھ نہیں
شام میں یہ کچھ ہے حلاوت کہ دم بدم
بورجی چڑھا کے دیکھیں ہیں جن دم عتاب سے
بٹکی میں دیر ہو دوسے تو ہوتے ہیں ہم وہیں
انہی کے التماس کا رہتا ہے جاں کو عزم
کہئے اگر کہ ہم ہیں تمہیں دل سے چاہتے
گر چشم غم نے دی بھی گواہی تو کہتے ہیں
اپنا یہ بد چلن دل انھیں کا ہے خاک راہ
خواب کی شوخیاں ہی بڑھاتی ہیں جی کی چاہ
ہوتے ہیں ہم اسی کے لئے مصدر گناہ
کس کس طرح کے لطف دکھاتی ہے وہ نگاہ
بے رحمی و تغافل ناخن کے داد خواہ
ٹھوکر کے اشتیاق میں پھرتا ہے دل تباہ
تو کہتے ہیں چرخش کوئی شاہد کوئی گواہ
اسے بے وقوف کس نے کہا تھا تو ہم کو چاہ

یہ کہہ کے جب بھڑکتے ہیں ہو کر خفا نظیر
وہ بھڑکیاں بھی ایسی ہی دل خواہ ہیں کہ واہ

ناہد و روضہ رضاں سے کہو عشق اللہ
جس کی آنکھوں نے کیا بزمِ دو عالم کو خراب
عاشق کو چہ جاناں سے کہو عشق اللہ
یار و دیکھو جو کہیں اس گل خنداں کا جمال
کوئی اس فتنہ دوراں سے کہو عشق اللہ
ہیں جو وہ کشتہ شمشیر نگاہ قاتل
تو مرے دیدہ گریاں سے کہو عشق اللہ
آہ کے ساتھ مرے سینے سے نکلے ہے ہوا
جا کے اُن گنج شہیداں سے کہو عشق اللہ
لے بُتاں مجھ دل بریاں سے کہو عشق اللہ

یاد میں اُس کے رُخ و زلف کی ہر آن نظیر
روز و شب سنبھل دیریاں سے کہو عشق اللہ

ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار آہ
منا تو اک طرف ہے عزیز و کہ بھر نظر
ہم عید کے بھی دن رہے امیدوار آہ
تھی اس عید کی سو گئی وہ بھی دوستو
پوشاک کی بھی ہم نے نہ دیکھی بہار آہ
اب دیکھیں کیا کرے دل امیدوار آہ
ہر عید میں ہمیں تو سدا آس ہی رہی
کافر کبھی نہ ہم سے ہوا ہم کنار آہ

جس عید میں کہ یار سے ملنا نہ ہو نظیر
اس کے آپر تو حیف ہے اور صد ہزار آہ

صحیح گلشن میں چلی بھر کے ہوا بسم اللہ
مصحف رخ پہ ترے ابروئے پیوستہ نہیں
چشم بد دور بہار آئی ہے کیا بسم اللہ
اس قدر تھا وہ نشہ میں کہ یکایک جو گرا
موقلم سے یہ قدرت نے لکھا بسم اللہ
زلف اُس عارضِ رنگیں پہ بکھرے جو لگی
میں نہ بولا، پر مرے دل نے کہا بسم اللہ
بول اُٹھی منہ سے وہیں باد صبا بسم اللہ

آج گلشن میں ذرا پاؤں جو پھسلاؤں گا گل ہنسائے غم نے جلدی سے کہا بسم اللہ
 یا رقتاں میرے جو جو کہ لگا تھا وار لب پہ بہر زخم کے بھلے تھی صدا بسم اللہ
 شیشہ و ساقی و ساغر بھی حاضر ہیں نظیر
 نے کشی کیجئے اب دیر ہے کیا بسم اللہ
 تری وہ شان کی رعت ہے یا رسول اللہ کہ لامکاں نے کسا لا الہ الا اللہ
 وہ نور دیدہ احمد کہ جس کے رتبے کی حدیث بضعتہ منی ہے دو جہاں میں گواہ

غم نہیں گرد لبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

تم سے ہم اے حسن کے سردار رخصت ہو چلے بد توں میں دیکھ کر دیدار رخصت ہو چلے
 چاہتا تھا دل تو یوں رہتے تھارے پاس تم پر فلک کے اتھ سے ناچار رخصت ہو چلے
 آگئے تھے میرے کرتے تم کو دیکھا خوش ہوئے اب خدا حافظ ہے ہم لے یا رخصت ہو چلے
 پھر بھی آجا دیں گے ایدھر کو اگر جیتے رہے اب تو رہنا ہے ہنس دینا رخصت ہو چلے
 کیوں نہ لالہ کی طرح دل ہو ہمارا داغدار کس مرنے میں جھوڑ کر گزار رخصت ہو چلے
 گل روں کی زم میں کیا بیٹھے ہو اے نظیر
 تم بھی رخصت ہو کر اب سب یا رخصت ہو چلے

منہ سے برق نہ اٹھے صاحب من یاد رہے پھر قیامت ہی عیاں ہے یہ سخن یاد رہے
 مر بھی جا دیں گے تو جز پس رہن عریانی آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد رہے
 اب تو ہے ازیہ ٹھکرا کے سروں کو چلنا لیکن آخر نہیں اچھا یہ چلن یاد رہے

سوچیں ایک نقطہ اس کے ہیں کھڑے میں نظیر

جب یہ صورت ہو تو پھر کس کو چہن یاد رہے

تن دیکھ کے جس گل کا جان چھوڑ کے تن نکلے
ہیں خال سر کا کل یا ڈالیاں سنبل کی
ہم درج گہراپنے سینے میں سمجھتے تھے
آنے کی قسم کھا کر پھر منہ بھی نہ دکھلایا
اب روئیے الفت کو یا ٹھونکے قسمت کو
وہ سیم تن اس تن سے کس طرح نہ تن نکلے
چرنے کے لئے شب کو آہوئے ختن نکلے
جب روئے تو آنکھوں سے کل لعل بین نکلے
سادہ جنھیں سمجھے تھے سوان میں یہ فن نکلے
جو قول کے پورے تھے وہ عہد شکن نکلے

تھا میں جو نظیر اس کے دندان کے تصور میں

جب منہ سے مرے ایسے موتی سے سخن نکلے

نہ سرخی غنیمت گل میں ترے دہن کی سی
میں کیوں نہ پھولوں کہ اس گل بدن کے آنے سے
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے
گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہوئے خواباں
جو دل تھا وصل میں آباد تیرے ہجر سیاہ
تو اپنے تن کو نہ دے نسترن سے آبِ شہیہ
ترا جواؤں کا تلوا ہے نرم محفل سا

نظیر ایک غزل اس زمین میں او بر بھی لکھ

کہ اب تو کم ہے روانی ترے سخن کی سی

نہیں ہوا میں یہ بونا فہ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی

میں ہنس کے اس لئے منہ چومتا ہوں غنچے کا
خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو
ہزار تن کے چلیں بانگے خوب رو سیکن
مجھے تو اس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے
کہا جو تم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا
وگرنہ بیچ ہے تو اے جان اتنی مدت میں
وہ دیکھ شیخ کو لا حول پڑھ کے کہتا ہے
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی
مجھے بوا آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی
کسی میں آن نہیں تیرے بانگین کی سی
کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی
ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکرو فن کی سی
یہی بس ایک کمی تم نے میرے من کی سی
یہ آئے دیجھے ڈاڑھی لگا کے سن کی سی

کہاں تو اور کہاں وصل اس پری کا نظیر

میاں تو جھوڑ یہ باتیں دوانہ پن کی سی

درج غم میں چشم نے گوہر اگل کر بھر دے
جلوہ گر محفل میں رات اُس حسن کے شعلے کو دیکھ
کل جو تک رو یا کسی کو یاد کر وہ گل بدن
جام کم بھرنے میں ساتی کو ذرا چھیسڑا جو میں
فوج کرتا تھا جو قاتل مجھ تپش آلودہ کو
زخم شانے کے تری زلفوں نے لے وعدہ خلاف
کہتے ہیں لے باغباں جتنے کہ خالی تھے چمن
اشک نے جنگل کے جنگل دم میں ڈھل کر بھر دے
شمعداں شمعوں نے اپنے سب پگھل کر بھر دے
اشک تھے آنکھوں میں یا موتی کچل کر بھر دے
اس نے ایک دو چار سا غر مجھ کو جل کر بھر دے
خون میں سب دامن کے پاٹ اس کے اچھل کر بھر دے
آخر شب بیت و محل سے آج کل کر بھر دے
جوش گل نے اب کے سب پھول پھل کر بھر دے

اب ترے رونے کا عالم حد سے گزرا ہے نظیر

اشک نے تیرے تو سب جل پھل، محل کر بھر دے

ہنسے روئے پھرے، رسوا ہوئے ہجائے بندھے چھوٹے
غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

کلیجے میں پھولے دل میں دلخ اور گل ہیں ہاتھوں
تفاوت کچھ نہیں گلچیں میں اور بے درد خواباں میں
ہزاروں گالیاں دیں پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا
کچلے ہو مجھے تم میں یہ مانگوں ہوں دعا دل میں
زباں کی کر کے مفروض اور بنا دشنام کا کاغذ
یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت سے

ہماری روح تو پھرتی ہے معنوقوں کی گلیوں میں

نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس حجال سے چھوٹے

خوشی دو چند تھیں سیر ماہتاب میں ہے
ملا ہے اس لب میگوں کے ساتھ خال دل
وہ جلوہ گر ہو تو رہتی ہے جان و گرنہ آج
لیا ہے ہم سے دل بے بن بھی ہو طلب کرتے ق

کہا کہ دفتر حسن پر ی رگوں کی نظیر

تھیں خبر نہیں یہ بھی اسی حساب میں ہے

نہیں آئے کل سے جو تم ادھر اسے کیا خیال میں لائے
کہا جب کہ ہم سے بھی بولے تو بتا کے منہ کہا غیر سے
لگے جب بچھانے باط ہم گلی اس کی میں تو کہا میاں
وہ نگار گل رخ و خیر بوجھلے سے آکے لگے تو پھر
یہ وہ ہاتھ ہیں کہ ستم کریں یہ بہار ان کی عجب ہو جب

جو کچھ عذر ہو تو بیان کر دہیں جیسے آئے تھے آئے
یہ سخن ہے سچ کہ ہر ایک کو بہت اپنے منہ نہ لگائے
یہ جو دام ہاں پہنچاتے ہو سے جلد بیاں سے اٹھائے
یہ شگفتگی ہو بہ رنگ گل کہ نہ پھولے دل میں سمائے
کڑے ان میں سونے کے ڈالے خاناں میں خوب چائے

جو کہا تھا تم نے کہ بزم میں تمہیں پاس اپنے بٹھائیں گے
نہیں لائق اس کے تو ہم مگر جو کہا تو کربھی دکھائیے

جو ہیں آتے دیکھا نظیر کو طرف اپنے ہنس کے کہا کہ ہاں

تمہیں لائی، اپنی کشش ادھر اچھی آئیے اچھی آئیے

دل اس کی زلف میں پھنس کر یہ خوش دلی تو
کہ جب صبا سے ملے وہ تو اس میں تو جھولے

نشا ہے اس کو بہت وقت ابھی لے دل
میں اس کے چوم لوں منہ کو تو زلف کو جھولے

جو دو بدو دل اس کے تو کیونکہ ہو جاں بر
بکے جو تیر نگہ سے تو تیغ ابرو لے

ہے اس کی چشم سیر وہ کہ دیکھ کر اس کو
مقام حلقہ حیرت میں چشم آہو لے

ہنسی ہنسی میں دل اپنے کو مفت کھو بیٹھے

میاں نظیر بہتوں کے تپاک پر پھولے

نہ دیں گے ہم تو دل اور تم ہو کہتے دوز بردستی
نہ صاحب ہم نہیں راضی گر لے دوز بردستی

جو تم زور آوری کرتے ہو ہم سے دل لگانے میں
کسی نے دل لگایا ہے کہیں لوگو زبردستی

ہمیں کچھ مدعا ہوتا تو آپ ہی بیٹھے اس جا
تمہیں کچھ ہے غرض جب تو بٹھالتے ہو زبردستی

بتاں دست خا بستہ یہ کرتے ہیں جسے مائل
وہ جانے ہے کریں ہیں اس پر یہ جو زبردستی

کہاں تک نہ دیوے وہ کہ ہم جسے پاس جا
بنا کر حُسن تم ہنس ہنس کے آبیٹھو زبردستی

نہ ہوئے ہم تو مل کر تم سے بس اس قدر لیکن
کریں کیا جب تمہیں آپ ہی سے آبیٹھو زبردستی

جو جو بولوں سے دل مانگیں تو پھر طعیں اور بٹھاؤ طعیں
نہ دل دیوں نہ گھر جانے دیں یہ دیکھو زبردستی

کریں حجت تو کہتے ہیں خوشی سے کیا دیا تھا دل
ارے ناداں لیا ہے گا وہ ہم نے تو زبردستی

نظیر اب تو تمہارے بس میں ہے کچھ کہ نہیں سکتا

کرو جو ہو سکے تم سے زبردستی، زبردستی

جو تم نے پوچھا تو حرف الفت برآیا صاحب ہمارا لب سے
 نہ دیتے ہم تو کبھی دل اپنا نہ ہوتے ہرگز خواب و روبا
 وہ جہد مشکیں جو دن کو دیکھے تو یاد اس کی میں شام ہی سے
 لگا ئی فراق جو ہم نے اس کی کلائی کو پی تو ہنس کے بولا
 کہا تھا ہم کچھ کہیں گے تم سے کہا تو ایسا کہ ہم نہ سمجھے
 ہوس تو بوسے کی ہے نہایت پہ کیجئے کیا کہ بس نہیں ہے

کسی نے پوچھا نظیر کو بھی تمہاری مغل میں بار ہوگا
 کہا کہ ہوگا اودہ بولا اکب سے کہا کھوکا کبھی نہ اسے

قدم پہ نقد دل اپنا رکھ دیں جو اس طرف بھی ہو جلوہ بازی
 مقابل اس چشم کے ہوں کیونکہ وہی فرصت نہیں ہے ہر گھر
 جو حال دل کا کبھی ہیں کہتے تو دو ہی باتیں ہے سن کے کتنا
 کہا یہ ایک شمع روئے شب کو کہ ہم کو چاہو تو ہم یہ بولے

جو ایک دلبر سے دل چھڑایا تو دوسرے سے وہیں لگایا

نظیر ہم تو رہیں خوشی سے جو صین لینے دے عشق بازی

بوسہ لب سے ہیں ہم خوش کیجئے
 ہے تمہیں اے جاں کے سر کی قسم
 قابل مغل ہمیں سمجھو اگر
 جیب تو پھاڑا مراد لدار نے

پھر ہیں دل چاہے سو کہہ لیجئے
 آج تو ایک ساغرے قیجئے
 تو کبھی آنے میں وہاں دیجئے
 فائدہ کیا ہے اسے جو سیجئے

صلح کو تم پاس آیا ہے نظیر

اور جو لڑنا ہے تو لڑ لیجئے

لو نہ نہیں ہنس کے تم اغیار کے گل دستوں سے
اتنی ضد بھی نہ کرو اپنے جگر خستوں سے
فندقیں بزم میں دیکھ اس کے سرگشتوں کی
رشتہ ربط نے لی رو کف گل دستوں سے
دوبہ دو ہو جو نہ چشمانِ بتاں کے لے دل
ڈرتے رہنا ہی مناسب ہے یہ مستوں سے
دست صیاد سے چھوٹے تو اچھل پے در پے
ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جتوں سے

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیرِ نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہشِ خوں ہے
کچھ دیر نہیں لگنے کی یہاں صیدِ زبول ہے
عشاق سے ملنے کی عیبت پوچھو ہر ساعت
جب دل ادھر آجاوے وہی نیک شگون ہے
جب میں نے کہا تم مجھے پہچانتے ہو گے
میں وہ ہوں کہ مدت سے جسے شوقِ دروں ہے
یہ سن کے نظیر اس نے کہا کتا ہے کس سے
ہیں یہ بھی کوئی زور تماشے کا فنوں ہے

ہم تیری تو صورت سے بھی واقف نہیں ہرگز
اے شخص تو بے عقل ہے یا تجھ کو جنوں ہے

ابرو نے کہاں زلف نے زنجیر دکھا دی
مڑگاں نے بھی ایک ترکش پرتیر دکھا دی
مل کر در ونداں میں سی شوخ نے ہنس کر
کچھ زورِ نزاکت بھری تحسیر دکھا دی
کوچے میں ہیں خاک نشینی نے تمھاری
تاناہو طلاس سے وہ اکسیر دکھا دی
کل اُس نے کہا حُسن میں ہم رشک پری میں
کھڑے نے ہمارے ہی وہ تنویر دکھا دی

ہم بولے نظیر اس سے کہ ہے جھوٹ تو ہنس کر
چھپ اس نے پری کی ہیں تصویر دکھا دی

اے دل صد چاک سج کہہ دل ہے تو یا شانہ ہے
ہم نشیں چشمِ بیاں کا بھی عجب مے خانہ ہے
دل جو ہم رکھتے ہیں وہ دل تو نہیں پروا نہ ہے
اب تلک پائیں ہماری غرض مستانہ ہے
یاد ہو اس کا نشہ کچھ یہ وہی پیما نہ ہے
یہ کوئی قصہ نیا ہے یا کُن افسانہ ہے

کا کل مشکیں کا تجھ کو شوق بیتا بانہ ہے
کر دیا پہلے ہی ساغر میں ہمیں مدہوش و مست
شمعِ رویوں کو تو کچھ پروا نہیں پر کیا کریں
پڑ گئی تھی ایک دن اس چشمِ مے گوں پر نظر
پھر وہ چشمِ مست لے دل میل کرتی ہے ادھر
حالِ دل کہم نے کہا جس دم تو بولا سچ کو

اس پر ہی رو سے چلا پھر دل لگانے کو نظیر
کیا کہیں یہ بھی کوئی وحشی ہے یا دیوانہ ہے

ناگن ہے نئی زلف کی دل کیونکہ نہ ڈر جائے
شکل و بدن و زیور و پوشاک سب اس کی
ہے حسن پرستی بھی عجب چیز و ناکیش
محبوب کے رتبے پہ نظر رکھو نظیر آہ

ایسا نہ ہو جو یار کے دل سے تو اُتر جائے

پہر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی
دیدہ گریاں بھلا، کوئی بھڑی اور بھی
اتنے میں ساتی نے دی اُس سے گڑھی اور بھی
ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی
آگ سی ایک آگ پر آن بڑی اور بھی
اتنی لگائیں جہاں، ایک چھڑی اور بھی

جام نہ رکھ سا قیاس ہے بڑی اور بھی
موسمِ برسات کی کر تو چسکے بات ہم
پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو بڑے بوٹے
عشق بھلا ہے تجھے زلفِ بیاں کی قسم
کچھ پیشِ دل تھی کچھ سننے ہی فرقت کا نام
گر جب اُڑائیں ہیں تن پہ مرے پر میاں

کیا کہوں اس شوخ کی واہ میں خوبی نظر
سننے ہی اس بات کے ایک جڑی اور بھی

دیکھ عفت ثریا ہیں انگور کی سو بھی
ہم نے تو اسے دیکھ کے جانا کہ بری ہے
غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے
دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا
سرباؤں سے جب پھنس گیا اس لف سیہ میں
جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت

کیوں بادہ کشاں ہم کو بھی کیا دور کی سو بھی
پریوں نے جو دیکھا تو انھیں حور کی سو بھی
موسیٰ کو بھلا کہئے جو کیا طور کی سو بھی
بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سو بھی
تب ہم کو سیاہی شب دی جو ر کی سو بھی
کی غور جو خاطر میں تو مزدور کی سو بھی

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیر آہ
نزدیک ہی کیا ہے کہ جہاں دور کی سو بھی

بھولتی دل سے نہیں ہوش رُباتی تیری
کیوں نہ پہروں میں تلوں باتیر کھڑے کی
مہ کی صورت مجھے آگے تیرے کتب لگے
آنکھ جوں آئینہ رہ جاتی ہے پریوں کی کھلی
ہے تو مختار جو کچھ چاہے سو کرنا ز غرور
کل جو گلشن میں گیا میں کہ ذرا غم بھولے
سوٹھا ایک گل کو جو ہیں میں تو اس میں بھی ہیں

دلبری عشوہ گری، جلوہ نمائی تیری
کیا کروں مجھ کو یہ صورت، خوش آئی تیری
اُس کے چہرے سے تو صورت، سوانی تیری
جب نظر آتی ہے کھڑے کی صفائی تیری
کشور دل میں پھری اب تو دہائی تیری
دہاں بھی ہر گل نے مجھے یاد دلائی تیری
لے مرے غنچہ دہن بُو مجھے آئی تیری

غم میں مرنا تھا نظر اس کو جلایا تو نے
جان جس منہ سے گہوں اب میں بُرائی تیری

سب ٹھاٹھ یہ ایک بوند سے قدرت کی بنا ہے
 بالفرض اگر ہم ہوئے حوا کے شکم سے
 یہاں لوگ دولہن دھوا کے قصے میں پھنسے ہیں
 حکمت کا الٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
 لے عرش سے تافرش جو روشن ہے طلسمات
 ہم کچے سے کچا اُسے سمجھے ہیں وگرنہ
 ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی
 حاجت نہ برآئی تو وہیں کرنے لگے ہجو
 یا بس کہیں مرطوب کہیں گرم کہیں سرد

ایک اس کی دوا سمجھی نہیں جاتی نظیر آہ

کچھ زور ہی معجون کا نسخہ یہ بنا ہے

تھے آگے بہت جیسے خوش اے یا رہیں سے
 ہے سب سے تو ایسا روا اشارات و لیکن
 محفل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور
 اور وں سے جو کہتے ہو کہ ہم ان سے ہیں ناخوش
 گلگشت چین کرتے ہو جب ہم درہ یاراں
 اقرار ملاقات ہر ایک سے ہے بہر صدر

سمجھے گا جو تہجے کو نظیر اہل وفا کے

نوسلنے لگے گا وہ طرح دار ہمیں سے

یہاں اور کسی کی نہ منی ہے نہ مناس ہے
 آدم کے تئیں دیکھے وہ کس کا جنا ہے
 وہاں اور بنت ہے نہ بنی ہے نہ بنا ہے
 وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہے یہ فنا ہے
 یہ نور سب اس نور کی پھلنی سے چھنا ہے
 اس دیگ کے چادل میں کہنی ہے نہ کنا ہے
 نہیں اور کسی سے کوئی اُروٹھا نہ مناس ہے
 اور ہو گیا مطلب تو وہیں مصف و ثنا ہے
 مصری میں کہیں زہر ہلاہل میں سنا ہے

سرسبز رکھو کشت کو اے چشم تو مری
گو میں جفا سے مرگیا رگ رگ کے رویا
تیری ہی آب سے ہے بس اب آبرو مری
پر شکر ہے وفا تو ہوئی سرخ رو مری
اس کی جبین پاک پر اس دم تک اے نسیم
بل کھا کے زلف کان میں اس کان حسن کے
پھونکے ہے پردے پردے میں کچھ موبہ مری
یعنی وہ مشاد ہو کہ مٹی ہاؤ دھو مری
سو تو نے میرے غم میں رلایا اسے فلک
اے رویا یہ تو نہ تھی آرزو مری

پہروں تلک بکامیں پر اس شوخ نے نظیر
ایک چٹکی میں اڑا دی وہ سب گفتگو مری

کیا ادا کیا ناز اور کیا آن ہے
حور بھی دیکھے تو ہو جادو سے فدا
یہاں پری کا حسن بھی حیران ہے
آج اس عالم کا یہ انسان ہے
اس کے رنگ سبزی ہے چین میں دھوم
جان ددل ہم نذر کو لائے ہیں آج
دل بھی دل سے ہے تصدق آپ پر
جان بھی سوجان سے قربان ہے

قطعہ

دل کہاں پہلو میں جو ہم دیں تمہیں
عقل و صبر و ہوش سب جاتے رہے
یہ تو گھراک عمر سے دیران ہے
ہاں میاں اک اودھوئی سی جان ہے
وہ اگر لینی ہو تو لے جائے
خیر یہ بھی آپ کا احسان ہے

آن کر مل لو نظیر اپنے سے جان
اب وہ کوئی آن کا ہمنان ہے

نجلت تو نہ دی کچھ اس بے مہر کی یاری نے
گلشن میں نقاب الٹا دوبارُ رخ اس کے سے
شرمندہ کیا ہم کو نا تجربہ کاری نے
اور بارہ کیا دم میں سو گل کے گریباں کو
کیا لطف کیا ہم پر کل باد بہاری نے
رات اس کو سنا آئی پھر صبح ملک ہم کو
اس رفک گلستاں کی ایک زیب شعاری نے
ایک لحظہ نہ فرصت دی ساعات شمار نے

کیا کیا چین پُر گل دکھلائے نظیر اس دم
اس دست نگار میں کی توصیف نگاری نے

سرسنک چشم سے موتی بہت پروئے گئے
غور نے تو ہمارے بہت ہی کھینچا سر
فلے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
ہماری اُن کی رہی عمر بھر ہی صحبت
پراس کو ہم بھی سدا خاک میں ملوئے گئے
ادھر وہ بہتے رہے ہم ادھر سے روئے گئے
نہ جائے میں کبھی اور کبھی نہ سوئے گئے

نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سواپ ہی کھوئے گئے

ہیں اس غنچہ لب کی بات کیا دل سے لگی پیاری
سے جو دل کے لینے والے ہیں وہ لے ہی جاتے ہیں آخر
کہ جس کو بے کلی لینی ہو وہ ہم سے کرے یاری
کیا ہم نے یہ استفسار اس سے لینی اب ہم پر قطعہ کسی کے کہنے سننے سے یہ رہتی ہے ستمگاری
اگر کہنے سے ہو تو کچھ کریں تدبیر ہم اس کی
وگرا اپنی ہی مرضی ہے یونہی تو خیر لا چاری

مکدر ہو گیا لیتے ہی دل کے یک بہ یک ہم سے
نظیر اس آئینہ رونے تو کی یہ صاف عیاری

کمر تک اس نے زلفوں کو جوں دے دے گے چھوڑا ہے
یہ دوزخیں نہیں کافر یہ ایک ناگن کا جوڑا ہے

جو کچھ بھی صبر ہو تو ایک گل کیا اس کو تھوڑا ہے
 جو بیچ پوچھو تو اس نے لعل کو پتھر سے توڑا ہے
 کسی کی ایڑ پر ہے اڑ اور کوڑے پہ کوڑا ہے
 کہ جس کے نیل کا اب تک مرے تن میں ددوڑا ہے
 مرے پہلو میں کیوں یا رویہ دل ہے یا کہ چھوڑا ہے
 بھلایا رو کسی نے بھی نرکار اپنے کو چھوڑا ہے
 ارے دل تجھ کو کیا دنیا میں محبوبوں کا توڑا ہے
 گلے میں ہار ہیں اور تن میں نافرماں کا جوڑا ہے

پھر ہے جس سے بل جہن کے تختے تختے میں
 دیا ہے سنگ دل کے ہاتھ جس نے شیشہ دل کو
 سمندر آسماں کب آپ سے دوڑے ہے اس پر تو
 کل اس نے نیلگوں ناخن سے ایسے میرے چٹکی لی
 تپک ہے درد ہے کوندن پڑی ہے ہول اٹھتے ہیں
 نشے میں پا کے اس کو کس طرح بوسہ نہ میں لیتا
 عبث اس بے وفا کے تو جو نکتوڑے اٹھاتا ہے
 یہی ہے دھوم کل سے وہ مرے ملنے کو آتا ہے

غرض میں تو نظیر اس سے یہ سمجھا ہوں کہیں شاید
 کسی کا نیل بگڑا ہے کہ یہ طوفان جوڑا ہے

شرم و فدا گر ایک دم دیتی زباں کو یاری
 ہم اُن کے بتلا ہیں اسے واسے خام کاری
 صورت ہی بھول جاوے پھر کیسی یادگاری
 دل بستہ گان کی بھر ہو کیونکر نہ اشک باری
 ان کے قرار میں ہیں صد خار بے قراری
 جو شام مومیں ہم نے کی تھی سیاہ کاری

اٹھا رہم بھی کرتے احوال دل فکاری
 جن میں فریب و فن کی سو نختہ کاریاں ہیں
 شکوہ فرامشی کا کیا اُن سے کیجے جن کو
 یک بار ملتے ملتے رُک جاؤ تم تو اسے جاں
 وعدہ پہ گل رخوں کے مت کھا فریبے دل
 لیتی ہے ہم سے بدلا اب صبح حشر اس کا

گر کہ نظیر ہم اس محبوب کی نظر سے

ایسے ہوئے ہیں ہلکے جو زندگی ہے بھاری

صد خستہ نہ خفتہ کی حاجت روا ہوئی

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم روا ہوئی

بلاوئے گل نہ کلبہ احزاں میں اے نسیم
 یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زرد
 یہ کب ہماری روح کی راحت فرما ہوئی
 آواز یا ہوئی نہ صدا سے درا ہوئی
 ہم نے کہا یہ اس سے کہ کیا کہئے کیا ہوئی
 پوچھی نظیر ایک نے گل شکل وصل یار
 جو شکل دور باشش تھی روز نخست کی
 اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی

بنا کے منہ جو سراسر ہمیں بُرا کہئے
 غرض تھی چاہ سے ہم کو سو ہم نے کی آگے
 تمہارا ہم نے بگاڑا ہے کیا بھلا کہئے
 گناہ اس کو سمجھ لیجے رخطا کہئے
 اگر ہزار طرح ہم کو بے وفا کہئے
 یہ احتمال میں ہے کون سی ادا کہئے
 یہ ناروا ہے محبت میں یا روا کہئے
 تمہارے دل کا جو کچھ ہو وہ مدعا کہئے
 نہ جانکا لئے لب سے کبھی نہ آ کہئے
 تو منصفو انھیں بھر کچھ نہ کہئے کیا کہئے
 جو لے کے دل کو کریں رات دن ستم گاری
 گلے کی داؤز اکت سے دیتے ہم بھی نظیر
 پر اس صنم کا ہے نازک مزاج کیا کہئے

جان بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل نگار بھی
 طرفہ فوں سرشت ہے چشم گر شمع سنجار
 ترے مزہ بھی اشک سے حیب کا تار بھی
 لیتی ہے ایک نگاہ میں صبر بھی اور قرا بھی
 ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی
 عشوہ پُر فریب بھی، غمزہ سحر کار بھی
 دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہی گھلت میں

زلف کو بھی ہے دبدم عزم کند افگنی دام لئے ہے مستعد سروسہ تا بدار بھی

گئے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر

اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یاد بھی

ہم اطوارِ تاسف سے نہ کرتے آج جہاں کا ہی
خیال شوخی چشم اس کا اپنے دیدہ تر میں
ہم اس کو بادکش بھی جھل نہیں سکتے ہیں اس سے
نہ کر پہلو تہی اس کے جفا و جور سے اسے دل

بتوں کو دل دیا تھا تو نے اب دیں کو بھی دے بیٹھا

ارے کچھ تو خدا سے ڈر، نظیر اتنی بھی گمراہی

غفلت میں جو رہا وہ نہ بھولے تو کیا کرے
گل سے کوئی کئے کہ شگفتن سے باز آ
جو ناقبول شے کے بنا یا قبول کو
لڑکے کو دیں جو مہم میں مادر پدر سٹلا

فرہ جے کیا وہ نہ بھولے تو کیا کرے
اس کو تو بھولنا ہے نہ بھولے تو کیا کرے
پھر اس کو وہ بھلا نہ قبول کرے
لاچار پھر وہ اس میں نہ بھولے تو کیا کرے

جس فیلباں کو حکم ہو سدا کا نظیر

پھر وہ غریب ہاتھی نہ ہو لے تو کیا کرے

اس رشک مہ کے منہ پہ شکیں جو خال ہے
لے مردمان چشم تباں یہ وہ خال ہے
کیا دام زلف چاہئے جس جا پہ خال ہے
اس مہ جہیں کے گوشہ ابرو میں خال ہے

ایسا تو خال، خلق میں اب خال خال ہے
تم سب کے آج خال کو یہاں جائے حال ہے
دانا کے واسطے تو یہ دانہ ہی جال ہے
جیسا وہ نیچہ ہے یہ ویسا ہی ڈھال ہے

کھڑے پہ اس کے گرجہ بناوٹ کا خال ہے اصلی کو پر یہ حسن بنانا محال ہے
 جس منہ پہ جوشِ حُسن سے تل بھر بھی جانہ ہو وہاں تل بھی اُڑے تو یہ تل کا کمال ہے
 اس خال کے فراق میں اپنے جگر کا آج وہ حال ہے جو چاند کے سینے کا حال ہے
 خوبی میں اس کی چشمِ سلیمانی کہنے آہ نیل ہے یا کہ مردم چشمِ غزال ہے
 اب کس سے اس کے خال کو تشبیہ دیں نظیر کافر یہ رو سیہ تو کوئی بے مثال ہے

اب تو ہر لحظہ وہ بے درد تاتا ہے مجھے بے نہایت ستم و ظلم دکھاتا ہے مجھے
 جاگتا ہوں تو یہ کہتا ہے کہ جا سو بھی کہیں اور جو سوتا ہوں تو ٹھوکر سے جگاتا ہے مجھے
 جس طرح جلتی ہے فانوس میں شمعِ محفل اس طرح پردہ گہی پرے میں جلاتا ہے مجھے
 خوش نصیبی مری الفت کی تو دیکھو یارو یاد کرتا ہوں جسے میں وہ بھلاتا ہے مجھے
 شوق دیدار ہے یا جذبہٴ الفت ہے غرض کوئی تو ہے کہ جو کہنے لے جاتا ہے مجھے
 آج وہ خاک نشین ہوں میں کہ جو نقشِ قدم ہر کوئی پاؤں کی ٹھوکر سے مٹاتا ہے مجھے

عشق میں اس کے نہ مڑتا ہوں نہ جیتا ہوں نظیر

ایسی مشکل ہے کہ کچھ بن نہیں آتا ہے مجھے

یہ کس نے آج چمن میں قبا اتاری ہے کہ جس کی بوسے ہر ایک گلِ بیقرا رہی ہے
 تو وہ ہے گل کہ ہمیشہ قدم قدم پہ ترے چمن نے باغ میں سو سو بہار واری ہے
 تر اس حُسنِ زلیخا سے پوچھ آتا جان تو کیا کروں کہ وہ شریف لے نہ دھاری ہے
 نہ برق میں ہے نہ سیلاب میں نہ شعلے میں اکی دل کو کہاں کی یہ بیقرا رہی ہے

نظیر، ابروئے مژگاں کو اپنا دل دے ڈال

نہیں تو دم میں میاں پھر پھری کٹاری ہے
 لینے کو ہم آئے ہیں دل زار کسی سے
 کچھ اور نہیں محبت و تکرار کسی سے
 اب خیر اسی میں ہے کہ دے ڈالے دل
 ہوا خلش اب تک تو کئی بار کسی سے
 ہم نے تو کیا کچھ نہیں اتسار کسی سے
 بوسے بھی نہیں پائے ہیں دو جا کسی سے
 تو ہم بھی نہ ہوں دل کے طلبگار کسی سے
 یہ سن کے نظیر اس نے کہا سنتے ہو یا رد
 ہم کو تو عداوت نہیں زہار کسی سے

سو آپ میں اس مکر کو ہوں خوب سمجھتا

اس پر تو نہ بولے میری پیزار کسی سے

ان کو ادھر سے حن دکھانا گھڑی گھڑی
 دن رات اس کے بھر میں گھڑیاں کی طرح
 آتے ہیں اب تو پہر میں کچھ آٹھ سات بار
 آنا کبھی تو گھر میں یہ کہہ آنا بار بار
 اور آپ بھی جو جا رہے گھڑی بیٹھنا تو پھر
 گروصل کی ہو شب تو انھیں ہونا مضطرب
 القصہ وقت صبح تک ان کو تو روٹھنا
 اور ہم کو غش بہ غش ادھر آنا گھڑی گھڑی
 پڑتا ہے مجھ کو شور مچانا گھڑی گھڑی
 کیا جانے کیا کرے گا یہ آنا گھڑی گھڑی
 یعنی کہ مجھ کو وہاں سے بلانا گھڑی گھڑی
 کرنا ہر ایک طرح کا ہسانا گھڑی گھڑی
 کہہ جاؤں جاؤں مجھ کو کھانا گھڑی گھڑی
 اور ہم کو پاؤں پڑ کے منانا گھڑی گھڑی

جانی ہے قدر اس میں کچھ اچھا نہیں نظیر
 گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھڑی گھڑی

جلد اتنا نہ چل اوجلوہ دکھانے والے
 داسے غفلت بخشیں ہے فکر جرات درپیش
 ہم نقاہت زدہ پیچھے ترے آنے والے
 ہم انھیں سمجھیں مریم کے لگانے والے
 شرم سے ہم نہیں اب سر کو اٹھانے والے
 ہم ترے دام میں آکر نہیں جانے والے
 چین دینے کے نہیں رشک کے کھانے والے
 ہم تو جا بیٹھیں ابھی یار کے کوچے میں مگر
 دل نہ بے درد ہوتوں سے ہیں ہے خوف نظیر
 تو ہے کم زور وہ ہیں زور جتانے والے

کہہ کے اس قاتل نے آج ایک بات میرے سامنے
 شعلہ دل سے مرے پر روانہ کیا ہوگا دوچار
 دل کے دو ٹکڑے کئے ہمہات میرے سامنے
 شمع نے رُور و دیا تھا، رات میرے سامنے
 ہو گئی برسوں پر ہی بھی مات، میرے سامنے
 ہو چکی اس کی بھی تحقیقات میرے سامنے
 بزم میں کیا کیا پڑھیں آیات میرے سامنے
 کیا کروں منکر ہوا بد ذات میرے سامنے
 کہہ کے اس قاتل نے آج ایک بات میرے سامنے
 شعلہ دل سے مرے پر روانہ کیا ہوگا دوچار
 کیا کوئی اُس شعلہ رو سے ہو مقابلِ حُسن میں
 نقطہ سخن اس کے رُخ کا ایک کتاب حُسن ہے
 اس کی ابرو کی صفت میں ہر کہاں ابرو نگہ رات
 میں تو اس غماز کو کیا کیا سزا دیتا مگر

پھر جلا تو آج اس جھپیل کے کوچے میں نظیر
 کل تو تو آیا تھا لکھ کر لات میرے سامنے

گئی فلک تیں پر اس کے دل میں راہ نہ کی
 جگر کو دیکھئے میرے کہ یوں ہوا ہوں قتل
 ہماری آہ نے پیدا یہ دست گاہ نہ کی
 سپر تو کیا ہے کہ ہاتھوں تلک پناہ نہ کی
 کہ جان آنکھوں میں آگئی پر آہ نہ کی
 ہماری شام کبھی تم نے صبح نگاہ نہ کی
 کہا میں یار سے ایک دن کہ لے مہ تاباں

نہ ہم سے پیار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص
یہ سن کے مجھ سے کہا یہاں بھی کچھ اجارہ ہے
جو سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی
نہ کی تو چل بے نہ کی، واہ خواہ خواہ نہ کی

میاں نظیر ہمیں چاہتے رہے سب کو
ہزار حیف کسی نے ہماری چاہ نہ کی

غنجہ لب، مہر جبین، عارض گلغام پری
کیوں نہ جھکیں طرب و عیش کہ جس بزم میں ہوں
وہ پری رو جہاں آوے تو ہو وہاں کی یاد
یوں مے سینے پہ سوتا ہے شب و صبح میں
اس کے ٹکڑے کی جھک بھی وہی کرتی ہے جو
میں نے پوچھا کہ ہے کیا نام تمہارا کہنے
گلشنِ حسن ہے اب ہ گل اندام پری
مے دینا پری ساتی پری اور جام پری
دن پری، رات پری، صبح پری، شام پری
جس طرح اپنے پلنگ پر کرے آرام پری
کرتی ہے حُسن کی دکھلا کے جھک کام پری
بولی کیا تو نہیں واقف ہے مر نام پری

جس گل اندام کو اپنا دیا دل تو نے نظیر
حسن میں نام خدا ہے وہ دل آرام پری

ہو جو دو چار صبح اس عارض برق تاب سے
چھپتے ہیں یوں پری رُخاں اس رخ مہر تاب سے
گھر سے گئی اس گئے ہمسری کیونکہ ہوا ہوتا ہے
دل کو اسیر کر لیا زلف کے تیج و تاب سے
چہرے پر اپنے تم نقاب کھینچو ہو کیوں حجاب سے
اس کا وہ رو مہر و شجکتے ہے یوں نقاب سے
سویا ہے وہ ابھی نسیم لگیو نہ اس کے تن سے تو
نخلیں تارے رشک کے دیدہ آفتاب سے
جیسے تارے صبح کو چھپتے ہیں آفتاب سے
باتیں کرے ہے اب توصاف بڑھ کے وہ آفتاب سے
آنکھوں کی میند لے گیا نرگس نیم خواب سے
یہ تو بھوکا اب نہیں وہ کہ چھپے نقاب سے
جیسے شعلہ آفتاب پھوٹے نرگس خواب سے
اور جو لگی تو وہ ابھی چونک پڑے گا خواب سے

زلفیں جو کھولیں آپ نے سنبل تر کا برم ہے
اس کا وہ قد ہے جلوہ گردیدہ تر سے یوں کی
اپنا کتابی رُخ جویوں پھیر دھوہم سے دم بدم
چھوڑ کے مجھ کو نیم جاں اب تو چلے ہو تم مگر
سخت عذاب تھا ہمیں آپ سے دل کی کیا کہیں
کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے لے نظیر
ہم کو تو آج کھل گیا عقدہ یہ ایک خاب سے

آیا نہیں جو کر اتر رہتے ہنستے
اتنا نہ ہنس دل اس سے ایسا نہ ہو کہ چل
لے کر صریح دل کو وہ گل عذار یا زو
ہنس ہنس کے چھیڑ اس کو زہا تو نہ آو
ہنسنے کی آن دکھلا، لیتا ہے دل کو گل بو
جھنجھلا کے حال دل کا کہنا نہیں روا ہے
دستا سرخ سج کر طرہ زری کار کھو کر
آنکھیں لڑا کے اُس نے ہنس کر نگہ کی لپی

آیا ہے دیکھنے کو تیرے نظیر اے گل
دکھلا دے ٹمک تو اس کو دیدار ہنستے ہنستے

لگایا دام زلفوں کی شکن نے بیج نے بل نے
مراد دل دیکھتے ہی اس صنم کو ہو گیا شاد دل
بنایا یان نے رنگ اور سنبھالا سحر کا جل نے
نگاہیں دم بہ دم عیش و عشرت سے لگیں پلنے

کبھی خوش ہو کے ہوں ہو کی، کبھی بولا ابا ہا ہا
 نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری
 مجھے کرجل سے غافل، بھولی صورت کا بنا تھا
 اب اس ظالم کے ہاتھوں سے بچاؤں کیوں کر لایا جی
 چلا ڈرتا جو آگے کو تو وہ پھر ہنس کے یوں بولا
 ادب سے یوں کہا ”اب تو ہونی تقصیر یہ مجھ سے
 لگے غم نے لگانے تیرا دھر دکھا کے سو بھرتی
 ادھر آنکھوں کے جادو نے بنایا بولا کیا کیا

عجب لے لے مرنے اس وقت نظاروں کی انگلیں
 مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے
 کیا ایک بار منہ غصے سے سرخ عیاں چلنے
 اٹھا کر جھٹ قدموں سے لگا گھر کی طرف چلنے
 ”اڑا کر مفت نظارے بچا“ اب تم لگے چلنے
 لگے قطرے پسینے کے مرنے سے وہیں ڈھلنے
 ادھر سے تیج ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے
 ادھر کہیں بھرتیاں کیا کیا لگا ہوں کی بھی چلنے

دکھا کر مجھ کو اپنی واں زبردستی کے یہ نقشے

وہیں دل لے لیا جھٹ پٹ نظیر اس شیخ خجل نے

ہم تو عاشق ہیں ترے ناز اٹھانے والے
 بند کر قید محبت میں خبر میری نہ لی
 کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں
 کل جو رستے میں ملاقات ہوئی تو یہ کہہ
 گزری مدت کہ مرے ساتھ لیٹے نہیں آئے
 یوں تو اوقات گزرتی ہے مرنے داری میں

تم سے کم دیکھتے نہیں محبوب تانے والے
 دام میں جس کے پھنسنے دام بھڑانے والے
 آج کیا مر گئے گھڑیاں بجانے والے
 کہاں جاتے ہو طرح دار جلانے والے
 کیا ہوئے یارو گلے ہم کو لگانے والے
 نہ ملے چین مرنے دار دکھانے والے

اب کے ملنا ہو نظیر اس سے تو کہنا جا کے

کیا ملیں ہم نہ رہے یار بلانے والے

کسی کی چین نہ لی ہم نے چاہ کی گھڑی
 نظر پڑی نہیں ہرگز نباہ کی گھڑی

پس از وفات نہ آئے ہماری تربت پر
 مرثہ سے اس کی پڑا ہے مقابلہ یارب
 تمہارے طرہ رہزن نے پھین لی سرشام
 حضور میں تری رحمت کے جھک نہیں سکتا
 رکھے ہے کون، جنون، وادی محبت میں
 بہم ہوا تھا جو کچھ یاں طواف کعبہ سے
 کوئی تو غرق ہے بحر فراق کا یاں شورش
 اُبھار سینے پہ اس کے گچوں کا ہے بائے
 پڑا ہے ناز و ادا کا، بہم جو یہ لشکر
 بجائے سبزہ رکھی لاکے کاہ کی گٹھری
 ادھر یہ دل ہے، ادھر ہے پیاہ کی گٹھری
 متاع صبر، اسی داد خواہ کی گٹھری
 کہ سر پہ ہے مرے بارگناہ کی گٹھری
 بغیر آبلہ پا زادِ راہ کی گٹھری
 کرشمے نے وہ بتوں کے، تباہ کی گٹھری
 نہیں جاب یہ ہے سوز و آہ کی گٹھری
 یہ شاہِ جن کے ہے خیمہ گاہ کی گٹھری
 بجائے گر گئیں گردِ سپاہ کی گٹھری

زمینِ نظیر، نہیں گرم، اس میں ہے کیا خاک
 مگر بہ زورِ طبیعت، نساہ کی گٹھری

دیر سے آج جو نکلے بت ذی شان کئی
 اتنا رو یا ہوں کہ اب نخت جگر کے یارو
 اب تو ٹک منہ کو دکھایا کہ زنگ بن کر
 اس کے دامن سے لگوں پاؤں پڑوں تھ چلوں
 آخر کیا ہے تو گلشن میں بھی ٹک اب تو چل
 پاں کھا کھانہ نہیں اس درجہ تو لے دشمن جان
 نظر آتے ہیں مجھے اس کی گلی میں دن رات
 جان کر گور غریباں میں قیامت نہ نجا
 لے گئے صبر کئی، دین کئی، ایمان کئی
 ڈھیر ہیں چشم سے لے تا سر دامن کئی
 نکلے ہیں خاکِ چمن سے ترے حیران کئی
 خاک ہوں تو بھی مردل میں ہیں اراں کئی
 یاں بھی رہتے ہیں ترے جاکِ گربان کئی
 ابھی بھر جائیں گے خون میں، دودن کئی
 ٹکڑے ٹکڑے کئی، بسمل کئی، بے جان کئی
 ابھی سوتے ہیں ترے بے سرو سامان کئی

بادشاہ کو نہ لکھا تو کبھی جن نے نظیر
 اُس شہِ حق کے آئے مجھے فرمان کئی
 کب آہ وہ کر سکتے ہیں دل کی تپشوں سے
 ہو چرب زباں سے نہ پری رویوں کی تحیر
 یہ لوگ جو ملتے ہیں تو دل کی کششوں سے
 ہے آج تو خوش پر نہیں بلبل کو یہ معلوم
 کل سر کو پٹکانا ہے چمن کی روشنیوں سے
 خواباں تو چلے ہم سے چلن ناز کے لیکن
 چھوڑا ہے انھیں ہم نے بھی کن کن دمنوں سے
 مدت میں نظیر اس نے کیا دل کے تئیں قتل
 صد شکر کہ ہم آج چھٹے سب خلشوں سے

نہ آیا آج بھی سب کھیل اپنا مٹی ہے
 تمام رات یہ سراور پلنگ کی پٹی ہے
 جس پہ قہر نہ تنہا سیاہ پٹی ہے
 ہوؤں کی تیج بھی کافر بڑی ہی کٹی ہے
 بھبکتی نکلیں ہیں اشکوں کی شیشیاں یارو
 ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹی ہے
 گلے لگائے منہ چومے سدا رکھئے
 ہمارے دل میں بھی کیا کیا ہوس اٹھی ہے

کوئی حجاب نہیں تجھ میں اور صنم میں نظیر
 ۹۰۵ ل مگر تو اب ہی پردہ ہے، آپ ہی ٹٹی ہے

وہ جب گھر سے نکلے لچکتے لچکتے
 قدم بھی اٹھائے جھجکتے جھجکتے
 نہ مانا کبھی دل نے کہنا ہمارا
 نہایت اہم عاجز ہوئے بکتے بکتے
 نہ آیا ادھر کر کے وعدہ وہ اور ہم
 گئے جی میں کھبرا، ادھر تکتے تکتے
 نظیر اُس کی محفل میں جب دور بیٹھا
 ہوا جب وہ ناخوش جھڑکتے جھڑکتے
 بٹھایا تو دور اُس نے پر اپنے ڈھب سے
 وہ پھرواں ہیں پنچا، سرکتے سرکتے

عشق پھر رنگ وہ لایا ہے کہ جی جانے ہے
 ناز اٹھانے میں جھائیں تو اٹھائیں لیکن
 زخم اُس تیغ نگہ کا مرے دل نے نہیں نہیں
 اُس کی دزدیدہ نگہ نے مرے دل میں چھپے
 بام پر چڑھ کے نمائے کوہیں حُسن اپنا
 اُس کی رقت میں ہیں جرخ ستم گارنے آہ
 حکم چنپی کا ہوا شب کو، سحر تک ہم نے
 پاکے سہلانے میں گواہ گئے سچک سچک

رنج ملنے کے بہت دل نے سے لیک نظیر

یا ربھی ایسا ملایا ہے کہ جی جانے ہے

ہم اشک غم ہیں اگر قہم رہے رہے نہ رہے
 رہیں وہ شخص جو بزم جہاں کی رونق ہیں
 تجھے ہے نزع وہ آتا ہے دیکھنے اب آہ
 بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چسراغ مزار
 ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیاہ
 یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے
 تمہارے غم میں غرض ہم تو دے چکے ہیں جی
 یہی سمجھ لو ہیں تم کہ ایک مساف ہیں
 نظیر آج ہی چل کر بتوں سے مل لیجئے

مژہ پہ آن کے ٹلک جم رہے رہے نہ رہے
 ہماری کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے
 کہ اس کے آنے تلک دم رہے رہے نہ رہے
 ہوا کے بیج کوئی دم رہے رہے نہ رہے
 مثال قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے
 کہ کل یہ دیدہ پر غم رہے رہے نہ رہے
 بلا سے تم کو بھی اب غم رہے رہے نہ رہے
 جو چلتے چلتے کہیں تم رہے رہے نہ رہے
 پھر اشتیاق کا عالم رہے رہے نہ رہے

تب سے حق کیا کہ قدقہ کی سی کچھ آواز ہے
اس دھوئیں والا نسب کی عرش تک پرواز ہے
گر گڑ گڑی پیٹنے میں کافر اور ہی انداز ہے
جتنا تیری گڑ گڑی کو ڈیڑھ خم پر ناز ہے
دل جلانے کو تو ابھی عاشق جا نواز ہے
منہ سے لگنے میں تو اب منہال بھی متناز ہے
دیکھ تمباکو کو کیا کیا سوز ہے اور ساز ہے
اے پری رو تیرے دم میں یہ کچھ غماز ہے
اومیاں تھے عجب پیاری تری آواز ہے
تو تو پریوں کے لبوں کا ہمد و ہمزاز ہے
گر گڑ گڑی تیری بھی سادی، اے پری طناز ہے
ہم کو کیا کیا گڑ گڑی اور پیچاں پر ناز ہے

جب سے حق تجھ لب جاں بخش کا ہم راز ہے
یہ جو اڑتا ہے دھواں اب تیرے منہ سے آپری
پیچاں پیٹنے میں کس کس آن کا کھلتا ہے تیج
پیچاں کو اپنے پیچوں پر نہیں اتنا غور

آب نے حقے توے نیچے کو یہ رتبہ کہاں
گر تجھے ہوا ہے گل لے دل تو جل اور دم نہ مار
گل کیا دم بھر میں تمباکو جلا کر آگ میں
ہے کہاں تک بول اٹھ جلدی خدا کے واسطے
کیوں نہ تجھ کو منہ لگا دیں خلق میں شاہ و گدا
پیچاں پر تیج کھاتی ہے پڑی حوروں کی زلف
ہم دم ایک دمڑی کی حقیا کو رہے عاجز سدا

غور کر دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہے اے نظیر
باب نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیرا انداز ہے

اے مرے بیدار گریبا دتیرے ہاتھ سے
پھر وہی رشک اس کو آیا دتیرے ہاتھ سے
اپنے چہرے پر ہوا یہ صا دتیرے ہاتھ سے
یہ نیا نشتر ہوا ایجا دتیرے ہاتھ سے
ہاتھ ملتے ہیں غرض صیا دتیرے ہاتھ سے

کچھ نہ دیکھا ہم نے جو بیدار دتیرے ہاتھ سے
پنچہ خورشید بھولا تھا یہ بیضا کا رشک
نہ ختم کھایا ہم نے منہ پر جب تو قاتل نے کہا
کھولی ناخن سے رگیاں تو نے لے فقدا دیا
صید کیا تو نے تو مارا دل پہ صیادوں کے ہاتھ

ہاتھ ٹوٹیں تیرے گل چین نے کیوں لٹوئے گل
حیف کیا گلشن ہوا بر باد تیرے ہاتھ سے
تو نے جنگل سے نہ چھوڑا بار کا دامن نظیر
ہم ہوئے دل میں نہایت شاد تیرے ہاتھ سے

زلزل ہو بر سر احسان تو گرفتار کرے
چشم کی عین غنایت ہو تو بیمار کرے
تیغ ابرو کی نوازش ہو تو ہو زخم حصول
شور لب زخم کو چاہے تو نمک زار کرے
بکا راقاصد اشک آن فوج غم کے ہاتھوں سے
ہوا تاراج پہلے شہر جان دل کا نگر تیغ
سنوین خون کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں درباری
جلے آتے ہیں اٹھتے بیٹھتے جگر تیغ
ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی جیسے
دہ کمر اور وہ دہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے
بے زری، فاقہ کشی، مفلسی، بے اسبابی
ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے
میں دست و گریباں ہوں م بارہا پس سے
ہمدم اسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے
سچی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہو

✓ مری اس چشم تر سے ابر باراں کو ہے کیا سبت
✓ گئی گزری اپنی وہے کشی لگی آگ جب سے فراق کی
✓ مزا ہے جو محبوب کی ٹھوکرہ نظیر
✓ کہ وہ دریا کا پانی اور یہ خون دل ہے برساتی
✓ یہ جلتے ہے دل سو کباب ہے یہ سرشک چشم شراب ہے
✓ پھر اس کو کبھی اور کوئی لت نہیں ہوتی
✓ ہو سکے غفا اور یوری چڑھا کر بولی میں اپنی کہا نظیر
✓ باتیں ہمارے دل کی کہہ دیں نظیر اس نے
✓ بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیر
✓ کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھئے
✓ کہ اپن نے جد گھالی تھی انہیں بن ٹھن، اوہو کا بن چھپے
✓ ہے سچ تو یوں کہ دل کو ہوتی ہے راہ دل سے

ازلی الازلی
غائب

مسلسل غریبیں

(۲)

ہو کیوں نہ ترسے کام میں حیران تماشا
لے عرش سے تافرش نئے رنگ نئے ڈھنگ
افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات
خات پری، دیو، ملک، حور بھی نادر
جب حسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر آہ
چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں
گر عشق کے کوہے میں گزرے تو داں بھی
منہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، الم ناک
یارب تری قدرت کا ہے ہر آن تماشا
ہر شکل عجائب ہے ہر ایک شان تماشا
اور روئے زمین پر گل دریچان تماشا
انسان عجب بہ ہیں تو حیوان تماشا
کیا کیا نظر آتا ہے ہر اک آن تماشا
رکھتی ہے کمبخت زلف پریشان تماشا
ہر وقت نئی سیر ہے، ہر آن تماشا
غل شور تیش ناکہ و افغان تماشا

ہم پست نگاہوں کی نظریں تو نظیر آہ
سب ارض و سما کی ہے گلستان تماشا

کہ خوراس کے جن رخ کو لگا تکتے ذرہ آسا
نظر آفت لادیں مژہ صد مضرت افزا
غرض اس طرح کا عالم کہ پری کے اہا ہا
جو چلی ہو یوں جھک کر کو عزم ہے کہ ہر کا
کہا سن کے یہ ارے میاں کوئی تم بھی ہوتا شا
جو یہ ہے اسی کی مرضی تو ہے سوچ چھو یہ کیسا

کہا جب نظیر ہم نے یہی دل میں ہم تو لہتے
تو کہا جو نیکی ہووے تو پھر اس کا پوچھنا کیا

یا ظلم سے دی ہجرتی آفات تو پھر کیا
قصوں میں رہے حروف نکایات تو پھر کیا
گروہ بھی میسر ہوا ہی بات تو پھر کیا
کی ناز و دادوں کی اشارات تو پھر کیا
لے شرق سے تا غرب لگا ہات تو پھر کیا
گر قبر تک اپنے چلا سات تو پھر کیا
دودن کی ہوئی کشف و کرامات تو پھر کیا
مرمر کے جو کی کوشش طاعات تو پھر کیا
رندوں میں ہوئے اہل خرابات تو پھر کیا
گر یہ بھی ہوئی ہم میں کرامات تو پھر کیا
تسخیر کیا عالم جنسات تو پھر کیا

سحر اس جھک سے آیا نظر اک نگار رعنا
خود خال خوبی آگیں لب اعلیٰ پان رنگین
کھلی بُرخ نہ زلف پر خم سی رشک رنگِ سلیم
کہا ہم نے لے سن بر روی چہرہ مہر پیکر
ہے جو قصد سیرت باں چلیں تم بھی کھ آجاں
نہ کچھ آشنائی اگلی نہ شناخت اک دودن کی

کی وصل میں دلبر نے عنایات تو پھر کیا
جب آئی اجل بھر کوئی ڈھونڈا بھی نہ پایا
حدبوس و کنار اور جو تھا اس کے سوا آہ
دودن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں مری جاں
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حسرت سب شان
اسپ و شتر و فیل و خر و نوت و لشکر
آخر کو جو دیکھا تو ہوئے خاک کی ڈھیری
جب آئی اجل ایک ریاضت نہ گئی پیش
جب آئی اجل پھر وہیں اٹھ بھاگے نشتابی
جب آئی اجل آہ تو اک دم میں گئے مر
دودن کو جو تو یہ فیتے و عمل سے

اس عمر دوروزہ میں اگر ہو کے نجومی سب چھان لئے ارض و سماوات تو پھر کیا
 اک دم میں ہوا ہو گئے سب علی و نظری تھے باد جو اسباب و علامات تو پھر کیا
 اس نے کوئی دم بیٹھ کے آرام سے کھایا وہ مانگتا در در پھر خیرات تو پھر کیا
 دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز نظم آہ
 بالفرض ہوئی اس سے ملاقات تو پھر کیا

سحر آیا جو نہی میں کلمہ احزاں میں بجا را وہیں اک بارگی جوش جنوں نے دل کو لگا را
 پڑا ہے کیا فسرہ مثل برف لے شعلہ آتش بہار آئی، دکھا اگر تجھ میں ہے کچھ قوت ویا را
 اڑا کر گرد و تل کر خاک، نکھلا گھر سے پھر باہر پڑھایہ بند اور ہو کر کے نالہ آہ کا مارا
 ہجوم محشر م، ہنگامہ ام، دیوانہ ام ستم نہ از پامی شناسم سر، نمی دانم ز سر پارا
 قصا نے لا وہین اک اس قدر زنجیر ہستانی کہ جس کے غل کا پہنچا عرش کے کاؤں میں جھکا را
 کھٹکتی دو رتک جاتی تھی اس شرف و خفا سے وہ مگر گرجا زمین کے رعد کی نوبت کا نقشا را

نظیر آیا جو نہی پھر ہوش میں تو کہہ کے یہ بولا
 کہ آخر ہر کمالے را زوالے می شود مارا

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حسن والا جھمک وہ کھڑے کی اس صنم کے کہ جیسے سورج کا ہوا جالا
 وہ زلفیں اس کی سیاہ پر خم کر ان کے بل اور شکن کو یا را نہ پھونچے سنبل نہ پہنچے ریاں نہ پہنچے ناگن نہ پہنچے کالا
 ادائیں بانگی عجب طرح کی وہ تر جھی جتوں بھی کچھ تماشا بھویں وہ جیسے پھنچی گائیں ملک سناں کش نگاہ بھالا
 وہ آنکھیں مست اور گلابی اس کی کہ ان کو دیکھے تو دیکھتے ہی مے نجات کا اس کی دل کو ہو گیا ہی گہرا نشہ دوبا لا
 بولیا یہ سرخی وہ بان کی کچھ کہ لعل بھی منفعل ہو جس سے وہ آن پہننے کی بھی پھر ایسی کہ جس کا عالم ہی کچھ نرالا
 وہ جاہ زری وہ دل فریبی وہ سج سج اس کی وہ قد زریا کہ دیکھ جس پر فدا ہوں فل سے وہ جن کو کہتے ہیں سر دبالا

اد ادا نے ادھر دلوچا، پلک پلک نے ادھر اچھا لا
 پڑا تڑپتا میں رہ گیا واں، زباں پہ آہ اور لبوں پہ نا لا
 نہ مجھ سے بولا، نہ کی اشارت نہ دی تسلی نہ کچھ سنبھالا
 بہ یاد سرو تو بے قرارم، نہال عشقت شدہ است بالا
 کثیر حزن نامع الہوم، تقیل ہجر زو کا کجا لا
 سدا لے میوں نے اپنے گھر وچ نہیں تو اٹھے اساد آ
 دلا سے سدا رانو ٹھے ابرن، پٹیلے موہن، انو کھے لا
 پھرتیں اگر کھربو ہماں کی پلک کٹا راجو تھان نے کھالا
 تو ہے جو نیاں نے نوبا جھکو نہ چھینوں تنکو نہو اد کھالا
 دوانی گیتی تمن ہر کج نہ سدھ کی گڑ بڑ نہ بدہ کی چھالا
 بنا کے سج دوج، پھر کے دامن، لگا کے ٹھوکر ہلا کے بالا
 اس کو دل کہتے ہیں بس لیتے ہی چرچا ہوگا
 ہم کو ہر لحظہ ادھر ذوق تماشا ہوگا
 تم سے بھی ضبط تبسم نہ پھر اصلا ہوگا
 چاہ غنجہ ز سر بستہ وہیں وا ہوگا
 متن اس کا بھی جو زلفوں میں مخشا ہوگا
 تاڑنے والوں میں شور اس کا بھی رہا ہوگا
 ہم سے دل لے لیا اور ہنس کے کہا کیا ہوگا
 حرف عتاب یا سخن دل کشا ہوگا

نکہ لڑائی ہے اس نے جن دم جھٹک لیا بھپے دل کو میر
 جو لے لیا دل کو میر یار، تو اس نے لی راہ اپنے گھر کی
 بہت یہ میں نے تو چاہا بوجھوں میں نام اس کے ولے وہ گل رو
 پری رخ من منکر لب من، دے تو باز، بہ پیش چشم
 فدا دجھک غشی نہر قادموع نہرا ومن نہر افکا
 سا دے سننے توں، دل ہے بیکل یہی وہ کلاں نہا کھدا
 ہماری آساگی ہے نہ ن تمہارے درشن کو ترسین نیاں
 اپن کے من کو جو چھینوں تھی ابار کا یں سگانی کا اتنی
 اگر برت ہے بیامیں جو کہ برہ میں تیرے لے من موہنوا
 جگت سیما امت ہر حکم اٹک گیسو، من کرن کھا
 کبھی تو ہنس کر تاب آجا، نظیر کی بھی طرف ٹک اکجان
 دل نہ لودل کا یہ لینا ہے نہ اخفا ہوگا
 تم کو ہر آن ادھر ہو دے گی حسن آرا بی
 ہم بھی سوچا ہ سے دیکھیں گے تمہاری جا
 جب تمھیں دیکھیں گے اور تم تبسم ہو گے
 گفتگو ہو دے گی باہم جو اشارتوں میں
 پاؤں تک ہاتھ جو لادیں گے کسی عذر سے ہم
 جب یہ تقریبی اس گل خداں نے نظیر
 قاصد صنم نے خط کو مرے دیکھ کیا کسا

تجھ کو قسم ہے کیونکہ پوشیدہ تجھ سے تو
 قاصد نے کب توں کے کہا کیا کہوں میں یا
 پھر تجھ کو سو عتاب سے جھنجھلا کے دم دم
 اس کا مزہ چکھاؤں گا جا کر اسے شتاب
 میری تو کچھ خطا نہیں تو ہی سمجھ اسے
 کہتا تھا میں تجھے کہ نہ بھیج اس کو خط میاں
 رخ و جبین و مژدہ و حشیم و ابرو کو
 شان و دل البتہ دندان کو روئے فکر سے
 ذوق کو جاہ زرخداں کو گوش و گردن کو
 کف خانی و انگشت و ساعد و قد کو
 نہ ٹوک دو دستوں کی ہمار نام خدا
 یہ وہ صنم ہے پیرو کہ جس پہ ہوتی تھیں
 اسی صنم کی نگاہوں کی برچھیاں یا رو
 اسی کے نشتر مڑگاں میں اب وہ تیزی ہے
 اسی صنم کے رخ و زلف کے تصور میں
 گلی میں کو جھو بازار میں ہم اب دن رات
 اسی کے سر کی قسم ہے کہ ہم تو مرجاتے
 بنے ہیں یہاں جو کئی دیر اور صنم خانے
 اٹھا کے سینہ جھٹک بازو اور بنا کر دھج

کیو وہی جو اس نے مجھے بر ملا کہا
 پہلے مجھی کو اس نے بہت ناسزا کہا
 کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کیا کہا
 رہ رہ اسی سخن کے تئیں بارہا کہا
 بے جا کہا یہ اس نے مجھے یا بجا کہا
 لیکن نظیر تو نے نہ مانا مرا کہا
 شان و ہر دم و زکس و ہلال لکھا
 عقیق و سیم و ڈور و نگ کے مثال لکھا
 صراحی و سب و گل و چشمہ زلال لکھا
 شان و برگ گل و غنچہ و نہال لکھا
 یہی اب ایک ہے یہاں گلخدا نام خدا
 ہزار جان سے پراں نثار نام خدا
 ہوئی ہیں میرے کلیجے کے پار نام خدا
 کہ جس سے ہوتے ہیں ہم دل و نگار نام خدا
 ہماری گزرے ہے لیل و نہار نام خدا
 اسی کے واسطے پھرتے ہیں خوار نام خدا
 اگر نہ ہوتا یہ گل و رنگار نام خدا
 اُدھر جو ہوتا ہے اس کا گزار نام خدا
 چلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خدا

قدم قدم پر پہن کہیں ہیں بسم اللہ صنم بھی کہتے ہیں سب بار بار نام خدا
 غرض جدھر کو نکلتا ہے یہ تو ہر اک کے زباں سے نکلے ہے بے اختیار نام خدا
 نظیر ایک غزل اور کہہ کہ تیرے سخن
 ہیں اب تو سب گھر آبدار نام خدا

نہ پئے کیونکہ وہ بچوں کے بار نام خدا ابھی تو اس کی نئی ہے ہزار نام خدا
 جو مجھ سے پوچھے ہے ہنس کر کہ میں بری ہوں کیا تو میں یہ کہتا ہوں ہاں میری بار نام خدا
 نشے کی اب تلک آنکھوں میں کچھ نہ تھی مستی پر اب کچھ آتا چلا ہے خسار نام خدا
 وہ دو بد و کی نگاہیں لڑا ناکیا جانے حیا سے ہے وہ ابھی شرم دار نام خدا
 ابھی تو اس کی بڑھائی ہیں ہنسیاں یارہ ابھی یہ آیا ہے چوٹی اتار نام خدا
 مجھی سے لینے کی دل کے ہوئی ہے بسم اللہ تجھی پر اس کا یہ پہلا ہے دار نام خدا
 ابھی تو آنکھ اٹھا کر مجھی کو دیکھا ہے ابھی تو مجھ سے ہی رکھتا ہے پیار نام خدا
 میں اپنی دیکھ کے ایڑی یہ بات کہتا ہوں نہ ہو گا ایسا کوئی وضع دار نام خدا
 کمر کو باندھ کے اپنی بری سے توسن پر جدھر کو نکلے گا ہو کر سوار نام خدا
 ادھر غرض کہ صفیں کی صفیں الٹ دے گا کرنے کا حشر سا ایک آشکار نام خدا

نظیر دیکھ اسے سب یہ مجھ سے کہتے ہیں

پری ہے یا تیرا یہ تو یار نام خدا

کل اس کے چہرے کو ہم نے جو آفتاب لکھا تو اس نے بڑھ کے وہ نامہ بہت عتاب لکھا
 جہیں کو مر جو لکھا تو کہا ہو جہیں بہ جہیں یہ کیسی اس کی سمجھ تھی جو ماہتاب لکھا
 چلتے ذاتوں کو گوہر لکھا تو ہنس کے کہا ستارے اڑ گئے تھے جو درخشاں آب لکھا

لکھا جو مشک خطا زلفت کو تو بل لکھا کر
گلاب عرق کو لکھا تو یہ بولانا کچھ
جگر بکاب لکھا اپنا تو کسا جل کر
حساب شوق کا دفتر لکھا تو جھجکا کر
جو بے حساب لکھا اشتیاق دل تو کسا
کہا خطا کی جو یہ حرف ناصواب لکھا
اسے نہ عطر میسر تھا جو گلاب لکھا
بھلا جی کیا میں شرابی تھا جو کباب لکھا
کہا میں کیا متصدی تھا جو حساب لکھا
وہ کس حساب میں ہے یہ بھی بے حساب لکھا

ہوئی جو رد و بدل ایسی کتنے بار نظیر
تو اس نے خط کا ہمارے نہ پھر جواب لکھا

نظر بڑا اک بہت پری و ش زلی سچ درج نئی ادا کا
جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
گلے پیٹنے میں یہ شبتانی بہ اضطرابی کہ مشن بجلی
یہ رنج و حشت یہ دور کھینچنا یہ ننگ عاشق کے دیکھنے کا
نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے نہ وہ منایا نے کسی سے
یہ چھلا ہٹ یہ اچھلا ہٹ خبر نہ سر کی نہ تن کی سد بدہ
یہ راہ چلنے میں اچھلا ہٹ کہ دل کہیں نظر کہیں ہے
لڑادی آنکھیں یہ بے حجابی کہ کھر لکے ملک نہ ماری
جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سننے تو میٹھی میٹھی

نظیر چھپ جا کہیں سرک جا بادل کی صورت چھپا لے منہ کو

جو دیکھ پاتا ہے وہ کسٹم گزرتا رہتا ہے ابھی بھڑکا

وہ رشک جو ہو وقت سحر بے نقاب تھا
دیکھ اس کے رخ کو رو بہ زریں آفتاب تھا

اک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر قطعہ زہرہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
یعنی وہ کیا زمانہ عشرت تھا اسے نظیر جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و ضعیف و نحیف ہوں نقش طلسم کوئی یا حساب تھا
اک جنبش مرثہ میں وہ برہم ہوا طلسم کیا کہنے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دم ہر دیوں کہا جس میں نے طرب سے تو مست و خراب تھا
ہیہات کیا باتیں ہم اُس عصر خوش کا نام اے غفلت اتماد ہی عہد شباب تھا
تھی باغ زندگی کی اسی سے ہی آب و رنگ دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا

ابنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز
مجموعہ حیات کا لب لباب تھا

ہر ایک گھاٹ پہ ہے اب رواج پریوں کا عجب نہان ہے دریا پہ آج پریوں کا
جو خوب ہیں ہم ان کے حکیم ہیں یارو کیا ہے ہم نے ہمیشہ علاج پریوں کا
جدھر کو دیکھے پریاں تمنا کم پھرتی ہیں ہوا جہان میں کیا یارو راج پریوں کا
نہ بیٹھے دل کا کبوتر کسی کے دانے پر ہمیشہ اس نے تو کھایا ہے نالج پریوں کا
ٹی کل ایک جو زندگی سیاہ بد صورت چار دیکھ کر ہے جس کو لاج پریوں کا
کسا نظیر تو ہم پاس کیوں نہیں آتا کہ ہم نے حسن میں پایا ہے تاج پریوں کا
ہم آج وہ ہیں پری زاد گل بدن گل بدو کہ ہم کو حسن میں آیا خسراج پریوں کا

یہ سن کے میں نے کہا بی یہ وہ مثل ہے آج
کہ ہو چٹیل کی صورت مزاج پریوں کا

جن دنوں حسن بتاں کے دل نے نظر تھا سو بہ سو ہر دم دواں اور کو بہ کو آورہ تھا

برج طفلی بل میں ملے کر آگیا پیری میں حیف
جب تلک خونِ تھارگوں میں گردش تھے خونخوار بھی
ہمد م اپنی عمر کا خستہ عجب سیارہ تھا
کس سبب مریوط اس سے اپنا جی ہموارہ تھا

ساتی بہارا آئی اور جوش بہے گلوں کا
دل لے کے تو بھی ظالم ملتا نہیں خوشی سے
لا جام بھر کے سن لیں ملکِ شورِ لبوں کا
شکوہ کروں میں کیا کیا اس کے تنافلوں کا
کل تو نظیر کیا کیا سیریں ہوئیں چمن میں
باران میں مے کشی کی ٹہریں عجب بہاریں
اس میں وہ شوخ گلِ رومنے پاس میرے لاکر
منہ دیکھ دیکھ اس کا میں نے کہا کہ پیاری
رخسار کا تو بوسہ زینہار میں نہ لوں گا
ایسا ہی گرہے دینا تو دیکھے لبوں سے

جب تو وہ شوخ ہنس کر بولایہ وہ مثل ہے

یعنی کہ گڑ تو کھا دیں پر ہمیںز گنگلوں کا

گلہ لکھوں میں اگر تیرے غم کے پھلوں کا
سے نامِ محبت کا تھر تھراتے ہیں
تو پھر نباہ نہ پھلوں کا اور نہ پھلوں کا
یہ کچھ تھاک ہے تیرے ستم کے دھلوں کا
مرا پڑے نہ اُسے کیونکہ آتشِ محلوں کا
طریق جیسے ہے عشرت کے اہل گھلوں کا
کچھا ہو فرش بھی دہاں باد سے رو پھلوں کا

گلہ لکھوں میں اگر تیرے غم کے پھلوں کا
سے نامِ محبت کا تھر تھراتے ہیں
جدھر کو دیکھے ادھر آپ ہی بھکتا ہے
کہا میں یار سے ایک دن کہ جی یہ چاہے ہے
مکان ہو ایک ٹھہر لوھرے ہوں شیشہ و جا

کھلی ہو چاندنی بھرے ہوں ٹھیکر پھولوں کے
یہ سن کے اس نے کہا یہ تو وہ مثل ہے نظیر
کہ سو دیں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا

ترسہ کچھ عاشقی میں نہ کم ہے فقیر کا
تکلیہ اسے نہ بھول کے کہنا کبھی میاں
رہتا ہے پھر وہ چھوٹا مثل سد اسھاگ
گھٹ جائیں جس کو دیکھ کے لاکھوں تری گھٹا
لکھتا ہے بن تراشے ہی حرفوں کے جوڑ توڑ
ظل ہما بھی وہاں سے سعادت کہے حصول
ہیں زیر سایہ اس کے ہزاروں گدا و شاہ
کیونکر لکھے نہ فقر کے شان و شکوہ کو

یار و نظیر پر بھی کرم ہے فقیر کا

عیسیٰ کے قلم سے حکم نہیں کم فقیر کا
خوبی بھری ہے جس میں دو عالم کی کوٹ کوٹ
سب جھوٹ ہے کہ تم کو ہمارا ہو غم میاں
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو ریلیوں جلتے جی
مر جائیں ہم تو یہ بھی خبر ہو نہ تم کو آہ
اب ہم پہ کیا گزرتی ہے اور کیا گزر گئی
جب بیٹے جی کسی نے نہ پوچھا تو مہربان
راہنی پکارتا ہے سد ادم فقیر کا
اللہ نے کیا ہے وہ عالم فقیر کا
بابا کے خدا کے سوا غم فقیر کا
اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا
کیا جانے کب جہاں سے گیا دم فقیر کا
کس سے کہیں وہ یار ہے محرم فقیر کا
پھر بعد مرگ کس کو رہا غم فقیر کا

دل کشائی بادہ نوشی، ذوقِ مستی خرمی پر خدا جانے یہ بیداری ہے لے دل یا کہ خواب
اس طرح کی عشرتوں میں اب تو بیٹھا ہے نظیر
پر خدا جانے یہ بیداری ہے لے دل یا کہ خواب

بزمِ طرب و وقتِ عیش ساقی و نقل و شراب
مجمعِ خواباں و لے از غم نہ چنگ و نے
صحنِ حین، حسنِ گل ابرو و ہوا شرابِ بل
عشرتِ صبح بہارِ سیرِ گل و لالہ زار
رقصِ بتِ غنچہ لب کثرتِ عیش و طرب
عشق کے بحرِ ویا ز حسن کے انداز و ناز
مستی میخانہ ہاگردش پیما نہ ہا
شادی و صلِ بتاں مہجبتِ مہِ طلقاں
غلغلِ کوس نشاطِ خوش دلی و انبساط
ثروت و مال و منالِ حشمتِ مجاہدِ جلال
قصہِ محلِ دل پریرِ زینت و زیب لے نظیر
کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب

یہ جواہرِ خانہ دنیا جو ہے با آب و تاب
وہ معنیِ قصرِ زکین و منتش ز رنگار
وہ مطلقاً شہِ نشین و نہ تپِ بام و دود
وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جلیں و نعین
اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب
جن کی رنگینی سے تھا قصرِ ارم کو تیج و تاب
وہ مرصعِ خواب کا ہیں بہرِ عیش و نہرِ خواب
ہنس کے طاقِ آسماں کو طاقِ ابرو و جواب

جن کے انہاروں میں جا آئے غل غل خالص گلاب
 کقباد و قیصر و کبیر و وافر اسباب
 مشتری ہمت تر یا بارگہ کیواں جناب
 وہ ششم وہ تنعم وہ تعیش وہ شباب
 جن کے عارض رنج ناہ و رشک رو آفتاب
 طنز و تعرض و کنایت غمزہ و ناز و عتاب
 متصل رقص و سرود و بے پے جام شراب
 ساغر و مینا گل و عطر و مے و نقل و کباب
 از زمیں تا آسمان شور نے و جنگ و ورباب
 وہ طرب وہ عیش کچھ جس کے نہیں حد و حساب
 کر دیا ایک کچھ اس دور فلک نے انقلاب
 رہ گئے عبرت زدہ وہ قصر ویران و خراب
 نقش سیم گور خریا کوئی کہنہ پر عتاب
 اور جو کوئی طاق ہے تو صورت چشم پر آب

خواب کہئے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال

کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

یہ بلغ و ہر غنیمت ہے دیکھ لو صاحب
 مباد پھر کف افسوس کو ملو صاحب
 تبدیل اس کا ہر ایک گل سے سوچ لو صاحب

صحی میں بستاں سہرا ایسے پر از غلمان و خور
 ان میں تھے وہ صاحب نے بت چھین لیتے تھے خلق
 مہر و شہر بہرام صولت بدر قدر و چرخ رخ
 وہ تجمل وہ تمول وہ تفوق وہ غرور
 ہر طرف فوج بتاں ہر سو ہجوم گل رخاں
 چشم کے آن و اشارات و داد و سہ کوشی
 صبح سے لے شام تک اتر شام سے لے تا صبح
 ساقی و مطرب، ندیم و مستی و میخوارگی
 کثرت اہل نشاط و جوش و نوشا نوش نے
 وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور
 یا تو وہ ہنگامہ تشیط تھا یا دفعشا
 جو وہ سب جاتے رہے دم میں جناب آساگر
 تھا جہاں وہ مجمع عالی و ہاں اب ہے تو کیا
 ہیں اگر دوخت باہم تو لب افسوس ہیں

خواب کہئے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال

کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

کہا یہ آج ہمیں فہم نے سنو صاحب
 جو رنگ بو کے اٹھانے ہیں حظ اٹھائیے
 یہ وہ چمن ہے نہیں ایک سے نہیں جس میں

کہ تھا صبح شگفتہ نہ تھا وہ شام کے وقت
پس اس مثال سے ظاہر ہے یہ سخن یعنی
جو شام تھا سو نہ دیکھا وہ صبح کو صاحب
اسی طریق سے عالم میں تم بھی ہو صاحب
جو سر نوشت ہے ہوگا اسی طرح سے نظیر
قضا قضا نہیں ہونے کی کچھ کرو صاحب

تری قدرت کی قدرت، کون پاسکتا ہے کیا قدرت
تو وہ یکتا ہے مطلق ہے کہ یکتائی میں اب تیری
زیریں آسمان تک تو نے جو جو رنگ لگے ہیں
ہزاروں گل، ہزاروں گلبدن تو نے بنا ڈالے
ہوئے ہیں نور سے جن کے زمین و آسمان پیدا
ہوا کے فرق پر کوئی بنا کر ابر کا خیمہ
جم و اسکندر و دارا و کیکاؤس و کخمر و
کیا عمرو دے گو کبر سے دعویٰ خدائی کا
نکا لائیر سے اک پٹے نے کفشین مار مغز اس کا
نکالے لکڑیوں سے تو نے جس جس لطف کے میوے
ترے ہی خوانِ نعمت سے سب کی پرورش، درخ
ہماری زندگانی کو بغیر از تیری قدرت کے
ترے حق تجلی کا، جہاں ذرہ جھمک جاوے
حرم عیسیٰ میں وہ تاثیر تھی تیری ہی قدرت کی
تو وہ محبوب پختل ہے کہ بار ناز کو تیرے

ترے آگے کوئی قادر کہا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی شرک و بی کا حرف لا سکتا ہے کیا قدرت
یہ رنگ آئینہ زیاں کوئی دکھا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی مٹی سے ایسے گل کھلا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی یہ چاندیہ سورج بنا سکتا ہے کیا قدرت
طناہیں تار باران کی لگا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی اس فصیحے دل بادل بنا سکتا ہے کیا قدرت
کعبہ اس کا یہ دعویٰ پیش جا سکتا ہے کیا قدرت
سو اتیرے خدا کوئی کہا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی پیڑوں میں یہ پیڑے لگا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی چیونٹی سے ہاتھی تک کہا سکتا ہے کیا قدرت
کوئی پانی کو پانی کر با سکتا ہے کیا قدرت
قیصر موسیٰ کوئی نواں تاب لا سکتا ہے کیا قدرت
وگرنہ کوئی عمرے کو جلا سکتا ہے کیا قدرت
بغیر از مصطفیٰ کوئی اٹھا سکتا ہے کیا قدرت

نظیر اب طبع پر جب تک نہ فیضان الہی ہو
کوئی یہ لفظ یہ مضمون بنا سکتا ہے کیا قدرت

دیر پہلے ہیں دل اپنے کے ادھر عشوہ گرے چند
کیا کیا گس عقل کے باندھیں ہیں پرواں
مہرنگان تر و سر و دم و رنگ شکستہ
ایک دن یہ ہوا عزم کہ با صد طرب و عیش
جب گھر سے چلے ہم تو ملے راہ میں یک جا
دیکھا جو مجھے سوئے چمن گرم تگ و پو
اسے یار تو جاتا ہے چمن میں تو خستہ ڈالر
وہاں آج تو البتہ مہیا ہیں بہ ہر سو

گلِ برگِ خزاں دیدہ نظیر اس میں اڑیں گے
اور ہوں کے پڑے بلبل و قمری کے برے چند

اے مری جان ہمیشہ ہو تری جان کی خیر
رات دن شام سحر ہر گھڑی پل ساعت
منہدی چوٹی ہو سوائی ہو چنگ پیٹی کی
بے طرح بو جھ سے جھکوں کے جھکے پڑتے ہیں
پان کھایا ہے تو اس وقت بھی لازم ہے یہی
آٹھ اٹھا دیکھئے اور دیکھ کے ہنس بھی دیکھئے
پہلے جس آن تمھاری نے لیا دل ہم سے

ناز کی دور بلا حسن کے سامان کی خیر
مانگتے جاتی ہے ہم کو تری آن آن کی خیر
عمر چوٹی کی بڑی زلف پریشان کی خیر
کہ جو اللہ تو ان جھکوں کی اور کان کی خیر
ایک بوسہ ہیں دیکھئے لب و دندان کی خیر
اپنے کا جل تپ زکوٰۃ اور مسی وہاں کی خیر
اب تلک مانگتے ہیں دل سے ہم اس آن کی خیر

کیا غضب لگے ہیں بھن کے وہ کافریار
آج ہوتی نظر آتی نہیں ایساں کی خیر
جتنے محبوب پری زاد ہیں دنیا میں نظیر
سب کے افتد کرے حسن کی اور جان کی خیر

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا کل اک دلبر
سخن بر غنچ لب گل بر وجہین ہر اور کہاں برو
شہیم زلف مشک افتاں تغافل سوہن سماں
ادا میں کب فسوں آئیں نہ چھوڑیں نہ چھوڑیں
یہ دیکھا ہم نے جب عالم تو رکھ دل ہاتھ پر ہدم
کہا لیا تو اپنا دل کہ تو کیا اور تیرا دل
یہی ایک دل ہے ہمارا بھلا ہے یا کہ ناکارہ
جو نامنظور کرتے ہو تو کر دے کب اٹھتا ہے

نظیر اس نے سنا یہ جب تو بولایوں وہ شیریں لب
ہمارا اہو چکا یہ اب بس اس قصے کو کو تر کر

دنیا ہے اک نگار فریبندہ جلوہ گر
آج اس پہ تھی کہیں تو لگانی نکل اس پہ گھاٹ
ہوتا ہے آخر اس کے گرفتار کا یہ حال
سحر و فسوں وہ رکھتی ہے بہر فریب دل
لینے کو نقد عمر کے شیریں ہے مثل نقد
جو اس سے دل لگاتے ہیں آخر ہو منفضل
الفت میں اس کی کچھ نہیں بڑ کلفت و ضرر
حسرت فزاو ہوشش برباد شکب بر
جیسے گس کے شہد میں بھر جاویں بال و پر
حیران ہو سحر سامی بھی جس کو دیکھ کر
جب کچھ تو ہوتی ہے حنظل سے تلخ تر
ملنے ہیں اپنے دست تاسف بہ یک دگر

تو بھی جو اُس کے پاس لگاوے گا دل تو یار
میں تجھ کو اس کے ربط سے کرتا نہ منع آہ
تو اس مثل کو سوچ ذرا، اگر سفر گزریں
گرد و میان رہ کوئی مل جاوے باغ اے
بس اس نگار خانے کو تو بھی اسی منط
سیر مسافر نہ کر اور اس سے در گزر
اس نخل سے ملے گا تجھے بھی یہی غم

اس حرف کو نظر کے یوں دل میں دے مکان

کرتا ہے جیسے نقش انگلیں کے جگر میں گھر

تقصیر نگیں سے گردِ باغ و گلستاں سے نکل
نگہت زلف یہ کس کی ہے کہ جس کے آگے
گو بہارِ اب ہے ولے روزِ خزاں اک بلبل
امتحان کرنے کو یوں دل سے کہا ہم نے رات
کھا کے سوچ کما میں تو نکلنے کا نہیں
ہو پریشانی سے جس کی مجھے سو جمعیت
لکھ زندان پر آفات میں ہوتا ہے وہ قید
مجھ سے ممکن نہیں محبوب کی قطع اُلفت

چاہ میں مجھ کو یہ مرشد کا ہے ارشادِ نظر

آہر و چاہ ہے تو مت چاہ زرخداں سے نکل

جو دل کو دیکھے تو دل میں خوش ہو کرے ہے کس کس طرح کی پل
اگر یہ کہے کہ ہم میں ہیکل ذرا گئے مل تو ہمیں کے ظالم
وگر نہ دیکھے تو دو وہں کیا کیا جاوے خفگیِ عتاب، اکہل
دکھاوے ہیکل اٹھاتے، یعنی بلا سے میری مجھے تو ہے نکل

تو ہاتھ جھپٹے پھر لے کہہ کر مجھے نہیں کچھ اس کی بھل
کہ اتنے آتے نگاہ نک پھیلے منہ کو اٹکے آہل
جو سوچے پھر تو کیا وعدہ فقط بہانہ، فریب اور پھیل
جو بوسہ لگو تو پھر یہ نقشہ کبھی تو آج اور کبھی کے کل

اگر اس بہانے سے ہاتھ پکڑیں کہ دیکھ دل کی دھڑک ہمارے
جو پھپھکے دیکھیں تو تار جھٹکے، اگر صریحاً تو دیکھو پھرتی
کرے جو وعدہ تو اس طرح کا کہ دل کو سننے ہی ہو تسلی
جو دل کو بوسے کے بدلے دیجئے، تو ہنس کے لیے بہت خوشی ہے

نہ جل میں آوے نہ پھر کے نکلے نہ پاس بیٹھے نظر اک دم

بڑا ہی پُرفن، بڑا ہی سیانا، بڑا ہی شوخ اور بڑا ہی حجل

پرورد، تند خواہ سرکش، ہتھیلا، چلبلا، جھیل
نم، خورشید زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
خاک افت، ستم فندق، مسمی جادو، فسوں کا جل
کڑے بندے، چھڑے، پھلے، لگوٹھی، نورتن، بھل
سمن، گل، لالہ، نسیم، لسن، دُر، زریاں، جل
شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھل

دکھا کر ایک جھمک دل کو نہایت کر گیا بیکل
وہ عارض اور جس تاباں کہ ہوں شرمندہ کیا اس کی
کنوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چمے گوں میں
بدن میں جامنہ زکریا سر اجاس پہ زیب آور
نزاکت اور لطافت و کف پلمک کہ حیراں ہوں
سراسر سُرِ فریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے

نظیر ایک عمر عشرت ہوئے ایسا پریمی پیکر

اگر ایک کن اگر ایک دم، اگر ایک چھن، اگر ایک پل

قدیر و وحی، کریم و مہمین و منعم
کہ جس کو پہنچے نہ فکر نہ دانش و اوہام
قلم کو لوح پہ بخشی ہے طاقت ارقام
عطارد و زحل و زہرہ، مشتری بہرام
پھر کریں گے یہ آغاز سے لے تا انجام

اسی کی ذات کو ہے دائم ثبات و قیام
بروج بارہ میں لا کر رکھی وہ بارہ دری
ادھر فرشتہ کر و بی اور ادھر غلمان
یہ دو ہیں شمس و قمر اور ساتھ ان کے یار
جو چاہیں ایک پلمک ٹھہریں یہ سوطاقت کیا

بشر جو چاہے کہ سمجھ انھیں سو کیا امکان
نکالے ان سے گل و میوہ شلخ و برگ بار
اسی کے باغ سے دل شاد ہو کے کھاتے ہیں
چمک رہا ہے اسی کی یہ قدر توں کا نور
کہ اس کا شکر کریں شب سے تا بہ روز ادا
نظیر نکستہ سمجھ، مہر و فضل خالق کو

ہر آن تمھارے چھینے سے ایسا الگ کھ پائیں گے ہم
بیزار کریں گے پہلے تو خاطر کو تمھاری چاہت سے
گر کننا دل نے مان لیا اور رک بیٹھا تو بہتر ہے
اول تو نہیں پہچانو گے اور لوگے بھی پہچان تو پھر
گر چھینا بھی کھل جاوے گا توں کر جا دو سازوں سے
جب نہ بھی پیش نہ جاوے گا اور شہرت ہو گی پھر تو
موقوف کرو گے پچھنے کو تو بہت روز نہ نظیر آسا

جو حرف زبان پر لا دیں گے ہم پھر وہی کر دکھلائیں گے ہم
تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھراؤ گے تم
بیزار کرو گے دل ہم سے نامنت ڈر سے روکو گے
گر بھیں بدل کر آؤ گے ہم کتنے تاڑنے والوں کو
گر چھپ کر دیکھنے آؤ گے ہم اپنے بالا خانے کے
تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھراؤ گے تم
بیزار کرو گے دل ہم سے نامنت ڈر سے روکو گے
گر بھیں بدل کر آؤ گے ہم کتنے تاڑنے والوں کو
گر چھپ کر دیکھنے آؤ گے ہم اپنے بالا خانے کے

گرجا دہنتہ سیکھو گے تو سحر ہماری نظروں کا
تصویر اگر منگو اوگے تو دیکھ ہماری صورت کو
آئینہ کو اس کی کھوٹے کا کچھ پیش نہیں لے جاؤ گے تم
حیران مصویر ہوو گے پھر رنگت کہو کیا لاؤ گے تم
جس وقت نظیر ان باتوں کی ہم خوب کریں ہنسیاری

جو حرف زباں پر لاؤ گے تم پھر کوئی نہ کر دیکھاؤ گے تم
کی طلب ایک شہ نے کچھ پندار حکیم نکتہ داں
یاد رکھ اور پاس رکھ اور سخت رکھ اور جمع کر
اس نے اس غل کے تفصیلات جب پوچھے تو پھر
یاد رکھ ہر دم خدا کو پاس رکھ حسن و فضا
کہا غضب غصہ پھیا عیب رفیق و آشنا
اور اٹھا ہر دم ضعیف و ناتواں سے ظلم و جور
اس نے سن کے یوں کہا اے صاحب تباہ شاہ
کھا اور کھا، کاٹ اور اٹھا، دے بے بخونی ہر زماں
لطف سے اس نکتہ رس نے یوں کہا اس کتابیاں
سخت رکھ دین کو دہام اور جمع کر علم لے جواں
کاٹ ربط ہم نشین بد کہ ہے اس میں زیاں
داد و منطو موں کی فے اور لے بہشت جلاواں

نثریں مجھ کو نظر آئے تھے یہ نکتے نظر
میں نے نظم ان کو کیا تو دل ہو ہر دم شاد ماں

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
مہر طلعت، زہرہ پیکر، مشتری روم، مہ جبین
نازنین، ناز آفریں، نازک بدن، نازک مزاج
تیر قد، نشتر نگہ، مرثکھاں سنان، ابرو کمال
بے مروت، بے وفا، بے درد، بے پرواہ، خرام
زلف و کاکل، خال و خط، چاروں کے چاروں علم
دوش و بزدان، لب چاروں سے چاروں نعل
گل رخ و گل گوں قبا و گل غدار و گل بدن
سیم بر، سیاب طبع و سیم ساق و سیم تن
غنچہ لب، رنگین ادا، شکر دہاں، شیریں سخن
برق تاز و رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن
جنگ جو قتال وضع و سرفراز و سر فلکین
مشک تبت، مشک چین، مشک خطا، مشک ختن
نشرن، برگ سمن، درعدن، الحل یمن

بتلا ایسے ہی خوش وصفوں کے ہوتے ہیں نظیر

بے قرار و دل نگار و خستہ حال و بے وطن

جھکنا سر کو چپ ہوں یوں میں بحر غم کی لہروں میں
چھنے ہیں جیسے مہرے خانے خانے میں بباط اور
ہمارے دل کے کیا کیا پیل بند صبر توڑے ہے
رکھیں سر سبز کشتِ عم کو کیونکر اسے شہِ خواہاں
تدویر و دیکھِ فرزین بند غم سے رخ ہیں لے مہِ رخ
دلا تو پایادہ وہ سوار اسبِ خوبی ہے

نظیر اب دل تھیں دیتا ہے لے لو، بُردہ ہی سمجھو

وگر نہ یار پھر ہوگی یہ بازی ماتِ پیروں میں

کر کے بسنتی لباس سب سے برس دن کے دن
کھیت پہ سرسوں کے جا، جامِ صراحی منگا
سب کی نگاہوں میں دی عیش کی سرسوں کھلا
خلق میں شورِ بسنت یوں تو بہت دن تھا
آگے تو پھر تار باغیروں میں ہوزرد پوش
گرچہ یہ تہوار کی پسلی خوشی ہے زیاد

تو نے گاہِ سال بھر گلبِ دنوں کی ہمار

یار سے مل کے نظیر، آج برس دن کے دن

ر نہ لذتیں ہیں وہ ہنسنے میں اور نہ رونا میں
جو کچھ مزا ہے تو ساتھ مل کے سونے میں

پانگ پر پیچ بچھاتا ہوں مدتوں سے جان
نرسک گئی ہے وہ اگیا بوتنگ بندھنے سے
کہا میں اُس سے کہ ایک بات مجھ کو کہنی ہے
یہ بات سننے ہی میں سمجھ گئی کافر
یہ سن کے بولی کہ ہے یہ کیا کہا تو نے
تو بوڑھا مرد اور بارہواں برس مجھ کو

نظیر ایک وہ عیار سرتی ہے کافر

کبھی نہ اُٹے گی وہ تیرے جادو ٹوٹنے میں

حال دل ہم نے کہا زہرہ جیس کہ دیویں
اس پہ جو جو کہ گزرتا ہے تغافل کے سبب
چاہ میں اس نے جو کچھ دیکھیں میں بچ دکھت
سُن کے اس بات کو اور ہم کو سمجھ کر بیاک

ہنس دیا اور یہ کہا اس پہ جو گزری ہے نظیر

ہم کو معلوم ہے، کہئے تو ہمیں کہہ دیویں

کیا کاسہ سے لیجے اس بزم میں اے ہمنشیں
یہ کاسہ فیروزہ گوں ہے شیشہ باز پر فنون
ہوا عتماد اس کا کہ ہے کاسہ بازی یاد ہے
کل دامن صحرائیں ہم گزرے تھے وقت صبح دم
بولا برفریاد و فغان کیا دیکھتا ہے او میاں

دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں
جتنے جیل ہیں اور فسون سب اس کے ہیں زیر نگین
رکتا ہے شاد ایک دم جسے کرتا ہے پھر زندہ نہیں
ایک کاسہ سر پر الم آیا نظر اپنے تئیں
تھے ہم بھی سر پر آسمان کو اب پڑے ہیں برزین

گل برگ سے نازک بدن، سر پاؤں سے رشک چمن
دن رات ناز اور نعمتیں مہ طلعوں سے صحبتیں
عیش و نشاط و عشرتیں، ساقی قرآن، طرب کیں
بلغ و چمن پیش نظر، نرم و طرب شام و صبح
ہر سوبہ کثرت جلوہ گر، حسن بتان ناز میں
ایک آسمان کے دور سے ایک گردش فی الفور سے
ہلک سوچے گا غور سے در لحظہ آں در لحظہ ایں
سننے ہی جی تھر گیا رخسار پر اشک آگیا
دل عبرتوں سے چھال گیا، خاطر ہوئی بس سہکیں

اس میں سراپا ناگماں، ہر موبنا مثل زیاں
بولا نظیر آگہ ہو یاں، من نیر و وزے، ہم چنیں

گر کسی صورت سے وہ صورت دکھا جاتے ہیں
وہ تو اپنا منہ دکھا کر ٹھپ گئے، پر ہمنشیں
تو غم و درد آج یہ صورت نہ دکھلاتے ہیں
جیسے کل تم نے خواہو کر کسا تھا مرہو
دو پہراب جاہنیں پھر ہوش میں آتے ہیں
پر یہ ڈور تھا پھر جو بلوادیں سو بلوایا ہے آج
صبح اگر لو چھو تو کیا لگتا تھا مر جاتے ہیں
ہم تو یہ کرتے ہیں خاطر داریاں اور مہرباں
کیوں جی فرجاتے تو اب پھر تم کہاں پاتے ہیں
سن کے فرمایا چہ خوش بس لگ نہ چلے اس قدر
تو بھی تم و اللہ خاطر میں نہیں لانے ہیں
یہ تمہارے چوہے ہی تو نہیں بھاتے ہیں

ہجرتی نظیر ایک تو یہ ہے جو شام سے
صبح ہو جاتی ہے اکثر سر کو ٹکراتے ہمیں

کیا دل لگاویں مہرباں چمن صورت سے کہیں
تھا اک مکان دلکش رشک چمن جس کی فضا
دہاں ثبات اس سے ہم نہ یہاں قیام اپنے نہیں
قد حسرت سر و چمن اب غیرت نعل یمن
تھی اس جگہ رونق فراز قاصدہ شبنم ایک ناز میں
دیکھ اس کی رقصوں کی ادا دل رقص میں ہے جا بجا
بعد مغرب پر شکن نوک مرزہ شتر قریں
نغمات یکسر سحرزا، انداز گل جسا دو گریں

طوّر نکم دُر نشان، طرز تبسم شکریں
کیا کیا بناوٹیل بیل کرتی تھی وہ زہرِ جبین
وہ نوجوانی تازگی دیکھا تو کوسوں تک نہیں
جان بچ و غم برد رہے، آرزو دل اندوہیں
ہر موجِ سنبلِ رشک تھا کیسر ہے برگِ یاسمن
نہ لب میں وہ سُرخ رہی نہ مُنہ میں وہ دُشمن
تھی کل تو رشک گستاہ ہے آج خارِ مہکین

ناز و ادا کی گرمیاں غارت گر صبر و تواں
کیا کیا لگاوٹ بے بدل کیا کیا رکھاوٹِ بخل
گردوں نے اک گردش ہوئی ناز و عجز ہو گئی
وہ گل سے کھڑا رہ دہے گرمی کا عالم سر ہے
جوں بید لرزاں دستِ پائے جا چوبِ گل عصا
نہ چشم میں مستی رہی نہ خو میں وہ تندہی رہی
دیکھ اس کو ہم نے نگاہاں پوچھا کچھ اپنا کر میاں

بولی نظیرِ غیرت میں رہ کیا پوچھنے کی ہے جگہ
یہاں کی یہی ہے رسمِ ورہ گاہے چناں گاہے چنیں

کہا جو ہم نے ”ہمیں درس سے کیوں اٹھاتے ہو“
کہا ”لڑاتے ہو کہوں ہم سے غیر کو ہمدم“
کہا جو حالِ دل اپنا، تو اس نے ہنس ہنس کر
کہا ”جتا تے ہو کیوں ہم کو روزِ ناز و ادا“
کہا کہ ”عرض کریں ہم پر جو گزارتا ہے“
کہا کہ ”روٹھے ہو کیوں ہم سے کیا سبب ملتا“

کہا کہ ”ہم نہیں آنے کے یاں“ تو اس نے نظیر

کہا کہ ”سوچو تو کیا آپ سے تم آتے ہو“

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو
دی بر زمین اب لباسِ بسنتی کو جیسے جا
جس کی نوید پہنچی ہے رنگِ بسنت کو
ایسے ہی تم ہمارے بھی سینے سے آگلو

گر ہم نشے میں ”بوسہ“ کہیں دو تو لطف سے
 بیٹھو عین میں زکس و صد برگ کی طرف
 سن کر بسنت مطرب زریں لباس سے
 کچھ غمخیزوں کے نغمے کو دوسرے میں راہ
 تم پائس منہ کو لاکے یہ ہنس کر کہو کہ ”لو“
 نظارہ کر کے عیش و مسرت کی داد دو
 بھر بھر کے جام پھرے گل رنگ کے پو
 کچھ بلبلوں کا زمرہ سنہ دل کشا سنو
 مطلب یہ ہے نظیر کا یوں دیکھ کر بسنت
 ہو تم بھی شاد، دل کو ہمارے بھی خوش کر دو

نور حق شافع امت سے کہو عشق اللہ
 یاد کر، مومنو، اس کا وہ ہر آپسراہن
 تشکر شام کو لکڑے تنہا وہ لڑا
 پر سوا حق کی رضا اس نے نہ کچھ دم مارا
 ہیں زمانے میں یہی بارہ امام لے یا راں
 راہ مولیٰ میں خوشی ہو کے دیا سراپنا
 مال و جان دولت و گھر با ملک بخش دیا
 دل میں خوش بیٹھے ہوئے کرتے ہیں اللہ اللہ
 کہیں ہیں باطنی لوٹے ہیں عبادت کے زے
 چاہیں اگسیر کریں خاک کو ہر دم لے لے
 ہر دم اس شاہ ولایت سے کہو عشق اللہ
 سبزہ باغِ امامت سے کہو عشق اللہ
 گوہر درج شجاعت سے کہو عشق اللہ
 اس جواں مرد کی ہمت سے کہو عشق اللہ
 سب ہر ایک صاحبِ عزت سے کہو عشق اللہ
 ان شہیدوں کی شہادت سے کہو عشق اللہ
 اس سخی دل کی سخاوت سے کہو عشق اللہ
 ان جوانوں کی قناعت سے کہو عشق اللہ
 دوستان کی عبادت سے کہو عشق اللہ
 اُن کی سب کشفِ کرامت سے کہو عشق اللہ
 کہ سخن عشق کا پھر سب کو سناتا ہے نظر
 اس کے سب حرف و حکایت سے کہو عشق اللہ

انداز کچھ اور ناز و ادا اور یہی کچھ ہے
 جو بات ہے وہ نام خدا اور یہی کچھ ہے

نہ برق نہ خورشید نہ شعلہ نہ بھجھو کا
 بلور کی چمکیں ہیں نہ الماس کی جھمکیں
 پیچھے کو نظر کی تودہ گدی ہے قیامت
 سینے پہ کہا میں نے یہ دو سبب ہیں کیا ہیں
 تم باتیں ہمیں کہتے ہو اور سنتے ہیں ہم چپ
 ہیں آپ کی باتیں تو شکر ریز پرلے جاں
 پوچھی جو دوا ہم نے طبیعوں سے تو بولے
 غناب نہ خطمی نہ بنفشہ نہ خیارین
 کیوں صابو یہ حسن ہے یا اور ہی کچھ ہے
 اُس گورے سے سینے کی صفا اور ہی کچھ ہے
 آگے کو جو دیکھا تو گلا اور ہی کچھ ہے
 شراب کے یہ چمکے سے کہا اور ہی کچھ ہے
 اپنی بھی خموشی میں صدا اور ہی کچھ ہے
 اس گونگے کے گڑس بھی مزا اور ہی کچھ ہے
 بیماری نہیں ہے یہ بلا اور ہی کچھ ہے
 اس دھب کے مریضوں کی دوا اور ہی کچھ ہے

ہم کو تو نظیر اُن سے شکایت ہے جفا کی
 اور اُن کا جو کُنئے تو گلا اور ہی کچھ ہے

یہ جو اٹھتی کو نبل ہے جب اپنا برگ لٹالے گی
 ہونہار پروانے پتے چکنے چکنے ہوتے ہیں
 ابھی تو کیا ہے بھٹکے ہو نادانی ہے ہوشی ہے
 ناز ادا اور غمزوں کے کو اور ہی کترے کی تل چھول
 کا جل منہ دی پان منسی اور سنگھی چوٹی میں ہر آن
 جب یہ تن گدراوے گا اور بازو باہیں ہوس کے گول
 کس کس کا دل دھڑکے گا اور کون ملے گا ہاتھوں
 پان جبا اور آئینے میں دیکھ کے اپنے ہونٹوں کو
 خانہ جنگیاں ہوں گی اور لوگ مریں گے کھٹ کٹ کر
 ڈالی ڈالی چالے گی اور بتاتا کھالے گی
 بہت نہیں کچھ ٹھوڑے ہی دن میں بل پہنک کر لے گی
 قہر تو اس دن ہووگا جب پناہ ہوش سنھالے گی
 سین لگاؤں جتوں کا بھی اور ہی عطر لٹالے گی
 کیا کیا رنگ بناوے گی اور کیا کیا نقشے ڈھالے گی
 اُس دم دیکھا تھا، کیا کیا میٹ کے پاؤں نکالے گی
 بکین سے جب انگلیاں یہ کچے سبب اچھالے گی
 کیا کیا ہنس منس دے گی اور کیا کیا دیکھے بھالے گی
 شہر کے کوچے کیوں میں ایک شعر قیامت ڈالے گی

جب یہ مہوہُجن کا رس رس پک کر ہووے گا تیار
 سونا روپا سیم و جواہر صبر و دل و دیں ہوش و قرار
 بانگہ اس کی قیمت کا جب دیکھا جائے گی
 آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہی ایک آن میں سب رکھو لے گی
 اپنے وقت جوانی میں یہ شوخ خدا ہی جانے نظیر
 کس کس کا زرو لے گی اور کس کس کا گھر گھالے گی

چتون میں شرارت ہے اور سین بھی چھل ہے
 بالابھی چمکتا ہے جگنو بھی دکھتا ہے
 گورا وہ گلا نازک اور پیٹ ملائی سا
 وہ جن کے گلشن میں مغرور نہ ہو کیونکر
 اگلیا وہ غضب جس کو ٹیل ہی کرے دل ہی
 یہ دو جوئے پھل ہیں سینے پہ ترے ظالم
 او بھرا ہوا وہ سینہ اور جو شش بھرا جو بن
 کیا کیجئے بیاں یا رو چھل کی رکھاوٹ کا
 یہ وقت ہے خلوت کا لے جان نہ کر کلکل
 کل میں نے کہا اس سے کیا دل میں یہ آیا جو
 معلوم ہوا ہم سے روٹھے ہو تم اسے جانی
 یہ سن کے لگی کہنے روٹھی تو نہیں تجھ سے

کافر تری نظروں میں کچھ اور ہی چھل بل ہے
 بدھی کی لپٹ لت پر تونیز کی ہیکل ہے
 سینے کی صفائی بھی ایسی گویا قفل ہے
 بڑھتی ہوئی ڈالی ہے اٹھتی ہوئی کوئل ہے
 کیا جانے کہ شبنم ہے تن سکھ ہے کرمل ہے
 ملک ہاتھ لگانے دے جینے کا یہی پھل ہے
 ایک ناز کا دریا ہے ایک حسن کا بادل ہے
 ہر بات میں دُر در ہے ہر آن میں چھل ہے
 کافر تری کلکل سے اب جی مرا بیکل ہے
 لنگھی ہے نہ چوٹی ہے مٹی ہے نہ کاجل ہے
 اُٹا ہی ڈوٹے کا ٹھڑے پہ یہ آنجل ہے
 پر کیا کہوں دو دن سے کچھ دل مرا بیکل ہے

جس دن ہی نظیر آکر وہ شوخ لے ہم سے

ہاتھ پھیر ہیں بوسے ہیں دن رات کی مل دل ہے

ترے رخ کی جھلکیں کیا کہوں جسے دیکھ رہیں نہ دستری
 رہے ہوش گنوا بھرے باؤنی سی تری ایک جھلکے دیکھ پری

تری نظریں تیرا کمان بھون تیری آنکھیں ترک شان مرنہ
تو نے پاں سے منہ کو لال کیا کہوں کیا جودل کا حال کیا
تیرے تن کی نرمی کیا کہوں تیرے چہ باؤں کے لہوے کو

نرمی پوش جو ہو کے نکلا ہے تو چمک جھک سے اومیاں
ہے نظیر بھی تیرا مبتلا بھلا اس کے پاس بھی بیٹھ ذری

پھر کتنی چشم ہے اور شوق مینا بی جاتا ہے
نگہ بھی لحظہ لحظہ سوئے در آتی ہے سرعت سے
تو ہم مضطرب ہو دوڑتا ہے دم دم کہہ کر
بخونی خود بہ خود آگہ گیا خوش وقتیاں ہوں گی
شکوں جتنے معین ہیں جہاں میں شاد ہونے کے
لگا رخسار دلی کرتا ہے دامن نقاب اپنا

نظیر ایسی تو باتوں سے عیاں یہ ہے کہ وہ گل رو
کوئی دم یا کوئی بل میں ابھی تشریف لاتا ہے

گل شاہم نے یہ کہتا تھا وہ اک ہم راز سے
وہ نیا زور بجرتھا اس کی نگہ سے آشکار
تو جو واقف ہو تو جاس کو بلا لا اس گھڑی
ہے مرا سنے کو اس کے دل نہایت بے قرار
میں تو اس کو جانتا ہوں نام اس کا ہے نظیر
تم ہو سائے مہر دل اس کو کبھی سے یاد ہیں

دیکھتا تھا مجھ کو آج ایک شخص عجب انداز سے
جس طرح سے تھک رہے طائر کہیں پرواز سے
میں تسلی دوں لے کچھ شرم سے کچھ ناز سے
سن کے وہ ہمارا بولا اس بت طناز سے
اور خبر ہے مجھ کو اس کی چاہ کے آغاز سے
اور سو اس کے مرادرتا ہے ہی غماز سے

ہنس کے وہ گل رولگا ہم راز سے کہنے میاں
کچھ ہی ہو ہم تو ملیں گے اس کچھیرے باز سے

چتون کی کہوں یا کہ اشارات کی گرمی
روئے سے مرے اس کو عرق آگیا یا رو
ٹمک پھول چھو اتھا سوزا کت سے کئی بار
کھلواتے ہی بندوں کے بدن گرم ہو گیا
جلتا ہوں میں اور شعلے نہیں دیتے دکھائی
رہنا ہے کوئی دن تو سمجھ جائو اسے دل
گرمی تھی کہیں آہ ہم افسردہ دلوں میں
آتے ہی جو تم میرے گلے لگ گئے دائرہ
کہتا ہے وہ جس دم کہ چلو ہم سے نہ بولو
سب پوچھ ہے ظاہر کی یہ سوچی دشوار است
تم غصہ ہو یا قہر ہو آتش ہو غضب ہو
یا حضرت دل تم تو بڑے صاحب دل تھے
ایک ہی نگہ گرم سے بس ہو گئے تم سرد
یوں گرمی صحبت تو بہت ہو گی نظیر آہ

پریا نہ بھولے گی مجھے رات کی گرمی

وہ صنم جو ہر عذار ہے اسے ہم سے ملنے میں عار ہے
لے جب سے کوچے میں اس کے جایہ سرد و عیش ہے بر ملا
ولے اپنا جو دل ناز ہے وہ ہزار جان سے نثار ہے
لب دل ہے اور وہ نقش پا بر جان ہے اور دریا ر ہے

ہے بادل کا طائر تیز پراسی باز کا یہ شکار ہے
کئی ایسے ہوویں گے امتحان یہ بھی تو پہلا ہی وار ہے
جنہیں چاہئے ہے ہر شک گل انہیں گل سے کیا تر کار ہے
بھلا کئے کیا اُسے ہنشیں یہ عجب کچھ ان کا شعار ہے

کئی دن ہو میں نظیر اب کہ خفا ہے ہم سے وہ غنچ لب
اُسے کیا ولے ہیں روز و شب نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے

غفلت کی گردِ دل سے جھڑی تب خبر پڑی
دلبر نے دی تب اس سے کڑی تب خبر پڑی
جب سیاہی پر سفیدی چڑھی تب خبر پڑی
مجلس میں جل بہ جل یہ بڑی تب خبر پڑی
جب لاگی آنسوؤں کی جھڑی تب خبر پڑی
گرنے لگی کڑی یہ کڑی تب خبر پڑی
جب چاب لی گلے کی نرطی تب خبر پڑی

جب آئے اس گڑھے میں نظیر اور ہزار من
اوپر سے آکے خاک پڑی تب خبر پڑی

دھان کے بھی کیفیت نے اب آن مانی آپ کو
چین نیف کی ڈھلک پیڑوہ آنی آپ کو
ٹلک جھک دکھلا کے بھرا نکیا چھپانی آپ کی
جس کے اوپر دو گھڑی ہو مسربانی آپ کی

وہ نگہ جو اس کی ہے فتنہ گرا سے مشق صید ہے پیشتر
وہ مزہ لگا کے جو ایک سناں گئی پھر تو کہ نہ دل اب نفاں
جو ہمار گل پہی پہی سہل ہمیں کیا جو حسن کی پی ہے مل
جو بتوں کو دیوں مل اور دیں لکھیں اس کو یہ بہ الم قرین

جب آنکھ اس صم سے لڑی تب خبر پڑی
پہلے کے جام میں نہ ہوا کچھ نشہ تو آہ
لائے تھے ہم تو عمر بٹایاں لکھا ولے
ڈاڑھیں لگیں اکھڑنے کو ذراں ہوئے شہید
بن انت بھی بنے جب آنکھیں چلیں تو آہ
شہتیر سادہ قد تھا، سوخم ہو کے جھک گیا
پنجر دکھایا شیر نے تو بھی یہ سمجھے جھوٹ

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
کیا تعجب ہے اگر دیکھے تو مردہ جی اُسٹھے
ہم تو کیا ہیں دل فرشتے کا بھی کافر چھین لے
آپڑے دوسے ہر کے مردہ بے جاں میں جان

ایک لپٹ کشتی کی ہم سے بھی تو لڑ دیکھو ذرا
وقت تو جاتا رہا پر بات باقی رہ گئی
ہاں بھلا ہم بھی تو جانیں پہلوانی آپ کی
ہے یہ جھوٹی دوستی اب ہم نے جانی آپ کی
کیا ہمیں لگتی ہے پیاری جب وہ کہتی ہے نظیر
ہے میاں کچھ ان دنوں ناہم سربانی آپ کی

گلاب زعشرت ہو جسے کیا گل رنخوں سے دم کھڑی
ہر دم تغیر دیکھ یہاں ہیبت سے یوں کانپے چہاں
ایک گلاب دن مغرور تھا نقص اس کا بس مشہور تھا
دل اس نے دیکھا جس جگہ بے جرم و تقصیر و گنہ
ہر دم نگاہ جانستہاں لے کر پٹیا غم سے کاہاں
سر پاؤں سے گل پوش تھا بلبل و شوں کا جوش تھا
وہ گرم دیکھا اس کی دوکان ایک سرد مہری کرچیاں
وہ حسن سب جاتا رہا میں نے کہا یہ کیا ہوا
کرتا ہے گلاب زلی کی یہاں ایک دم میں گردوں گچھڑی
جیسے ہوا سے ہر زماں ہو بید کی لرزاں چھڑی
جس جس کا وہ منظور تھا کرتا تھا جو اس پر کڑی
مارا وہیں تیسرے گنہ یا تیغ ابرو کی جڑی
کرتی تھی کیا کیا پھرتیاں وہاں جا پڑی یہاں آ پڑی
ہر دل بڑا بیہوش تھا جاں دست بستہ تھی کھڑی
ناگاہ جو آسماں اس مہر سپر سے لڑی
بولا نظیر اب کہنے کیا حیرت ہے مجھ کو بھی بڑی

تھی وہ جو خوبی کی چمک جاتی رہی سب یک بیک
کیا جانے وہ ظالم جھک مہتاب تھی یا پھل جھڑی

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اتر تھے
دن رات وہ محبوب میسر تھے کہ جن کی
ساتی کے ادھر جام ادھر ناز و اداسے
محفل سے جو اٹھتے تھے ذرا بھی تو لپٹ کر
ہمراہ گل انداموں کے ہو خرم و خنداں
کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے
زلفیں الم شام تھیں رخ اشک سحر تھے
جاد و نظراں خوش نگہاں پیش نظر تھے
نازک بذناں موکراں دست و کمر تھے
بارغ و چمن گلشن و بتاں میں گزر تھے

کیا شور تھے کیا روز تھے کیا عیش تھے کیا لطف
کیا ولولے کیا تھقے بے خوف و خطر تھے
دکھلا کے جھک جاتے رہے دم میں نظیرِ آہ
کیا جانے وہ دن برق تھے یا مثلِ شر تھے

یک بہ یک موکی سیاہی اس قدر جاتی رہی
گو سفیدی مُوکی یوں روشن ہے جوں آبِ حیات
دم بہ دم بزمِ سرور و ہر گھڑی سرچھن
خندہ شادی سے ہرگز لب نہ ہوتے تھے بہم
جام دیتا تھا ادھر ساقی بہ منت ہاتھ جوڑ
گلبدن کرتے تھے کس کس طور اظہارِ اشتیاق
کوئی دیتا تھا محبت سے گلے میں ہاتھ ڈال
جس طرف تھے دیکھتے عیش و طرب کا جوش تھا
آن کر مُوکی سفیدی نے یہ کیسے بربادیاں
قدیں خم، آنکھوں میں خم چہرے پھہری رنگِ زر
کیا تماشے انقلابِ چرخ کے تھے نظیرِ

دم میں وہ رونق تھی اور ایک دم میں بے رونق
جس کے لب سے سخنِ بند گمِ جوش ہوئے
کل جو گزرے تھے ہم ایک کمنہ مزارستان میں
یعنی ایک شخص یہ بولا کہ یہاں عظمِ دہن
مجھ سے یوں کہنے لگی ہم تھے بڑے صاحبِ عیش
عمر بھر پھر وہ ہمارے گمِ گوش ہوئے
وہاں عجب طور کی عبرت سے ہم آغوش ہوئے
سخت بوسیدہ گم سے مری ہمدوش ہوئے
کبھی گلشن میں پھرے اور کبھی مے نوش ہوئے

رات دن عیش و طرب میں ہی بسر کرتے تھے
 گل عذاران سمن بر سے رہے شاو مدام
 ایک دم چرخ حد پیشہ سے مانتہ چراغ
 اب کوئی نام و نشان سے نہیں اپنے آگاہ
 مثل عشرت طلباں خوش خور و خوش نوش ہوئے
 نازنینان جٹا جو سے وفا کو کش ہوئے
 ایک پلک بھر نہ کھنچی دیر جو خاموش ہوئے
 ایسے ہم خاطر عالم سے فراموش ہوئے
 جب میں نے یہ اس شخص سے احوال نظیر
 روح تھرا گئی لرزاں خرد و ہوش ہوئے

فرض ہے سب کو جناب کبریا کی دوستی
 اگر شفاعت کی تمنا ہے تو رکھ جی میں سدا
 جام کوثر کا پیا چاہے تو اپنے دل میں رکھ
 حشر میں کھیتی ہری چاہے تو کربیاں اختیار
 سرخ روی دین دنیا کی اگر درکار ہے
 زب زبیت حشر کی چاہے تو سینے میں ٹھا
 گر تہمتی جنتی ہونا ہو تو کر دل میں نقش
 قبر کی کنہی سے چھٹا ہو تو اے مومن محب
 راہ جنت کی اگر چاہے تو اپنے ساتھ لے
 جس کو کہے مذہب حق اور صراط المستقیم
 جنتی ہے جنتی ہے جنتی ہے وہ سعید
 دوزخی ہے دوزخی ہے دوزخی ہے ہشتی
 نوح کی کشتی انھیں کو ہے ہمیں بکرا کما
 ہے وہی بندہ کہ جس کو ہے خدا کی دوستی
 شافع عشر محمد مصطفیٰ کی دوستی
 ساتی کوثر علی مرتضیٰ کی دوستی
 سبز پیرا ہن امام مجتبیٰ کی دوستی
 تو تو رکھ دل میں شہیدِ کربلا کی دوستی
 عابد و باقر شہ ہر دوسرا کی دوستی
 جعفر و کاظم علی موسیٰ رضا کی دوستی
 رکھ تقی حضرت نقی سے پیشوا کی دوستی
 عسکری حمیدی امام رہنما کی دوستی
 ہے وہ بیشک اہل بیت مصطفیٰ کی دوستی
 ان کی خدمت میں جو رکھتا ہے وفا کی دوستی
 اس طرف سے جو رکھے روئے را کی دوستی
 چھوڑ مت لے دل تو ان بحرِ سخا کی دوستی

ملی صراطِ حشر میں جس دم ترا کھسکے کا پاؤں
ہاں مگر جب تو کہے گا یا علی مشکِ کاشا
دیکھو کس کس طرح سے ہاں ترے آتی ہے کام
گر تو یہ چاہے خدا اور مصطفیٰ ہو تجھ سے شاد
حیف اس کی بندگی اور خاک اس کی زندگی

دین و دنیا میں وہی ہے جنتی بے شکِ نظیر

جس کے دل میں ہے سدا آلِ عبا کی دوستی

کل دیکھ کے اس کے عالم کو اک عالم کے اوسان گئے
کیا حُسن کہوں اللہ نے حُسن اس شکِ پری کی صورت پر
اُس کھڑے چاند کے ٹکڑے کو تو دیکھ عرق کے قطروں
تھے جن جن پر ایسے ہی اُس شکِ بتِ چیں کے جس سے
وہ بوندیا ہی مڑ گاں کی جب اُتری تیر اندازی پر
کچھ بھیس بدل کر شب کو ہم چوں پہنچے اس کی گلین
وہ دیکھ کے خط آئینے میں کل بھر کر آہ لگا کہنے

جب میں نے نظیر اُس سے یہ کہا اب غم کھا گیا ہوا ہے

ان باتوں کو مت یاد کرو وہ پانی بہ ملتان گئے

یہ رنگِ پان سے جو دہن اس کا لال ہے
استغفر اللہ لعل کہاں اور یہ لب کہاں
خوشید جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت

آج ان لبوں سے لعل کی پوری مثال ہے
اے بے وقوف کچھ بھی تجھے انفعال ہے
وہ ان لبوں کے پان کا ادنیٰ اکال ہے

ہوں لعل گرچہ سُرخ ہے پر رنگِ سخت ہے
کھتے ہیں لعل ٹوٹ کے ہوتا نہیں دُست
گو زرم بھی ہوا تو یہ اُس کی مجال ہے
بچ ہے پراپنے دل میں تو اور ہی خیال ہے
یہ معجزہ ہے یا کوئی سحرِ حلال ہے
بس لعل لب سے لعل کو نسبت ہے کیا نظیر
یہاں لعل کی بھی اب تو زباں مُنہ میں لال ہے

گل رنگی و گل پیرہنی گل بدنی ہے
گلزار میں خوبی کے اب اس گل کے برابر
وہ نامِ خدا حسن میں بچ مچ کی بنی ہے
بوٹا ہے نہ شمشاد نہ سرو چمنی ہے
اور تفس یہ غضب کلم نگہی کم سخنی ہے
ختم اس کے اوپر گل رُخِ وسعتی ہے
ذندال ہیں گھر ہوٹ عتیقِ بیتی ہے
یا چین میں ایک چینی کی مورت یہ بنی ہے
ریشم ہے نہ گلبرگ نہ برگِ سمی ہے
چھل جاوے بدن اُس کا یہ نازک بدنی ہے
یعنی یہ پری یا کہ غزالِ ختنی ہے
کام اس کا سدا لبری و دل شکنی ہے
جب میں نے وہیں ہنس کے کہا اس سے نظیر
ہیرا نہ کہو اس کو یہ ہیرے کی کہنی ہے

جو تو کہتا ہے اے غافل یہ میرا ہے یہ تیرا ہے
تو ادل سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے
جس کا ہے اسی کا ہے نہ میرا ہے نہ تیرا ہے
نمازی ہے، شرابی ہے، اچکا ہے، لیٹرا ہے

فرشتہ ہے پری ہے دیو ہے یا آدمی جن ہے
 ترسی کیا ذات ہے کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے
 جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز پھیراؤ
 یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں تو اپنا ہی نہیں مالک
 تو بچے سوت کا دھاگہ حبث بل تیج کھاتا ہے
 تو کیا جائے کہ تجھ کو کس نے کس چہنچے میں کا تا ہے
 تماشا ہے مزا ہے سیر ہے کیا کیا ابا ہا ہا
 ترقی میں تنزل ہے تنزل میں ترقی ہے
 طلسمات حقیقی ہے یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا

بلا ہے بھوت ہے یا من مڑو ریا کبیرا ہے
 مسافر ہے وطن ہے یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
 تو اس کے بعد یہ کیوں یہ تیرا ہے یہ میرا ہے
 تجھے اوبے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے
 یہ سب دھم دغلا ہے اور تصور فہم تیرا ہے
 تو کیا جائے کہ تجھ کو کس اطرین میں اٹیرا ہے
 مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بھیرا ہے
 اندھیرے میں اجا لاسے، اجالے میں اندھیرا ہے
 یہی چاند اور یہی سورج، یہی خام اور یوراء

نظیر اللہ اللہ اس جہاں میں دم غنیمت ہے
 کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا سیرا ہے

فلک پہ سورج بھی تھر تھرا کر مناس کا حیرت سبک رہا ہے
 ہے ایسی کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر ایک لٹ میں لٹک رہا ہے
 پڑھی ہے جس نے کس کی بچی، وہ بچی سے سر ٹک رہا ہے
 دل اس کے دیکھے سے کیوں نہ بکھرے کہ مثل سورج چمک رہا ہے
 وہ پلکیں کج خو کہ جن کا ہر مو، جگر کے اندر کھٹک رہا ہے
 پھر اس نے تھکی وہ ہنسنی پھر اس پہ مونی پھر کھا رہا ہے
 سخن بھی کرنے کی وہ لطافت کہ گویا موتی ٹپک رہا ہے
 ادھر کو تھکے جھک رہے ہیں ادھر کا بال لاپٹک رہا ہے

یہ جس نے کہہ یا قیامت کہ اک بھجوا کا بھبک رہا ہے
 کھجوری چوٹی ادا میں مٹی، خنایں لمبی، دفا میں چھوٹی
 وہ نیچی کا فریاد بچی کہ دل کے زنجروں پہ باندھے بچی
 وہ ماتھا ایسا کہ چاند ٹھہرے پھر اس کے اوپر وہ بال بکھرے
 وہ چین خود رو کیلے ابرو، وہ چشم جادو، انگا ہیں آہو
 غضب وہ پھیل کی شوخ بینی پھر اس پہ ہتھوں کی کتیر پی
 لب وہاں بھی وہ نرم و نازک مٹی وہاں بھی وہ تہذیب
 وہ کان خوبی میں چھک رہے ہیں، ہر سون میں جھک رہے ہیں

بھرا ہے جس میں تمام کینہ کہ جوں نینمہ دمک رہا ہے
 ہیں جس نے دیکھے وہ پھل درختی، کلیجہ اس کا دھڑک رہا ہے
 کچھ ایسے ڈھب سے وہ کس رہی ہے کہ اس کا کنا سک رہا ہے
 مزار جی کا جھپٹ کیو کچھ ایسا پیڑو پھوٹک رہا ہے
 اب آگے کہنے کو کیا کہوں میں کہ ہوش اس جا ٹھٹک رہا ہے
 سلاح سونے کی ایک ڈلی ہے کہ گویا کندن دمک رہا ہے
 کڑی کڑی سے کھڑک رہی ہے کڑا کرے سے کھڑک رہا ہے

نظر خونی میں اس پری کی نگاہوں کہاں تک شناسنا کر
 صفت سراپا میں جس کے لئے دل اب اسی سے ایک رہا ہے

بعد ازاں سر حلقہ پیغمبران کو عشق ہے
 دوستان اس شاہ مرداں سے جو ان کو عشق ہے
 غنچہ دگل، سبزہ عنبر فشاں کو عشق ہے
 عالم بالا کے سب باشند گاہ کو عشق ہے
 ساتھ ان باغوں کے رضواں باغباں کو عشق ہے
 قائم و میل فلک، قطب زماں کو عشق ہے
 بے سخن ان سب زمین و آسماں کو عشق ہے
 خاک باد و آتش و آب روداں کو عشق ہے
 دمدم ان بادشاہان ہساں کو عشق ہے
 پھر ہمارے کشمکش ہندوستان کو عشق ہے

صراحی گردن وہ آہ کینہ پھر آگے سینہ بھی خون نکسند
 کچیں نہ کچھ کچھ شہر درختی، کچھ ان کی سختی وہ کچھ کر سختی
 وہ سرخ انگیا جو کس رہی ہے وہ چہ رہی ہے اُس رہی ہے
 وہ پیٹ دل کو پیٹ کیو، وہ ناف جی کو سمیٹ کیو
 وہ پیٹ گہری، کمرہ پتلی، غضب لگاؤ وہ پھر ہری کی
 فقط وہ چیمپے کی اک کلی ہے کچھ اک مندھی کچھ ایک کھلی ہے
 وہ پیاری رانیں وہ گول ساقیں، وہ کف ملائم وہ نرم پہنچے

اولاً اس بے نشاں اور بانشاں کو عشق ہے
 لافتا الّا علی ہے شان میں جس کی نزول
 پھر جو ہے باغ نبوت اور امامت کی بہار
 عرش و کرسی جو روغلاں اور ملائکہ خاص و عام
 جنت و عدن و بہشت و خلد و مینو اور ارم
 ہیں جو سیار و ثوابت آفتاب و ماہ تاب
 ہیں جو یہ چودہ طبق متحرک و ساکن سدا
 مختلف ہیں اور طے رہتے ہیں باہم روز و شب
 ہے جہاں میں جس سے روشن عقل کے گھر کا چراغ
 اور خراساں اصفہاں ایران اور توران کو

ہیں جہاں تک سلسلے فقر کے از کمہ تا بہ
 کوہ تھراتے ہیں لرزیں ہیں زمین و آسماں
 ہر طرف گزار ہے سبزان اور آبِ رواں
 وہ جو ہیں اس گلشن ہستی میں اب محفوظ
 دل کو لے پا مال کر دینا بہ صد جور و جفا
 گرد کے مانند پھرتی ہیں پڑی اڑتی خراب
 لوہے ہیں مست مے خانے کے در پر جا بجا
 کل ہی نقشِ فرائدہ من کر بھی ہم عامل رہے
 عارفان اور کاملاں اور عاشقاں کو عشق ہے
 عاشقِ مولایا فریاد و فغاں کو عشق ہے
 اپنی نظروں میں بہارِ گلشن کو عشق ہے
 ان کے آگے موسمِ بادِ خزاں کو عشق ہے
 اس خوبانِ عالم ولساں کو عشق ہے
 لٹ گئی دستِ جنوں کی کارواں کو عشق ہے
 جامِ و صبا ساقی و پیرِ مغساں کو عشق ہے
 اے عزیزاں اس حیاتِ رنگاں کو عشق ہے
 خلقت کو نین میں کیا جن و کیا انسانِ نظیر
 وحشی و طائر زبان و بے زباں کو عشق ہے

موضوعی غزلیں

موضوعی غزلیں

بسنت

جوش نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا
باغوں میں لطف نشوونما کی ہیں کثرتیں
پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دلبراں
جادریہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم
تشریف تم نہ لائے جو ہو کر بسنتی پوش
سنے ہی اس ہمارے نکلا کہ جس کے تئیں
ہے طرفہ روزگار طرب زابسنت کا
بزموں میں نغمہ خوش دلی افزا بسنت کا
ہے جن سے زنگار سراپا بسنت کا
اے جان ہے اب تو ہر کسب چچا بسنت کا
کہنے گناہ ہم نے کیا کیا بسنت کا
دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا
اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکایا حسن، یار نے کیا کیا بسنت کا

ہولی

ہولی کی رنگ نشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا
 جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں
 لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دہیان نہیں
 ہر محفل میں رقاصول کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے
 ہے روپ جمیروں کا ہوش اور رنگ گلاؤں کا گلگول
 اس گل روئیوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہے
 جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو صحن چمن اور گلشن کا
 ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
 یہ ساغر پہنچے دوست تلک یا ہاتھ پلگ لے دشمن کا
 وہ حسن جتنا کانے کا اور جوشش دکھانا جو بن کا
 ہیں بھرتے جس میں رنگ بنا ہے رنگ عجب اُس تن کا
 نہ دہیان ہمیں کچھ چولی کا نہ ہوش تمہیں کچھ دامن کا
 جب ہم نے نظر اس گل رو کے بات کی ہنس کر اس دم
 کیا پوچھے ہے آ رنگ بھری ہست مہینہ بھاگن کا

جوانی

بنا ہے اپنے عالم میں وہ کچھ عالم جوانی کا
 نہیں بوڑھوں کی ڈاڑھی پر بیان رنگ سجکا
 یہ بوڑھے گو کہ اپنے منہ سے یہی نہیں کہتے
 یہ پیران جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہم
 کسی کی پیٹ کبڑی کو بھلا خاطر میں کیا لاؤ
 شراب و گلاب ساقی عزیز عیش و طرب ہر دم
 نظرب ہم ڈالتے ہیں مزے کیا کیا اہا ہا ہا
 کہ عمر خضر سے بہتر ہے ایک ایک دم جوانی کا
 کیا ہے ان کے ایک ایک نال نے اتم جوانی کا
 بھرا ہے آہ پران سب کے دل میں غم جوانی کا
 کہ کیا کیا ان کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا
 اکرامیں تو جوانی کے جو مارے دم جوانی کا
 بہار زندگی کسے تو ہے موسم جوانی کا
 بنایا ہے عجب اللہ نے عالم جوانی کا

بالا

تم نے جس دن سے صنم کان میں بالا ڈالا
 کیوں نہ ہوں ہوش گامیں اس کے دوانہ یارو
 ایک تو قہر ہے جھکے کے کرن پھول میں جھوک
 اب تو بالی نہیں، کافر وہ بڑی سیانی ہے
 واہ جی ہم کو تو بالے ہی بتانا ہر دم
 یہ بھی کیا کن غضب ہے کہ دکھانا ہر کن
 جیسے مہتاب پہ ہالے کا بندھے ہے کندل
 کیا غضب تھی وہ ادا آہ کہ چنچل نے شتاب
 نوک مڑگاں کو خبر ہونے نہ دی آہ ذرا
 لے دل اس بالے کی ہرگز تو لگاوٹ میں نہ آ
 چوے ہر جھوک میں کافر ترے رخسار کو آہ
 ادب بھی یوں تو پری زاد ہیں بالے والے
 جب ہلاتی ہے صراحی سی وہ گردن اپنی

ہو گیا چاند سے کھڑے کا اجالا بالا
 جس پر زاد نے بالی سے نکالا بالا
 جس پر کافر ہے جگر چھیدنے والا بالا
 کیوں نہ اب اس کا بتا دے ہمیں بالا بالا
 آپ غیروں میں مزے لوٹنا بالا بالا
 کان کے پاس سے سر کا کے دوشالا بالا
 ہے ترے چاند سے رخسار کا بالا بالا
 گونج کھلتے ہی جھوک کر جو سنبھالا بالا
 دل کو یوں اس کی نگہ لے گئی بالا بالا
 تجھ کو بتا دے گا بالے پہ یہ بالا بالا
 کیوں نہ مارے مرے سینے میں یہ بھالا بالا
 پر ہے اسے جان ترا سب سے نرالا بالا
 نشہ حسن کو کرتا ہے دوبالا بالا

اب تو رہ کے مرادل ہی کہتا ہے نظیر
 اک نظر چل کے مجھے اس کا دکھالا بالا

پنکھیا

کیوں نہ جھمک کر کرے جلوہ گرمی پنکھیا
 کچھ گف نازک پری، کچھ وہ پری پنکھیا

دیکھ چمن میں سحر، اس کی جبیں پر عرق قطعہ لائی اُدھر سے نسیم، عطر بھری پنکھیا
 شاخ نے نکل کی ادھر برگ جو تھی سبز تر اُن کی بنا کر جھلی اس کو ہری پنکھیا
 گرمی میں ایک دن گئے اُس سے جو ملے کو ہم چھوٹی سی آگے تھی ایک اُس کے دھری پنکھیا
 ہم تھے پیسے میں تر، بیٹھتے ہی یک بیک ہاتھ بڑھا کر جولی، اس کی ذری پنکھیا
 اس نے وہیں چھین لی اور یہ کہا واہ واہ تو نے چھوئی کیوں مری، زیب بھری پنکھیا
 کچھ تھی عرق کی تری، کچھ ہوئی خجالت نظیر
 اور تری کے اوپر لائی تری پنکھیا

بٹوا

دیکھ تیرا یہ جھلکتا ہوا اے جاں بٹوا صبح نے پھینک دیا مہر کا رخشاں بٹوا
 چاندنی میں ترے بٹوے کے مقابل ہونے بن کے نکلا ہے فلک پر مہ تاباں بٹوا
 گر چمن میں تجھے بٹوے کی طلب ہو تو وہیں زربھرا غنچے کا لاوے گل خنداں بٹوا
 ہاتھ نازک ہیں ترے اور وہ ہے سنگین دُزن بن کے آجادے ابھی لعل بدخشاں بٹوا

قطعہ

یوں کہا میں کہ یہ بٹوا ذرا ہم کو دیکھے ہم بھی جوائیں گے ایسا ہی درخشاں بٹوا
 سن کے بٹوے کو دکھا کر یہ کہا واہ سے شعور ارے بن سکتا ہے ایسا کوئی اب یہاں بٹوا
 جب کہا میں نے سبب کیا تو کہا ہنس کے نظیر
 یہ تو لائیں ہیں مرے واسطے پریاں بٹوا

ہوا

یہ کس الفت بھری نے سچ کہو تم کو دیا بٹوا
کہوں میں عطر داں، کیوں صاحب اس ٹوٹے کو بٹوا
تمہارے آگے کیا کیا رنگ بدلے ہے پڑا بٹوا
ہمارے دل بہا تم اور تمہارا دل بہا بٹوا
تو صاحب یاد رکھو یہ ہمارا ہے چھٹا بٹوا
بہ صد تائید بنوایا تھا ہم نے ایک نیا بٹوا
تو کیا کہنے وہی اُس دم ہمارے پاس تھا بٹوا
کہا، یہ تو بنایا ہے کسی نے واہ کیا بٹوا
کہ یہ تعریف کچھ خالی نہ جاوے گی چلا بٹوا
یہ کس کا ہے قیامت پر نزاکت خوش نما بٹوا
اسے میلانے کچھ ہے یہ ایک محبوب کا بٹوا
تو میں اس سے بھی بہتر اور دوں تم کو منگا بٹوا
میں بیگانہ تمہیں اب کس طرح سے ڈول بھلا بٹوا
وہیں اُس شوخ نے مارا، میرے منہ پر اٹھا بٹوا
یہ کہہ کر میں نے پھر اُس کی طرف دھلکا دیا بٹوا
کہیں ناگہ سر زانو میں اس کے جا لگا بٹوا
یہ تو نے آپ سے مارا مرے، واروں تیرا بٹوا

تمہارے ہاتھ سے ہوتا نہیں اک دم جدا بٹوا
معطر ہو رہا ہے نگہت جو زورِ نفس سے
گھڑی غنچہ، گھڑی گل، پھر گھڑی میں گل سے غنچہ ہو
تمہیں ہم چاہیں تم بٹوے کو چاہو کیا تماشہ ہے
جو تم نے بدلے ایک بٹوے کے ایک بوسہ ہی ٹھرایا
نہایت پر تکلف اور بہت خوش قطعہ نازک سا
گئے ہم اتفاقاً اُس پر میری رو سے جو ملے کو
یہ کیا آپڑی اس کی نظر اس پر تو لے ہم سے
بہت تعریف کی اور ہنس دیا جب دل میں ہم اچھے
کبھی یوں اور کبھی دُور دیکھ آخروں کو کہا، کس
کہا جب میں نے ہنس کر سونیا زو و عجز سے لے جا
میں بھولے سے لے آیا تھا اگر درکار ہو تم کو
کہا ہم تو یہی پس گئے تو میں نے پھر کہا صاحب
جو ہیں یہ بات نکلی میرے منہ سے پھر تو جھنجھلا
کہا میں نے خفا ہوتے ہو کیوں چاہو تمہیں لے لو
چلا جب دھلکتا اس کی جانب دیکھتے تھے
تو لے بٹوے کو اور زانو پکڑ کر یوں کہا دشمن

جلا دوں ٹکڑے کر ڈالوں اے تجھ کو نہ دوں ہرگز لگا میرے بہت، اب تو یہ میرا ہو چکا بٹو ا
 نہ بٹو ادوں نظیر اور تجھ سے زانو کا بھی بدلہ لوں
 یہی دھکی دکھا کر آخر اس نے لے لیا بٹو ا

سنگترا

کیا کیا ہر ایک درخت پہ آیا ہے سنگترا
 نارنگی اور انار کب اچھے لگیں اُسے
 چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کہیں اُس سے جان
 گر تم بُرا نہ مانو تو اک بات میں کہوں
 تم تو رتی تھیں، آن پڑا اس میں باغیاں
 یہ سن کے اُس نے ہنس دیا ادویوں کہا مجھے
 ایک بلخِ حُسن کس ہے جوانی ہے اس کا نام
 جو بن کے باغبان نے اُٹھتی ہمارے
 کو لے ہی لگ رہا ہے ہمارے تمام عمر
 جب تو نظیر میں نے یہ ہنس کر کہا اُسے
 میوہ خدا کے خوب بنایا ہے سنگترا

پسکھا

برگ گل دلالہ کا نہ بنو اے پسکھا
 اس سے بھی سبک اور کوئی منگوا اے پسکھا

ہم ترہیں پسینے میں تو کیا آپ کو صاحب
 مدت کے تمہارے ہیں ہوا دار ہم لے جاں
 سن کر یہ کہا خیر اگر ہے یونہی دل میں
 جب ہم نے کہا یہاں تو کچھ روں کے ہیں اکثر
 فرمایا کسی کا ہو یہ نازک ہو سبک ہو
 بنوا کے بہ صد زب کہا ہم نے یہ اگر
 جب ہنس کے کہا چھڑ تمہاری نہیں جاتی
 القصہ جو ہیں جھلنے لگے ہم اُسے خوش ہو
 حلقہ مری زلفوں کے کھلے جاتے ہیں ہل ہل
 پنکھے کے بھی جھلنے کا نہیں تم کو شور اب
 ایک دن عرق آلود ہو گھبرا کے کہا میں
 بولا کہ چہ خوش فائدہ کیا اب جو تمہارے
 اس چھوٹے سے پنکھے کی ہوا اب تمہیں آئے

خوش بیٹھے ہوئے آپ تو جھکائے پنکھا
 ایک چار گھڑی ہم سے بھی جھلوائے پنکھا
 تو جا کے شتابی ابھی لے آئے پنکھا
 مقشیش کا لے آویں جو فرمائیے پنکھا
 ایسا نہ ہو جو پھر کے بدلوائیے پنکھا
 ہم شرط بدیں ایسا جو دکھلائیے پنکھا
 اب جی میں ہے منہ پر کوئی لگوائے پنکھا
 بولا وہیں بس بس ذرا اٹھ لائیے پنکھا
 ایسا بھی تو لپ جھپکے نہ جھپکائیے پنکھا
 معلوم ہوا بس جی ادھر لائیے پنکھا
 اس وقت تو ہم کو کوئی دلوائیے پنکھا
 ان گھر گھر سے ہاتھوں سے پر دوائے پنکھا
 بے فائدہ جاگہ سے نہ ہوا لائیے پنکھا

ایسا ہی جو جھلنا ہے نظیر اب تمہیں تو آپ
 گدھ پنکھ کے پر کا کوئی بنوائے پنکھا

حنا

کچھ دل فریب ہاتھ وہ کچھ دل ربا حنا
 دیکھیں جس کے دل نے خابستہ اس کے ہاتھ
 لگتی ہے اُس پری کی عجب خوش نما حنا
 راتوں کو چونک پڑتا ہے کہہ کر حنا حنا

ہے سرخ یہاں تلک کہ جو چھلے ہیں نقرئی
یہ فندقیں نہیں مرے قاتل کے ہاتھ میں
خونِ شفق میں پنجرہ خورشیدِ رشک سے
غرغے سے ہاتھ کھول کے اور پھر لیا جو کھینچ
شب کے خلاف وعدہ کا جب بن سکا نہ عقد
کل مجھ سے ہنس کے اُس گل خوبی نے یوں کہا
دہ چھوٹی پیاری انگلیاں وہ گورے گورے پاؤں
کرتی ہے اس کے ہاتھ میں ان کو طلا خا
ہوتی ہے پور پور پہ اُس کے فدا خا
ڈوبا ہی تھا اگر وہ نہ لیتا چھپا خا
بجلی سی کچھ جبک لگی کافر بلا خا
ناچار پھر تو ہنس دیا اور دی دکھا خا
پاؤں میں تو ہی کج تو میرے رچا خا
ہاتھوں میں اپنے لے میں لگانے لگا خا

اُس وقت جیسی نکلیں مری حسرتیں نظیر
اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا خا

برسات

ساقیا موسمِ برسات ہے کیا روحِ فزا
کھل رہے ہیں درو دیوار پہ درہائے بہشت
جا بجا نکلے ہیں اس سخن سے طفلانِ نبات
دیکھ ہسروں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے
برگِ اشجار وہ ہر سبز نہیں اور نرم و لطیف
کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا
الغرض دشت تو ہیں کارِ گہِ مغل سبز
برج سے کرتے ہیں اب نصرتِ مخفرت و ملک
دیکھ تک تانگیِ صنعت، بیچونِ دھیرا
اکہی ہے چمنِ خلد کی گھر گھر میں ہوا
اپنے ہاتھوں پہ کھلاتے ہیں جنھیں نشوونما
دمدمِ انبستہ استرِ نباتا خا
فی المثل حُلہِ جنت انہیں کہئے تو بجا
مغل تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بکھا
اور جو ہیں کوہ تو وہ کوہِ زمرِ برپا
جیسے غنچوں سے نسیمِ سحر اور گل سے صبا

اس میں اب عکس ہر ایک گل کلبے پو جلو نہا
طشت بلور ہے اقسام جو اہر سے بھرا
سرخ دتار بہ سر رکھتا ہے اور سبز قبا
جیسے شادی میں پسند آتی ہے نوبت کی صدا
اُس سے کیا جھوم کے اڑھی، دہواں دھار کھٹا
کیا تناسب ہیں یہ صفت کے ابا ہا ہا
لب مالیدہ مسی میں دُر و دنداں کی صفا
جنگل ایک رنگ پہ سومانے اُرژنگ فدا
کس سے یہ زنگ ہوں یا رب تری قدرت کے سوا
جس کے قطرے سے بنے صد گہر بیش بہا
ہم تو جانے ہیں یہ گل برسے ہے مینہ موتی
یہ وہ قطرے ہیں کہ ہیں آبِ رُخ شاہ و گدا
شاہد اس بات کی ہے حی من الما کی زبا
اور ہیں مجور تو وہ گریہ کناں ابر آسا
ہے ادھر مینہ تیرا دھر آنسو کا ٹپکا ہے لگا
چپ بھی ہو رہا رے کم بخت نہ جلتوں کو جلا
جن کے احوال پہ ہر ابر کو آتا ہے بکا
کوئی تشبیہ نہیں ملتی مسرت پیلا
جھڑیریں کہوں یا زلفِ سیاہ لیلیا

ہے زمین چمن از بس کہ جو پانی سے سفید
عقل کہتی ہے تامل سے جسے دیکھ کے یہ
شاخ پر گل کا یہ عالم ہے کہ جیسے محبوب
غلغل رعد خوش آتا ہے ہر ایک گوش لویں
آتش برق جو ہے مشتعل از بس ہر دم
ایسی آتش کے لئے چاہئے ایسا ہی دہواں
اس سید ابر میں یوں اڑتے ہیں بگے جیسے
بدلیاں بدلے ہیں کیا رنگ نئے رنگارنگ
روح ہزار کی کہتی ہے تصدق ہو کر
متصل برسے ہے جھڑپوں سے وہ باران گہر
لوگ کہتے ہیں یہ ہیں آب کے قطرے لیکن
بلکہ موتی ہے فقط گوش بتاں کی زینت
آبِ رُخ کیا کہ اسی سے ہے حیات ہر شے
جن کو ہے وصل تو وہ خندہ زناں ہیں برق
اس طرف ابر سیہ اس طرف آہوں کے جھوم
سن پیسے کی وہ بی بی کی صدا کہتے ہیں
قصہ کوتاہ یہ کچھ رنگتے ہیں اندوہ فراق
اب میں سانوں کے اندھیر کی کردل کیا تعریف
خجہ شکر تو بہت لیک میں اب حیراں ہوں

جیہ فیل پہ شنکرت کسی نے چھڑکا
 کوندا اور شور سے معمور ہے کل ارض و سما
 جس کو سُن سُن کے فلک ناپے ہے بر رو ہوا
 کونک کی صدا
 بوس و آغوش کہیں ساغر و مینا کی ادا
 ایک عالم کو ہے عیش و طرب و برگ و وفا
 اہل باطن بھی اُچھلتا ہے ہر ایک وجد میں
 شہر اور دشت میں یہاں چار نہیں تو نظیر
 نظر آجاتے ہیں جنت کے نمونے ہر جہا

عید

شاد تھا جب دل وہ تھا اور یہی زمانا عید کا
 دل کا خون ہوتا ہے جب آتا ہے اپنا ہم کو یاد
 آنسو آتے ہیں بھر جب نہیاں میں گورے ہے آہ
 حشر تک جانی نہیں خاطر سے اس حشر کی بو
 ہونٹ جب ہوتے تھے لال اب آنکھیں ہو جاتی ہیں سرخ
 دل کے ہو جاتے ہیں ٹکڑے جس گھڑی آتا ہے یاد
 گھزاروں کے میاں ملنے کی خاطر جب ہم
 اسیوں چھپتے ہیں جیسے تیرے بھاگے کوئی

اب تو یکساں ہے ہمیں آنا نہ آنا عید کا
 آدھی آدھی رات تک منہ دی لگا نا عید کا
 پچھلے پہرے سے وہ اُٹھ اُٹھ کر نہا نا عید کا
 عطر بفلوں میں وہ بھر بھر کر لگا نا عید کا
 یاد آتا ہے جو ہم کو پان لکھا نا عید کا
 عید کہ تک دلمروں کے ساتھ جانا عید کا
 ٹھان رکھتے تھے مہینوں سے بہانا عید کا
 یا بنے پھرتے تھے ہم آپ ہی نشا نا عید کا

نیند آتی تھی نہ ہرگز بھوک لگتی تھی ذرا یہ خوشی ہوتی تھی جب ہوتا تھا آنا عید کا
کیا ہوئے وہ دن کہاں جاتے رہے خوابِ نظیر
اُٹھ گیا خاطر سے سب ہنسا ہنسا نا عید کا

رات

کھینچ کر اس ماہ رو کو آج یہاں لائی ہے رات
چاندنی ہے رات ہے خلوت ہے صحنِ باغ ہے
بے حجاب اور بے تکلف ہو کے ملنے کے لئے
جب میں کہتا ہوں کسی شب کو تو کافر یہاں بھی آ
کیا مزہ ہو ہاتھ میں زلفیں ہوں اور یوں پوچھے
جب نشے کی لہر میں بال اس بری کے کھل گئے
دو میں حُسنِ بیاں کے ہم نے دیکھ لیا بارہا
یہ خدا نے مدتوں میں ہم کو دکھلائی ہے رات
جامِ بھرسا کی کہ قسمت سے ہاتھ آئی ہے رات
وہ تو ٹھہر لئے تھے دن پر ہم نے ٹھہرائی ہے رات
ہنس کے کہتا ہے میاں ہاں وہ بھی بڑائی ہے رات
لے مری جاں بچ کہو تو کتنی اب آئی ہے رات
صبح تک پھر توچم میں کیا ہی لہرائی ہے رات
بُخ سے گھبرا رہے دن زلفوں سے گھبرائی ہے رات
ہے شب وصل آج تو دل بھر کے سووے گا نظیر

اس نے یہ کتنے دنوں میں عیش کی پانی ہے رات

عالم کے بیچ جس گھڑی آتی ہے شبِ برات
دیکھے ہے بندگی میں جسے جاگتا تو پھر
روشن ہیں دل جنھوں کے عبادت کے نور سے
بخششِ خدا کی راہ میں کرتے ہیں جو مجب
خالق کی بندگی کرو اور نیکیوں کے دم
کیا کیا ظہور نور دکھاتی ہے شبِ برات
پھولی نہیں بدن میں سلاتی ہے شبِ برات
اُن کو تمام رات جگاتی ہے شبِ برات
برکت ہمیشہ اُن کی بڑھاتی ہے شبِ برات
یہ بات ہر کسی کو سناتی ہے شبِ برات

خافل نہ بندگی سے ہوا اور خیر سے ذرا
 حُسنِ عمل کرو جو بھلا عاقبت میں ہو
 ہر لحظہ یہ سمجھوں کہ جو جاتی ہے شبِ برات
 سب کو یہ نیک راہ بتاتی ہے شبِ برات
 لے کر امیرِ حمزہ کے ہر بار نام کو
 خلقت کو اُن کی یاد دلاتی ہے شبِ برات
 کیا کیا میں شبِ برات کی خوبی کہوں نظیر
 لاکھوں طرح کی خوبیاں لاتی ہے شبِ برات

ازار بند

چھوٹا بڑا نہ کم نہ منجھولا ازار بند
 گوشت، کتاری، بادلو، مقیش کے سوا
 ہر ایک قدم پہ شوخ کے زانو کے دریا
 جوں ہی کمر سے اس کی مرا ہاتھ لگ گیا
 سنہتے میں ہاتھ میرا کہیں لگ گیا تو وہ
 اور دھونہیں تو پھینک دے ناپاک ہو گیا
 اک دن کہا یہ میں نے کہ سارے جان آپ کا
 سُن کر لگی یہ کہنے کہ داچھڑے چہ خوش
 آجاوے اس طرح سے جو اب ہر کسی کے ہاتھ
 اک رات میرے ساتھ وہ عتار مکر باز
 جب لگئی تو میں نے بھی دہشت میں اس کی
 آخر بڑی تلاش سے اس شوخ کا نظیر

ہے اس پر می کا سب سے امولا ازار بند
 تھا چار تو لے موتی جو تو لا ازار بند
 کھاتا ہے کس جھلک سے جھکولا ازار بند
 لونڈی سے بولی جا مرا دھولا ازار بند
 لونڈی سے بولی جا مرا دھولا ازار بند
 وہ دوسرا جو ہے سو پرولا ازار بند
 ہم نے کچھ مڑے میں نہ کھولا ازار بند
 ایسا بھی کیا میں رکھتی ہوں پولا ازار بند
 ویسا تو کچھ نہیں مرا بھولا ازار بند
 لیٹی چھپا کے اپنا ممو لا ازار بند
 پہلے تو چپکے چپکے ٹھولا ازار بند
 جب آدھی رات گزری تو کھولا ازار بند

کوٹھا

کبھی تو آؤ ہمارے بھی جان کوٹھے پر
 کھڑے جو ہوتے ہو تم آن آن کوٹھے پر
 تمہیں جو شام کو دیکھا تھا بام پر میں نے
 یقین ہے بلکہ مری جاں جب کہ نکلے گی
 مجھے یہ ڈر ہے کسی کی نظر نہ لگ جائے
 بشر تو کیا ہے فرشتے کا جی نعل جاوے
 جھمک دکھا کے ہیں اور بھی پھنسا نا ہے
 تمہیں تو کیا ہے دلیکن مری خرابی ہو
 گوچنے کاری میں ہوتی ہے سرخی تو ایسی
 یہ آرزو ہے کسی دن تو اپنے دل کا درد
 لٹاؤ غیر سے آنکھیں کہو ہو ہم سے آہ
 خدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو
 کیا ہے ہم نے اکبر کا مکان کوٹھے پر
 کر دگے حسن کی کیا تم دوکان کوٹھے پر
 تمام رات رہا میرا دھیان کوٹھے پر
 تو آ رہے گی تمہارے ہی جان کوٹھے پر
 پھر وہ تم کھلے بالوں سے جان کوٹھے پر
 تمہارے حسن کی دیکھ آن بان کوٹھے پر
 جی تو چڑھتے ہو تم جان جان کوٹھے پر
 کسی کا آن پڑے اب جو دھیان کوٹھے پر
 کسی کے خون کا ہے نشان کوٹھے پر
 کریں ہم آن کے تم سے بیان کوٹھے پر
 کہ تھا میں تو تمہارا ہی دھیان کوٹھے پر
 کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر
 کند زلف کی لٹکا کے اس صنم نے نظیر
 چڑھایا مجھے اپنے بدن کوٹھے پر

کوٹھا

رہے جو شب کہ ہم اس گل کے ساتھ کوٹھے پر
 تو کیا ہمارے گزری ہے رات کوٹھے پر

یہ دھوم دھام بھی صبح تک آہا ہا
مکان جو عیش کا ہاتھ آیا غیر سے خالی
گر آیا شور کیا، گایاں دیں، دھوم مچی
لکھیں ہم عیش کی تختی کو کس طرح آجاں
کنڈ زلف کی لٹکا کے دل کو لے لیجے
خدا کے واسطے زینے کی راہ بست لاؤ
کسی کی اُتر ہی ہے جیسے برات کو ٹھہرے
پٹے کے چلنے لگے پھر تو بات کو ٹھہرے
عجب طرح کی ہوئی واردات کو ٹھہرے
قلم زمین کے اوپر دو است کو ٹھہرے
یہ جنس یوں نہیں آنے کی بات کو ٹھہرے
ہمیں بھی کہنی ہے کچھ تم سے بات کو ٹھہرے
لیٹ کے سوئے جو اس گل بدن سے کو ٹھہرے
تمام ہو گئیں حل مشکلات کو ٹھہرے

بہار

گلشن عالم میں جب تشریف لاتی ہے بہار
صبح کو لاکر نسیم دلکش ہر شاخ پر
نونا لوں کی دکھا کر دم نشوونما
بلبلیں چہکاری ہیں شاخ گل پر جا بجا
حوض و فواروں کو نے کر آبر و پھر لطف سے
جنبش باد صبا سے ہو کے ہم دوش نشاط
خلق کو ہر لحظہ اپنے حسن کی رنگت دکھا
مجمع خواباں ہجوم عاشقاں اور جوش گل
گل بیچوں کی دیکھ کر گل بازیاں ہر دم نظیر

رنگ و بو کے حسن کیا کچھ دکھاتی ہے بہار
تازہ تر کس طرح کے گل کھلاتی ہے بہار
جسم میں روح درواں کیا بڑھاتی ہے بہار
بلبلیں کیا فی الحقیقت چہچہاتی ہے بہار
کیا مطر آفرش سبزے کا چھاتی ہے بہار
ساتھ ہر سبزے کے کیا کیا اُٹھاتی ہے بہار
تے نکلت کیا ہی ہر دل میں ساقی ہے بہار
دیکھ ان رنگوں کو کیا کھلکھلاتی ہے بہار
گل ادھر خنداں، ادھر دھو میں پجاتی ہے بہار

آگرہ

رکھتا ہے گو قدیم سے بنیاد آگرہ
 یاں کے کندہ رنادر جگہ کی عمارتیں
 شداد زر لگاتہ بناتا بہشت کو
 توڑے کوئی قلعے کو کوئی لوٹے شہر کو
 اب تو ذرا سا گاؤں ہے بٹی نہ دے اسے
 ایک بارگی تو اب مجھے یارب تو پھر با
 ایک خبر و نہیں ہے یہاں درنہ ایک دن
 ہرگز وطن کی یاد نہ آوے اسے کبھی
 اکبر کے نام سے ہوا آباد آگرہ
 یارو عجب مقام ہے دل شاد آگرہ
 گر جانا کہہ ہووے گا آباد آگرہ
 اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ
 لگتا تھا درنہ چین کا داماد آگرہ
 کرتا ہے اب خدا سے یہ منیر یاد آگرہ
 تھا رشک حسن بلخ و نوشاد آگرہ
 ہو کر کے اپنی جان کو کرے شاد آگرہ
 اس میں سدا خوشی سے رہا ہے ترانہ نظیر
 یارب ہمیشہ رکھو تو آباد آگرہ

پری

رخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری
 جھکے جھکے وہ تریا کے کرن پھول دہ پھول
 رنگ خورشید ہیں، ابرسیہ سی پٹی
 حسن گلزار، قمر شمس، صراحی گردن
 مار غمرے کی بلا، تیرنگہ، دشت سناں
 کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری
 بندے بالے پری، موتی پری، اور کان پری
 لہر چوٹی کی غضب، زلف پریشان پری
 مہ جیں سب ذوق، چاہ زرخندان پری
 تیغ ابرو کی ستم، ترکش مرگان پری

مسکرانے کی اداجیے چمک بجلی کی
 آنکھیں مستی کی بھری شوخ نگاہیں چخیل
 مینی و نتھ کا وہ عالم کہ چھوے دل جس سے
 چاک سینے کا غضب صاف بدن مٹی سا
 دھلکھلکی چاندی، جگنو بھی ستاروں کی مثال
 پشت گلبرگ، شکم سیم، کمر تارنگہ
 گھیرا پشوار کا وہ جس کے کنارے قربان
 کیا کہوں اس کے سراپا کی میں تعریفِ نطیسہ
 قد پری، دھج پری، عالم پری اور شان پری

بنت

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دکھائی
 سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر
 جب رنگ آنی اس کی پوشاک پر نزاکت
 اک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں
 جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنے اس کو
 پھر تو بصد مسرت اور سوز نراکتوں سے
 چیمے کا عطر مل کر موقع سے پھر خوشی ہو
 بن نھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی
 ہنس کر کہا یہ ہم نے اسے جان بسنت آئی
 پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی
 سرسوں کی شاخ پر گل بھر جلاک منگائی
 رنگت کو اس کی اپنی پوشاک سے ملائی
 دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی
 نازک بدن پہ اپنے پوشاک وہ کھپائی
 سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی
 دیکھی بہار گلشن بہر طرب فشرائی

جس جس روش کے اوپر جا کر ہوائیاں
کیا کیا بیاں ہو جیسے
صدر برگ نے صفت کی، نرگس نے تامل
پھر حسن میں چمن کے آیا بہ حسنِ خوبی
اس انجمن میں بیٹھا جب ناز و نمکنت سے
کی مطربوں نے خوش ہو آغازِ نغمہ سازی
کس کس روش سے اپنی آن و ادا دکھائی
وہ زرد پوشی اس کی وہ طرزِ دلربائی
لکھنے کو وصف اس کا اپنی قلم اٹھائی
اور طرفہ تر بسنتی اک انجمنِ بنائی
گلدستہ اس کے آگے ہنسِ ہنسنت لائی
ساتی نے جامِ زریں بھر بھر کے نے پلائی
دیکھ اس کو اور محفل اس کی نظیر ہر دم
کیا کیا بسنت آکر اس وقت جگمگائی

دوالی

دوستو کیا کیا دوالی میں نشاط و عیش ہے
اس طرح ہیں کوجہ و بازار پر نقشِ نگار
گر مجبوشی اپنی با جامِ چراغِ لطف سے
ایل سیر چراغاں خلقِ ہر جا دمبدم
عاشقاں کہتے ہیں مستو توں سے با عجزِ دنیا ز
گر کمرِ عرض کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ توخ
کہتے ہیں اہلِ تمار آپس میں ہو گرمِ اختلاط
جیت کا پڑتا ہے جس کا داؤں وہ کہتا ہے پو
ہیں سہسہیں بھی یوں تو زینت و فرحتِ نظیر
سب ہیما ہے جو اس ہنگامِ کنایاں سے
ہو عیاں حسنِ نگارستانِ چیں کی جن سے لے
کیا ہی روشن کر رہی ہے ہر طرفِ رخس کی
حاصلِ نظارہ حسنِ شمعِ رویاں پلے بہ پلے
ہے اگر منظور کچھ لینا تو حاضر ہیں روپے
ہم نہیں لیتے نیاں تکرار و حجت تا بہ شکے
ہم تو ڈب میں سو روپے رکھتے ہیں تم رکھتے ہو گے
سوئے دست راستہ، میرے کوئی فرخندہ ہے
پر دوالی بھی عجب پاکیزہ تر تھوار ہے

خرپوزے

اب تو بازار کے ہیں زریب فرخربوزے
 قند و مصری کی حلاوت تو عیاں ہے لیکن
 دلکش اتنے ہیں کہ بازار میں لینے ترپوز
 ناشپاتی کو لگا کر اگر امروہ و انار
 سو بڑھلے کے کھل بھی اگر آوے بل کر
 یار آیا تو کہا ہم نے منگواویں لڑو
 کھنیاں فالے منگواویں تو جھجھلا کے کہا
 ہم نے دیکھا کہ ادھر رغبت خاطر ہے بہت
 چھوڑا سیب فتن کو تو کہا واہ چہ خوش
 اب کے متقا لوئے بسے کوئی لوگے بوسہ
 ہنسی جوڑے ہوں اور ب کو ہم پہنچیں بہت
 سو نظیر ایسے تو ترپوز ہیں یا خربوزے

سمدھن

سراپا حسن سمدھن کا گویا گلشن کی کیاری ہے
 کلینچی گنگھی گونڈھی چوٹی، جمی پٹی، لگا کاجل
 کماں ابرو و نظ جادو نگہ ہر ایک دولاری ہے
 بدن موتی، دہن عجب ادا سنسنے کی پیاری ہے

کیجیں تصویر سی جن پر لگا گولہ کنساری ہے
 اٹھا سینہ صفا پیڑ و عجب جون کی ناری ہے
 کہوں کیا آگے اب اس کے مقام پر وہ داری ہے
 ادا میں دل لئے جاتی عجب سمدھن ہماری ہے
 کمر لٹکنے سے بل کھاتی، لٹک گھونٹ کی بیاری ہے
 ہیں سمدھن کی خدمت میں بہت مدت باری ہے
 مگر اس عین مطلب کی رہی امید واری ہے

لکھی تو نے نظیر ایسی غزل، اب وصف سمدھن میں
 مصور نے گویا تصویر بنک سک کی اتاری ہے

سمدھن

لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی
 اگر دیکھیں ذرا صورت گل دریاں سمدھن کی
 نظر چنل ادا اچھل میہ ہے بچان سمدھن کی
 چکتا حسن جون کا جھلکتی آن سمدھن کی
 فضا زانو کا آئینہ، ملائم ران سمدھن کی
 صفت منظور ہے ہم کو تو اب ہر آن سمدھن کی
 میسر ہوا اگر صحبت ہیل ایک آن سمدھن کی
 جو کچھ لٹکنے کے اندر چیز ہے پنہان سمدھن کی

نیا کجواب کا لنگا، جھلکتی تاش کی انگیا
 ملائم پیٹ غل سا اگلی سی ناف کی صورت
 سر پر نازک کمر تلی، خط گلزار ردما دل
 لٹکتی چال سدھماتی سچلے بچھوں کو چھٹکا تی
 پھرے جون پہ اتراتی جھمک انگیا کی دکھلا تی
 تمہیں کیا ہے خبر اس بات کی سنتے ہو سدھی جی
 بنے بولے ہو ادا دل شاد بوسے بھی لئے ہم نے

کردوں کس منہ اب یار ویاں میں شان سمدھن کی
 چمن میں جن کے ہوں اس کے رخ اور زلف پر قربا
 کمر نازک، ملکتی چال، آنکھیں شوخ اتن گورا
 سنہری تاش کا لٹنگا، رو پہلے گوٹ کی انگیا
 ملائی سا شلم، سینہ مصفا، خوش نساقین
 کہوں کچھ اور ابھی آگے جو سمدھن حکم فرما دیں
 بڑا احسان مانیں ہم تمہارا آج سدھی جی
 ہیں ایک دو گھڑی کے واسطے ● دلاؤ دم

نظیر اب آفریں ہے یا تیری طبع کو ہر دم
کمی تعریف تو نے خوب عالی شان سدھن کی

موتی .

پر زادوں میں ہے نام خدا جس شان موتی
بھٹک جاوے نگاہوں میں جواہر خانہ قدرت
رنگ گل اس کمر کے سامنے بھرتی پھرے پانی
ادھر ہر ایک نگاہ پر موتیوں کے ڈھیر چلا دیں
صدائیں کر ہر ایک کی چشم سے موتی ٹپکتے ہیں
عجب نقشہ عجب سب دھج عجب آنکھیں عجب نظریں
شرف پے کپتے پر شرف ہی سے کوہ شرف پر
ہر ایک دندان موتی احسن موتی نام بھی موتی
جو خوبان بے نظیر اس دور میں ہیں نازک و رنگیں
شرف رکھتی ہے یا ردا اب تو سب کے حُسن پر موتی

آرسی

بنو کے ایک آرسی ہم نے کہا کہ لو قطعہ
لے کر بڑے دماغ سے اور دیکھ یک بہ یک
جھنجھلا کے دور پھینک دی اور یوں کہا کہ خوش
پکڑی کلائی اس کی جو وہ شاخا رسی
تیوری چڑھا کے ناز میں کچھ کر کے عارسی
ہم مارتے ہیں ایسی انگوٹھے پہ آرسی

چند تخلصیں اور مستزاد

خمسہ برغزل سعدی

کل ہم جو گئے بلخ میں ملک لطف اٹھانے اور دل کو لگے سیر گشتاں کی دکھانے
 اتنے میں کہوں کیا تجھے اے یار یگانے برہو دلم در چہنہ سرو روانے
 زریں کمرے، سیم برے، موئے میانے
 وہ شوخ کہ عالم میں نہ دیکھا ہو کسی نے وہ حسن کہ نے حور نے پایا نہ پری نے
 کیا تجھ سے کہوں اس کی میں خوبی کے قریبے خورشید رُخے، ماہ و شے، نہ ہرہ جبینے
 یا قوت لے، تنگ دے، تنگ دہانے
 گلغام، گل اندام، دلارام، نکوئے دلدار، دل آزار، جفا کار، دور دے
 آہو صفتے، کبک تنگے، عنبریں موئے بیداد گرے، کج کلے، عربہ جوئے

شکر شکنے، تیر قدے، سخت کمانے
 ابر و خم طاق حرم و زلف کُنشتے قدرِ رخِ دلِ طوبی و رخِ رشکِ بہشتے
 قلِ نقشِ سدیدائے دل و خطاب کشتے جادوِ نظرے، غنّوہ گرے، حسنِ سرشتے
 آسیبِ دے، رنجِ تنے، آفتِ جانے
 وہ رخ کہ ہر اک شوخ پر بزد کو شہ دے وہ زلف کہ سنبل جیسے بیتاب ہو کہہ دے
 گرجو بھی دیکھے تو اُسے جان میں دے عیسے لفسے خضر رہے، یوسفِ عہد دے
 حجمِ مرتبہ، تاجورے، شاہِ جہانے
 شمشیر نگہ، تیرہ منزہ قاتلِ خلقے غارت گر و برباد وہ حاصلِ خلقے
 مشہورِ جہاں، افتنہ جاں، مقلِ خلقے تنگ شکرے، چوں شکرے دردِ خلقے
 شوخے، عینے، چوٹک شورِ جہانے
 کیا اس کی میں تعریفِ اکوئیں ادا کی ہے ختمِ دو عالم کی اُسی شوخ پہ خونی
 پھر مثلِ نظیر اس بتِ رعنا سے لگا جی بے زلف و رخِ دلِ لبِ اوشدہ سَوئی
 آہے و بُجارے و غبارے و دُخانے

خمسہ بر غلِ خسرو

کب لالہ و گل کر سکیں عارض سے تیر ہمِ مری قد سے نخلِ سرو سہی، رفتار سے کبکِ مری
 محبوبِ تجھ سے یکھ لیں نازِ داد او دلبری اسے چہرہ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری
 ہر چند و صفتِ می کُفر، درُخِ زانِ زیبِ تری
 ہے شوخِ حنِ کالے کز زینِ سچرخِ تک دلِ اتِ صحتِ کو تری نہیں مٹ رہتے ہیں تک

دیکھے ہے جو تیرے تئیں کتا ہی کے ایک بیک
 تانقش می بند فلک کس اندہ داد است اینک
 جو رے نہ دانم یا ملک منہ زند آدم یاری
 تیرا رخ لے رغا صنم بھر کر نظر دیکھے ہے جو
 کھو دین وایماں کے تئیں باندھے، وہ زار کو
 دیوانے تیرے عشق میں دل سے نہیں کچھ ایک د
 عالم ہمہ لیناے تو خلق ہمہ شیداے تو
 ایں نرگس شیداے تو آورد رسم کافری
 ہے خلق و خوبی میں بھر اس طور سے وہ از نہیں
 بھڑا دمانی دیکھتے تو ہوتے وہ حیرت قرین
 گراں بیان کے راست کا آتا نہیچ کو قشیں
 صورت گر نقاش حیں رو صورت یارم بہ بنیں
 بصورتے کش ایں حیں یا ترک کن صورت گری
 ہیں خلق میں ہر سوعیاں رنگیں ادا زیبا صنم
 گلاں تبا، نازک بدن، زوید زینت سے بہم
 کی غور تو سچ ہے ہی مجھ کو محبت کی قسم
 آفا تھا گردیدہ ام ہر بہتیاں و زیدہ ام
 بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیز سے دیگر
 آیا نظر جس روز سے تجھ سا شکر بے لقا
 ابرو تگیاں، جادو نظر شیریں سخن اور عشوہ
 اپنے وطن کو چھوڑ کر مثل نظیر مبتلا
 خسرو غریب ست گدا افتادہ در شہر شما
 باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

خمسہ برغزل حافظ

کہاں وہ کی قبادی کا رخا نہ کہاں وہ مے، وہ جام خسروانہ
 کہوں کیا تجھ سے لے یار لیگانہ سحر گاہانہ مخمور شبانہ
 گر فتم بادہ، با چنگ و چھانہ

بڑا جب گوش میں وہ نالہ سنے تو سو جی اور ہی عالم کی اک شے
 ہوئی مستی دم ہوشی جو درپے نہاد م عقل راہ تو ستہ از سے
 بہ ملک عاقبت کردم روانہ
 کیا پہلے ہی ساغر نے یہ دل شاد کہ سر اپنا رہا مجھ کو نہ پایاد
 تو تجھ کو کر کے دریا یک جام امداد نگارے می فروشم عشوہ داد
 کہ امین گشتم از مکر زمانہ
 ہوا جب میں نہایت شاد و خرم تو رکھ کر سر قدم پر اس کے ہر دم
 کہا میں نے اُسے لے ساقی جم بہ دہشتی سے تا خوش سراپیم
 دریں دریائے ناپید اکرا نہ
 کیا ہے گر مجھے منزل سے محرم تو رستے میں نہ چھوڑے خضر عالم
 کہا جب میں نے یہ نکتہ تو اس دم ز ساقی کہاں ابرو شنیدم
 کہ لے تیر ملامت را نشانہ
 یہ باریک ہے اور تو ہے فربہ کمان اس عزم کی ہرگز نہ کرو نہ
 گمان و دہم کی جاگہ نہیں یہ برواں دام بر مرغ دگر نہ
 کہ عنقا را بلند است آشیانہ
 اگر ہے تجھ کو اس رہ سے سرکار تو ہو سب ماسوا تارک آیار
 نہ رکھو ہون خودی کی کچھ خبر دار نہ بندی زان میاں طوق مکر دار
 اگر خود را نہ بینی در میانہ
 وہی عاشق وہی معشوق دلچوست وہی بواور وہی مغز اور وہی پوست

دہی حامی، دہی دشمن ہی دوست شرابِ شاہد و ساقی ہمہ اوست
 خیالِ آبِ دگل در رہ بہانہ
 نظیرِ آبِ چول تو شیدائیتِ حافظ تنِ خاکی عجب جایستِ حافظ
 نہ در یاد نہ صحرائیتِ حافظ وجودِ مامعنائیتِ حافظ
 کہ تحقیقش فسون است و فسانہ

خمسہ بر غزلِ خود

قمرِ خجل ہو انہوں کی تھلک نہ دیکھ سکا سنہرے رنگ کی کندینِ ڈلک نہ دیکھ سکا
 گہر بھی لب کے سخن کی ڈھلک نہ دیکھ سکا ترے جمال کی سوچ جھلک نہ دیکھ سکا
 کھلی نقاب رہی جب تھلک نہ دیکھ سکا
 ترے الم میں نہ ہو دخل سو دھورت کو نہ ہمسری ہو کبھی صاف سے کہ دھرت کو
 ملاپ تجھ سے کہاں ہے دگل کی صورت کو تودہ ہے نورِ سراپا کہ تیری صورت کو
 بشر تو کیا ہے مری جاں ملک نہ دیکھ سکا
 غمِ فراق میں جینے سے ہم جو اکتائے ندانِ یام کے کوچے میں جا کے کام آئے
 تو داں بھی ذرے ہمارے ہوانے اڑوائے گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھرنے پائے
 ہمیں تو آہِ فلک یاں تھلک نہ دیکھ سکا
 ہوا ہوں سوکھ کے کانٹا میں بھر میں ورو نہ بال اور نہ کمرِ اب مرے مقابل ہو
 کمالِ ضعف کا اپنے میں کیا کہوں یارو یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو
 تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا

پڑا ہے آہ مجھے جب سے شوخ سے بلا
 نہ جی کو چین ہوا اور نہ دل نے سکھ پایا
 لگا لگائے نگاہوں کا تیر اور بھلا
 گھڑی تو دل کو پر دیا گھڑی جگر چھیدا
 کبھی خوشی وہ مجھے ایک بل نہ دیکھ سکا
 ابھی تو آہِ جنوں میں شراب ہے باقی
 ہمارے بار کو ظالم یہ چین مشتاقی
 لگا لگھٹانے جواب نے کو دمدم ساقی
 ہمارے جام کی شاید جھلک نہ دیکھ سکا
 کبھی ایدھر کو جو قاصد ترا گزر ہو دے
 ویا کہ راہ میں جاتے کہیں تجھے وہ لے
 تو آہ بھر کے یہ کہو تو اس پر پیرو سے
 نظیر تجھ سے نہ ہوتا کبھی جدا پیار سے
 مگر یہ عشقِ احد سے فلک نہ دیکھ سکا

خمسہ بر غزل سہراج

کھلی جب کہ چشمِ دلِ حزیں تو وہ غم رہا نہ تری رہی
 ہوئی حیرت ایسی کچھ آن کر کہ اثر کی بے اثری رہی
 پڑی گوشِ جان کیں عجب نذاکہ جگر نہ بے جگری رہی
 خبرِ خیرِ عشقِ سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
 نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
 ہوئیں کیا ہی دل کو فراغتیں گئی جب قیدِ لباس کی
 نہ ہوئے اطلس و گلستان نہ تلاشِ بادِ روزری
 کوئی پہنویا کہ نہ پہنویا غرض اس کو جانے بلا مری
 شہرِ بخود نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
 نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
 کسی وقت مکتبِ عقل میں بہت علم ہم نے بھی تھا پڑھا
 کہ ہر اک سے حجتِ بحث تھی سو اس علم کا یہ کمال تھا
 گیا جب کہ مدرسہ عشق میں تو اب آگے یار و کموں میں کیا
 وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درسِ نسخہ عشق کا

کہ کتاب عقل کی طاق میں جو دھری تھی وہ میں نہری رہی
 ترے منہ پہ اب تو ہے وہ جھلک جہاں توجہ کے نہاں
 اگر کتاب جمال تھا تجھے دیکھ وہ بھی نہساں ہوا
 کوئی آگے تیرے نہ آسکا وہ فکر کہ مہر نشاں ہوا
 کہ نہ آئے میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی
 عجب اتفاق ہے خود بخود مجھے دل سے عشق نکلا
 پڑی آگ غم کی وہ تن میں آ کہ بہ رنگ شمع گھل گیا
 اُدھر آہ شعلہ زناں ہوئی اُدھر اشک آنکھوں سے ڈھل گیا
 جلی مت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
 مگر ایک شاخ نہال غم ہے دل نہیں سوہری رہی
 کرے عشق اب وہ جہاں میں کہ سبھوں سے بیٹھے ہاتھ دلو
 نہ کسی کے ڈر سے چھپے کہیں نہ کسی کے خوف سے دیوے و
 اسے کچھ کسی کی خبر نہیں ہوا اب تو مثل نظیر وہ
 تیرے درد عشق میں لے لے مہاں دل بیوے سراج کو
 نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سوئے بھری نہی

مستزاد

ساتی مری آغوش میں ہے آج وہ دلبر یہ وصل کی ہے شب
 جلدی سے نکلا بی سے گھٹوں کی اٹھا کر بھر جام لبالب
 عطر و گل و قفس و شب و تاب و لب بام اور مجمعِ خواب
 اباب جو ہیں فرحت و عشرت کے سر اسر اس وقت وہ ہیں سب
 سینے میں تری لب میں منہی جان میں شادی نظروں میں بہاریں
 آنکھوں میں نشے دل میں خوشی میں سن بڑ کیا عیش ہیں مطلب
 زکین در و دیوار ہیں اور محن میں ہر جا ہیں ڈھیر گلوں کے
 اس حسرت گزار کے آنے سے مرا گھر ہے رشک چمن اب

راتی کی ادا دل کو ادھر کھینچے ہے کیا کیا، ہر جسم کے ہمراہ
چھینیں میں ادھر صبر و خرد و ناز سے ہنس کر محبوب شکر لب
دلت سے نظیر عشق کی سرکار سے بارے طالع کی مدد سے
عشرت کی ہوئی ہے مری جاگیر مقرر اور عیش کا منصب

مستقر ۱۲

کرتا ہے نگاہوں کو ترا مطلع انوار یہ مہر نذران
کس کا ہے بتا نام نہ ایسا جھک دار لے تیرے سوانح
دل تڑپے ہے اور آنکھیں کھلی رہتی ہیں انات فرقت کے الم سے
وہ کون سا دن ہوگا مبارک چہم لے یا ز دیخیں گے ترا رخ

ہفتاب کی کیا تاب جو ہو تیرے مقابل اسے شک سے مہر
غورید بھی دیکھے ہو تیرے منہ کو تو یک بار چھپ جا کہ بتاؤں
دلت سے ترستے ہیں ترے دیکھنے کو ہم ڈر کچھ تو خدا سے
زلفوں کے تئیں کھول کے اے دہر عیار امت ہم سے چھپاؤں

آئینہ ترے دیکھ کے عارض کی صفائی رہ جاتا ہے حیراں
رکھتا ہے تراحن میں اسے حسرت گلزار یہ جن صفاؤں
اتنا کوئی کتا میں اس شوخ سے جا کر افسوس صد افسوس
مرتا ہے ترے ہجر میں ایک طالب دیدار تک اس کو دکھائوں

کیونکہ نہ بھلائیے کو دل دیکھے نظیر آہ ہو جن میں جس کا
لب روح فراغ عشق و تم ناز فوس کار اور ہوش برائے

فوق

فرہنگ

۱۔ الہی نامہ

طور۔ قسم	کشف۔ پوشیدہ حالات جاننا	مکھاٹھ۔ سامان۔ انتظام
وفاقی۔ وفادار	زنا۔ زنا۔ جینیو	ہو حق۔ نیست نابود۔ فنا فی اللہ
ملک۔ ذرا	کرامات۔ خلاف عادتیں۔ بجز قیام۔ آزاد	خبثیات۔ بد روئیں
ایہام۔ ایک صفت شعر کا نام ہے۔	مستور۔ پوشیدہ	سماوات۔ آسمان
	خسرہ۔ پٹواری کا کاغذ۔ سند آگے۔ پیشتر	

۲۔ برسات کی بھارتی

جھڑ۔ پیہم پر سنا	امنڈ۔ جمع ہو کر غل کرنا	ڈوڈ۔ جوش مارنا	ڈاڑ۔ چٹھے
------------------	-------------------------	----------------	-----------

گھٹاوت - حن	جنگل - جنگل	سوگن - فرقت زدہ	گھنٹہ - یکجا ہونا - جمع ہونا
چھک - بدست	سنگ - ہمراہ	برہ - درد فرقت	ٹکوریں - ٹکڑیاں
کھوٹی - بوسے کی چادر	اسارا - چھپر کا دالان	برہن - ہجو عورت	ملا - برسات کا گیت
نکھوٹا - نالائق	دوانا - باگن - دیوانہ	سُده - خبر	زٹل - بہودہ آواز
کنے - پاس	ٹاری - چھپر کا بالا خانہ	امڈی - بھری	یج - بستر
رت - موسم	ندان - آخر کار	ماروجی - جنگو - عاشق	سوہن - زیب دینا - سرخ
اکس - اٹھنا	کیڑا - سانپ	رین - رات	اہرن - بوشاک

۳۔ بنجارس مینا

گرٹھ - چھوٹا قلعہ	دھی پوت - ہونما فرزند	دھن - دولت	پرہیں - پردیس
رہنکھ - چھوٹی توپ	جنوائی - داماد	ناتی - واسہ	گوئیں - جمع ہے گن کی بمعنی
دانی - دودھ پلانے والی	کھپنی - تباہ ہونی - برباد ہونی	ڈنڈا - لاؤشکر	بدری بوری
رضاعی ماں	چوپاری - بالا خانے کا کمرہ	بھانڈا - بھرم دکھاوٹ کا	پلا - تھیلا، ترازو کا پلا
ودا - کھلانے والی	جس میں چار کھڑکیاں	سامان -	سر بھارا - سر پر رکھے کا تھیلا
چیلہ - شاگرد	ہوں -	کھانڈا - غالباً کسی پرانے	لکھی - لکھتی
بھونگا - جھوٹے چھوٹا	بان - تیر	ہتیار کا نام ہے -	چتر - بہتر
کیڑا -	تاش تھامی - ایک قدیم کپڑا	ٹایک - سپاہی - جان - روح	داکھ - کشمٹ
	کوٹ - عمارت - محل	ہانڈا - سیاح - پھرنے والا	کیمسر - زعفران
	رند - دیوار قلعہ کے موٹے	ڈھل - گھڑنا	

۴۔ عاشق نامہ

نیزنگ - عجائبات نت - ہمیشہ راہیل - راہے ہیل سپل - نام تیار بھاری بوجھ حال - عالم بخودی وجدان حرم - کعبہ مسجد	پوتھی - مقدس کتاب سماچار - حالات و دیات وار - اس کنارے پر سحر - تسبیح بھوگی - عیاش غنی سوگی - بھور و فرقت زدہ	سیکنڈ - جنت دیوات - بتوں شہباز غالب رہات ہے جس کے معنی بلند سی اور تیرہ ہیں سکناات - خوشی سکون مرگانگ - کشتہ	جیب - زبان وانگ - بال، سہارا تھانگ - نقب مایا - طلسم خیال
---	--	---	--

۵۔ اسی حق نامہ

بے نوا - محتاج گمنا - مشہور بر ملا - گفتار گھٹا حسن - نیکی، اچھائی	قج - عیب زور - عزیز، چالاکی، ریا ہادی - رہنا امام - پیش نماز، پیشوا	تاڑتا - پہچانتا، بھانپتا نقیب - اعلان کرنے والا چاکر - نوکر مزدور - مزدور	جاضرور - پانخانہ ڈائرسے - بھیرے شنگ - طرحدار مرید - شاگرد
---	--	--	--

۶۔ ہنس نامہ

سمندر - سفید رنگ طور - قسم سوارا - بنانا، سجا	جاہت - محبت چنگ - ایک ایرانی بابج کا نام سیرغ - رخ، ہوا، عطا، موسیق	نکس کی طرح رد مان کا پرند ہے - مدار - خاطر مدارات	برستے - بڑی آگ کا ایک پڑہ غش - مہوٹ کھچی - پسند آئی
---	---	---	---

چھانپو۔ شرمیلی۔ ایکہ نہ لانا ہے	دارا۔ نثار کیا	پنکھ۔ پکر	رے۔ کیفیت۔ حالت
جھپ۔ نوراً	پیت۔ محبت	پسارا۔ پھیلایا	نرباد۔ نباہ
بہری۔ بہودی	سہارا۔ برداشت کیا	کرارا۔ مضبوط	سدرھارا۔ روانہ ہوا

۴۔ روضہ تاج گنج

گزیاں۔ چھوٹے گنبد	باس۔ خوشبو	سہاگ۔ نازگی، شگفتگی	سہر و سہی۔ بدست سرو
اساس۔ مضبوط	مخمر۔ جالیاں	محلی۔ چکیلا	شکر شکن۔ خوش آواز

۵۔ تند رستی نامہ

حزمت۔ عزت	میری۔ سرداری	بنے ٹھنے۔ خوبصورت لکھے ہوئے	تن۔ بدن
سدا۔ ہمیشہ	مین۔ مخصوص	بنے۔ دولہا	گل۔ مشین
چلن۔ چال چلن	سہر بسر۔ بالکل	روہیں۔ نوراً، اسی دم	کل۔ آرام
تئیں۔ واسطے اکوٹے	نباہ۔ بسر اوقات	سو۔ وہ	چل پیر چل۔ بیکار

۶۔ ذکر مرغان

ہستوں۔ خدا	بچوں۔ خدا جس کے وجود میں	کلپتے۔ ترپتے، یچیں رہتے	سوی۔ سرخ
ساجھ۔ شام	کوئی ٹنگ و شبہ	ہیں۔	تخم۔ بچ
کیر۔ صبح	نہیں	چیتے۔ دھراتے	پنکھی۔ پرند
	پتنے۔ جلنے	واذر۔ بینڈاک	

۱۔ فنا نامہ

افسر تاج	شکر کو کہتے ہیں۔	پوشش۔	پران۔ ہنود کی ایک مقدس کتاب۔
سرور۔ سردار	خاصہ۔ مخصوص	سلاح ہتیار	کانام ہے۔
دہائی۔ حکومت	جلیب۔ چلنے والا	بکتر۔ زرہ، لوہے کا بنا ہوا جاکٹ	عالم۔
مورچہ۔ محفوظ مقام، قلعہ	مرمر۔ بیشکل	گنڈا۔ بد معاش شہدا	نویسے۔ نئے
شکر۔ شکر	لبیدہ۔ سوٹا، آگ، پسنا	ہاتھکا۔ رنگیلا سپاہی، وضعدار	جنگم۔ ایک قسم کا فقیر جس کے سر پر جٹائیں ہوتی ہیں اور ہاتھ میں سوٹا۔
جھپاں۔ ایک قسم کی عاریٹ	مردھا۔ مرد بہن دس جوان کے	سپر۔ دُعاں۔	سید۔ شہدائیک تھاہیوں کی سیدوٹا۔ جن فریب کا فقیر
پالکی۔	افسر ایک عہدہ دار جو سرکار کی طرف سے دیہاتیوں پر نذر کیا جاتا ہے	کچا رکے۔ سوچے	امطلاح میں گیت کو چٹا۔ بالوں کا چٹھا۔
میگ ڈنبر۔ ایک قسم کی گاڑی۔	چیمہ۔ ایک قسم کا صاف	کہتے ہیں۔	ہاتھکا۔ چٹلا
مہر چھاپا۔ حکم، عمل	نوجدار۔ افسر پولیس کا عہدہ	وید۔ اہل ہنود کی مقدس کتاب۔	گر۔ آتش پرست
لنگ۔ زبان ناڈواڑی میں	خود۔ لڑائی کے وقت سر	یہ چار ہیں۔	نقاش۔ صورت گر

۱۱۔ طفی

منت۔ مراد	بگڑنا۔ خفا ہونا	اونٹنے۔ پھیلاتے	سلوٹا۔ نیکیں
دول۔ ویسے، ہر طرح	گھرنا۔ قید	کھونٹے۔ کھینچتے	بھونپو۔ منہ سے بکھنے والا باجا

۱۲۔ جوانی

دنگ۔ حیران	گل۔ زخم	سیف۔ تلوار	پہل بل۔ غمزدگی
پھندے میں۔ گرفتار	سین۔ اشارہ، آنکھ کا اشارہ	جاو۔ آؤ بھگت، خوشی	چوں۔ مثل
مجنون۔ نشہ کی ایک قسم ہے	نین۔ آنکھ	بھاؤ۔ نرد کرنا	پن۔ زمانہ، عالم

۱۳۔ بڑھاپا

کنے۔ پاس	لنڈو لے۔ بے دم	لگاؤ۔ محبت، تعلق	پڑکا نام ہے۔
ردکھ۔ درخت	پھکڑی۔ نفیست	چاہت۔ محبت	پات۔ پتہ
پت جھڑ۔ خزاں	مت۔ عقل	لت۔ عادت	بھبھو کے۔ سفید گورے
ادھو لے۔ بیکار، لاچار، پانچ	جگت۔ بھبتی	ڈھاک۔ ایک ہندوستانی	چاد۔ محبت، لوازش

۱۴۔ فقیہان کی صلا

بشار۔ رہزن	دان۔ خیرات	پڑمرد	آئند۔ آرام
بس۔ قابو	بھاجی۔ مرنے کا کھانا جو	لاجر۔ دلچسپی، حرص	پھند۔ مکر و فریب
من طبیعت، قلب، دل	اعتر کرتے ہیں۔	کرنی۔ افعال، اعمال	ارتھی۔ خازنہ
بلج چکا۔ بچ چکا	ناکند۔ دشمنی، بد لگام	سکھ۔ آرام	ہستی۔ باقی
پن۔ خیرات	ہلکان۔ پریشان، نیم جان	جنتی۔ گھلاتی	سواری۔ سواری

۱۵۔ خوشامد

ڈھب۔ ڈھنگ، انداز	بج۔ اندر	آشنا۔ شناسا	پیر۔ مرشد، ولی
	سروکار۔ تعلق	خرابی۔ بزدل	

۱۶۔ کلجگ

کرجگ۔ جائے عمل، جائے	پرکھا۔ تنقید پرکھ، پہچان	چیتے۔ چاہے	طوفان۔ بہتان
مکافات	تیل۔ ذرہ، ذرہ	کل۔ آرام، چین	جاگہ۔ جگہ، مقام
بیکھا۔ شمار	لیکھا۔ تحریر	کلیاوسے گا۔ دکھ دے گا	باک۔ خون، ہشیاری
تس۔ اس	پڑا۔ محسوس	آن۔ ذرا سی دیر	

۱۷۔ مفلسی

جپاتی۔ شرمندہ کراتی	پکھڑیاں۔ خواریاں، ذلتیں	گوری۔ ایک راگنی کا نام ہے	ٹھٹھول۔ مذاق
ان۔ حیمت، غیرت	جھکڑیاں۔ خاردار درخت	بھیاں۔ ایک راگنی کا نام ہے	چدر۔ چادر
ست۔ طاقت، نیرو، برکت	برے۔ دوسرے بڑے، بڑے	بول بول۔ منت، ان کر	نجابت۔ حسب نسب کی درستی
گزر گئی۔ مر گئی	کھلا نوٹ۔ گویا	حلال خوری۔ منتہانی	ندان۔ آخر کار

۱۸۔ معجزہ خضر علیہ السلام

بہی۔ بھگی	جنی۔ پیدا کرنا	جیب۔ زبان	عنقریب۔ قریب
-----------	----------------	-----------	--------------

بغیر آواز شوم - بد، نحس	قدیم - سلف، ہمیشہ سے کھپاتی - نائل کرتی	کرم نہاد - بخشش کرنے والے، محسن	نا تمام - عاجز
----------------------------	--	------------------------------------	----------------

۱۹۔ دوالی

دیا - چراغ کھلونے - شکر کے کھلونے گنڈے - پانچ کوڑی گرو - رہن	نئی موٹھی - ایک قسم جوے کی نرد - چوسر کی گوٹ زارا - تباہ حال ازار - پا جامہ	نوگرہی - ایک زیور کا نام ہے گھڑوے - ملامت جھوٹے - بال خدی - چھال	فیر - نشانہ لگانا آڑے آنا - دستگیر ہونا کھانیو - اختیار کرنا کھانیو - بیان کرنا
---	--	---	--

۲۰۔ حضرت سلیم چشتی

دو جہاں - دنیا و عقبی عرفان - تصویق، خدا شناسی	لوا - جھنڈا، علم مقتدا - پیشوا	مسلم - ثابت سالک - چلنے والے رشاگرد	تفاوت - فرق دو جگہ - دو جہاں
---	-----------------------------------	--	---------------------------------

۲۱۔ ہولی کی بھاس

دھ - ایک ایرانی باجا ڈھول دھکتے - روشن، چمکدار چمکتے - مست	آہنگ - آواز، سر منہ چنگ - ایک منہ سے بچنے کا پاچا خوبوں - معشوق، حسین ٹوہلوں - شرابور	بھوئیے - بھاڑ، بھاؤ بتا کر ناچنے والے لونڈے چھکڑ - ہنگام چھکڑ - بد لگام، یا وہ گو لکڑی - لکڑی کا بڑا موٹا ٹکڑا	جواگ کے لئے سنگ ہے - شرابور، لہسا ہوا غلط
---	---	--	--

۲۲- نانکشاہ گرو

آگاہ - مارن	نوا - بھاکر	سیوک - خادم، پرستار	کرتے -
جگ - دنیا	ارداس - عرض داشت	کاج - خواہش - آرزو	چنا - تردد، اضطراب
نیلس - سر	ونج - بیچ	من - دل	ہرتے - دور کرتے ہیں
	دھیان - خیال	گہتے - ہاتھ پکڑتے، ڈنگیری	وو - وہ

۲۳- جنم کنھیا جی

ریت - رسم و رواج	ابکار - حرکات، افعال	دوجا - دوسرا	پرکھ - عاقل، دانا
جنم - زمانہ	یل - زور	بلی - قوی، طاقت ور	مارن ہارا - مارنے والا
بالا - بچہ، طفل	یج - رعب	بان - تیر	قاتل
منڈل - مکان	انیک - انواع اقسام	بڑھیل - مشہور، طاقتور	مورکھ - شیطان، گنہگار
بتھا - رنج و غم	ڈیل - جسم	ڈوشٹ - بد ذات، شیطان	ہنکار لیا - غرور کرنا، تعلیٰ کرنا
پنچھتر - ساعت	تج - ہاتھی	جدہ - تعلیٰ	بکھو - ڈرا، خوف
اوتار - پیغمبر	ترنگ - گھوڑے	موں - مجھ پر	سگرے - سارے
بہہ - نیک سہ	نیکے - عمدہ، اعلیٰ	وا - اس	بسرے - زائل ہوئے
گرہہ - حل	پانی - گنہگار	بول - باتیں	مات پتا - ماں باپ
نارومن - روشن ضمیر	کنٹ دل - بے شمار فوج	گرہہ - غرور	ناؤں - نام
شست - عالم	بج - شکل و شبہات	سبھا - انجمن	ریکھا - لکیر

پاچھے - پیچھے، آخر میں	اجالی - روشنی	پگ - پاؤں	نیگ - حق
نارگ - چارہ، طریقہ	گھیر - جمع کرنا	براجے - پہنچے، رونق افروز ہوئے	بہن - بہن
پھند - جال	باشتی - بانیدے	ہوئے	تہارے - تمہارے
نکسن - نکلنے	دیا - عنایت	اجالی - اُجالا	بڑھ بھالگی - خوش قسمت
رسوئی - طعام، کھانے پکانے	حال - فوراً	دیوے - چراغ	موہر - مجھ
کامکان -	کرم - قسمت	چنبھا - عجیب بات	کر یا - نوازش
دوار - دروازہ	گکھ - منہ	بھور - صبح	باغے - وہ جوڑے جو سرد
ہارے - والے	ایشر - خدا	لجیا یا - شرمایا	کو دے جائیں
وا - وہ	سانکر - سائل، زنجیر دار	کارج - کام	لوگ لگائی - مرد
چنڈال - بد ذات	کنڈی	ناری - عورت	عورت
شیطان	زبھو - بے خوف	جچا - زچہ	پر جاتے - خوش رکھتے
پر گھٹ - بدائش	پتا - اضطراب، مصیبت	بھاری - تصدق، نثار	

۲۲۔ بانسری

مرلی - بانسری	کوڑھ - گند ذہن	بنسی - بانسری	موہن - پیارے
میت - محبت	گنی - عاتل	پنچھی ٹوہی - چڑیوں کے	جتن - طریقے، ڈھب
بیاکلی - اضطراب	کانہرجی - کنہیا جی	نام ہیں	بچن وروو
بے چینی	گوالوں - چرواہوں	شیام جی - کرشن جی	چل پون - پاؤں چلنے والا
	گوئیں - گائیں	مرارہ - بانسری	

۲۵۔ اگرہ کی تیراکی

پیرنے۔ تیرنے	بستار۔ کرتب	چوہ۔ کشتی	کشتی
رت۔ موسم	کرارے۔ کنارے	ڈونگے۔ سیر و تفریح کی	نواڑے۔ چھوٹی کشتی
سیانے۔ سمجھ دار، جواں	بجرے۔ کشتی	کشتی	مور۔ پھولوں کا جڑا
دل لگن۔ دلچسپی	ناؤ۔ بڑی کشتی	بنے۔ ایک قسم کی لمبی	تیر۔ کنارہ

۲۶۔ موسم زمستان

چلا۔ چنے کا جڑا سخت	ہماوٹ۔ لگھ کی بارش	نیمہ۔ نیم آستین	چھب۔ طرح داری
سردی	باؤ۔ ہوا	جان۔ معشوقہ، نازنین	

۲۷۔ اومس

اومس۔ سڑی گرمی	بٹ۔ سراسر	بدلی۔ بادل	آدھن۔ کھوتا ہوا پانی
	تاؤ۔ غصہ	آٹیں۔ بھریں، پڑ کریں	

۲۸۔ کورا برتن

کھنکی۔ پڑی، گری، جس سے	گولی۔ بڑا مڑکا	کھرا کھوٹا۔ فاسد خیالات	گرٹھتے۔ بناتے
آواز پیدا ہونی	مول۔ قیمت	کاہجوم	جوہن۔ حسن
مات۔ شکست	ٹھٹھولیاں۔ مذاق	عالم میں۔ حسین، پر جمال	جوہرے۔ پرانے، استعمال شدہ

۲۹۔ کو اوہرن کا بچہ

لگا۔ بہلا چھلا	بد سگال۔ بد معاش	لپٹ۔ زمین سے مل کر	چیتا۔ چاہا
حذر۔ ڈر، پرہیز	بد وضع	جھپاک۔ فوراً، جلدی سے	

۳۰۔ خواب کا طلسم

کڑمی کڑمی۔ بے غل غش	جرط۔ جرطاد	لوٹ پلوٹ۔ بے قابو	بکھرن۔ بوچھاڑ، جھڑی
بکثرت	ہڑبڑی۔ گھبراہٹ	بے تاب	دھڑی۔ بیسیر
کھان۔ کان	ہیجان، اضطراب	نار۔ سنگھار، آرائش	کثیر

۳۱۔ ریچھ کا بچہ

سونٹا۔ ڈنڈا	قیق۔ چیچ، ہانھی کی	جنگے۔ جنگل	کھروا۔ ایک قسم کا نالچ
جھولنا۔ جھولی	آواز	سدھایا۔ رام کیا	سحر۔ جادو
دور۔ موتی، بندے	ڈکاریں۔ آواز شتر	ڈھیلی۔ ڈفلی	

۳۲۔ راکھی

راکھی۔ ایک قسم کا اون	کاہار جوسونو	بامجن۔ برہمن	تشقہ۔ ٹیکا
اور سنہری پھولا	کے دن باندھا جاتا	دوانی۔ دیوانی	

۳۳۔ سناوتِ عشرت

تن زیب۔ ایک قسم کا ایک	پانی۔ کنجوس، بخیل	من ماننا۔ خاطر خواہ	ڈل۔ نقدی، زر
نہ سکہ۔ ایک قسم کا بڑا	دانا۔ سخی	لکٹن۔ قمرانی، دبوٹ	آن۔ کھانا، رزق
	ڈنکا۔ شہرہ	خالصہ۔ کورٹ	

۳۴۔ چاندنی رات

بلوئیں۔ موحیں، ارنا، بچکولے	گجر۔ صبح کا مسلسل گھنٹہ	فرار۔ غائب	گمان
لینا	دوچار۔ بے حجاب	ہک نہ دھک۔ بے شاد	جیون میں۔ طبیعتوں میں

۳۵۔ ہوئی

خرسند۔ خوش	مردنگ۔ ایک قسم کا	عجیر۔ گکال	فقرہ بازیوں
سج و سج۔ چلبلا پن، سنگھار	ڈھولک	دھینکا مستی۔ زبردستی	چھندوں۔ خوشی۔ شگفتگی
سوانگ۔ کسی کی صورت بنانا	جھڑپیں۔ تار کی آواز	مار دھاڑ کرنا	کامنیوں۔ کامنی، حسین
موہ لیا۔ چھین لیا	جاگہ۔ جگہ	نوکا جھونکی۔ مذاق	دلربا نازک اندام عورت

۳۶۔ جوگی نامہ

پھبن۔ زینت	بید۔ ایک درخت کا نام	مندرے۔ حلقے	نمن۔ طرح
ذوقن۔ ٹھوڑی	منکلم۔ گفتگو	سیلی۔ سیلاب	بھبھوت۔ راگھ

پونگی - عام اصطلاح میں اس کے بین کتے ہیں بین حالانکہ دوسری چیز ہے -	پینتھ - گروہ برن - شوک جماعت تبدیلہ گیان - خدا کا توفیق عرفان	استحل - خافقہ، اودہ مگن - خوش و خرم ان بن جھگڑا، الجھن	بندھن - رشتہ تعلق چرن - جسم بدن لکھن - مشکل	نکین - آنکھیں اچیل - شوخ آسن - نشیبت
ہر - خدا درشن - دیدار سیلے - چادر، ڈوپٹہ	رمائی - لی لنگھن - فافہ کارن - وجہ سبب	پیتیم - معشوق اتیت - جوگیوں کی ایک قسم	لگن - دھن اکسیر - امرت قدح - پیالہ	چتر - شامیانہ سنگھاسن - چوکی، ایک قدیم سواری

۳۷۔ جوگن نامہ

توبہ - کشکول منکوں - تسبیح کے دانے چندراں - چاند	پت - شوہر ساجن - معشوق بیری - دشمن	کمٹی - کمی من - میرے شہانہ - شاہانہ	جلیو - جل جائے متوالا - سرشار دیوانہ لنگ - لنگا	بہارول - جھاڑوں صاف کروں پیا - پیارے، عاشق
--	--	---	---	--

۳۸۔ موتی

میسر - تھک نرموں - کان کی لو	اوٹھگدی - سینے کا ایک پورا پور - انگلی کا پورا، ٹکڑا	لینے - حصہ	دارے - قربان کیجئے نثار کیجئے
---------------------------------	---	------------	----------------------------------

۳۹۔ اکبر آباد

جہاں تہاں - کسی کسی جگہ	عارض - زرخار	جعد - زلف	نبات - مصری
-------------------------	--------------	-----------	-------------

قوانین

۱۰۔ حواشی

(روایتی و ادبی نقطہ نظر سے)

۱۔ الٰہی نامہ

گنبدِ ارزق - نیلا آسمان - مشرقی نجوم اور قدیم فلسفے کی بنا پر آسمان کو گردش کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور شمار اس کو گنبد سے تشبیہ دیتے ہیں۔

لوحِ قلم، عرش - قدیم عقیدہ ہے کہ یہ آسمان جو نظر آتا ہے یہ عرش ہے۔ اس پر ایک جگہ کرسی ہے اور کرسی پر لوح محفوظ ہے جس پر قرآن مجید اور دیگر کتب آسمانی یعنی زبور، توریت، انجیل وغیرہ منقوش ہیں جس قلم نے ان کتب کو لوح پر تحریر کیا اسے قلم قدرت کہتے ہیں۔

عالم ارواح - وہ مقام جہاں مرنے کے بعد روحوں کا اجتماع ہوتا ہے۔

عالم جنات - وہ مقام جو جنات کا مسکن ہے۔

دارا و سکندر۔ مقدونیہ کے بادشاہ سکندر اعظم نے ایران قدیم پر حملہ کیا اور وہاں کے آتش پرست بادشاہ دارا سے اس کی جنگ ہوئی۔ جس میں سکندر فتح مند ہوا اور دارا مغلوب۔ نظامی کی مشہور شہنوی سکندر نامہ میں یہ تاریخی فسانہ نہایت وضاحت کے ساتھ مرقوم ہے۔

مجنون لیلی۔ قیس جس کا لقب بعد کو مجنون ہوا عرب کا ضرب النثل عاشق ہے۔ یہ قبیلہ بنی عامر کا ایک فرد اور غالباً جناب امام حسن علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ لیلی اس کی معشوقہ نجد کی رہنے والی تھی۔ جس پر یہ بچپن ہی میں مکتب میں عاشق ہو گیا تھا۔ یہ بد نصیب ناکام داماد و مراغہ عشاق میں اس کا ہم اب بھی نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔

ع قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں

فرہاد شیریں۔ ایران کے آتش پرست بادشاہ خسرو نے شیریں نگار رزمی کی تصویر پر عاشق ہو کر اسے شادی کا پیغام دیا اور وہ اپنے ملک سے شادی کرنے کے لئے ایران آئی۔ شیریں کی ماں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے واسطے پہلے محل و بلوغ و نہر تعمیر کرے اس وقت شادی کرنے پر رضامند ہو۔ چنانچہ اس نے اس کی فرمائش خسرو سے کی۔ خسرو نے فرہاد نامی سنگتراش کو بلا کر حکم دیا کہ بے ستون نامی پہاڑ سے ”جوئے شیر“ کاٹ کر لائے۔ فرہاد شیریں کو دیکھ کر عاشق ہو گیا اور اسی عالم مجنون و بدحواسی میں پہاڑ کا ٹٹا شروع کر دیا۔ یہ خبر شدہ شدہ خسرو کو پہونچی اس نے بدنامی کے خیال سے فرہاد کو خفیہ قتل کرانے کی کوشش کی یہ کام ایک پیرزن کے سپرد کیا گیا وہ اس مقام پر پہونچی جہاں فرہاد شیریں کے عشق میں مہوت نہر کاٹ رہا تھا اور اس سے کہا کہ شیریں نے اپنی جان دیدی۔ دیوانہ عاشق کے لئے یہ تازیانہ کافی تھا۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی فرہاد نے تیشہ مار کر اپنا کام تمام کر لیا۔ جب یہ خبر شیریں کو پہونچی فرہاد کا تیر عشق اس کے جگر کے پار ہو گیا۔ اس کی وفاداری اور صداقت عشق پر دیوانی ہو کر

شیریں نے بھی اپنے کو ہلاک کر لیا۔ فرہاد و شیریں کا وجود اب دنیا میں نہیں لیکن ان کی محبت کا فسانہ اب تک ہمارے تڑپانے کے لئے زندہ ہے۔

۲۔ برسات کی بھاسرین

ماہ تا بہ ماہی۔ قدیم فلسفہ ہندوستان اس کا قائل ہے کہ سب سے نیچے پانی ہے اس پر ایک بھلی قائم ہے اور اس پر ایک گائے کھڑی ہوئی ہے اور گائے کے ایک سینک پر دنیا قائم ہے چنانچہ جب گائے کا ایک سینک ٹھک جاتا ہے تو وہ دوسرا بدلتی ہے اس طرح جو حرکت ہوتی ہے اس کا نام زلزلہ ہے۔ اس لئے اس محاورے کے یہ معنی ہیں کہ اوج کے اعلیٰ ترین نقطے ماہ سے لے کر حقیض کے پست ترین نقطے ماہی تک۔

۳۔ بنجار کا نام

سیسہ دار و اور گولا۔ زمانہ قدیم میں جب غنیم قلعہ پر حملہ کرتا تھا اور خندق کو پار کر کے دروازہ توڑنے پر آمادہ ہوتا تھا تو قلعہ کے اوپر سے اس پر بہت سے حملے کئے جاتے تھے۔ منجملہ ان کے گولے بھی مارے جاتے تھے اور سیسہ بھی گھلا کر ڈالا جاتا تھا کہ ان باتوں سے مجبور ہو کر پسپا ہو جائے۔

۴۔ عاشق کا مکر

روم۔ قدیم ترکی کا نام ہے۔

زننگ۔ زنگبار افریقہ میں ایک ملک کا نام ہے۔

برج۔ قدیم اسلامی نجوم کے مطابق آسمان پر بارہ برج ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں :- حل، عورت، دلو، جدی

توس، عقرب، میزان، سنبلہ، اسد، سرطان، جوزا، ثور۔

۵۔ آدمی نامہ

ابدال قطب } یہ تصوف کی اصطلاحیں اور مدارج عرفان کے نام ہیں۔ ابدال سب سے بڑے عارف کو کہتے
غوث گوی } ہیں اور یہ دنیا میں صرف چالیس ہوتے ہیں۔ غوث کا رتبہ ابدال سے کم ہے اور یہ بہت ہو سکتے
ہیں۔ قطب کا مرتبہ غوث سے کم ہے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ تو سب مدارج
عرفان اور تصوف کے عہدے ہیں، لیکن ولی کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ ولایت عہدوں
کے سلسلہ میں شامل نہیں لیکن فی نفسہ اعلیٰ ترین درجہ فقر و تصوف ہے۔

فرعون۔ فرعون کے خاندان نے مدت دراز تک قدیم مصر پر حکومت کی ہے فرعون کسی فرد واحد کا نام
نہیں بلکہ ایک خاندان کا لقب ہے اس خاندان کی لاشیں ممی بنی ہوئی اب تک مصر کے
میناروں اور حفريات سے برآمد ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جو فرعون بادشاہ
تھا اس کا نام بعض مورخوں کے نزدیک رعیمیس تھا۔ اُسے بخومیوں نے خبر دی کہ تو موسیٰ
کے ہاتھ سے جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا مارا جائے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں جتنے بچے
پیدا ہوتے تھے فرعون انھیں قتل کرتا تھا جب موسیٰ پیدا ہوئے تو ان کی ماں نے
فرعون کے در سے انھیں ایک صندوق میں بند کر کے ایک دریا میں چھوڑ دیا۔ خدا کی قدرت
دیکھو فرعون کی زوجہ آسیا نے اپنے باغ سے صندوق کو دریا میں بہتا دیکھ کر نکلوا لیا۔ آسیا
کے کوئی اولاد نہ تھی اس نے موسیٰ کو مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا۔ جب موسیٰ بڑے ہو کر
پیغمبر ہوئے تو فرعون کو ہدایت فرمائی اور تلقین دین حق کرنی چاہی۔ فرعون نے قبول نہ کیا
اور بڑے بڑے ساحروں سے حضرت موسیٰ کے مقابلے کرائے۔ آپ نے سب کو اپنے

عصا کے ذریعہ سے شکست دی۔ آخر کار فرعون سے جنگ کی نوبت آئی۔ بہت سی مرتبہ حضرت موسیٰ ہارے لیکن آخر کار غضب الہی فرعون اور اس کی فوج پر نازل ہوا اور بانی نیل میں غرق کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کو دوسرے خداوند تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے ایک توید بیضا یعنی آپ کی کت دست مثل باہتاب کے حکمت تھی دوسرا عصا یعنی جب اپنی لکڑی کو زمین پر ڈال دیتے تھے تو سب کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

شدا د۔ کہتے ہیں کہ عاد کے دو بیٹے تھے شدا د اور شدید اور یہ دونوں بادشاہ تھے۔ جب شدید مر گیا تو شدا د سب ملکوں کا بادشاہ ہوا اور بہت سے بادشاہوں نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ اس کا غور یہاں تک بڑھا کہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت داؤد کو اس کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر تو ایمان لائے گا تو خدا تجھ کو بہشت عطا کرے گا۔ اس نے پوچھا بہشت کیا ہے، حضرت داؤد نے بہشت کے محاسن اس کے سامنے بیان کئے۔ اس نے جواب دیا کہ ایسا تو میں خود بنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے سرزمین میں ایک بہشت تعمیر کرایا جس کا نام ارم رکھا۔ جس وقت وہ بن کر تیار ہوا تو شدا د اس میں جانے لگا تو ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی اور واصل جہنم ہوا۔

نمرود۔ اپنے زمانے کا بہت بڑا بادشاہ گزرا ہے حضرت ابراہیم اسی کے زمانے میں تھے۔ ان کا چچا آذر بت تراش اور بت پرست تھا حضرت ابراہیم کو اس مذہب سے نفرت تھی۔ آخر کار نمرود نے ایک بہت بڑی آگ روشن کر کے حضرت ابراہیم کو جھنق میں رکھ کر اس میں پھنکوا یا۔ اس دوران میں تمام آسمانی فرشتے ایک ایک کر کے حضرت ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہمدردی کرنی چاہی لیکن آپ نے ہر ایک کی مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کی مدد کے منتظر رہے۔ جس وقت آپ کو آگ میں پھینکا گیا۔ خداوند تعالیٰ نے

اگ کو سردہر جانے کا حکم دیا اگ سردہو گئی اور حضرت ابراہیم کو اس سے کوئی گزند نہ پہونچی۔
 کلمہ - لا الہ الا اللہ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللہ - یہ مسلمانوں کے اعتقاد کا پہلا سبق اور جزو اعظم ہے۔

۴۔ روضۂ تاج گنج

دو مرتب ہیں۔ ممتاز محل اور شاہجہاں کی قبریں اس کے اندر ہیں لیکن درمیان میں ممتاز محل کی ہے اس لئے کہ صرف اسی کے لئے یہ مقبرہ تعمیر کرایا گیا تھا شاہجہاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے شاہجہاں کو بھی اسی میں ایک طرف دفن کرایا اور دوسرا تاج گنج بنوانا فضول خرچی سمجھ کر اس سے قطعی انکار کر دیا۔

خط طغرئی - بہت سی قسم کے خط ہیں مثلاً، خط نستعلیق، خط ثلث، خط گلزار وغیرہ وغیرہ منجملہ ان کے خط طغرئی بھی ہے۔ تاج گنج کے دروازے پر یہی خط لکھا ہوا ہے۔
 بُرج بسی - تسبیح خانہ کے قریب دریا کے کنارے جو بُرج ہے اس کو برج بسی کہتے ہیں۔

تاجدار شاہجہاں - مشہور ہے کہ ممتاز محل کے بعد شاہجہاں نے خواب دیکھا کہ ممتاز محل اس سے یہ فرمایا میں کر رہی ہے کہ اس کا مقبرہ ایسا بے عدیل بنوایا جائے جس کی مثال و نظیر دنیا میں کہیں نہ ہو۔ اس عالم خواب میں شاہجہاں نے وعدہ کر لیا۔ اس خواب کو دیکھے جب کئی روز ہو گئے تو ایک فقیر دربار میں آیا اور کہا کہ بابا بی بی کی وصیت بھول گیا، شاہجہاں نے کہا میں جی بھولا تو نہیں لیکن اس پریشانی میں ہوں کہ نقشہ کہاں سے لاؤں۔ فقیر نے یہ سن کر ایک ٹھیکر ہی اس کے ہاتھ میں دیدی اور کہا کہ اس نقشہ کا بنوادے، یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ مشہور ہے کہ وہ فقیر فرشتہ تھا اور ممتاز محل کے مکان بہشتی کا نقشہ شاہجہاں کو دے کر غایب ہو گیا۔ چونکہ بہشت کے

تقے پر بنا ہے اس لئے تاج میں یہ دلفریبی ہے۔

۹۔ زکمرغان

کُنْ فَيَكُونُ۔ یہ عربی کا فقرہ قرآن مجید میں ہے اس کے معنی یہ ہیں ”ہو جائیں ہو گیا“ اسلام کی کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید میں ذکر ہے کہ خداوند عالم نے کائنات کو لفظ کن کہہ کر پیدا کیا اور فوراً تمام کائنات وجود میں آگئی۔

۱۰۔ فنا نامہ

گوہر۔ شہزادہ علی گوہر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بعد کو شاہ عالم کے نام سے بادشاہ ہوا۔
ماہی مراتب۔ اعزازی نشانات۔ یہ انگریزی ”کوٹ آف آرمس“ کا مترادف ہے۔
جسم۔ ایران قدیم کے مشہور بادشاہ جمشید کے نام کا مخفف ہے۔ یہ آتش پرست تھا اور اسی نے جام جمشید بنوایا تھا۔

اکبر۔ خاندان مغلیہ کا مشہور و معروف شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر۔
نوشیرواں۔ ایران قدیم کا بادشاہ تھا، اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے ضرب المثل ہے، اس کا مذہب آتش پرستی تھا۔

راج بنی۔ راجپوت، راجہ کے خاندان کا۔

چتوڑ گڑھ۔ ریاست اودے پور میں ایک مقام ہے جہاں ایک قدیم قلعہ بنا ہوا ہے، یہاں راجپوت راجاؤں کا ایک مشہور خاندان آباد ہے جو غایت شرافت سے اپنے آپ کو آفتاب نسب خیال کرتا ہے اور سورج بنی کے لقب سے ملقب ہے۔ اس خاندان کے راجہ اپنے متین

رام چندر کی اولاد جانتے ہیں، سب سے پہلے چتوڑ گدھ پر مامون نے حملہ کیا مگر اس کا حملہ ناکام رہا، علاء الدین خلجی نے حملہ کر کے اس پر فتح حاصل کی، اس فتح کے بیسیوں قلعے بن گئے انہی میں آلا اودل بھی ہے، دوسری فتح اکبر نے حاصل کی۔

ستارا۔ ستارادہ جگہ ہے جہاں رام راجہ قلعہ ججی سے بھاگ کر قلعہ بند ہوا مگر اورنگ زیب نے سنہ ۱۶۷۸ء میں بذات خاص اس کا محاصرہ کر کے چوتھے ہی مہینہ فتح کر لیا تاریخ فتح ستارا اپریل سنہ ۱۶۷۸ء ہے۔

کالنجس۔ بندیل کھنڈ کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ ہے جس کے محاصرے میں شیر شاہ کی جان گئی۔ پنج ہزاری۔ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں پنج ہزاری ایک منصب تھا۔

امیر خاں۔ امیر خاں محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب تھا اور بادشاہ کا بہت ہی مٹھ چڑھا تھا۔ ذوالفقار خاں۔ ذوالفقار خاں اورنگ زیب کا سپہ سالار تھا سنہ ۱۶۹۸ء میں قلعہ ججی اس کے ہاتھ سے فتح ہوا۔

محمدا ر خاں۔ دلی میں محمدا ر خاں کا باغ شہر سے باہر جھادنی میں واقع ہے۔

ہانسی - مشہور تاریخی مقام ہے
حصار - مشہور تاریخی مقام ہے
ٹھٹھہ - مشہور تاریخی مقام ہے

شہنواز خاں۔ یہ ناصر جنگ والی ریاست حیدر آباد کا مدار المہام تھا۔

سرفراز خاں۔ سرفراز خاں، شجاع الدین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا تھا۔ سنہ ۱۷۷۸ء میں اپنے باپ کا جانشین ہوا، نادر شاہ کا حملہ اسی کے زمانہ میں ہوا۔ جب نادر شاہ چلا گیا تو علی وردی خاں صوبہ دار بہار نے محمد شاہ کے وزیر کو کچھ دے لے کر ہنگال کی صوبہ داری حاصل کر لی۔ سنہ ۱۷۷۸ء

لے کر مرشد آباد پر چڑھ دوڑا، سفر ازخاں گولی سے مارا گیا، علی وردی خاں اس کی جگہ تخت پر بیٹھا اور خطبہ سکھ جاری کیا اور حسب وعدہ دہلی کو ایک کروڑ زر نقد اور ستر لاکھ کے جواہرات بطور نذر روانہ کئے۔

عیسیٰ - عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام - یہ بن باب کے پیدا ہوئے مسلمان اور عیسائی دونوں ان کو پیغمبر سمجھتے ہیں۔ ان کا معجزہ یہ تھا کہ مردوں کو جلا دیتے تھے اس لئے ان کا لقب روح اللہ ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کو صلیب پر چڑھا دیا گیا لیکن مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کو خداوند عالم نے زندہ اٹھالیا اور اب چوتھے آسمان پر مقیم ہیں۔ حضرت امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام کے ہمراہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔

لقمان - لقمان زمانہ قدیم کا ایک بہت بڑا حکیم اور فلسفی گزرا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ ایشیا کوچک کا باشندہ تھا اور شہد قتل مسیح میں اس نے کریسٹس نامی بادشاہ کی خواہش سے شہر سارڈس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈلفی کے باشندوں نے اس پر مالہ جرانے کا جھوٹا الزام لگا کر اس کو ٹیلے سے سر کے بل نیچے گرا کر ہلاک کر ڈالا۔ لقمان بڑا نیک کردار اور مریض شخص تھا اس نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مصائب اٹھائے۔ سبقتی آموز حکایات کا ایک مجموعہ اس کی یادگار ہے اور اس کی اہمیت اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ سقراط نے اپنی زہر خورانی سے پیشتر اپنی حیات کے باقی چند گھنٹے طویل خانہ میں اسی کتاب کے مطالعے میں گزاریے تھے۔ اہل اسلام اس کو نبی کا درجہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

سلاطین - یونان قدیم کا ایک بڑا حکیم اور مہتمم باثان فلسفی تھا، یہ سقراط کے ارشد تلامذہ میں تھا اور قدیم فلسفے کا موجد اور اساتذہ سمجھا جاتا ہے۔

بانک - گرو نانک سکھ مذہب کے موجد ہیں اس لئے سکھوں کے بہت بڑے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔

ان کا وطن پنجاب تھا اور یہ اورنگ زیب کے معاصر تھے۔
 کسبیر - یہ بنارس کے بہت بڑے بزرگ زیدہ بزرگ اور عارف شاعر گزرے ہیں۔ ان کے اشعار
 اب ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ دو بے مثالوں اور کمالوں کے طور پر زبان زد
 خلایق ہیں۔ ان کا مذہب کسی کو معلوم نہیں، زندگی میں یہ فرقہ انھیں اپنے مذہب پر سمجھتا
 تھا جب انتقال ہوا تو لاش پر ہندو مسلمانوں نے جھگڑا کیا اور اپنے عقیدے کے مذہب کے
 مطابق تجسیر و تکفین کرنی چاہی جب جادو اٹھا کر کچھ تو لاش غائب ہوئی صرف کچھ بھول ہاتھ
 آئے جو نصف ہندوؤں نے لیکر بھونک دئے اور نصف مسلمانوں نے لے کر دفن کر دئے
 ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ہے اور محبت کی تلقین کرتا ہے۔ ہندو سنا تھ ٹیگور نے
 اس کا کچھ حصہ انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کرایا ہے۔

۱۳۔ بڑھایا

یوسف ثانی - حضرت یوسف علیہ السلام بنی اسرائیل کے بڑے مشہور اور بزرگ مدحیہ غیر اور حضرت یعقوب
 علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ حسن و جمال میں اب تک ان کا ثانی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اس
 لئے حسینان عالم کو یوسف کے حسن سے تشبیہ دی جاتی ہے حضرت یعقوب ان سے
 بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے ان کے بھائیوں نے ان کو کنوئیں میں ڈھکیل دیا، خدا کی
 قدرت سے وہاں ان کو کوئی گزند نہ پہنچی اور ایک شخص نے باہر نکال لیا اور اپنا غلام بنایا۔
 اور آخر کار یہ مصر میں فروخت ہوئے عزیز مصر کی زوجہ زلیخا ان پر عاشق ہو گئی جس کے دام فریب
 سے یہ بہ شکل اپنے کو محفوظ رکھ سکے۔ عرصہ دراز تک یہ مصر کے خمس میں قید رہے لیکن
 آخر کار مصر کے بادشاہ ہوئے۔ ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ ماجامی نے اپنی مشہور مثنوی

یوسف زلیخا میں لکھا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام اسلام کے بڑے جلیل القدر پیغمبر اور انبیاء الواعزم میں سے ہیں۔ ان کا علم زبردست اور وسیع ہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ یہ اب تک زندہ سمجھے جاتے ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے لیکن عوام کی نظروں سے نہلاں ہیں جو بے شکلوں کو راستہ بتانا ان کا کام ہے اور عالم آب خصوصاً ان کی حکومت میں سمجھا جاتا ہے۔

۱۶۔ کلجگ

ہندو فلسفے نے دنیا کی عمر چار حصوں میں تقسیم کی ہے سَت یُگ، تریتا، دو اُپر اور کل یُگ۔ سَت یُگ بہترین زمانہ تھا۔ تریتا اور دو اُپر درمیانی لیکن کل یُگ (کل جگ) جو کج کل ہے بدترین زمانہ ہے۔ ہر زمانہ کی مذت بہت وسیع ہے جس کا صحیح حساب بتانا بہت مشکل ہے۔

۱۷۔ مَفِلِیسی

گوری { یہ دونوں راگنیوں کے نام ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر علم موسیقی اور اس کی اصطلاحوں بھیا س سے خوب واقف تھے۔

۱۸۔ مَعِیَہُ خَصْرَ عَلَیہِ السَّلَام

عُلی۔ حضرت علی علیہ السلام کے وہ رکن اعظم ہیں جنہوں نے سب سے پہلے دعوت اسلام تیرہ سال کی عمر میں قبول کی۔ آپ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے چچا زاد بھائی اور ان جناب کے داماد تھے اسلام کی جرّ آپ کی ذات سے بھی اور ابتدا کی تمام
 رطائیاں مثل بدر خیمہ اخذ حق وغیرہ سب محض آپ کی ذات سے فتح ہوئیں۔ اہل تشیع آپ کو
 آنحضرت کے بعد وصی رسول اور خلیفہ برحق جانتے ہیں۔ لیکن اہل تسنن جو تھا خلیفہ سمجھتے ہیں۔
 نوروز کے دن آپ کو کوفہ میں ظاہری خلافت ملی۔ اس لئے اور موسمی تہوار ہونے کی وجہ سے
 بھی ایران میں نوروز منایا جاتا ہے۔ اہل تصوف کے آپ سب سے بڑے پیشوا ہیں اور یہ
 فرقہ آپ کو سرچشمہ ولایت و تصوف گردانتا ہے۔

نجف اشرف۔ حضرت مولانا علی علیہ السلام کی قبر اطراف نجف اشرف میں ہے جو عراق عرب کا ایک مشہور شہر ہے۔
 حیدر صفدر۔ حضرت علی علیہ السلام نے عہد طفولت میں ایک انڈیا چیر بھینک دیا تھا اس لئے آپ کا
 لقب حیدر ہوا اور چونکہ آپ ایسے شجاع کیٹا تھے کہ تن تنہا صفوں کے منہ پھیر دیتے تھے اس
 لئے صفدر مشہور ہوئے۔

صاحب قنبر۔ حضرت قنبر حضرت مولانا علی کے خادم اور ذوالجناح کے رائیس تھے اسلام میں ان کا مرتبہ
 بہت بلند ہے اور بڑے جلیل القدر بزرگ سمجھے جاتے ہیں حضرت علی علیہ السلام چونکہ قنبر کے آقا
 تھے اس لئے آپ کو صاحب قنبر بھی کنایہ کہا جاتا ہے۔
 شریف۔ نجف اشرف کے مکی حاکم کو شریف کہتے ہیں۔

۱۹۔ دیوالی

دیوالی - دیوالی ہندوؤں کا نہایت لطیف تہوار ہے۔ آپ دیوالی اس کا خصوصاً نہایت اچھا اثر پڑتا
 ہے۔ مکانوں کی صفائی لازمی طور پر کرائی جاتی ہے، شب کو چراغاں کیا جاتا ہے اور سیروں
 بلکہ ننوں لگی اور خوشبودار مصلح بخورات کے لئے جلا دیئے جاتے ہیں جس سے ہوا نہایت

صاف اور صحت پرور ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں جبکہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا شباب تھا یہاں کے مصور لڑکے اور لڑکیاں دوالی کے روز اپنی صنعتوں کے نمونے عوام کے سامنے پیش کرتے تھے اور بہترین تصویر کو انعام دیا جاتا تھا۔ یہ بات تو اب مفقود ہو گئی ہے لیکن تصویروں کی نمائش اب بھی ہوتی ہے کاش ہندوستان کا وہ عہد زریں پھر واپس آجائے اور اسی طرح آرٹ کی نمائش پھر ہونے لگے۔ دوالی کے دن لکشمی کی جو ہندو علم الا صنم میں دولت کی دیوی سمجھی جاتی ہے پرستش ہوتی ہے۔

۲۔ حضرت سلیم حشتی

حضرت سلیم حشتی۔ شیخ سلیم بن تہاؤ الدین حشتی فتح پور سیکری میں دفن ہیں اور ۲۹ رمضان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جہانگیر آپ ہی کی دعا کی برکت سے پیدا ہوا تھا اس وجہ سے اکبر کو آپ سے خاص عقیدت تھی۔ آپ فریدی ہیں اور حضرت بابا فریدی کی اولاد سے ہیں۔

نغفور۔ چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

خاقان۔ یہ بھی چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

سلیمان۔ حضرت سلیمان بن داؤد دہشت بڑے پیغمبر اور جملہ خلائق کے بادشاہ تھے آپ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر کچھ اسماء الہی کندہ تھے۔ اس کی وجہ سے تمام مخلوق آپ کے زیر فرمان تھی۔ آپ کا تخت بساط سلیمان ہمیشہ ہوا پر اڑا کرتا تھا۔ آصف بن برخیا جو قوم جن سے تھے آپ کے وزیر اعظم تھے۔ سا کی شہزادی بلقیس کے جن و جمال، تہذیب و شایستگی کا قصہ حضرت سلیمان نے ہر ہر اسے سن کر اس شاہزادی کو اپنے یہاں دعوت دی تھی۔ یہ شاہزادی خود بھی نہایت دولتمند اور بڑی جلیل القدر ملکہ تھی حضرت سلیمان کی بلقیس سے ملاقات ایک نہایت دلچسپ

کے چار اذیحائی اور ان جناب کے داماد تھے اسلام کی جڑ آپ کی ذات سے جمی اور ابتدا کی تمام لڑائیاں مثل بدر خبیر خندق وغیرہ سب محض آپ کی ذات سے فتح ہوئیں۔ اہل تشیع آپ کو آنحضرت کے بعد وصی رسول اور خلیفہ برحق جانتے ہیں۔ لیکن اہل تسنن جو تھا خلیفہ سمجھتے ہیں۔ نوروز کے دن آپ کو کوفہ میں ظاہری خلافت ملی۔ اس لئے اور موسیٰ تیموہار ہونے کی وجہ سے بھی ایران میں نوروز منایا جاتا ہے۔ اہل تصوف کے آپ سب سے بڑے پیشوا ہیں اور یہ فرقہ آپ کو سرچشمہ ولایت و تصوف گردانتا ہے۔

نجف اشرف۔ حضرت مولا علی علیہ السلام کی قبر اطہر نجف اشرف میں ہے جو عراق عرب کا ایک مشہور شہر ہے۔ **حیدر صفدر۔** حضرت علی علیہ السلام نے عہد طفولت میں ایک اژدہا چیر کر پھینک دیا تھا اس لئے آپ کا لقب حیدر ہوا اور چونکہ آپ ایسے شجاع یکتا تھے کہ تنہا صفوں کے منہ پھیر دیتے تھے اس لئے صفدر مشہور ہوئے۔

صاحب قبر۔ حضرت تمبر حضرت مولا علی کے خادم اور ذوالجناح کے سائیں تھے اسلام میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور بڑے جلیل القدر بزرگ سمجھے جاتے ہیں حضرت علی علیہ السلام چونکہ قبر کے آقا تھے اس لئے آپ کو صاحب قبر بھی کنایت کہا جاتا ہے۔

شریف۔ نجف اشرف کے ملکی حاکم کو شریف کہتے ہیں۔

۱۹۔ دیوالی

دیوالی۔ دیوالی ہندوؤں کا نہایت لطیف تیوار ہے۔ آپ وہاں اس کا خصوصاً نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ مکانوں کی صفائی لازمی طور پر کرائی جاتی ہے، شب کو چراغاں کیا جاتا ہے اور سیروں بلکہ منوں گلی اور خوشبو دار مصلح بخورات کے لئے جلا دئے جاتے ہیں جس سے ہوا نہایت

صاف اور صحت پر در ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں جبکہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا شباب تھا یہاں کے مصور لڑکے اور لڑکیاں دوالی کے روز اپنی صنعتوں کے نمونے عوام کے سامنے پیش کرتے تھے اور بہترین تصویر کو انعام دیا جاتا تھا۔ یہ بات تو اب مفقود ہو گئی ہے لیکن تصویروں کی نمائش اب بھی ہوتی ہے کاش ہندوستان کا وہ عہد زریں پھر واپس آجائے اور اسی طرح آرٹ کی نمائش پھر ہونے لگے۔ دوالی کے دن لکشمی کی جو ہندو علم الا صنم میں دولت کی دیوی سمجھی جاتی ہے پرستش ہوتی ہے۔

۲۔ حضرت سلیم حشمتی

حضرت سلیم حشمتی۔ شیخ سلیم بن نبھاؤ الدین حشمتی فتح پور سیکری میں دفن ہیں اور ۲۹ رمضان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جہانگیر آپ ہی کی دعا کی برکت سے پیدا ہوا تھا اس وجہ سے اکبر کو آپ سے خاص عقیدت تھی۔ آپ فریدی ہیں اور حضرت بابا فریدی کی اولاد سے ہیں۔

نغفور۔ چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

خاقان۔ یہ بھی چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

سلیمان۔ حضرت سلیمان بن داؤد دہشت بڑے پیغمبر اور جملہ خلائق کے بادشاہ تھے آپ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر کچھ اسماء الہی کندہ تھے۔ اس کی وجہ سے تمام مخلوق آپ کے زیر فرمان تھی۔ آپ کا تخت بساط سلیمان ہمیشہ ہوا پر اڑا کرتا تھا۔ آصف بن برخیا جو قوم جن سے تھے آپ کے وزیر اعظم تھے۔ ساکی شہزادی بلقیس کے جن و جمال، تہذیب و شایستگی کا قصہ حضرت سلیمان نے ہر کہے سن کر اس شاہزادی کو اپنے بہاں دعوت دی تھی۔ یہ شاہزادی خود بھی نہایت دولتمند اور بڑی جلیل القدر ملکہ تھی حضرت سلیمان کی بلقیس سے ملاقات ایک نہایت دلچسپ

تاریخی فائدہ ہے۔ آخر کار بقیس نے ایمان قبول کیا اور حضرت سلیمانؑ کی زوجیت میں داخل ہوئی۔

۲۲۔ ناناک شاہ گرو

واہ گرو واہ گرو۔ بابا ناناک شاہ گرو کی تعریف کا فقرہ اور سکھوں کی قومی صدا ہے۔

۲۳۔ جنم کنھیہ جی

کنس - کنس متھرا کا راجہ اور نہایت ظالم و بدکردار شخص تھا اس کے اطوار راہون کے سے تھے۔ یہ کرشن جی کا مامول تھا۔ آخر کار کرشن جی کے ہاتھ سے مارا گیا کنس اور کرشن کا قصہ بالکل فرعون اور موسیٰ کا سا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں اور تاریخ نویس دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مشابہت نہایت پر لطف اور بار آور نکتہ ہے۔

بادیو - کرشن جی کے باپ کا نام ہے۔

دیو کی - کرشن جی کی ماں کا نام ہے۔

روہنی - ایک پختہ کا نام ہے یعنی یہ اس ساعت سعد و نیک کا نام ہے جس میں کرشن جی پیدا ہوئے۔

گوکل - ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے جو متھرا کے نزدیک ہے۔ یہ بہت بڑی تیرتھ کی جگہ ہے۔

کرشن جی کا بچپن اسی مقام پر گزرا۔

نسند - اس شخص کا نام جس نے کرشن جی کی بطور باپ کے پرورش کی اس لئے اس کو رضاعی باپ سمجھنا چاہیے۔

جسودا - نند کی زوجہ کا نام ہے یہ کرشن جی کی رضاعی ماں تھی۔

ہوکاندے۔ ہندوؤں کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ یہ اُس وقت کی جاتی ہے جب بچہ پہلی مرتبہ پاخانہ
 بھرتا ہے۔ وہی اور زعفرانی ملا کر بچہ کا مصنوعی پاخانہ بنایا جاتا ہے اور کورے مٹی کے برتنوں
 میں دودھ بھر دیا کر رکھایا جاتا ہے اور اس میں ہلدی پیس کر ملا دی جاتی ہے تاکہ اس کا رنگ
 زرد ہو جائے۔ پھر اس دودھ کو تمام اہل خانہ غالباً ایک دوسرے پر چھڑکتے ہیں۔

۲۴۔ بانسری

راوے۔ رادھا کرشن جی کی مشوقہ کا نام ہے۔

۲۵۔ آگے کی تیراکی

جھڑنا۔ تلج گنج سے لٹوٹلہ تک تیر کر جاتے ہوئے درمیان میں ایک مقام پڑتا ہے جس کو جھڑنا کہتے
 ہیں۔ وہاں ایک پل بنا ہوا ہے جسے بھرنے کا پل کہتے ہیں۔
 سہا کا پیالہ۔ سہا کسی استاد تیراکی کی لڑکی اور قوم کی ساقن تھی۔ اس کو تیرنے کا بڑا شوق تھا، نوچندی
 کے میلہ میں سہا حقہ لے کر جاتی تھی اور تیرنے کی حالت میں انھیں حقہ پلاتی جاتی تھی۔ اس
 کے مرنے کے بعد تیرا کوں نے اس کی یادگار میں ایک میلہ قائم کیا جس کا نام پیالہ رکھا،
 سہا کا انتقال چونکہ نوچندی جمعرات سے دو روز بیشتر یعنی منگل کو ہوا تھا اس لئے یہ میلہ
 ہمیشہ منگل کو ہوتا ہے۔ جس مقام پر پہلے پہل سہا کی فاتحہ خوانی تیرا کوں نے کی تھی وہ مقام
 اب سہا کے نام سے مشہور ہے اور سہا مانی کا پیالہ کہلاتا ہے۔ شہباز کی رائے ہے کہ
 سہا کسی امیر عورت کا نام تھا اور اس کا کوئی نالہ ہے۔ یہ قطعی غلط معلوم ہوتا ہے۔
 چھتری۔ سہا کے پیالے سے تھوڑی دور لب دریا ایک برج بنا ہوا ہے جسے چھتری کہتے ہیں۔ یہ آگرہ

کے کسی قدیمی سیدھ نے جس کا نام جنونت تھا بنوائی ہے۔ اس مقام پر غالباً کوئی مندر یا معبد بنوانے کا قصد تھا جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا لیکن یہ پچھتری اب تک موجود ہے۔
 بُرجِ خونی - آج کل یہ بُرج دریا کنارہ کی سڑک پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہاں سڑک نہ تھی بلکہ دریا اس سے ٹکراتا تھا۔ یہاں پانی اس قدر عمیق اور خطرناک تھا کہ اکثر ناٹھی تیراک ڈوب جایا کرتے تھے اس لئے اس کا نام خونی بُرج مشہور ہو گیا۔

دارا کا چوترا - سید کے باغ اور آرام باغ کے درمیان شکستہ شاہی عمارات کا ایک سلسلہ ہے جس میں سے ایک دالان منہدم ہو کر پانی کے اندر بیٹھ گیا ہے اس دالان کی چھت مثل چوترے کے ہو گئی ہے جو کبھی پانی کے اندر پوشیدہ اور کبھی نمایاں رہتی ہے۔ ممکن ہے یہاں پہلے دارا کا محل ہو اور اس مقام کو محل منہدم ہو جانے کے بعد دارا کا چوترا کھنے لگے ہوں۔
 مہتاب باغ - تاج گنج کے سامنے دوسرے کنارے پر ایک بُرج بنا ہوا ہے اس مقام کو تیراک مہتاب باغ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غالباً کسی زمانہ میں یہاں باغ تھا اور وہ خصوصاً تاج گنج کے تیراکوں کی آماج گاہ بنا رہتا تھا۔ اس جگہ شاہجاں اپنا مقبرہ بنانا چاہتا تھا۔

سید - بھرنے سے آگے لب دریا ایک قبر ہے جو سید شاہ صوفی کی مشہور ہے۔ سید سے مراد یہ مقام ہے۔ یہ مقام تاج گنج سے براہ آب ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے تیر کو ٹوٹ لے جانے والے تیراک اس مقام پر دریا سے نکل آتے ہیں اور پھر ریل سے آگرہ واپس آتے ہیں۔
 تلسی - تاج گنج اور بھرنے کے درمیان ایک باغچہ ہے جو سیاحرن کی باغیچی کہلاتا ہے اس میں کئی تلسی بادا رہتے تھے جنھیں تیراکوں سے بڑی محبت تھی۔ باوا ان لوگوں کے لئے بھنگ، تنباکو، چرس، آگ، پانی ہمیشہ مہیا رکھتے تھے، یہاں پرانے تیراک اکثر جایا کرتے تھے، تلسی بادا کے مرنے کے بعد ان کی سل جن پر وہ بھنگ پیسا کرتے تھے بہت مشہور ہوتی۔

باغ حکیم - سجا کے پیلے اور بلیکشر کے درمیان ایک باغ ہے جو حکیم کا باغ مشہور ہے یہاں ایک لائبریری
 سفید قبر ہے جو غالباً کسی شاہی حکیم کی ہے۔ تیراکی کے میلہ کے دن یہاں رقص و سرود
 کی محفلیں بپا ہوتی اور تیراک یہاں کچھ دیر قیام کرتے ہیں۔

شیو داس کا چمن - جس مقام پر ب دریا کا رخا نے بنے ہوئے ہیں وہاں کسی زمانے میں ایک بہت
 بڑا باغ تھا جو رائے شیو داس کا بنا ہوا تھا یہاں میلے کے دن رقص و سرود کی محفلیں
 قائم ہوتی تھیں۔ اور تیراک یہاں بھی انفرج کے لئے ٹھہرتے تھے یہ باغ اب موجود نہیں
 لیکن یہ مقام اب بھی راشو داس کا چمن کہلاتا ہے جو یقیناً رائے شیو داس کی خرابی
 ہے۔

۲۸۔ گورابرتن

آب حیات - مشہور ہے کہ آب حیات وہ پانی ہے جس کو پی کر انسان کبھی نہیں مرتا۔ اس کا چشمہ
 ظلمات میں ہے۔ سکندر ذوالقرنین کو اس چشمے تک پہنچنے کی خواہش ہوئی لیکن کیونکر
 پہنچ سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو نگاہوں سے پوشیدہ ہے آخر کار حضرت خضر کی رہبری
 سے وہاں پہنچا لیکن وہاں عجیب عبرت ناک منظر نظر آیا۔ دیکھا سینکڑوں آدمی اپنا بیج
 بنے پڑے ہیں صرف سانس چل رہا ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ آب حیات پنی کر یہ کیفیت
 ہو جاتی ہے تو اس نے نہ پیا اور واپس چلا آیا۔

۲۹۔ کوّا اور ہرن کا بیچہ

کوّا اور ہرن۔ یہ قصہ اصل میں انوار سہیلی میں ہے۔ میاں نظیر نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ قصہ نثر میں تھا میں نے نظم کیا ہے۔

۳۲۔ چاندنی رستا

ارم - ارم ایک بہشت کا نام ہے۔ ارم دراصل اس بہشت کا نام ہے جو خدا نے دنیا میں تعمیر کرایا تھا خدا کے واصل جہنم ہونے کے بعد اس کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

۳۶۔ جوگی نامہ

بند رابن۔ منہر کے نزدیک ایک مشہور برتیش گاہ اور تیرتھ کا مقام ہے۔
آدم - ابوالبشر حضرت آدم کو خداوند تعالیٰ نے مٹی سے بنایا اور ان کی زوجہ حوا کو ان کی بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ ابلیس کو حکم ہوا کہ حضرت آدم کو سجدہ کرے لیکن اس نے انکار کیا۔ اس لئے اس کو راندہ درگاہ کر دیا گیا اور مرد و خلاق قرار پایا اور شیطان کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت آدم کو بہشت میں سوائے گندم کے جملہ میوہ جات کھانے کا حکم تھا۔ شیطان کی اب یہ کوشش ہوئی کہ آپ کو کسی طرح گہیوں کھلائے۔ پہلے

اس نے حضرت حوا کو بہکایا اور اُن کے ذریعے اسے حضرت آدمؑ کو گیہوں کھلانا چاہا۔ لیکن ناکامیاب ہوا۔ کئی ناکامیوں کے بعد آخر کار ایک مرتبہ شیطان حضرت آدمؑ کو فریب دینے میں کامیاب ہوا اور اُنہیں گیہوں کھلا دیا۔ اس ترکِ اولیٰ کی بنا پر حضرت آدمؑ اور حوا بہشت سے نکال کر دنیا پر ڈال دئے گئے اور دونوں کو علیحدہ علیحدہ مقام پر رکھا گیا ایک مدت کے فراق اور بڑی آہ و زاری کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کی ملاقات نصیب ہوئی۔ بنی نوع انسان ان ہی کی نسل ہے۔

۳۷۔ جوگن نامہ

کاشی - بنارس کا قدیم نام ہے۔ یہ ہندوؤں کا بڑا مقدس شہر، پرستش گاہ اور تیرتھ ہے، یہ زمانہ قدیم میں بہت بڑا اور العلوم تھا۔ اب بھی سنسکرت کے بڑے بڑے علما اور جوگی یہاں رہتے ہیں۔ اس مقام پر شیخ علی حزیں کی قبر ہے۔
دکن - شاہی زمانہ میں دکن نہایت دور دراز جگہ سمجھی جاتی تھی۔

۳۸۔ موتی

موتی - میاں نظیر کی معترفہ کا نام تھا۔ یہ شہباز کی تحقیق ہے اور غالباً صحیح ہے۔

۴۰۔ اکبر آباد

اکبر آباد۔ آگرہ کا قدیمی نام ہے۔ یہ مقام اکبر کو بہت پسند تھا اور اسی نے اس کو آباد کیا اور اُسی زمانہ سے اس کا نام اکبر آباد پڑا۔ پُرانا آگرہ جہاناکے بائیں کنارے پر ہے اور اب صرف ایک محلہ کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی جانتا بھی نہیں کہ اکبر کے بسا نے سے پیشتر آگرہ اس طرف آباد تھا۔

عنوانات کا اندیس

۱۔ عنوانات کا اندیکس

(اشاریہ)

دیباجہ ۱	جوانی ۲۴۲/۵۷	بڑھاپا ۲۴۷/۵۸	(الف) اخلاقی پہلو ۱۹
دیباجہ طبع دوم ۹	جوانی بڑھاپا ۳۶۲	بلدیوچی کا میلہ ۳۶۶/۱۳۵	ادب القدما ۲۴
ذکر مرغان ۵۴ (ذ)	جوگن نامہ ۳۲۳/۸۹	بنجارہ نامہ ۴۷	آدمی نامہ ۲۲۳/۴۹
راکھی ۳۰۹/۸۴ (ر)	جوگی نامہ ۳۱۷/۸۹	بھونچال ۳۵۲/۱۲۵	اڑوہے کا بچہ ۳۴۷/۱۲۲
رسم خط ۳۸	چاندنی رات ۳۱۳/۸۶ (ج)	پری کا سراپا ۳۳۶/۹۳	اکبر آباد ۳۳۵/۹۱
رنگ کے موجد ۱۰	چڑیوں کی شیج ۲۳۵	تعبیرہ ۴۳/۴۱ (ت)	اکبر آباد کی قدیم زبان ۳۰
روٹی نامہ ۳۴۲/۱۱۸	حاکیمانہ انداز ۱۸ (ح)	تخریب کلام ۲۹	آگرے کی تیراکی ۲۹۱/۷۱
روح نظیر ۱	حضرت سلیم جشتی ۲۷۸/۶۶	تضمینیں ۵۴۱	آلہی نامہ ۲۰۳/۴۳
روضہ تاج گنج ۳۳۰/۵۲	حواشی ۵۴۷	تضنیج کلام ۲۸	آندھی ۳۴۵/۱۲۰
ریچھ کا بچہ ۳۰۶/۸۲	(خ) خاتمہ ۴۰	تغزل ۱۳۹	اوس ۲۰۶/۷۵
زبان پر اجہاد ۳۱ (ز)	خالص ہندوستانی شاعر ۱۵	تقدیم و تاخیر کلام ۲۷	آئینہ ۳۴۰/۱۱۷
زبان پر احسان ۳۲	خواب کا طلسم ۳۰۳/۸۰	تہدید ۳	ایلیگری یا تمثیل ۲۲
زخاوت و عشرت ۳۱۰/۸۵ (ز)	خوشامد ۲۵۹/۶۰	تندرستی نامہ ۲۳۱/۵۳	(ب) بانسری ۲۸۹/۷۰
سوانح نظیر ۳۸	(د) ددالی ۲۷۵/۶۵	(ج) جنم غیاہی ۲۸۳	برسات کی ہماریں ۲۰۷/۴۵

مقدمہ ۱	گوراہتن ۲۹۸، ۷۶	فلستیت ۱۶۵	شاعرانہ اہلیت ۷
موتی ۳۳۱، ۱۹۱	گڑی نامہ ۳۵۷، ۱۲۷	فقیروں کی صدا ۲۵۷، ۵۹۱	شیکسپیر ۲۵
موت ۳۳۳	کوئی بڑا شاعر اتنا گنہگار نہیں	قائمہ ۲۳۷، ۵۵	شیب و شباب ۱۳۱
موسم زمستان ۲۹۴، ۷۲	دگ (گنہگار) ۴	فہرست مضامین ۱۷	ط (طولی) ۲۴۲، ۵۶
موضوعی غزلیں ۵۰۱	دل (لوکل کلر) مقامی رنگا ۲	ق (قطعات) ۳۹	ع (عاشق نامہ) ۲۲۰، ۴۸
نارنگ شاہ گرو ۲۸۱، ۶۸	م (متر و کات و معائب) ۳۵	قومی شاعر ہے محض ادبی	عروض ۳۶
نظیر کا آرٹ ۱۱	مسلل غزلیں ۴۶۱	نہیں ۳۳	علیت ۹
نظیر کا پرتو غالب پر ۱۹۲	مستزاد ۵۲۹	ک (کثرت کلام) ۲۸	عنوانات کا اندیکس ۵۶۹
نوا آزادانہ ۳۴	مواشرت نگاری ۱۶	کلام نظیر ۲۰۳، ۲۰۱	غ (غزلیات) ۲۷۵
و (وجد و حال) ۳۶۰، ۱۳۰	محبزہ حضرت علیؑ ۲۷۱، ۶۲	کھجک ۲۶۳، ۶۰	غزلیں ۲۷۷
ہنس نامہ ۲۲۶، ۵۱	مشتوق کی تدبیر ۱۳	گڑی ۳۴۹، ۱۲۳	ف (فارسی ترکیب) ۱۸۱
ہولی کی بہار ۲۸۰، ۶۷	مفسی ۲۶۶، ۶۲	کنہیا جی کا جنم ۶۸	فحشیات ۳۷
ہولی ۳۱۵، ۸۸	مقبولیت ۲۷	کوا اور ہرن کا پیر ۳۰۱، ۷۵	فرہنگ ۵۳۱

خاتمہ

نوشترہ حفیظ اکبر آبادی

